برگِ گُل

بابائے اردو نمبر

۱۶؍ اگست ۱۹۶۳ء

اُردو کالج

اردو روڈ۔ کراچی

د اۓ رسو

بابائے اردو اور صدر مملکت

اردو کالج (کراچی) فٹ بال ٹیم
بابائے اردو کے ساتھ
سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء

بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں۔ جناب اکبر علی معتمد کلب ۔ کیپٹن جناب اکرام الرحمٰن نگراں اعلیٰ ۔ جناب سید ذکی الدین پرنسپل
جناب ڈاکٹر عبدالحق (مرحوم) صدر اُردو کالج ۔ جناب سید تقی الدین معتمد اردو کالج ۔ جناب صابر علی چشتی کلب کیپٹن ۔ جناب
وثیق الدین ۔ و دیگر اراکینِ کلب

بابائے اردو نمبر

۱۶ - اگست ۱۹۶۳ء

سرپرست

لفٹیننٹ کرنل محمد عطاء الرحیم

نگراں

پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر

پروفیسر اے - کے - آفتاب زبیری

مدیرین

امراؤ طارق - منین الرحمن مرتضیٰ

معین الرحمن - جمیل احمد صدیقی

عذرا کیفی

اردو کالج

اردو روڈ۔ کراچی

ترتیب

تاثرات

سرآغاز — اسرار طارق — ۷
پیغام — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی — ۱۱
پیغام — نیاز فتحپوری — ۱۲
رباعی — تلوک چند محروم — ۱۳
تاثر — غلام ربانی تاباں — ۱۴
تاثرات — نجیب اشرف ندوی — ۱۵
تاثر — ماجدہ مسرور — ۱۷
تاثر — خدیجہ مستور — ۱۹

انعامی مضامین

روشنی کا مینار — آمنہ صدیقی — ۲۳
مولوی عبدالحق — در شہوار — ۶۲

بابائے اُردو — آنسہ مغنسہ کیفی — ۷۰
مولوی عبدالحق کا مرتبہ — معین الرحمٰن — ۲۴۰

فن اور شخصیت

مولوی عبدالحق — ممتاز حسین — ۸۱
حیاتِ عبدالحق کے چند پہلو — ڈاکٹر ابوسعید نورالدین — ۸۵
بابائے اُردو۔ ایک تجریدی خاکہ — رفیق خاور — ۱۰۵
مجاہدِ اُردو — ڈاکٹر قطب النسا ہاشمی — ۱۱۸
مولوی عبدالحق — پروفیسر خان رشید — ۱۲۷
اُردو کا زخمی سپاہی — سجاد مرزا — ۱۳۸
عبدالحق۔ ایک تاثر — تابش دہلوی — ۱۴۱
سنجیدگی، مقصدیت اور محنت — عباس احمد عباسی — ۱۴۴
افکارِ عالیہ۔ — ضیاالدین احمد برنی — ۱۴۷
مولوی عبدالحق — منظر حیدرآبادی — ۱۵۴
لفظوں کا جوہری — منظر ایوبی — ۱۵۹
بابائے اُردو — وجد چغتائی — ۱۶۴
محسنِ اُردو — شریف رزمی — ۱۷۱
بابائے اردو مولوی عبدالحق — محمد ایوب اولیا — ۱۷۵
اُردو زبان کی نشو و نما میں مولوی عبدالحق کا مرتبہ — نسیم ریاض — ۱۸۵
اُردو جو سٹ نہ سکی — ظفر نیازی — ۱۹۰
ایک صاحبِ طرز نثار — قیصر نظامی — ۱۹۳
اک شمع رہ گئی ہے — نیرنگ نیازی — ۱۹۸
مولوی عبدالحق اور ترقی پسند اد — مسعود جعفری — ۲۰۶
دیوانہ محسن — محمد طلٰہ خاں — ۲۱۵
اردو تنقید اور عبدالحق — متین الرحمٰن مرتضٰے — ۲۲۴
ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت شخصیت نگار — ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی — ۲۵۱

عنوان	مصنف	صفحہ
عبدالحق۔ باباتے اُردو	ڈاکٹر اختر اورینوی	۲۵۷
مولوی عبدالحق کی نثر: ایک جائزہ	احمد اسحاق نعمانی	۲۶۱
مولوی عبدالحق کا مشن	آنسہ حفیظہ خاتون اسدی	۲۶۷
عبدالحق اور ادب	آنسہ شمسہ کلثوم	۲۷۵
مولوی عبدالحق کی شخصیت	فردوس خاتون	۲۸۳
عبدالحق بحیثیت ایک نقاد	غوثیہ زریں لکھنوی	۲۸۸
ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سیاسی بصیرت۔	افروز شوکت	۲۹۴
مولوی عبدالحق	آنسہ خورشید احسن صدیقی	۲۹۹
بابائے اُردو کے خطبات میں لطیفے اور چٹکلے	کنیز فاطمہ اشرف	۳۰۳
زیب دیتا ہے اسے	عذرا کیپٹن	۳۰۹
اُردو کے معمارِ اعظم	خان اقبال یوسفی	۳۲۱
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں	عزیز الرحمٰن	۳۲۶
اُردو کا باپ	شرلا دیوی	۳۳۲

افکارِ عالیہ

عنوان	مصنف	صفحہ
خطباتُ الحق	مرتبہ مدیر	۳۳۵

منظومات

عنوان	مصنف	صفحہ
نذرِ عقیدت	نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۴۰۳
تو نے جوشِ عشق . . .	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴۰۴
بابائے اُردو	جگن ناتھ آزاد	۴۰۵
دُختِ کشی	شاد عارفی	۴۰۶
خلوص کار دور افتادہ	سلام مچھلی شہری	۴۰۷
اُردو نامہ	رئیس امروہوی	۴۱۰

خالق تخلیق	محشر بدایونی	۴۱۵
ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی نذر	بلراج کومل	۴۱۶
بابائے اُردو	جمیل نقوی	۴۱۷
بابائے اُردو	بہار کوٹی	۴۱۹
مشورہ	صہبا اختر	۴۲۱
بابائے اُردو	حمایت علی شاعر	۴۲۳
اک شکن آلودہ ہاتھ	شاہد عشقی	۴۲۴
شاہدِ اُردو	فضا ابن فیضی	۴۲۵
بابائے اُردو کی خدمت میں	یوسف جمال انصاری	۴۲۸
فخرِ مشاہیر	رضا ابن حامد رضوی	۴۳۰
بابائے اُردو	نصیر کوٹی	۴۳۳
بابائے اُردو	جام بنارسی	۴۳۵
معراج	سہیل اقبال	۴۳۷
پیکرِ عمل	محسن بھوپالی	۴۳۹
بابائے اُردو	منظر جعفری	۴۴۰
بابائے اُردو	ناصر کاسگنجوی	۴۴۱
بابائے اُردو کے حضور ہدیۂ تبریک۔	خورشید حیدر صدیقی	۴۴۳
جس کا ایمان ہے اُردو	نیرنگ نیازی	۴۴۴
بابائے اُردو	شریف کمال عثمانی	۴۴۵
اُردو	انجم اعظمی	۴۴۷

ہم نے "باباۓ اُردو نمبر" نکالنے کا عزم جیسا کہ مضامین سے ظاہر ہے بابا کی زندگی ہی میں کیا تھا اور صرف عزم کیا تھا بلکہ اپنے حصّے
بھی ختم کر لیا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ بابا کی انتھک محنت، لازوال خدمت، صبر آزما جنگ اور فتح و شکست کا اعتراف اپنی بساط بھر ان کی
ہی میں کریں، لیکن یہ نمبر ان کی زندگی میں نہ نکل سکا اور بزم سید کی آخری شمع بجھ گئی؛ ایک عہد تھا، دور تھا کہ ختم ہو گیا، ماضی سے ایک
تھا جو منقطع ہو گیا۔ پوری ایک تہذیب اور معاشرت کا اکمل تصوّر ان کی ذات سے تھا کہ جاتا رہا اور تاریخ کا ایک درخشاں اور روشن
تمدنی باب تھا کہ ختم ہو گیا —— اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اپنے ہاتھ لہو میں ڈوبے ہوئے ہیں، ہمارے اپنے دامن
دار ہیں؛ اور ہم اُس وقت تک سر نہیں اٹھا سکتے جب تک بابا کی آخری خواہش اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں نہ آ جائے۔ یہ کام ہم طلبہ
جن کے لئے بابا ہمیشہ سینہ سپر رہے، ہمیں یقین ہے کہ اُردو کالج سے حیالے بابا کا یہ فرض ادا کریں گے۔

ہمیں مسرت ہے کہ انجمن ترقی اردو، سہ ماہی رسالہ "اُردو" کا "باباۓ اردو نمبر" نکال رہی ہے جس کی تزئین
لئے "برگ گل" نے بہت سے انتہائی اہم مضامین رسالہ "اردو" میں شامل کر دیئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ رسالہ "اُردو" کا نمبر بابا
ماۓ شایانِ شان ہو۔

"برگِ گل" کے اس شمارہ میں طلبہ و طالبات کے وہ مضامین بھی شامل ہیں جنہیں اوّل، دوم، سوم اور خصوصی انعامات دیئے گئے۔
نے گولڈ میڈل اور دوسرے انعامات کی تقسیم کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ہم آمنہ صدیقی، نغمہ کیفی، دُرِ شہوار اور معین الرحمٰن کو مبارکباد
تے ہیں ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ عذرا کیفی اور زین الرحمٰن مرتضیٰ بھی انعامات کے مستحق تھے لیکن انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے ان کے انعامات کا
ان نہیں کیا گیا۔

انصاف نہ ہوگا اگر ہم اپنے بزرگ جناب حکیم اسرار احمد کریوی کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے اس نمبر کی تزئین میں ہماری ہر طرح مدد کی۔
آخر میں ہم اپنے محترم پرنسپل جناب لفٹیننٹ کرنل محمد عطاالرحیم صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ہمیں اعتراف ہے کہ اس
لے کی اشاعت ان کی خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے ہم ان کی محبت، خلوص اور سرپرستی کو فراموش نہیں کر سکتے۔

○

برگِ گل تعلیمی اداروں سے شائع ہونے والے جرائد میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ایک دہائی میں اس نے علمی و ادبی دنیا میں ایسا ممتاز مقام پیدا کر لیا ہے کہ اب یہ صرف اپنے نام سے خوب اچھی طرح جانا پہچانا جاتا ہے اور مزید تعارف کا چنداں محتاج نہیں۔ آج کے کئی اچھے ادیب شاعر کچھ عرصہ قبل اسی مجلے میں لکھنے والے نوعمر و نوآموز طلبا کی صف میں شامل تھے۔
سر سید نمبر کے بعد "بابائے اردو نمبر" شخصیات کے متعلق برگِ گل کی دوسری پیشکش ہے اور پہلی پیشکش سے زیادہ وقیع اور جامع ہے یہ نمبر طلبائے اردو کالج کا بابائے اردو کے اس رتبہ و مقام کو خراج ہرگز نہیں کہ وہ اس ادارہ کے بانی و صدر رہے تھے۔ یہ خراج فی الحقیقت مرحوم کی اس بزرگی اور عظمت کا ہے جو انہیں ایک مقصد کے حصول کی دھن میں ساٹھ برس کی مسلسل ریاضت اور ایثار کی بدولت حاصل ہوئی۔ اس نمبر کی تدوین میں مرتبین کی محنت اور ان کو پیش آنے والی دشواریوں کا معیار اندازہ زیر نظر مجلے کے مطالعے کے بعد بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے طالب علم امراؤ طارق مدیر برگِ گل کی صلاحیتوں کا معترف ہوں جنہوں نے اس نمبر کے مدیر کی حیثیت سے انتھک محنت کی اور اس کو بابائے اردو کے شایان شان بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ اس سلسلہ میں امراؤ طارق اور اُس کے رفقائے کار قابلِ مبارکباد ہیں۔
میرے لئے یہ احساس بے حد مسرت بخش ہے کہ اردو کالج کے طلبا نے برگِ گل کے ہر شمارہ میں وقت کے آہنگ اور اس کی رفتار تغیر کو محفوظ کرنے کی مثالی اور تاریخی کوشش کی ہے۔ زیر نظر شمارے کے مطالعے کے بعد یہ تاثر ناگزیر ہوگا کہ اس پیشکش کا فکری پس منظر فی الاصل عصری تقاضوں کے تجزیہ و تنقید کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

لفٹننٹ کرنل محمد عطاء الرحیم
پرنسپل اردو کالج۔ کراچی۔

تاثرات

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

نیاز فتح پوری

تلوک چند محروم

غلام ربانی تاباں

نجیب اشرف ندوی

ماجدہ سرور

خدیجہ مستور

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

(میرؔ)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

شاید یہ بات میرے قریبی احباب تک کو معلوم نہیں ہے کہ جس زمانے میں میں اورنگ آباد دکن کے مدرسہ فوقانیہ دولتی اسکول میں پڑھتا تھا، مولوی عبدالحق صاحب اس زمانہ میں اورنگ آباد کے مہتمم تعلیمات (انسپکٹر آف اسکولز) تھے۔ اس وقت سے میرے دل میں ان کا غایت درجہ کا احترام ہے۔ اور اس زمانہ میں ان کی جو تقریریں سنی تھیں ان کا اثر اب تک دل و دماغ پر ہے۔ اس کے بعد جس طرح اُردو زبان کی ترویج و ترقی کا ایک مقصد اپنے لئے متعین کر کے انھوں نے اپنی ساری محنتوں اور توجہات کو اس پر مرکوز کر دیا اور جس دُھن اور لگن کے ساتھ سالہا سال سے وہ اس کے لیے کام کر رہے ہیں، وہ درحقیقت محض قابل قدر ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے۔ اس سے ہمارے نوجوانوں کو یہ سبق لینا چاہیئے کہ دنیا میں آدمی کوئی قابل ذکر کارنامہ بھی انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر کے اس پر اپنی کوششوں کو مرتکز نہ کرے، اور پھر تن من دھن سب کچھ اس ایک مقصد کے لیے لگا نہ دے۔

پیغام

دُنیا میں کبھی کبھی ایسے انسان بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو صرف پیدا ہو

جانتے ہیں، مرنا نہیں جانتے۔ ان کی زندگی کی پیمائش سال و ماہ سے

نہیں بلکہ ان کے کردار و عمل سے کی جاتی ہے اور انھیں انسانوں میں

ایک ڈاکٹر عبدالحق بھی ہیں —— تاریخ کے نقشِ غیر فا

داستانِ ادب کے سب سے بڑے ہیرو —— اور جریدۂ عا

ایک مُہرِ دوام ——!

ان کے متعلّق یہ سوال کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ خدمتِ زبان کے لیے

انھوں نے کیا کیا؟ بلکہ ہمیشہ یہ پوچھا جائے گا کہ "کیا نہیں کیا؟" ا

اس اجمال کی تفصیل کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

می گویم و بعد از من گویند بدستانہا

نیاز فتحپوری

افسوس ہے کہ بحالت موجودہ میں کوئی نظم یا مقالہ حاضر نہیں کر سکتا۔ ایک رُباعی بابائے اُردو کی شان میں حاضر ہے۔ قبول کیجیے۔ وَھُوَ ھٰذا

رُباعی

بے مثل ادیبِ نکتہ داں عبدُالحق ۔۔۔ سرتاپا نازِشِ زباں عبدالحق
ہیں لائقِ صد ہزار تحسین و سپاس ۔۔۔ اُردو کے چمن کے باغباں عبدالحق

تمکین جنید مرحوم

غلام ربانی تاباںؔ

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اُن برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد کسی ملک اور قوم میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ آپ کی بے لوث اور انتھک خدمات کو اردو اور اُردو سے محبت رکھنے والے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ خدا آپ کو تا دیر زندہ وسلامت رکھے۔

نجیب اشرف ندوی

تاثرات

یوں تو بابائے اُردو کا نام میں نے جس وقت ہوش سنبھالا تھا اسی وقت سے سننے لگا تھا۔ پھر ان کے مضامین اور مقدمے پڑھنے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں دور سے ان کی جھلک دیکھی لیکن ان سے قربت کا شرف حاصل کرنے کے لئے تقریباً بائیس ۲۲ سال تک انتظار کرنا پڑا۔

۱۹۳۸ء میں اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی کے سابق پرنسپل ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم کے والد اُردو کے ایک ممتاز انشاپرداز اور مصنف مولوی خلیل الرحمٰن مرحوم ڈاکٹر صاحب مرحوم کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انجمن ترقی اُردو اپنے قبرستان سے نکل کر زندوں کی دنیا میں آچکی تھی۔ اور اس کی سرگرمیاں کتابوں کی تصنیف سے نکل کر عوام تک پہونچ چکی تھیں، یہ طے پایا کہ صوبہ بمبئی میں انجمن کی شاخ قائم کی جائے۔ مولوی خلیل الرحمٰن مرحوم نے مولوی صاحب کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا۔ اور وہ بمبئی آنے پر تیار ہوگئے۔ ۴ مارچ کا دن میری زندگی میں ایک بڑا اہم دن تھا۔ شاخ کے قیام کے سلسلے میں جلسہ اندھیری میں عزیب خانہ پر ہونے والا تھا۔ مولوی صاحب کی تشریف آوری نے اندھیری کو مطلع انوار بنادیا۔ اتفاق سے صوبہ کی انجمن کا میں سیکریٹری چُنا گیا۔ اور اس طرح مجھے موقع ملا کہ میں مولوی صاحب کے ساتھ نہ صرف اردو کا کام کروں بلکہ ریاست کے تمام اہم شہروں

میں ان کے ساتھ جانے کی عزت بھی ملی، چنانچہ ہم لوگ پونہ، دھارواڑ، بلگام، شولاپور، دھولیہ، مالیگاؤں، بھروچ، سورت، احمدآباد تک گئے۔ ہر جگہ چلتے ہوئے تقریریں بھی ہوئیں اور شاخیں قائم کی گئیں۔ اس کے بعد میں ۳۹ء کی گرمیوں کی تعطیل میں بہار گیا ہوا تھا کہ وہاں بھی مولوی صاحب کے ساتھ شمالی بہار کے دورہ میں شریک ہونے کی عزت ملی اور مولوی صاحب نے اپنی رپورٹ لکھتے ہوئے مجھے یہ سرٹیفکیٹ دیا کہ میں تمام سفر میں بار شاطر نہ کہ بار خاطر ثابت ہوا یہ میرے لیے بڑی سند ہے اس وقت سے ہم لوگ قریب تر ہوتے گئے۔ تا آنکہ اس مجلس مشاورت میں بھی جسے گاندھی جی نے واردھا بلایا تھا شریک تھا۔ اس طرح مجھے مولوی صاحب سے قریب سے قریب تر ہونے کا موقع ملا۔ تقسیم نے اگرچہ جسمانی دوری پیدا کر دی ہے۔ لیکن اُردو زبان و ادب کی ترقی کی خواہش نے ذہنی حیثیت سے ہم کو دور نہیں ہونے دیا۔ اُردو کے سلسلہ میں مولوی صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں جو قربانیاں کی ہیں اور اس کو ترقی دینے کی جو دامے، درمے، قدمے اور سخنے پُرخلوص کوششیں کی ہیں ان کی روشنی میں دل اس کے سوا کیا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بابائے اُردو کو اس وقت تک سلامت رکھے کہ اُردو کو اس کا صحیح مقام مل جائے۔ آمین۔

ہاجرہ مسرور

بابا کی شخصیت اور کام پر کوئی لکھنا چاہے تو کئی کتابیں لکھ سکتا ہے، اور یہاں ایک مضمون بھی نہ ہو سکا۔ دراصل ایسے موقعوں پر کافی پہلے اطلاع ملنا چاہیئے میں بابا کی شخصیت سے بے حد متاثر اور مرعوب ہوں اور سمجھتی ہوں کہ ان کی پوری زندگی نئی نسل کے لئے ایک زبردست روشن مثال ہے۔ انتھک جدوجہد، مسلسل کام اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے زندگی کی دوسری تمام خوشیوں کو تج دینا کسی معمولی انسان کا کام نہیں، بس نوجب ان کا نام سنتی ہوں، احترام سے میرا سر جھک جاتا ہے اور ایک حسرت دل میں ابھرتی ہے کہ کاش ان کی روح کے شعلے کی ایک چنگاری اللہ میاں مجھے بھی بخش دیتے تو میں بھی سچی لگن کے ساتھ زندہ رہنے کا کچھ سامان کر لیتی۔

کہا جاتا ہے کہ بابا نے اردو کو زندہ رکھنے کے لئے کچھ غلطیاں کی ہیں۔! کی ہیں، اس سے مجھے انکار نہیں جو کسی مقصد کی خاطر جدوجہد کرتے ہیں انہی سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، مگر وہ کیا کہیں گے جن سے نہ کچھ صحیح ہوا نہ غلط۔ جو دور سے بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہے اور بابا نے پچھلے دس بارہ سال برسر اقتدار اصحاب کی بے اعتنائیوں اور اپنے ساتھیوں کی زیادتیوں کو سہا اور پھر بھی نہ صرف زندہ رہے بلکہ جدوجہد کرتے رہے۔ کیا ان کا یہ کارنامہ

اُن کی غلطیوں" کو بھلانے کے لئے کافی نہیں؟

ادھر کچھ عرصے سے بابائے اُردو کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل رہا جنہیں حکومت نے ان کی خدمات کے صلے میں انعامات واعزازات سے نوازا۔ لیکن کیا یہ انعام، یہ اعزاز اس بوڑھے مجاہد کے لئے خوشی کا باعث بن سکتے ہیں؟۔ بابائے تو برسوں پہلے اپنی تمام ملکیت بلکہ اپنی پوری ہستی "اردو" کو سونپ دی، جو آج تک اپنے وطن میں بھی "آبادکاری" کے "وعدہ فردا" کا شکار ہے۔ اگر حکومت بابا کی خدمات کا اعتراف ہی کرنا چاہتی ہے تو کیا اس کی سب سے بہتر شکل یہ نہیں کہ ان کی زندگی ہی میں اُردو کو سرکاری زبان تسلیم کرلے؟

خدیجہ مستور

تاثر

بچپن میں بابائے اُردو کا ذکر سُنا تو بڑی ہنسی آئی کہ بھلا اُردو بھی کوئی بچّہ ہے کہ اس کا بھی ایک "بابا" ہو۔ بڑے ہوکر احساس ہوا کہ اُردو ایک بابا کی محتاج تھی اگر اسے ان کا دست شفقت میسّر نہ ہوتا تو وہ واقعی یتیم اور بے سہارا تھی۔

مجھے بابا سے نیاز حاصل نہیں۔ انھیں صرف دو مرتبہ اور وہ بھی دُور سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ آخری بار اس وقت جب وہ رائٹرز گلڈ کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ اس وقت سورج ڈوبنے کے آثار شروع ہو چکے تھے۔ بابا نے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کرکے کہا تھا: "اُردو کو آج ہی، اسی وقت، غروب آفتاب سے پہلے قومی زبان ہونا چاہیئے۔" یہ الفاظ اتنے پُر تاثیر تھے، اتنے خلوص اور یقین کے ساتھ کہے گئے تھے کہ میری طرح ہر سننے والے کے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یہی الفاظ کوئی اور دہراتا تو شاید سامعین ذرا سی توجہ بھی نہ دیتے مگر یہ الفاظ تو اس بزرگ کی زبان سے ادا ہو رہے تھے جس نے اپنی زندگی اُردو کی خدمت اور حفاظت میں گزاری تھی، جس کی خوشیوں اور غموں کا محور اُردو تھی، جس کی اُمیدیں اور آرزوئیں صرف اُردو سے وابستہ تھیں۔ الفاظ اپنا اثر کہاں سے مستعار لیتے ہیں، اس کا اندازہ رائٹرز گلڈ کے اس جلسے سے ہوا تھا۔

یہ میری پختہ رائے ہے کہ اس دور میں اگر کسی کو سرسیّد احمد خاں مرحوم کا جانشین کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر مولوی عبدالحق ہیں۔ وہی کام کی اندھی لگن، مقصد سے بے پناہ الفت، خلوص و ایثار کا مکمل جذبہ، طمع اور خوف سے بے نیاز جرأت اظہار۔

ہماری نسل کے لئے یہی بات ایک عجوبہ ہے کہ نوّے برس کا ایک بزرگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جوانوں سے کہیں زیادہ سرگرمِ عمل ہے۔ بابا کا یہ جذبہ قوم کے ہر فرد کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ہار مان لینا، یا کسی بھی مشکل کے سامنے ہتھیار ڈال دینا جراَت مند اور صداقت پسند انسان کا شیوہ نہیں، بابا کے کردار کا یہ ایک ایسا روشن پہلو ہے جسے اگر ہم اپنے قومی کردار کا جزو بنالیں تو قومی ترقی اور سربلندی کی راہ میں وہ کون سا سنگِ گراں ہے جو ریزہ ریزہ نہیں ہو جائے گا۔

بابا نے اس پیاری زبان کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا جائزہ لینے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ مولوی صاحب کی شخصیت پر کوئی ایسی معقول اور مستند کتاب موجود نہیں جس سے ہم یا ہمارے بعد کی نسلیں اُردو اور قوم کے اس عظیم محسن سے پوری طرح متعارف ہوسکیں۔ "برگِ گل" نے اپنا ایک خاص شمارہ اس کام کے لئے وقف کیا ہے تو یہ واقعی بڑا نیک کام ہے۔ اگر دو چار کتابوں یا رسالوں میں دوسروں کے ساتھ بابا کی شخصیت پر بھی تھوڑی بہت روشنی ڈالی گئی ہے تو اس کی افادیت کا بھی مجھے اعتراف ہے۔ مگر ہمیں تو ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو اس ذاتِ گرامی کی زندگی اور جہدِ زندگی کے تمام نقوش اپنے سینے میں سمیٹے ہو۔

اگر بابا کو اُردو کے مسائل مہلت دیں اور وہ خود اپنی سوانح حیات مرتب کریں تو اُردو پر ایک اور بڑا احسان ہوگا۔

سچ یہ ہے کہ بابا کے علمی، تنظیمی اور دوسرے قومی کارناموں کو اگر تھوڑی دیر کے لئے بھلا بھی دیا جائے تو لسانیات اور ادبیات پر ان کے مقالات تاریخِ اُردو میں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ پچھلے دنوں سرسیّد احمد خاں پر ان کے مقالات کا مجموعہ پڑھا، ایسی نکھری ستھری زبان اور کم سے کم الفاظ میں مقصد اور مدعا کا بیان اور کسی کے ہاں نہیں ملتا۔

آخر میں صرف یہی کہنا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ تو مقالہ ہے نہ مضمون یہ تو میرے صرف چند ذاتی تاثرات ہیں جنھیں میں اس دُعا پر ختم کرتی ہوں کہ خدا بابا کو اُردو یونی ورسٹی کے قیام میں کام یاب کرے اور اُردو ان کی زندگی ہی میں وہ درجہ حاصل کرے جس کے لئے وہ نصف صدی سے اپنے آپ کو بھی بھولے ہوئے ہیں۔

انعامی مضامین

★ اوّل	آنسہ آمنہ صدیقی ٹیچرز ٹریننگ کالج - کراچی	"روشنی کا مینار"
★ دوم	آنسہ نغمہ کیفی، کراچی یونیورسٹی	"بابائے اردو"
★ سوم	آنسہ در شہوار، پشاور یونیورسٹی	"مولوی عبدالحق"
انعام خصوصی	جناب معین الرحمٰن، شعبہ قانون اردو کالج کراچی	"مولوی عبدالحق کا مرتبہ"

جناب معین الرحمٰن کا مضمون صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

آمنہ صدیقی

روشنی کا مینار

زبان کسی ملک یا قوم کا سب سے اہم ثقافتی مظہر ہے۔ یہ انسانی خیالات و جذبات کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صدیوں کے ان گنت تجربات، مفاہیم و معانی کے نئے نئے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ انسان کی سماجی تگ و دو اور ثقافتی جد و جہد کی ایک زندہ و متحرک تاریخ ہے۔ اس کے دامن میں وہ سب کچھ ہے جسے انسان نے حاصل کرنے کی تمنّا کی، جس کے لیے وہ کوشاں ہوا اور جسے آخرکار اس نے حاصل کر لیا۔ یہ انتقال مطالب کا ذریعہ ہی نہیں انکشافِ مضمرات کا وسیلہ بھی ہے۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہے، جس کا ایک کنارا ازل سے اور دوسرا ابد سے ملا ہوا ہے۔ زبان تہذیب کی آئینہ داری ہی نہیں کرتی بلکہ آئینہ تہذیب کو جلا بھی بخشتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی ملک یا قوم کی ترقی کا اندازہ اس کی زبان سے کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ زبان صرف وہی نہیں ہوتی کہ جس میں الفاظ کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہو یا جس کے بولنے والے بہت زیادہ ہوں، بلکہ اصل ترقی یافتہ زبان وہ ہے کہ جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی سکت رکھتی ہو اور جسے وقت کی صداؤں سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ آتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہی بات یوں بھی

جا سکتی ہے کہ ترقی یافتہ زبان اسے کہتے ہیں جس میں جہانِ معنی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرنے کی سکت ہو۔

زبان سماجی ضروریات کی تابع ہوتی ہے، الفاظ و معانی کا تعلق ریاضی کلیوں کی طرح غیر تغیر پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس میں نشیب و فراز زمانہ سے متاثر ہوتے رہنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس کا مقام کوچوں، گلیوں اور بازاروں میں نہیں ہوتا لسانیات کی تاریخ میں ہوتا ہے — اُردو ایک ایسی ہی زبان ہے، جسے سماجی ضرورتوں نے جنم دیا، کوچوں، گلیوں اور بازاروں نے اپنایا اور وقت نے اسے اپنے ساتھ ساتھ چلنے کا سلیقہ سکھایا۔

یہ دُنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ہے اور اسے موجودہ شکل و صورت حاصل کئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس زبان کے بنانے اور سنوارنے میں مختلف تہذیبوں اور قوموں نے حصّہ لیا ہے، اسے ہم انگریزی، فرانسیسی یا چند ایک دوسری زبانوں کی طرح بہت ترقی یافتہ تو نہیں کہہ سکتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے ترقی یافتہ زبانوں کے زمرّے سے علاحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کی وسعت کو دیکھنا "حیرتی، جلوہ" بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

اس زبان کی ترویج و اشاعت میں جن لوگوں نے مختلف طریقوں سے حِصّہ لیا، ان کا تذکرہ اس مختصر سے مضمون میں نہ تو کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، کیوں وہ تمام لوگ اردو کے معمار ہیں جنھوں نے اظہار و بیان کی ضرورتوں کے لیے اس زبان کو اپنایا۔ اور جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

کسی زبان کی "خدمت" کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے اور اس شعور کو عام کیا جائے کہ زبان سے تغافل برتنا خود اپنے مفاد کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو زبان کی ثقافتی اہمیّت سے واقف ہوں اور اسے ملک و قوم کی ترقی میں ممد و معاون بنانے کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہوں۔ پہلی صورت سے جن لوگوں نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والے دو چار ہی ہیں اور

ایسے اور بھی کم ہیں۔ جنھوں نے دونوں صورتوں سے زبان کی خدمت کی ہو۔ کم کیا صرف ایک !!!

دُنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں، کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیّت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں صرف کر دی ہو۔ یہ فخر صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسّر ہے جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ اس پیرِ جوان ہمّت نے اس مقصد کے لیے کبھی اپنوں کی جفائیں سہیں اور کبھی غیروں کے ستم، مخالفتوں کے ایسے ایسے خار زاروں میں قدم رکھا کہ جہاں رہ نوردی کی داد ملی بھی تو آبلہ ہائے پا سے، مگر اس جوان ہمت اور عظیم انسان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش پیدا نہ ہوئی اور وہ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر مردانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔

"عبدالحق" اور "اردو" مترادف نہیں مرادف الفاظ ہیں، اردو کا عبدالحق کے بغیر اور عبدالحق کا اُردو کے بغیر تصوّر کرنا محال ہے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیّت بڑی پہلو دار ہے انھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت مختلف طریقوں سے کی۔ کبھی وہ اس زبان کے سپاہی بن کر مخالفت کے مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ کبھی وہ اس کے سفیر بن کر گھر گھر اس کا پیغام پہنچاتے رہے۔ کبھی انھوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا اور کبھی انشا پردازی کے بل پر ذہنوں کو جلا بخشی۔ زبان کی بنیادی ضروریات کو پورا

کرنے کے لیے قواعد، صرف و نحو اور لغات کی طرف توجہ کی، تعلیمی ضروریات کے لیے نصابی کتابیں تیار کیں اور کروائیں۔ قدیم ادبی سرمائے کو گم نامی سے نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔ تحقیق و تنقید کی راہوں پر نئے چراغ جلائے۔ قوم کو زبان سے دل چسپی لینے کا ڈھنگ سکھایا۔ علم کی عام اشاعت کے وسائل کو وسعت دی۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک عظیم ثقافتی رہنما کو کرنا چاہیے ـــــ وہ یقیناً ایک عظیم ثقافتی رہنما ہیں۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ انجمن ترقیٔ اردو ہے۔ اگرچہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں لیکن اس انجمن کی بقا اور ترقی انہیں کی مرہونِ منت ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ

کسی ادارے نے کامل پچاس سال تک زبان و ادب کی ترقی کے لیے کام کیا ہو۔ اس انجمن سے ہند و پاکستان کے بہترین مشاہیر اہلِ قلم وابستہ رہے ہیں اور اس طرح اس کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ایسے پُرآشوب زمانے میں جب کہ مخالفوں نے اُردو کو ہر طرح سے ختم کرنے کے منصوبے باندھے، انجمن ان کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں اس طرح جمی رہی جیسے ایک چھوٹی سی ندی کے سامنے کوہ ہمالیہ ـــ حریفوں کے ہر وار کو انجمن نے ناکام بنا دیا اور یہ انجمن کی ایسی کامیابی ہے جو اُردو کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی۔

انجمن اردو کے دفاع کے لیے ہی سرگرمِ کار نہیں رہی بلکہ اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی اس نے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کرکے ان کی نگرانی میں اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعے سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا جہاں اس سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ مثلاً چھوٹا ناگ پور کا علاقہ ایسا ہے کہ سَو میں مشکل سے ایک آدمی بھی اردو سمجھ سکتا تھا، لیکن انجمن کی سرگرمیوں کی وجہ سے اس برعظیم کی ایک قدیم ترین قوم میں، ایک جدید ترین زبان پہنچی۔

کسی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مختلف علوم و فنون پر فنی کتابیں ہوں۔ اردو زبان کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ اس کے دامن میں سب کچھ تھا، لیکن نظروں سے اوجھل تھا۔ تمام ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں تھا۔ انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ اس وجہ سے بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظر عام پر آئیں اور اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح کم مایہ نہیں ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اردو گزشتہ ایک دو صدیوں میں پھلی پھولی، لیکن اب یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اردو اس مدت سے بہت پہلے مروج ہو چکی تھی۔

انجمن نے اردو زبان کی تہی دامانی کو ختم کرنے کے لیے علمی و فنی کتابوں اور عالمی ادبیات عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی۔ اس مقصد کو پورا کرنے سے پہلے اس امر کی ضرورت تھی کہ اردو میں علمی اصطلاحات وضع کی جائیں اور ایک ایسا انگریزی اردو لغت تیار کیا جائے جو مترجمین کی مشکلیں آسان کر دے۔ انجمن نے یہ دونوں کام نہایت جاں فشانی سے انجام دیئے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا اور ایک ایسا انگریزی اردو لغت تیار کیا گیا جو اپنی نوعیت کا واحد لغت ہے دنیا بھر میں انگریزی اردو کا کوئی دوسرا لغت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لغت کی وجہ سے، اردو زبان میں مغربی علوم و فنون کا دروازہ کھل گیا۔ مترجمین نے اچھی اچھی کتابوں کے ترجمے کیے اور یہ ثابت کر دکھایا کہ جن کتابوں پر دوسری زبانوں کو ناز ہے اردو کا دامن بھی اُن سے تہی نہیں۔

انجمن نے ہر طرح اور ہر انداز سے اردو کی خدمت کی اردو کے لیے اتنا کام کسی ادارے نے نہیں کیا جتنا کہ انجمن نے کیا۔

> لیکن ان سب کاموں کے پس پردہ جو شخصیت کار فرما رہی وہ مولوی عبدالحق ہی کی شخصیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تمام وسائل انجمن کی نذر کر دیئے۔ ان کی تمام توانائیاں، ان کا تمام سرمایہ، ان کی راتوں کی نیند، ان کی صبحوں کا آرام، غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کے سرمائے کا ایک ایک حبّہ انجمن کی

نذر ہو گیا۔ انجمن کی رگوں میں انھیں کا خون جوش مارتا رہا اور آج بھی جب کہ وہ نوّے سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں، حسبِ سابق انجمن ہی ان کی تمام دلچسپیوں کا مرکز ہے۔"

انجمن ترقی اُردو دراصل مولوی عبدالحق ہی کی ذات کا پرتو ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ شخصیتیں اداروں کو بناتی ہیں نہ کہ ادارے شخصیتوں کو۔ اگر مولوی صاحب انجمن کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اس کا یہ شعبہ بھی ختم ہو جاتا اور خدا جانے اردو کو مخالفوں کے کیا کیا ستم سہنے پڑتے۔

مولوی عبدالحق نے اردو کی جو خدمت کی ہے اس سے اس زبان کو تو بہت فائدے پہنچے ہیں، لیکن اس سے خود مولوی صاحب کی ذات کو ایک ایسا نقصان پہنچا کہ جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کی اردو دوستی کی شہرت ایسی ہوئی ہے کہ ان کی شخصیّت کے دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی شخصیّت کا کوئی ایک پہلو اس حد تک نمایاں ہو جاتا ہے، کہ باقی پہلو قدرے دب جاتے ہیں، لیکن یہ صورتِ حال ہمیشہ نہیں رہتی، باقی پہلوؤں میں اگر کوئی خاص بات ہوتی ہے تو وہ ضرور نمایاں ہو کر رہتے ہیں۔ مولوی صاحب کی اُردو دوستی نے ان کے ساتھ کچھ ایسی ہی دشمنی کی ہے، اور اس وجہ سے ان کو ایک مفکّر کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مولوی صاحب نے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو سمجھنے سمجھانے کی جو پُرخلوص کوشش کی ہے، اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ذہنی جولانیاں نفلسفہ محض کی پُرپیچ و خم رہ گزاروں سے وابستہ نہیں رہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ انھیں صاحبِ فکر تسلیم نہ کیا جائے۔

> مولوی صاحب نے ایک باشعور انسان کی طرح ان تمام حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ جنھیں زندگی کی بنیادی حقیقتیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مشاہدے، ادراک اور تجربے کا عکس ان کی بعض تحریروں میں اس طرح نمایاں ہے کہ مطالب و مفاہیم کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی مربوط نظامِ فکر نہیں ملتا، کیوں کہ کسی مسئلے پر انھوں نے تفصیل سے بحث نہیں کی۔ اس سلسلے میں وہ غالب کے ہم قدم ہیں: وہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیتے فلسفیوں کی طرح ذرا ذراسی باریکیوں پر توجہ نہیں کرتے بلکہ وہ مسئلے سے متعلق کوئی ایک بنیادی بات، اس طرح سے کہہ جاتے ہیں کہ جس کو ذہن نشین کر لینے سے مسئلے کی ساری پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔

ان کی ان گنت تحریروں میں بعض ٹکڑے اور جملے ایسے فکر انگیز نظر آتے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ادب کی طرف توجہ نہ کرتے تو وہ یقیناً بہت بڑے فلسفی ہوتے۔ انھوں نے انسان اور اس کے متعلقات کے بارے میں کہیں کہیں ایسی باتیں بھی کہیں ہیں جو صداقت کے تابندہ چہرے سے تہہ در تہہ نقاب اٹھانے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ یہاں مولوی صاحب کی مختلف تحریروں سے بہت سے فکر انگیز "نثر پارے" پیش کیے جاتے ہیں، لیکن صرف ایک ایسی تحریر کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مولوی صاحب کی مفکرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہر دور اور ہر زمانے میں کیا جائے گا—— یہ تحریر "معرکۂ مذہب و سائنس" کا مقدمہ ہے، اس میں مولوی صاحب نے نہایت مدلل انداز سے سائنس اور مذہب کا جائزہ لیا ہے اور اس مفروضے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ازلی اور ابدی حریف ہیں۔ مولوی صاحب نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ انسانی زندگی کو ارتقا کے اعلا ترین مدارج تک پہنچنے کے لیے مذہب اور سائنس دونوں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک کو

نظر انداز کرکے آگے بڑھنے کی کوشش پیچھے ہٹنے کے مترادف ہے۔

> مولوی صاحب کے نزدیک سائنس یا مذہب ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں اور دونوں کا مقصد انسان کی خوش حالی ہے۔ مولوی صاحب نے مذہب کی فوقیت کو بھی تسلیم کیا ہے کہ انسان کی مادی ضرورتیں خواہ کتنی ہی بڑھ جائیں، اس کی روحانی قدریں پامال نہیں ہو سکتیں اور پھر آخر میں مذہب اسلام کے بارے میں مولوی صاحب نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ انسان کی ترقی اور نجات کا سیدھا اور صحیح راستہ اسی مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے سے نظر آ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بیسوی صدی میں ایسے افراد ان گنت ہیں جو متذکرہ خیالات کو نشانۂ تضحیک بنائیں اور یہ کہیں کہ آج سائنس اتنی ترقی کرچکی ہے کہ مذہب کو اس کے مقابلے پر لانا رجعت پسندی ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ اسی بیسویں صدی میں، جب کہ انسان کی مادی ترقی اپنے شباب پر ہے، روحانی قدروں کی افادیت بڑھتی چلی جارہی ہے اور سائنسی دُنیا کے بہترین دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ روحانی قدروں کے بغیر مادی ترقی، ترقی معکوس کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مقدمے میں الفاظ کے طوطا مینا نہیں اڑائے گئے بلکہ بحر معانی میں غواصی کرکے ایسے ایسے گوہر ہائے نایاب کا سراغ لگایا گیا ہے جن سے مولوی صاحب کی ذہنی بلندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہب اور سائنس کا موازنہ ایک بہت ہی مبتذل موضوع ہے، عام طالب علموں سے لے کر ڈریپر جیسے عالم تک سبھی نے اس مصرع طرح پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھا گیا ہے اس وقت تک اس موضوع پر اتنا کچھ کہا جا چکا تھا کہ کوئی نئی بات پیدا کرنا مشکل تھا، لیکن مولوی صاحب نے اس مبتذل موضوع کو اپنے نادر اسلوب اور گہری فکر سے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کر دیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور اس کے متعلقات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جذبہ، عقل، ادراک، خیال، احساسات، مادہ، روح، جنس، تمدّن، سیاست، ایمان، عقائد، نیچر، علم، محبت، تجربہ، یقین، صداقت اور دوسرے بہت سے بنیادی

مسائل پر عالمانہ بحث کی ہے، یہ مقدمہ مولوی صاحب کی مفکّرانہ صلاحیتوں کا ایک دلِ کش آئینہ ہے۔ جب تک اُردو زبان موجود ہے یہ آئینہ دھندلا نہیں پڑ سکتا۔

ایک مفکر کی حیثیت سے مولوی صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ ادب اور زبان کے مسائل میں بھی ان کی فکری توانائیاں مضمحل نہیں ہوئیں، ادب، تنقید، زبان اور معنویات (SEMENTICS) وغیرہ کے بعض بنیادی مسائل پر انھوں نے جو نظریاتی بحثیں چھیڑی ہیں وہ اردو ادب کا خلاصہ ہیں۔ افسوس کہ ان موضوعات پر مولوی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف موجود نہیں ہے، تاہم وہ اشارے جو ضمنی طور پر ان کی تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں، فکر و تدبّر کا ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

تقریظ، دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ — یہ سب الفاظ بڑی حد تک مترادف ہیں، ممکن ہے از روئے لغت ان میں بہت فرق ہو، لیکن از روئے استعمال تو یہ ایک ہی طرح کے سانچے ہیں، جن میں چند پیش پا افتادہ باتوں — مصنف کی تعریف اور کتاب کی تعریف — کو ڈھال کر کسی بھی کتاب کی ضخامت بڑھائی جا سکتی ہے۔ رسم ہمارے ادب میں ایک عرصے سے چلی آرہی ہے کہ اکثر مصنفین اپنی کتابوں کا آغاز "سند" حضرات کے کلماتِ تحسین سے کرتے ہیں اور پھر ان کلمات کے عنوان کے لیے متذکرہ بالا الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ منتخب کر لیتے ہیں۔ اردو کتابوں کے بیشتر دیباچے، مقدمے یا پیش لفظ دیکھ جائیے، سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مصنفین کو نہ صرف قارئین پر بلکہ خود اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں ہوتا اس لئے وہ اس بے اعتمادی کی فضا کو ختم کرنے کے لیے ایسی اسناد فراہم کرتے ہیں جن میں کتاب اور مصنف دونوں کو ہی لاثانی قرار دیا گیا ہو۔ یہ روایت صحت مند ادبی فضا کے لیے سخت مضر ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آئے دن ایسی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ جن میں ایک دو دیباچے نہیں بلکہ بیس بیس پچیس پچیس "اسناد" ہوتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دیباچوں (اور اب تو اس قسم کی تحریروں کے لیے اور بھی کئی نئے نئے عنوان وضع کر لیے گئے ہیں، مثلاً سخن ہائے گفتنی، حرفے چند، حرفِ اول، پیش رس وغیرہ وغیرہ) کی ضخامت اصل کتاب سے کئی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

غالب پہلا شخص ہے، جس نے اس روش سے انحراف کیا، اگرچہ اس نے بعض روائتی انداز کی تقریظیں ضرور لکھی ہیں، لیکن "آئینِ اکبری" کو جب سرسیّد احمد خاں نے مدون کیا تو اس کے لیے غالب نے جو تقریظ لکھی اس میں اُنھوں نے کچھ "صاف صاف باتیں" کہہ دیں، جو سرسیّد کو اس حد تک ناگوار گزریں کہ انھوں نے اس تقریظ کو شامل کتاب ہی نہ کیا۔ غالب کی یہ "بت شکنی" شاید پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھی گئی اور شاید اسی لیے پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی۔

کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، قابلِ اعتراض بات تو یہ ہے کہ اس مقدمے یا دیباچے کو مصنف یا کتاب کا اشتہار بنا دیا جاتا ہے۔ مقدمہ نگار اگر متعلقہ کتاب کے موضوع پر خود اپنے خیالات پیش کرے یا بعض ایسے امور کی طرف توجہ دلاتے کہ جن تک مصنف کی نظر نہیں گئی تو یقیناً اس کا مقدمہ کام کی چیز بن سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

> انھوں نے اپنے مقدموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا۔ ان کے مقدمات کی علمی و ادبی حیثیت بعض اوقات اصل کتاب سے بڑھ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں ان کے مقدمے ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ ان کا پہلا مقدمہ شاید کتاب "جنگ روس و جاپان" پر تھا جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کا تازہ ترین مقدمہ "جدید اردو لغات" پر ہے جو رسالہ اردو (جنوری اپریل ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ گویا مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کی داستان پورے ساٹھ برسوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس دوران میں انھوں نے تقریباً سچ[1] اس مقدمے لکھے۔

یہ مقدمات اپنے موضوعات کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کی سب

---

[1] مولوی صاحب کے مقدمات کا مجموعہ دو جلدوں میں حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں تمام مقدمات شامل نہیں ہیں۔

سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا عنصر بھی
پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کتاب، مصنف اور موضوع کے بارے میں صرف وہی باتیں
کہتے ہیں کہ جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں۔

مولوی صاحب نے ہر طرح کی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ادب، تاریخ، سائنس، فلسفہ، مذہب
غرض کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ زیادہ تر مقدمے اردو کی قدیم کتابوں پر
ہیں، جو انھوں نے خود مرتب کیں۔ مثلاً اردو شاعروں کے بعض اہم تذکروں (مثلاً نکات الشعرا، گلشنِ ہند،
چمنستانِ شعرا، گلِ عجائب، مخزنِ شعرا وغیرہ) اور قدیم ادب کی بعض نادر کتابوں (مثلاً سب رس،
معراج العاشقین، باغ و بہار، مثنوی خواب و خیال، دریائے لطافت) پر انھوں نے جو مقدمے لکھے بخصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس قسم کے مقدموں میں مولوی صاحب کتاب کی اہمیّت پر خاص طور سے زور دیتے ہیں،
اس کے ادبی و علمی معیار کو جانچتے ہیں، اسی نوع کی دوسری کتابوں سے اس کا موازنہ کرتے ہیں، خوبیوں اور
خامیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مصنف کے حالات زندگی پر بھی وہ خاص توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے
میں وہ بڑی تحقیق سے کام لیتے ہیں، مثال کے طور پر "چمنستان شعرا" (از لچھمی نرائن شفیق) کا مقدمہ ملاحظہ
کیجیے۔ اس میں ابتداءً مصنف کے حالاتِ زندگی ہیں، پھر اس کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ اس کی تذکرہ
نگاری کی خصوصیات پر بحث ہے (اسی میں "چمنستانِ شعرا" کا جائزہ بھی شامل ہے) اور پھر اس کے کلام کی
خصوصیات اُجاگر کی گئیں ہیں۔ گویا "چمنستان شعرا" کا یہ مقدمہ شفیق کی زندگی اور اس کے کارناموں کا
ایک محققانہ جائزہ ہے۔ اسی طرح "باغ و بہار" اور "سب رس" کے مقدموں میں انھوں نے وجہی اور میرامن
کے حالات، ان کی کتابوں کے ماخذات و مماثلات اور ان کی زبان پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے تحقیق کا
ایک اعلیٰ معیار سامنے آتا ہے۔

مولوی صاحب کے مقدمات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جو اپنی افادیت کے اعتبار سے بے مثال ہے
یعنی بعض مقدموں میں موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کر دی جاتی ہے، اور یہ تاریخ، قاری کو اصل کتاب
کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس سلسلے میں دو مقدمے بڑے معرکے کے ہیں
ایک "قواعد اردو" اور دوسرا "جدید اردو لغات" کا مقدمہ۔ پہلے مقدمے میں انھوں نے بڑی تفصیل سے
یہ بتایا ہے کہ اردو زبان کی قواعد کی کتابیں کس زمانے سے لکھی جا رہی ہیں اور پھر ہر کتاب اور اس
کے مصنف کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح "جدید اردو لغات" کے مقدمے
میں تمام اردو لغات کا تاریخی جائزہ لیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ یہ دونوں

مقدمے بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادبی کتابوں پر جو مقدمے مولوی صاحب نے لکھے ہیں ان میں سے بعض نقد عالیہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً "انتخاب کلام میر" "مسدس حالی" "خطوط شبلی" اور "اردو تنقید کا ارتقاء" کے مقدمے کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب کا سب سے اچھا مقدمہ "انتخاب کلام میر" پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مقدمہ میر سے متعلق بڑی بڑی کتابوں پر بھی بھاری ہے۔ اس میں میر کے حالات زندگی بڑی تحقیق کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اہم ترین حصہ وہ ہے جو میر کے شاعرانہ کمالات پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ عملی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ "مسدس حالی" پر مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں مولانا حالی کے عہد کے سیاسی و سماجی محرکات، ان کے شاعرانہ محاسن اور مسدس کا تجزیہ، بڑے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ "اردو تنقید کا ارتقاء" (از ڈاکٹر عبادت بریلوی) پر جو مقدمہ ہے، وہ اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار اس میں فن تنقید کے متعلق اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ اور اس فن کی تعریف نہایت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند صفحے کا یہ مقدمہ، اصل کتاب سے (جو پانچ سو صفحات سے زاید پر مشتمل ہے) زیادہ مفید ہے۔

سوانحی اور تاریخی کتابوں پر مولوی صاحب نے جو مقدمات لکھے ہیں ان میں "حیات النذیر" "مشاہیر یونان و روما" "تمدن ہند" "مآثر الکرام" اور "ناقابل فراموش" کے مقدمے ہر اعتبار سے ناقابل فراموش ہیں۔ "حیات النذیر" کا مقدمہ دل چسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ دل چسپ اس لحاظ سے کہ اس میں دو ایک جگہ بعض لوگوں پر بہت دل کش پیرائے میں طنز کیا گیا ہے، فکر انگیز یوں ہے کہ اس میں فن سوانح نگاری کے بارے میں بعض بنیادی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ شبلی کے دیباچہ الفاروق کے بعد اردو زبان میں یہ دوسری تحریر ہے کہ جس میں فن سوانح نگاری کی حدود سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ "مشاہیر یونان و روما" کے ابتدائی چند صفحات مطالعے یا پڑھنے کی عادت کے بارے میں ہیں۔ مولوی صاحب نے ان چند صفحوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ملٹن کے اس قول کی تفصیل پیش کی ہے۔ "عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے"۔ "تمدن ہند" کا مقدمہ دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں اس کے مترجم مولوی سید علی بلگرامی کے حالات زندگی بیان کیے ہیں اور دوسرے حصے میں تمدن ہند پر بحث کی گئی ہے۔ اس مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ سماجی اور سیاسی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہیں، قوموں کے عروج و زوال اور ان کی تہذیبوں پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔

سائنس اور مذہب سے متعلق جن کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ "اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام" "تحقیق الجہاد" "معرکہ مذہب سائنس" اور "پر اسرار کائنات" ان مقدموں سے مولوی صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ "اعظم الکلام فی ارتقا الاسلام" مولوی چراغ علی کی کتاب ہے۔ جس کا ترجمہ خود مقدمہ نگار نے کیا۔ اس مقدمے کے بھی دو حصے ہیں پہلے میں مصنف کے حالات زندگی قدرے تفصیل سے بیان کئے ہیں اور دوسرے میں موضوع کتاب سے بحث کی ہے۔ مولوی صاحب نے اس حصے میں کتاب کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ مصنف کا مافی الضمیر بڑی خوبی سے واضح ہو جاتا ہے، ضمنی طور پر بعض مذہبی اور معاشرتی مسائل پر بھی بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ "پُر اسرار کائنات" کا مقدمہ اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں مولوی صاحب نے ترجموں کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

"معرکہ مذہب و سائنس" مولوی صاحب کا طویل ترین مقدمہ ہے۔ یہ تقریباً ایک سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں یہ ایک بالکل نئی چیز ہے اور مولوی صاحب کو ایک مفکر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس مقدمہ میں غور و فکر کی وہ تمام بلندیاں ملتی ہیں جو کسی بھی تصنیف کو حیات دوام بخش سکتی ہیں میرے نزدیک یہ مولوی صاحب کا بہترین مقدمہ ہے (اس مقدمہ پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے)۔

مختصر یہ کہ مولوی صاحب کے مقدمے علم و ادب کی بعض ایسی راہوں سے متعارف کراتے ہیں کہ جہاں سے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کی تحقیق بعض ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے کہ جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تنقید ادب پاروں کی قدر و قیمت اس طرح متعین کرتی ہے کہ ان کی دیانت داری پر ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی شک

نہیں کر سکتا۔ ان مقدمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب
کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور علم کا کوئی شعبہ ان کی دسترس
سے باہر نہیں ۔۔ مختصر یہ کہ مقدمات عبدالحق ہمارے
تنقیدی و تحقیقی سرمائے کا لازوال حصّہ ہیں۔

خیالات کے اظہار کے لیے خطابت کو ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا ہے اور یہاں تک کہ بعض مفکّرین نے اس کا شمار، فنونِ لطیفہ میں کیا ہے۔ اچھی خطابت بعض اوقات شاعری اور ڈرامے سے بھی زیادہ تاثر پیدا کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خطیب، اپنے سامعین کو محض الفاظ و معانی سے ہی نہیں متاثر کرتا بلکہ اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ، اس کے چشم و ابرو کی حرکات، لب و لہجہ کی موزونیت، اور اس کے ہاتھوں کے اشارے وغیرہ بھی سامعین کو متاثر کرنے میں بڑا حصّہ لیتے ہیں۔ الفاظ کے معانی ہر حال اور ہر عالم میں وہی نہیں ہوتے جو لغات میں بیان کیے جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ---- بعض اوقات کیا اکثر اوقات، بولنے والے کا انداز بیان معانی میں بہت کچھ ردّ و بدل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات "کہی ہوئی" باتوں سے "ان کہی" باتیں زیادہ بامعنی ہوتی ہیں۔ خطیب کی کامیابی اس میں نہیں کہ وہ سامعین کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ خود سامعین کی توجہ کا مرکز بنا رہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہنے والا سننے والوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو۔ مولوی صاحب اس راز سے اچھّی طرح واقف ہیں، میں نے ان کی دو باتیں تقریریں سنی ہیں۔ جن کی یاد آج بھی میرے لیے "فردوس گوش" ہے ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور لب و لہجے کی شگفتگی سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ وہ کسی موقع پر بھی سامعین کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ تقریر کر رہے ہیں، گفتگو کا سا سادہ لیکن پرکار انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص یہی تصوّر کرتا ہے کہ وہ صرف اسی سے مخاطب ہیں—— مولوی صاحب کے خطبات و تقاریر دو طرح کی ہیں، ایک وہ جو فی البدیہہ کی گئیں اور دوسری وہ جو پہلے سے لکھ کر پڑھی گئیں۔ پہلی طرح کے خطبوں کا افسوس ہے کہ کوئی ریکارڈ میرے سامنے نہیں، دوسری طرح کے خطبے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں اور یہاں انھیں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات کی حیثیت مستقل مضامین کی سی ہے

کیوں کہ یہ نہایت محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ہر خطبہ اپنی علاحدہ انفرادیت رکھتا ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف ہے۔ یہ خطبات ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں اور وہ مرکزی خیال "اُردو" ہے۔ ان خطبوں میں اُردو زبان کی تاریخ، اس کا لسانی ارتقا اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ علمی و ادبی اداروں کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کے لسانی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ادب و زبان کے بنیادی مسائل کو سلجھانے کی پرخلوص کوشش کی گئی ہے۔ اُردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے قابلِ عمل تجویزیں بتائی گئی ہیں۔ اُردو زبان سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ہو، جس پر مولوی صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو گویا یہ خطبات اُردو زبان کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔

ان خطبات کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ ان میں عام لسانی مسائل اور اُردو زبان سے متعلق فکر انگیز بحثیں کی گئی ہیں اور بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کو خوش اسلوبی سے سُلجھایا گیا ہے۔ زبان کیا ہے؟ قومی زبان کسے کہتے ہیں؟ لفظ کیا ہے؟ لفظ و معنی کا باہمی ربط کیوں کر قائم ہوتا ہے؟ مخلوط زبان کیا ہے؟ اردو مخلوط زبان کیوں ہے؟ اُردو کا خمیر کن عناصر سے مرکب ہے؟ اردو میں ہندی فارسی اور عربی عناصر کس حد تک ہیں؟ اُردو میں نظم و نثر کا رواج کب ہوا؟ اردو نے ہندوستان کے کن کن مختلف مقامات پر پرورش پائی؟ کن کن لوگوں اور اداروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں حصّہ لیا؟ مختلف زمانوں میں اس زبان کی صورت کیا تھی؟ مقامی تعصّب زبان کی ترقی کی راہ میں کس حد تک حارج ہوتا ہے؟ زبان کی صحت کا معیار کیا ہے؟ اُردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کس طرح حل کرنا چاہیے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے

سوالات کے تشفی بخش جوابات ان خطبوں میں ملتے ہیں۔

مولوی صاحب نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ان خطبات کی وجہ سے ان کا شمار صفِ اوّل کے ماہرینِ لسانیات میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو داد تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مثال کے طور پر بہار اُردو کانفرنس کا خطبہ دیکھئے۔ اس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اس مسئلے پر بھی لکھا ہے کہ مختلف زمانوں میں اردو زبان کو کن کن ناموں سے یاد کیا گیا۔ اس موضوع پر انھوں نے بمشکل تین صفحے لکھے ہیں، لیکن ان تین صفحوں میں بھی انھوں نے پوری ایک داستان بیان کردی ہے اور مدلّل طور پر بتایا ہے کہ یہ زبان کن کن ناموں سے موسوم ہوتی رہی۔

برصغیر ہند و پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں وہ لسانی جھگڑا بڑی اہمیت رکھتا ہے، جسے ہندی اُردو جھگڑے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ جھگڑا آج سے تقریباً اسّی نوّے سال قبل شروع ہوا جب کہ اُردو کی عام مقبولیت کو نظرانداز کرکے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان منوانے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اس کی تشکیل و تعمیر اور بنانے سنوارنے میں ہندوستان کی تمام قومیں برابر کی شریک ہیں۔ یہ زبان نہ تو کسی ایک فرقے کی ملکیت ہے اور نہ ہی کسی ایک قوم کی میراث ہے۔ اس پر سبھی کا حق ہے۔ لیکن جب بعض لوگوں نے اپنا مفاد اردو کی مخالفت ہی میں دیکھا تو انھوں نے ہندی کا ڈھونگ رچایا۔ ہندی بقول ڈاکٹر مسعود حسین ایک منفی لسانی تحریک ہے اور کوئی فطری زبان نہیں۔

ایک عرصے تک ہندی اردو کا جھگڑا دبی ہوئی آگ کی طرح سلگتا رہا لیکن جب ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی نے سیاست اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی مسیحا نفسی سے یہ دبی ہوئی آگ شعلۂ جوالہ بن گئی۔ سارا ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اردو کے حامی اور دوسری طرف ہندی کے طرف دار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے طرف دار زیادہ طاقت ور تھے، کیوں کہ گاندھی جیسی بڑی شخصیت ان کی رہ نمائی کر رہی تھی۔ ایسے موقع پر مولوی عبدالحق نے اردو کے تحفظ پر کمر باندھی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو ہی ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ ہندی اردو کے اس جھگڑے کی تمام تفصیلات اور اردو پر جو اعتراضات کئے گئے ان کے مدلّل جوابات، خطبات عبدالحق میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے

ان خطبات کو ہندوستان کے اہم ترین لسانی جھگڑے کی مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔
ان خطبات میں مولوی صاحب نے ملک کے تعلیمی مسائل پر بھی جا بجا بحث کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کی تعلیم خود انھیں کی زبان میں ہونی چاہیئے اس سلسلے میں انھوں نے جہاں ایک طرف یہ بتایا ہے کہ غیر زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے کیا نقصانات ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف یہ بھی مدلّل طور پر ثابت کیا ہے کہ اُردو ہر اعتبار سے اس لائق ہے کہ اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ کی مثالیں جا بجا دی ہیں اور ان عظیم الشان اداروں کی خدمات کا خاکہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں انگریزی راج کے استحکام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان کی قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ختم کر دیا۔ مولوی صاحب کے نزدیک ہندوستانیوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرانے کی یہی سب سے موزوں تدبیر تھی کہ انھیں خود انھیں کی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے انھوں نے کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ انھیں کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر مولوی صاحب کوشش نہ کرتے تو جامعہ عثمانیہ کبھی وجود میں نہ آتی۔ اس یونی ورسٹی کی تعمیر و تشکیل مولوی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے کہ جس نے ہند و پاکستان کے تعلیمی نظام میں ایک تغیّرِ عظیم برپا کر دیا۔ اور ہر شخص کو یہ ماننا پڑا کہ اُردو میں یہ

صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے
رائج ہو سکے — مولوی صاحب کے ان خیالات کی جھلک ان
کے خطبات میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

ان خطبات میں مولوی صاحب کی اردو دوست شخصیت پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے
مجھے تو ان خطبوں میں وہی سچائی اور وہی خلوص نظر آتا ہے۔ جو ایک اچھی خود نوشت سوانح عمری
کا خلاصہ ہے۔

مولوی صاحب نے جن مختلف زاویوں سے اردو کی فضیلت ثابت کی ہے جن مختلف طریقوں
سے اردو کے مخالفوں کو شکست دی ہے۔ اس کی تمام روداد ان خطبوں میں مل جائے
گی، اور یہ روداد ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی داستان لکھ رہا ہو۔ اگرچہ لفظ "میں" ان
خطبوں میں بہت کم آیا ہے، اس کے باوجود مجھے یہ اصرار ہے کہ یہ خطبات مولوی صاحب
کی خود نوشت سوانح عمری نہیں بلکہ ان کے "اعتراف"
ہیں۔ انھوں نے اپنی ذات کو اردو میں ضم کرکے "من وتو" کا فرق مٹا دیا ہے۔ الغرض
ان خطبوں میں ہمارے دور کا ایک عظیم ذہن پوری طرح بے نقاب نظر آتا ہے۔ ارسطو
نے زہر کا پیالہ پینے سے پہلے یونان کی عدالت میں جو بیان دیا تھا وہ انسانی ذہن کی
تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ خطبے جو مولوی عبدالحق نے اردو
کی محبت میں سرشار ہونے کے بعد لکھے، ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کا نمایاں
ترین باب ہیں۔

انسان کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ خود انسان ہے۔ کسی ایک انسان
کی سیرت کو بے نقاب دیکھ لینا، بہت سی کتابیں پڑھنے سے کہیں زیادہ مفید ہے،
کیوں کہ کتابیں محض علم میں اضافہ کرتی ہیں اور سیرتیں انسانی تجربات ومشاہدات میں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ علم بغیر تجربے اور مشاہدے کے جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں۔
انسان کی دلچسپی کی سب سے بڑی چیز خود انسان ہے۔ اسے دوسروں کی شخصیتوں کو بے نقاب دیکھنا اس حد تک پسند ہے کہ وہ بعض اوقات اس سلسلے میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ خود اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ دنیائے ادبیات میں فن سوانح نگاری کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔

سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں، انھیں میں سے ایک "شخصی خاکہ" ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری ہی کی ایک قسم ہے، جس میں کسی شخصیت کے ان نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے، جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستانِ حیات نہیں ہوتا، بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔
شخصیت کی تصویر کشی کرنا بڑا مشکل فن ہے، کوئی شخصی خاکہ اس وقت تک کامیاب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا کہ جب تک اس میں موضوع کی تصویر اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر نہ آئے۔ موضوع کی خوبیوں یا خامیوں کی پردہ داری کی کوشش خود مصنف کی نااہلیت کی پردہ در بن جاتی ہے۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے جس میں موضوع کو اسی رنگ میں پیش کیا جائے جو اس کا خاصہ ہے۔ اسے صرف فرشتہ یا صرف شیطان بنا کر پیش نہ کیا جائے، اسے ان دونوں کا مجموعہ ہی رہنے دیا جائے کیوں کہ اسی مجموعے کا نام "انسان" ہے۔

ایسے لوگ دُنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں جو صرف "اچھے" یا صرف "بُرے" ہوں۔ اچھائی اور بُرائی دونوں اضافی قدریں ہیں، ہر دَور اور ہر زمانے میں ان کا مفہوم بدلتا رہا ہے، اس لیے مصنف کو خاکہ نویسی کرتے وقت اپنے اچھائی بُرائی کے معیار

82648
8.1.82

کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ اصل حقیقت کو پیش
کرنا چاہیے۔ خاکہ نویس کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے اور مصوّر
کے موقلم سے لکھنے کا فن آنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو
اس کی تحریر موضوع کے مزار کا کتبہ تو بن سکتی ہے۔ لیکن اس
کی زندگی کا آئینہ نہیں۔

اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصی خاکہ نویسی کے لیے کس قسم کی شخصیتوں کا انتخاب کرنا چاہیے۔ یہ سوال اس وقت بیکار نظر آتا ہے جب یہ حقیقت فاش ہو جائے کہ ہر انسان بجائے خود ایک وسیع دُنیا ہے، اس میں اچھے بُرے، توانا، اپاہج اور سفید و سیاہ کی کوئی قید نہیں۔ یہ چیزیں "شخصیت" کو بناتی ہیں نہ بگاڑتی ہیں اور نہ ہی بنیادی طور پر ان خوبیوں یا خامیوں کا اثر انسان کی "انسانیت" پر پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف انھیں لوگوں کی زندگی کے حالات قلم بند کرنا چاہئیں کہ جنھوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو اور شہرت و نام وری حاصل کی ہو۔ یہ خیال شہرت و نام وری کی حد تک رُسوا کن ہے، اس لیے کہ وہ لوگ جنھوں نے کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا اور کبھی شہرت و نام وری حاصل نہیں کی، ان کی زندگی کے حالات بھی دوسرے انسانوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں اور اس کی مثالیں دنیا کے ہر ادب میں موجود ہیں۔

اردو زبان میں شخصی خاکہ نویسی کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں، لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثال "آبِ حیات" میں ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے بڑی چابک دستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ جو اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض جگہ انھوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ درست ہے کہ یہی مبالغہ بعض اوقات موضوع کے بارے میں بہت سی ناگفتنی باتیں کہہ گیا۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے وہ اردو خاکہ نویسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے، لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اردو میں صحیح طور پر متعارف کرنے کا سہرا مولوی عبدالحق صاحب کے سر ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات

مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دیئے۔ جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں "چند ہم عصر" کے نام سے یکجا کر دیا گیا۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں بے شبہ بلند مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے، جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں، جس شخص کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے۔ بعض لوگوں (مثلاً سرسید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے، لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

یہاں یہ توضیح کر دینا ضروری ہے کہ "چند ہم عصر" میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں، جو مرتب (شیخ چاند مرحوم) نے محض اس بنا پر شامل کر لیے کہ ان میں بعض شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ایسے مضامین "شخصی خاکے" نہیں ہیں (مثلاً حکیم امتیاز الدین اور مولانا گرامی وغیرہ کے متعلق تحریریں) اس لیے وہ ہماری بحث کا موضوع نہیں ہو سکتے، ہمارے پیش نظر وہی مضامین ہیں، جن میں مولوی صاحب نے موضوع کی شخصیت کو پوری طرح سامنے رکھ کر قلم اٹھایا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایسے ہی لوگوں پر قلم اٹھایا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابل تقلید ہو سکتی ہے مگر انھوں نے ان خاکوں سے اخلاقی درس دینے کا کام نہیں لیا کیوں کہ یہ خصوصیت کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں، عماد الملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی، حسرت موہانی وحید الدین سلیم جیسے شاعر و سخن فہم بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے معمولی انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کرنے کا فن خوب

اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے شخصی خاکے مختصر ہیں، لیکن اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت بھی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سرسید کے متعلق انھوں نے تقریباً ایک سو صفحات لکھے ہیں، لیکن اپنی افادیت کے اعتبار سے یہ صفحات، آٹھ سو صفحے کی "حیاتِ جاوید" سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "حیاتِ جاوید" اردو کی بہترین سوانح عمری ہے، اور اس کا مقابلہ مولوی صاحب کے مضمون سے نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس مضمون میں بعض ایسی معلومات ہیں جو "حیاتِ جاوید" میں نہیں اس اعتبار سے اسے حیاتِ جاوید کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب موضوع کی صرف اچھائیوں ہی سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ برائیاں بھی بیان کرتے ہیں، کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ " دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اس طرح نہ انسان بے عیب ہوا، نہ ہوگا" (چند ہم عصر ۹) سید محمود سے جو انھیں تعلق خاطر تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مولوی صاحب ان کی شراب نوشی کی عادت پر پردہ ڈالتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ سرسید کے حالات میں اس طرف واضح اشارے کیے ہیں اور خود سید محمود کے بارے میں جو مضمون ہے اس میں ان کو "ایک شان دار انسانی کھنڈر" سے تشبیہ دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون سید محمود کی وفات کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ تعزیتی جلسوں میں عموماً رسمی باتیں ہوتی ہیں اور بقول سعادت حسن منٹو مرنے والے کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں موقع کی مناسبت سے رسمی باتیں نہیں کہیں، بلکہ سید محمود کی شخصیت پر بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کے متعلق بڑی متوازن رائے دی ہے۔

> " اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا کلیسہ سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔"
>
> " وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی، دوست بھی اس کے جان نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

ان دو جملوں میں مولوی صاحب نے مولانا محمد علی کے کردار کی بڑی جان دار تصویر کھینچی ہے، ہو سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کے بعض عقیدت مند یہ تصویر پسند نہ کریں، لیکن وہ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ مولوی صاحب کی "بے باکی" حقیقت پر مبنی ہے۔

مولوی صاحب کے دو شخصی خاکے ایسے ہیں جن کی اُردو ادب میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں مضمون ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو نہ تو بڑے سیاست دان تھے، نہ ادیب نہ شاعر یہاں تک کہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ جس کی وجہ سے ان کے جاننے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا۔ ان میں ایک سپاہی تھا اور ایک مالی۔

"دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے
بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے
انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کچھ فرق نہیں ہے۔
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے"

(چند ہم عصری ص ۱۲۴)

یہ وہ تمہیدی سطور ہیں جو مولوی صاحب نے "نور خاں" کے حالات لکھنے سے پہلے سپرد قرطاس کی ہیں۔ "نور خاں۔ گدڑی کا لال" معمولی آدمی تھا، لیکن اس کے کردار کی بعض خصوصیات بڑی غیر معمولی تھیں ــــ انھیں خصوصیات نے مولوی صاحب کو متاثر کیا اور انھوں نے یہ خاکہ لکھا۔ اسی طرح نام دیو ایک عام طرح کا انسان تھا، لیکن اسے اپنے کام سے جو لگن اور عشق تھا، وہ مولوی صاحب کے لیے کشش کا باعث ہوا اور انھوں نے اس کی تصویر کشی کی۔ یہ دونوں شخصی خاکے بہترین انسانی مطالعے ہیں۔ یہ دونوں کردار ہمارے ادب میں لافانی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق کے قلم ہی کی مسیحائی ہے کہ معمولی آدمیوں کو انھوں نے حیات جاوید عطا کر دی۔

مولوی صاحب کے شخصی مضامین کی ایک خصوصیت اور بھی بہت دل چسپ ہے اور وہ یہ کہ ــ اگر اس مجموعے کا نام "چند ہم عصر" کی بجائے "یاد رفتگاں" ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ مولوی صاحب نے اپنے کسی ہم عصر کا خاکہ اس کی زندگی میں نہیں لکھا۔ تمام خاکے ہم عصروں کے مرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خاکوں کی صورت، موجودہ صورت سے مختلف ہوتی۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں تعریف و مدح کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ذرا جراءت کی بات ہے، مجھے مولوی صاحب میں اس جراءت

کی کمی نظر آتی ہے، لیکن یہ کمی اس وقت کچھ زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتی جب ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ ان مضامین کو لکھنے کی محرک شخصیتوں کی موت ہے۔ اگر یہ لوگ مولوی صاحب کی زندگی میں نہ مرتے تو مولوی صاحب کبھی ان پر قلم نہ اٹھاتے۔ ان لوگوں کی دائمی مفارقت کے احساس نے مولوی صاحب سے یہ مضامین لکھوائے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے شخصیتوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں، وہ زندگی سے بھرپور ہیں۔ یہی بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ مولوی صاحب نے یہ مضامین لکھنے کے لیے ہم عصروں کے مرنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ان کو موجود نہ پاکر دل کی تسکین کے لیے ان کی لفظی تصویریں تیار کر لیں اور یہ اچھا ہی ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی زندہ انسان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر چند ہم عصر کے مضامین متعلقہ لوگوں کی زندگی کے دوران میں لکھے جاتے تو اردو ادب ایک متاع گراں مایہ سے محروم رہ جاتا۔

"چند ہم عصر" جہاں دوسروں کی داستان ہے، وہیں اس میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار کے لیے بنیادی مواد اسی کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اسی دریچے سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے، ان کی کوئی نہ کوئی — خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود ہے وہ سرسید

کی طرح ثقافتی رہنما ہیں، حالی کی طرح سادگی پسند ہیں،
محمد علی جوہر کی طرح جذباتی ہیں، میرن صاحب کی
طرح وضع دار ہیں، اور نام دلیو مالی کی طرح کام سے عشق
رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اُردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے، انسان کو سمجھنے کا انداز دیا ہے، شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں، ان سے زندگی کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے اور نشیب و فراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ مرقعے اُردو کے سوانحی ادب کی آبرو ہیں۔

اردو کا تمام قدیم ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے اور یہ مخطوطات بھی ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں ان جواہر پاروں کا تحفظ نہایت ضروری ہے کیوں کہ اردو زبان کی تاریخ انھیں سے وابستہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ قدیم سرمائے کے تحفظ کو بھی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ انھوں نے بہت سی نادر کتابوں کو کثیر سرمائے اور مشکلوں سے فراہم کیا۔ ان کی ترتیب و تدوین میں جان کھپائی اور انھیں عالمانہ مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ اردو کے بہت سے اہم تذکرے انھیں کی اس جگر کاوی کی وجہ سے محفوظ رہ گئے۔ بعض دوسری منظوم اور نثری تصانیف بھی ان کی وجہ سے منظر عام پر آئیں۔ مخطوطات کی تدوین ایک بہت مشکل کام ہے، اس کے لیے بڑی محنت اور جگر کاوی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں اور پھر اُردو میں تو اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود ہی نہیں تھی۔ یہ مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس طرف خود توجہ کی اور دوسروں کو متوجہ کیا اور اس طرح اہم ادبی سرمایہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا۔

زبان کا عشق انھیں ہر میدان میں لے گیا اور ہر جگہ ان کی طبع کی جولانیوں نے نئے نئے راستے تراشے۔ وہ ایک ماہر لسانیات ہیں، اور کئی زبانیں جانتے ہیں اور اردو زبان کی تو ایک ایک ادا سے واقف ہیں، لغت نگاری سے ان کا انہماک شروع سے ہے اور ہندو پاکستان میں صرف وہی اس فن کی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ انگریزی

اردو لغت کی تیاری میں اگرچہ انھیں اہلِ علم کی ایک پوری جماعت کا تعاون حاصل رہا، لیکن کام کا بڑا حصّہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایک اُردو لغت بھی تیار کی ہے، جو ابھی شائع نہیں ہوئی۔ زبان کی قواعد سے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک "صرف و نحو اردو" اور دوسری "قواعد اُردو" ثانی الذکر کتاب اپنے موضوع پر درجۂ استناد رکھتی ہے، اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو مقبولیت اس کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔

مولوی صاحب کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ صفِ اوّل کے نقّاد و محقق نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بہترین نمونہ دو کتابیں ہیں (۱) "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام"۔ (۲) "ملک الشعرائے بیجاپور ـــــ ملا نصرتی"۔ اس کے علاوہ قدیم اُردو ادب کے متعلق بہت سے مضامین رسالہ "اُردو" میں شائع ہو چکے ہیں۔

تحقیق اور تنقید کا بہت گہرا تعلق ہے تحقیقی مزاج کے بغیر نقاد اور تنقیدی شعور کے بغیر محقق بننا مشکل ہی نہیں نا ممکن ہے۔ ایک نقّاد کے لیے محقق ہونا اور محقق کے لیے نقّاد ہونا ضروری ہے، ورنہ محقق کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ کون سا موضوع اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے اور نقّاد یہ نہ جان سکے گا کہ جس موضوع پر وہ اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

> مولوی صاحب محقق بھی ہیں اور نقّاد بھی۔ لیکن ان کی پہلی خصوصیت اس درجہ نمایاں ہے کہ دوسری خصوصیت دب گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کے تنقیدی کارنامے پوری طرح سامنے نہیں آئے، رسالہ "اُردو" میں جو مضمون شائع ہوئے ہیں، وہ ابھی کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے اس وجہ سے وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ لیکن جب یہ کتابی شکل میں سامنے آئیں گے تو مولوی صاحب کو ایک بڑے محقق کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نقّاد بھی ماننا پڑے گا۔

مولوی صاحب نے ادب اور تنقید کے بنیادی مسائل پر کوئی مستقل کتاب تصنیف نہیں کی، اس بارے میں انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں ضمنی طور پر اظہارِ خیال کیا ہے، جن کو پیشِ نظر رکھ کر ایک باشعور قاری مولوی صاحب کے ادبی نظریات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

مولوی صاحب ادب کو زندگی سے علاحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کے خدوخال کی عکاسی کرے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے جابجا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

"ادب زندگی کا جز ہے۔ ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات
ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا۔"

(خطبات صفحہ ۸۶)

"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔"

(خطبات صفحہ ۳۹)

ادب کو وہ معاشرے کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حالیؔ کی طرح وہ بھی اس خیال کے پوری طرح حامی ہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے گرد وپیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی
ہے۔ اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔"

(مقدمات حصہ دوم صفحہ ۴۶)

ان کا خیال ہے کہ ادب بغیر کسی مقصد کے ادب نہیں بلکہ فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ مقصدیت کو وہ ادب کی غایت اولیٰ قرار دیتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ مشاہدے، مطالعے اور حقیقت شناسی کی شرط کو ضروری سمجھتے ہیں وہ لوگ جو گرد وپیش کے حالات سے بے خبر ہو کر فردوس تخیل میں پناہ لیتے ہیں، ان کے نزدیک ادیب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔

"ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمان ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت سے
کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے دماغ پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے
لیکن اگر انھیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں تو انھیں اپنی ہوائی
پرواز سے اس ناپاک زمین پر اُترنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اُٹھا
کر بھی نہ دیکھے گا۔

(خطبات صفحہ ۴۰)

ادب سے وہ زندگی کے بنانے اور سنوارنے کا کام لینے کے قائل ہیں۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ادب کا زندگی کے ہر شعبے سے تعلق ہے۔ جہاں ادب معاشرے سے متاثر ہوتا ہے وہاں یہ معاشرے کو متاثر کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

"علم و ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیات انسانی، اور اس کا اثر زندگی کے
ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا"

اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیّر پیدا ہوتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔"

(مقدمات دوم صفحہ ۲۰۴)

وہ ادیب کو زندگی کی حقیقتوں سے منہ چراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا ایمان ہے کہ اگر ادیب میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ زندگی کی مشکلوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے تو اس کے ادب میں ہرگز ہرگز وہ توانائی پیدا نہ ہوگی جو زندگی کے بنانے سنوارنے کے کام آتی ہے۔ ادب کو وہ محض ذہنی لذت نہیں سمجھتے۔

"یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ... زندگی کی کش مکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے۔ اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعر و ادب صرف حظ نفس کے لئے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظ نفس کے ساتھ قوت روح بھی ہو جائے۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۶۳)

یہاں تک کہ وہ شعر و ادب سے "آلات حرب" کا کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں:۔

"اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں (شعر و ادب) سے آلات حرب کا کام لینا چاہیئے۔ آلات حرب سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں، نہیں۔ بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیئے۔ ان کے ذریعے سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجئے۔"

(ایضاً)

مولوی صاحب ادب کے لئے تازگی اور جدّت کی خصوصیات کو بہت اہم سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں خصوصیات ممدحیات کاموں کی بنیاد ہیں ادب بھی ایک ممدحیات کام ہے اور اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔

"ممدحیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدّت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدّت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممدحیات کاموں میں سے ہے اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۱)

مولوی صاحب کے ذہنی رجحانات کی تشکیل و تعمیر میں سرسید کی عقلیت پسندی اور حالی کی حقیقت بیانی کا بہت حصہ ہے وہ ان دونوں عہد آفریں شخصیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ خاص طور پر ادب کے معاملے میں وہ حالی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حالی کی طرح وہ ادب سے اصلاح کا کام لینے اور اسے زندگی کی جدوجہد میں برابر کا شریک رکھنے کے قائل ہیں، اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ قدیم ادب کی روایات پر قانع ہو جانے کو مناسب نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ موجودہ ادب کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے اور پرانے ادب میں جو باتیں معیوب ہیں ان کو ترک کر دینا چاہئے۔

"...... ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہئے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی.... لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے گذشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں..... اس لئے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئے جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہو گئی ہیں ان کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کار آمد اور مفید ہیں ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہئے۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۸۹)

مولوی صاحب کے نزدیک ادب کو "جدید" اور "قدیم" کے خانوں میں بانٹنا مناسب نہیں ہے وہ اس سلسلے میں اقبال کے ہم آواز ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

وہ ہر اس چیز کو ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے کہ جو قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی ہر اس جدید چیز کو اپنانے کے حامی ہیں جو آج کے زمانے کی پیداوار ہے۔ ادب اگر اچھا ہے، تو وہ خواہ کسی زمانے کا کیوں نہ ہو، سب کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہئے، تازگی، جدت اور خیالات کی گہرائی، ایسی خصوصیات ہیں جو ہر زمانے میں ایک ادب پارے کو مقبولیت سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

"ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں۔ جس کلام میں تازگی، جدت اور خیالات کی گہرائی ہے وہ ہمیشہ نیا ہے گو وہ دو ہزار سال پہلے کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو اور جس میں یہ نہیں وہ پرانا ہے گو وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۲۰۲)

وہ قدیم اور جدید دونوں ادبیات کی قدر کرتے ہیں نئے ادب کی تشکیل کے لئے وہ قدیم ادبی روایتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔

"ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے، جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے"

(خطبات عبدالحق صفحہ ٦٩)

گویا ادب زندگی کی طرح ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اس میں بھی اصلاح و ترقی کی گنجائش ہر حال اور ہر زمانے میں رہتی ہے۔ ادب کا یہی صحت مند نظریہ کسی ادب پارے کی حیات جاوید کا ضامن ہو سکتا ہے۔ وہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی اصطلاحوں میں گم ہونا پسند نہیں کرتے۔

"رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیّر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے، سراسر رجعت سے آلودہ ہے صحیح نہیں"

(خطبات عبدالحق صفحہ ٧٩)

الغرض مولوی صاحب ادب کو زندگی کا آئینہ بھی سمجھتے ہیں اور زندگی کے حسن کو بڑھانے کا ذریعہ بھی۔ وہ اسے کبھی عالم میں سماج سے علیحدہ کرکے دیکھنے کے قائل نہیں۔ ادب کے ظاہر اور باطن دونوں پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ حالؔی کی طرح وہ خیال کی اوّلیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن بیان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے۔

"شے ایک ہی ہوتی ہے، لیکن اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک باطن، دوسرا ظاہر۔ ظاہر اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال وغیرہ ہے۔ باطن خیال یا موضوع جو اصل مقصد ہے خیال کیسا ہی اہم اور رفیع کیوں نہ ہو اس کے اظہار کا ذریعہ لا محالہ الفاظ یا زبان ہے اور یہی ایک ذریعہ ہے۔ جس کی بدولت ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ادب کے بنانے میں اس کا بڑا حصّہ ہے۔ حسن بیان ہی خیال میں دل کشی پیدا کرکے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزیں کرتا اور تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حسن بیان ذریعہ۔ لیکن طرز بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور

روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے ۔"

(مقدمہ" اردو تنقید کا ارتقا" صفحہ ی)

وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ادیب کو لکھنے کی پوری پوری آزادی ہونی چاہئے ۔ اس پر موضوعات کے انتخاب کی پابندی عائد نہ کی جائے ، لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ بھونڈے پن سے لکھے ۔

"ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہئے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے ۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۲۰)

لفظ کے صحیح استعمال پر وہ بہت زور دیتے ہیں ۔ کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس پر عمل کرکے ادیب اپنے خیالات کو موثر بنا سکتا ہے ۔

"لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور منظر خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ، ادب کا بڑا کمال ہے .... دلوں میں گھر کر لینے کے جو گُر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے ۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۱۶۸)

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کو وہ اچھے ادب کے مقاصد کے منافی سمجھتے ہیں ۔

"عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو ۔"

(چند ہم عصر صفحہ ۲۸۲)

ادبی تنقید کی اہمیت اور قدر و قیمت سے مولوی صاحب پوری طرح واقف ہیں ۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ تنقید کے مقاصد بہت وسیع ہیں اور اس کے بغیر صحت مند ادبی فضا پیدا نہیں ہوسکتی ۔ لیکن وہ ہر شخص کو نقاد بننے کا اہل نہیں سمجھتے ہیں ۔ اس کے لئے کچھ شرطیں ہیں ۔

"تنقید صحیح ذوق کے لئے لازم ہے لیکن ایک نقاد کے لئے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے ۔ وسیع معلومات ، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے ۔ صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لئے مفید ہے ۔"

(خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں ۔

"تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے ۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اُسے ذاتی اظہار کے قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے ۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر مزید کی شفتگی سے بچاتی اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے یعنی بریک کا کام دیتی ہے ۔ پڑھنے والوں کے لئے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور محرک بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے ۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لئے تنقید لازم ہے ۔"

(مقدمہ اُردو کا ارتقا صفحہ ک)

یہ تھے مولوی صاحب کے ادب و تنقید سے متعلق اصول و نظریات ان کی عملی تنقید انھیں اصولوں اور نظریوں کی پابند ہے ۔ انھوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے ۔ کسی فن کار کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ اس کی زندگی کے حالات، اس کے مزاج کی خصوصیات اور اس زمانے کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔ وہ سماجی و سیاسی محرکات پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں وہ آج کل کے نقادوں کی طرح سیاسی و سماجی حالات کو تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان نہیں کرتے کہ اصل موضوع کی اہمیت ہی ختم ہو جائے ۔ آج کل بعض نقاد جب کسی فن کار پر لکھتے ہیں تو اس کے سال پیدائش سے لے کر سال وفات تک کے تمام تاریخی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں جن کا براہِ راست فن کار کی زندگی اور فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ ادبی تنقید میں سیاسی حالات کو بطور پس منظر کے اس حد تک بیان کرنا چاہیئے کہ ان کے وہ اثرات واضح ہو جائیں جو فن کار کی شخصیت نے قبول کئے اور جن کے تحت اس کے ذہنی رجحانات کی تشکیل ہوئی ۔ مولوی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے ۔ وہ عملی تنقید میں سیاسی و سماجی حالات کو اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ فن کار کی سیرت اور اس کے فن کا مطالعہ کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے ۔ مقدمۂ انتخاب کلامِ میرؔ اس کی بہترین مثال ہے ۔ انھوں نے میرؔ کے شعری محرکات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے ۔ اور دکھایا ہے کہ زمانے کے حالات نے ان کی شخصیت اور فن پر کیا اثرات ڈالے ۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے ۔ انھوں نے عالمی ادب سے پوری طرح استفادہ کیا ہے ۔ صرف اردو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کے ادبیات پر ان کی بہت گہری نظر ہے ۔ ادبیات کے علاوہ دیگر سماجی علوم سے بھی وہ بخوبی آشنا ہیں ۔ مختلف ادبی، علمی، عمرانی، سیاسی، تحریکات اور رجحانات سے ان کی آشنائی قابلِ رشک ہے ۔ ان سب خصوصیات نے ان کی عملی تنقید کو بہت متوازن بنا دیا ہے ۔ وہ صرف خوبیوں

یا صرف خامیوں سے ہی سروکار نہیں رکھتے، بلکہ ادب پارے کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جگہ وہ تحسین و تعریف کرتے ہوئے مبالغے کی حد تک جا پہنچتے ہیں، لیکن ایسے مقام بہت کم ہیں اور انہیں بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے جو خاص دل چسپی ہے اس کی وجہ سے وہ تنقید کرتے ہوئے فن پارے کی زبان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی ہیں تو ان کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور اگر کوئی قابلِ تعریف پہلو ہوتا ہے تو اس کو بھی بیان کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی ساری تنقید زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

مولوی صاحب کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹیفک تنقید ہے۔ موضوع کے ہر پہلو پر وہ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے اُردو میں تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہیں۔ حالی نے صرف بنیاد ڈالی تھی، لیکن مولوی صاحب نے اسی بنیاد پر عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔

تبصرہ نگاری تنقید ہی کی ایک شاخ ہے۔ تنقید میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل جائزہ لیا جاتا ہے تبصرے میں ایک سرسری سی نظر ڈالی جاتی ہے۔ تنقید نگار مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں لکھتا ہے۔ تبصرہ نگار کبھی کبھی ذاتی پسند اور ناپسند کو بھی معیار بنا لیتا ہے۔ بہر حال تبصرہ نگاری کے لئے تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر تبصرہ تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں۔ غالباً "تہذیب الاخلاق" پہلا علمی رسالہ ہے جس نے اس روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اور پھر "الندوہ" اور دوسرے علمی رسالوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ حالی اور شبلی اُردو کے اولین تبصرہ نگاروں میں سے ہیں۔ مگر ان کے "تبصرے" ان کے دوسرے علمی کاموں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ افتخار مولوی صاحب ہی کو حاصل ہے کہ ان کے تبصرے اُردو تنقید کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔

مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا باقاعدگی سے آغاز رسالہ "اُردو" کے اجرا سے ہوتا ہے۔ اس رسالے میں انھوں نے بے شمار کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے لکھے، جن کے ایک دو انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔

"مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر تبصرہ

لکھتے ہیں۔ (یہ بات ہیں نے اس لئے لکھی ہے کہ اردو کے اکثر تبصرہ نگار کتاب پڑھے بغیر ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرتے ہیں) کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر وہ تفصیلی بحث تو نہیں کرتے مگر ایسے اشارے ضرور کرتے ہیں جن سے کتاب کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے۔ ان کی تبصرہ نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زیر تبصرہ کتاب میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے کہ نہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو وہ بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُسے نشانۂ تضحیک بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

مولوی صاحب کے تبصرے عملی تنقید کا اچھا نمونہ ہیں۔ وہ بہت کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی کے مجموعہ "آیات و نغمات" پر انھوں نے یہ چند سطریں لکھی ہیں۔

"جوشؔ صاحب کوئی نئے شاعر نہیں۔ اچھے خاصے پختہ اور پرانے شاعر ہو گئے ہیں۔ نہ کسی تعارف کے محتاج ہیں نہ کسی تعریف کے۔ ان کے کلام میں جوش، روانی، حسنِ بیان بدرجۂ کمال موجود ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور شور بھی۔ وہ رسم و روایات و اخلاق، مذہب و معاشرت اوہام و عقائد سے سخت بیزار ہیں اور متانہ وار انھیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ انقلاب، نظام جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے ان کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں۔ انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس میں تعمیر تو ہے لیکن ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے، جس پر ہنستی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوشؔ کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور ہوتا ہے لیکن اس میں بلندیٔ فکر اور تاثیر نہیں۔"

(ادبی تبصرے صفحہ ۸۰)

ان چند سطروں میں جوشؔ کی شاعری کی تمام خصوصیات کو بیان کر دیا گیا ہے۔ جوشؔ کے کلام پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی۔ مولوی صاحب کے تقریباً سبھی تبصروں میں یہی شان پائی جاتی ہے۔ تبصرہ کرتے وقت مولوی صاحب کتاب کی زبان و بیان پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اگر کہیں اس قسم کی خامیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی ضرور

کرتے ہیں، لیکن سارا تبصرہ اسی پہلو تک محدود نہیں ہوتا۔ شعری مجموعوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی چیز ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی نئی بات نظر آتی ہے تو اس کو پوری فراخ دلی سے سراہتے ہیں اور اگر رسم و روایات کی فرسودگی نظر آتی ہے تو دامن بچا کر گزر جاتے ہیں۔ ایسی کتابوں پر، جو اردو میں اپنی نوعیت کی نئی کتابیں ہوں، وہ مصنف یا مؤلف کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ اس موقع پر تحسین و تعریف کے کلمات کے استعمال سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

مولوی صاحب نے اپنی تبصرہ نگاری کو کبھی ادبی بددیانتی سے آلودہ نہیں کیا۔ یعنی انھوں نے نہ تو کبھی کسی کتاب پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے کچھ لکھا اور نہ ہی کبھی کسی کتاب پر تبصرہ کیا، جس کے موضوع سے ان کو واقفیت نہ ہو۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے ان کی تبصرہ نگاری نے اردو تنقید میں ایک ایسی روایت کی بنیاد رکھی ہے جو نہایت ہی صحت مند اور مستحسن ہے۔ کسی خراب سے خراب کتاب میں بھی انھیں کوئی کام کی بات نظر آجاتی ہے تو وہ اس کو ضرور سراہتے ہیں۔

اور اگر کسی کتاب میں کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے جس پر وہ خود کو تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تو فوراً اس کا اقرار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ "روح سیاست" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "مترجمین نے اس ترجمے میں اکثر غیر مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ ان کے خیال میں اس کا استعمال مجبوری اس لئے جائز رکھا گیا ہے کہ ہماری زبان میں بلینک ورس کو رواج نہیں اور یہ مجبوری اس لئے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے۔"
>
> (ادبی تبصرے صفحہ ۳۰)

ایسا لکھ دینا بڑے ظرف کی بات ہے۔ اسی کو ادبی دیانت کہتے ہیں اور یہی چیز مولوی صاحب کے تبصروں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اسلوب کیا ہے؟ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا عکس ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خود شخصیت ہی اسلوب ہو۔ یعنی میرے نزدیک اسلوب

"عکس" نہیں" اصل تصویر" ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت ہی اس کا اسلوب ہے۔ ایک انسان کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کے ذہنی رجحانات بڑا اہم حصّہ لیتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انفرادیت کی تشکیل ہی یہی کرتے ہیں۔ ذہنی رجحانات جب ایک عرصے کی رنگ و دو کے بعد کوئی مخصوص صورت اختیار کر لیتے ہیں تو انسان کی انفرادیت وجود میں آتی ہے جو اسے اپنے ہم جنسوں سے ممیز کرتی ہے۔ اور پھر اس کے ہر فعل میں یہ انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ادیب کی تحریر کو بھی ایک مخصوص رنگ اور روپ یہی انفرادیت عطا کرتی ہے اور اسی رنگ اور روپ کا دوسرا نام "اسلوب" ہے۔

ادب خیال اور بیان کا ایک خوب صورت امتزاج ہے۔ خیال کی اہمیت بہت زیادہ ہے، لیکن اگر خیال کو مناسب و موزوں طریقے سے ادا نہ کیا جائے تو ادبیت مجروح ہو جاتی ہے۔ ایک واقعہ جب ایک اخبار نویس بیان کرتا ہے تو وہ "خبر" بن جاتا ہے، لیکن اگر اسی واقعے کو ایک ادیب بیان کرے، گا تو وہ فن پارہ بن جائے گا۔ وہ عنصر جس نے "خبر" کو "فن پارے" کا درجہ عطا کیا ادب کی بنیاد ہے۔ اسلوب کا تعلق اسی عنصر سے ہے۔ ایک ادیب اپنے اسلوب سے وہی جادو جگاتا ہے جو ایک مصوّر رنگوں کے امتزاج اور خطوطِ تصویر کی موزونیت سے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ادیب کا اسلوب ایسا ہے اور فلاں کا ایسا تو اس وقت ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ادیب نے اپنے موضوع کو پیش کرنے کے لئے بیان کا کیسا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ایک ادیب کے جملوں کی ساخت، لفظوں کے استعمال اور بات کہنے کے طریقے سے اسلوب کی خصوصیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں جن ذہنی رجحانات نے حصّہ لیا ہے ان کی نوعیت کیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی کہ جب سر سیّد کی عقلیت پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور تصنع سے بھرپور تحریروں کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ ہر بات صاف اور سیدھے انداز سے کہی جانے لگی تھی۔ مولوی صاحب سر سیّد سے اور پھر مولوی حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے خیالات انھوں نے اپنائے بلکہ ان کے طرزِ تحریر سے بھی تاثر لیا۔ ان دونوں کی سادگی اور سادہ بیانی کا اثر مولوی صاحب کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سر سیّد کا اسلوب اگرچہ بہت سادہ و آسان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں "اکھڑ پن" پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سیّد کے ہاں "ادبیت" کی حیثیت "ثانوی" ہے اور "مقصدیت" کو "اوّلیت" حاصل ہے۔ اُن پر "اصلاح" کا خیال اس حد تک طاری تھا کہ وہ تحریر کی خوبیوں یا خامیوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ مولوی حالی کا اسلوب سر سیّد سے قدرے بہتر ہے۔ اس میں اگرچہ "اکھڑ پن" نہیں پایا جاتا، مگر وہ جاذبیت بھی نہیں ہے جسے "ادبی حسن" کہا جا سکے۔ اس کا سبب بھی وہی "مقصدیت"

کی اولیت ہے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حالی کا اسلوب بے داغ ہے لیکن وہ شبلی کے اسلوب کی طرح رنگین بھی نہیں۔ یہ فرق طبیعتوں اور شخصیتوں کے باہمی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا۔

مولوی عبدالحق نے حالی اور سرسید سے سادگی اور سادہ بیانی لی، لیکن ان کا اسلوب صرف انھیں دو عناصر سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جسے "رنگینی" کہا جا سکتا ہے اور یہ خصوصیت انہیں شبلی سے ملی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلی کو "مطعون" کیا جا سکے لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنے کہ حالی اور سرسید سے (واضح رہے کہ مولوی عبدالحق مدرستہ العلوم علی گڑھ میں شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں، حالی اور سرسید سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی۔ شاگرد کا اُستاد سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مولوی صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلی کے انداز تحریر سے متاثر ہوتے) گویا مولوی صاحب کے اسلوب بیان کی تین خصوصیات ہیں۔ سادگی۔ سادہ بیانی اور رنگینی۔ "سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت آرائی اور دیگر تصنعات سے اجتناب کیا جائے۔" سادہ بیانی" یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے دوٹوک انداز سے کہا جائے۔ موضوع کی مناسبت سے کہا جائے۔ اور پیچیدگی اور الجھاؤ سے دامن کشی کی جائے۔" رنگینی" کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں وہ لطافت پیدا کی جائے جو" ادبی حسن" کہلاتی ہے۔ یہ تینوں خصوصیات

جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مولوی صاحب لفظوں کے بہت بڑے مزاج دان ہیں ۔ انہیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ ۔

"الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جان دار ہیں، وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، مرتے، بڑھتے اور گھٹتے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے، جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے۔ وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے ادنیٰ، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے۔ جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے۔"

(تنقیدات صفحہ ۱۱)

مولوی صاحب کو انشا پردازی کا یہ گر معلوم ہے وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اسی جگہ کے لئے وضع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لفظ کس زبان سے اُردو میں آیا ہے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس مقصد کے لئے یہ لفظ اُردو میں آیا ہے وہ پورا ہوتا ہے کہ نہیں۔ ان کی نثر ابوالکلامؒ آزاد کی نثر کی طرح صرف عربی فارسی لفظوں ہی کی محتاج نہیں، بلکہ وہ ہندی لفظوں کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ غریب سے غریب لفظ بھی ان کی نثر میں آکر بڑا مانوس دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں متروکات کے استعمال کو بھی روا رکھتے ہیں لیکن اس طرح کہ پڑھنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ آخر ان الفاظ کو متروک کیوں قرار دیا گیا وہ ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں جو ہماری زبان کے مزاج پر پورے نہیں اُترتے یا جن کی ثقالت مفہوم کو سمجھنے میں دشواری پیدا کرتی ہے۔

مولوی صاحب بڑے بڑے جملوں کے عادی نہیں ـــــ وہ چھوٹے مربوط جملوں سے بڑی متوازن نثر لکھتے ہیں۔ چھوٹے جملے لکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خیال کو دوسروں تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر کو حسین بنانے میں نادر و خوبصورت تشبیہات کو بھی بہت دخل ہے۔ یہ تشبیہیں محض لطافت بیان کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے مفہوم کی وضاحت کا کام لیا ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا۔ کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی، دوست بھی اس کے جان

نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے"

مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

(چند ہم عصر صفحہ ۴۹)

" حیدرآباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک جھگڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہوجاتا ہے، وہ اسی طرح سے رہے، جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہاؤس"

(چند ہم عصر صفحہ ۴۹)

اسی طرح اور بھی بہت سی تشبیہات پیش کی جاسکتی ہیں، جو مولوی صاحب کی تقریباً تمام تصانیف میں موجود ہیں۔ مولوی صاحب کبھی کبھی طنز اور مزاح سے بھی اپنی تحریر میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ طنز کا استعمال تو وہ وہاں کرتے ہیں جہاں وہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ عام طرح سے بات کرنے کا انداز موثر نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے "تذکرہ اعجاز سخن" پر جو تبصرہ لکھا ہے، وہ بہت ہی دلچسپ ہے اور طنز کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کتاب کو" سلسلہ ستم ظریف بک ڈپو" کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب بہت سی باتیں کہنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں۔

" ابتدا میں مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ کتاب" سلسلہ ستم ظریف" میں کیوں داخل کی گئی لیکن کتاب ختم کرنے کے بعد ثابت ہوا کہ بے شک وہ اسی سلسلے کے لائق تھی"

(تنقیدات صفحہ ۳۸)

اسی طرح "ناٹک ساگر" کے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

" ناظرین کو حیرت ہوگی کہ یہ پونے پانچ سو صفحے کی کتاب ایک ہفتے میں چھپ کر تیار ہوئی ہے، یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہے۔ یہ تو خیر چھپائی کا کام ہے ہم نے سنا ہے کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں"

(ادبی تبصرے صفحہ ۵۳)

اس سلسلے میں وہ بعض اوقات اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے جلسے کا خطبہ صدارت ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جارہا تھا، چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کوئی نہیں تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے" جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ ظریف بڈھا یاد آتا ہے

(باقی صفحہ ۶۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

مولوی عبدالحق

اگر یہ صحیح ہے کہ کسی ادیب کی تحریریں اس کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہیں تو یہ قول ڈاکٹر عبدالحق پر صادق آتا ہے۔ ان کی طبیعت میں تجسس، تلاش اور کسی بات کی تہہ تک پہونچنے کا جذبہ ہے وہی ان کے تحقیقی اور تخلیقی کاموں کا محرک بنا۔ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو اس وقت تک چین نہیں لیتے جب تک اسے ختم نہ کرلیں۔ اس قسم کی شخصیتیں تحقیقی کاموں کے لئے بہت موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو سادگی خلوص عزاہمت اور بلندارادے ہیں وہی ان کی تحریر و تقریر میں جاری و ساری ہیں۔ دہلی میں ڈاکٹر عبدالحق کے پاس اپنی ذاتی لائبریری تھی۔ جس میں قلمی نسخوں کے علاوہ دوسری نایاب اور مفید کتابیں موجود تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد انھیں پاکستان آنا پڑا اور وہ قیمتی سرمایہ وہیں رہ گیا۔ جس کا انھیں بے حد افسوس تھا۔ انھوں نے کتابوں کی منتقلی کے لئے حکومت ہند کو لکھا بھی، مگر سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً ہمت ہار بیٹھتا۔ مگر یہ ڈاکٹر عبدالحق ہی کا جوش، عزم اور حوصلہ تھا۔ کہ انھوں نے پھر اس قدر محنت سے کتابیں جمع کرنی شروع کیں کہ دو سال کے عرصے میں ان کے پاس کئی ہزار نایاب کتابیں جمع ہوگئیں۔ آج تو ان کی تعداد کتنی ہی بڑھ گئی ہے۔ یہ ان کی اردو زبان و ادب سے والہانہ وابستگی کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کا خاص موضوع تحقیق و تنقید ہے۔ "تنقیدات عبدالحق" جسے دکن سے شائع کیا گیا۔ اسے پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، کہ اس سلسلہ میں ان کا رنگ عموماً حالؔی سے ملتا جلتا ہے۔ اسی لئے وہ حالی اسکول کے نمائندہ کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے حالؔی کے میدان کو پھیلانے آگے بڑھانے میں بڑا کام کیا۔ حالؔی کے وقت مغربی شعور کے اثرات اتنے نمایاں نہیں تھے اس لئے وہ ان سے زیادہ مستفید نہ ہو سکے۔ لیکن آج مغربی تہذیب و تمدن اور ادب کے اثرات اتنے واضح ہیں کہ ہر شخص ان کا اثر قبول کر رہا ہے۔ اسی لئے عبدالحق کی تحریروں میں مشرقی اثرات کے ساتھ ساتھ مغربی اثرات بھی ملتے ہیں یعنی ان کے پیش نظر مشرقی تنقید کے علاوہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد کے انگریزی ادب اور انگریزی تنقید کا مطالعہ بھی رہا ہے۔ "تنقیدات عبدالحق" ان کے ابتدائی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں بہت سی ایسی کتابوں پر تنقید کی گئی ہے جو آج بھی اردو ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً "ارباب نثر اردو" زبان اردو پر سرسری نظر "روح تنقید" "بانگ درا" "دیوان ولی" اور "نور اللغات" وغیرہ۔ ان مضامین کو پڑھ کر ان کے تحقیقی اور تنقیدی شعور کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ البتہ یہ شعور اتنا گہرا نہیں جتنا بعد کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

عبدالحق کے نام کے ساتھ انجمن ترقی اردو کا ذکر کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ یوں تو اس انجمن کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں پڑ چکی تھی۔ لیکن وہ برائے نام زندہ تھی۔ اس میں اصل جان اس وقت پڑی جب مولوی عبدالحق نے اس کا انتظام سنبھالا۔ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق اس انجمن کے سکریٹری بنا دیئے گئے۔ یہیں سے انجمن کی سرگرمی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جب باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام شروع ہوا۔ اردو رسم الخط اور اصلاح کے لئے باقاعدہ تجربہ کار حضرات کی سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان میں بھی عبدالحق کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی "تاریخ"، "معاشیات"، "اردو"، "سائنس" اور "قومی زبان" جیسے رسائل شائع ہوئے۔ تاریخ اور معاشیات کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے باقی اب بھی جاری ہیں۔ اسی انجمن کے زیر اہتمام اہم کام یہ ہوا کہ قدیم نظم و نثر کی کتابیں جو اس وقت تک نایاب تھیں۔ بڑی محنت و جانفشانی سے مقدمات کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کی گئیں۔

مولوی عبدالحق کی بیشتر تصنیفات "انجمن ترقی اردو" کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف کتابوں پر جو مقدمات سپرد قلم کئے — نوعیت اور مواد کے لحاظ سے اپنا

ایک منفرد درجہ رکھتے ہیں۔ اور جو "مقدمات عبدالحق" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ان کا تحقیقی اور تنقیدی رنگ نمایاں ہے۔ ان مقدمات کا بیشتر حصہ دکنی تصنیفات سے متعلق ہے۔ انھوں نے دکنی تصنیفات کی سنگلاخ زمینوں کو ہموار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت دنوں تک اردو نثر کی ابتدا کا سہرہ فورٹ ولیم کالج کے سر باندھا جاتا رہا۔ لیکن جب سے دکنی تصنیفات کا پتہ چلا، اردو کی عمر دو ڈھائی سو سال اور بڑھ گئی ہے۔ اور یہ عبدالحق ہی کے ان مقدمات کی بدولت ہے۔ ان کے اپنے زمانہ کا رجحان قصہ اور مواد کے ماخذ کا پتہ، لفظوں اور محاوروں کی نشو و نما ان مقدمات کے امتیازی پہلو ہیں۔

"خطبات عبدالحق" ان کی تقریروں اور خطبات کا مجموعہ ہے۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق زبان کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی زندگی کے دوسرے اہم مسائل کو۔ یہ زیادہ تر زبان و ادب کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اس قدر سادگی اور روانی ہے کہ پڑھنے میں کہیں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ان خطبات میں انھوں نے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اردو کو ترقی کے راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے اتنا بلند کر دینا چاہتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اسے پیش کیا جا سکے۔ انھوں نے صرف خواہش ہی ظاہر نہیں کی بلکہ اس کی ترقی کے لئے راستے کا تعین بھی کر دیا ہے — یہ خطبات ہماری تہذیب اور کلچر کے گہرے شعور کا پتہ دیتے ہیں جو ڈاکٹر عبدالحق کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کی شخصیت کی بنیادی باتیں ان خطبات سے ہمارے سامنے آگئی ہیں — وہ خود کو طالب علم سمجھتے ہیں اور طالب علم ہی سمجھتے رہیں گے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں کیا ہے۔ اس میں ان کے ارادہ اور عزم روشن دماغی متجسس طبیعت، خلوص اور سادگی کے پرتو نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی تحریر کا ایک نمایاں پہلو ان کی کردار نگاری اور شخصیت نگاری بھی ہے۔ "چند ہم عصر" میں اس کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اردو میں کردار نگاری کوئی نئی چیز نہیں ہے ہمارے ادب میں اس کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ کردار فرضی اور عام لوگوں کے ہوتے ہیں۔ حقیقی اور ادبی شخصیتوں کے کردار بہت ہی کم پیش کئے گئے ہیں۔ البتہ فرحت اللہ بیگ کا کردار "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" ادبی حیثیت کے لحاظ سے کردار نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسی قسم کے کردار عبدالحق نے بھی "چند ہم عصر" میں

پیش کئے ہیں۔ البتہ ان میں ایک کردار ایسا ہے جس کا ادب سے تعلق نہیں ہے لیکن اس کی بابت پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ صلاحیتیں صرف بڑے آدمیوں ہی میں نہیں ہوتی بلکہ عام لوگوں میں بھی۔ اور یہ کردار ہے نام دیو مالی کا۔ نام دیو کی شخصیت کے مختلف پہلو اور اس کے کردار کی جزئیات اور خوبیاں اس طرح بیان کی ہیں کہ اس کے پڑھنے سے جو اثر و تاثر ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ بہت دیر تک باقی رہتا ہے۔

"کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھالولا صاف کر رہا ہے۔ تھالولا صاف کرکے حوض سے پانی لایا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رخ سے مڑ مڑ کر پودے کو دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کام اسی وقت ہوتا ہے۔ جب اس میں لذت آنے لگے"

اسی کے متعلق ایک جگہ یوں لکھا ہے" وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔" ادبی شخصیتوں میں جن لوگوں کے کردار اور شخصیت کے مرقعے پیش کئے ہیں ان میں محسن الملک' مولوی عزیز مرزا' وحیدالدین سلیم، سرسید، حالی، حسرت موہانی اقبال اور مولانا محمد علی کے کردار کردار نگاری کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ مولانا محمد علی کی شخصیت کا مختصر سا خاکہ یوں پیش کیا ہے:"

مولانا محمد علی مرحوم " عجیب و غریب " شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف متضاد اور غیر معمول اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے۔

ان کرداروں کے ساتھ ساتھ خود عبدالحق کی شخصیت اور کردار کے کئی پہلو ہمارے سامنے بھی آگئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ خود بھی ان سب کے ساتھ تقریباً شریک رہے ہیں۔

دیوان ولی حیدر ابراہیم سایانی مرتب کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ ولی کے دیوان کے جو چند نسخے دستیاب ہیں ان میں کتابت کی غلطیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو بہت بڑا ادبی نقص ہیں۔ قدیم کتابت ہونے کی وجہ سے صحت کے متعلق خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے دیوان ولی کا صحیح نسخہ مرتب کرنا

چاہتے تھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ پونا کے ایک پروفیسر حیدر ابراہیم سایانی اس کا نسخہ تیار کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن دیوانِ ولی کے اس نسخہ کے شائع ہونے کے بعد مولوی عبدالحق کو معلوم ہوا کہ اس میں ابھی بہت سی اصلاح باقی ہے۔ اس خیال سے انھوں نے دیوان ولی کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ جس میں نہ صرف ولی سے متعلق مشتبہ باتوں کی تحقیق شامل ہے بلکہ اس وقت کی زبان، قدیم الفاظ کی فرہنگ، ولی کا اثر دوسرے شعرا پر اردو شاعری بالخصوص اردو غزل پر جیسے مفید پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔

اردو نثر کی ابتدا کے وقت سے اردو میں قواعد پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ بیرونی حضرات کی تھیں۔ ان میں تفصیل اور تحقیق نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر گلکرائسٹ کی قواعد اردو اچھی کتاب اور کسی حد تک کامیاب کوشش ہے۔ اردو والوں میں سب سے پہلے قواعد پر کتاب انشا کی دریائے لطافت ملتی ہے۔ جو قواعد کی کتاب تو نہیں کہی جاسکتی البتہ قواعد سے متعلق بہت سی مفید باتیں اس میں آگئی ہیں اردو میں سب سے پہلی مستند قواعد کی کتاب مولوی فتح محمد خاں جالندھری کی مصباح القواعد ہے۔ جس کو عام طور پر تمام اہل زبان اور اہل قلم نے سراہا ہے۔ مولوی فتح محمد خاں نے فارسی قواعد کی تقلید میں اردو قواعد کا سارا ڈھانچہ عربی فارسی قواعد کا بنایا ہے۔ مثلاً لفظ کی تقسیم اسم، فعل اور حرف کی ہے۔ مولوی عبدالحق کی قواعد اردو" میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انھوں نے فارسی قواعد کی اس اندھی تقلید کو چھوڑ کر انگریزی اور فارسی اور فارسی کے اصولوں کے امتزاج سے اردو قواعد میں بعض نئی باتیں شامل کی ہیں۔ مثلاً لفظ کی تقسیم اسم فعل اور حرف کے بجائے پانچ کی ہیں۔ اسم صفت ضمیر، فعل اور حرف۔ اس کے علاوہ تذکیر و تانیث، واحد جمع خطابقتِ فعل اور مطابقت صفت جیسی ازبس مفید اور ضروری باتوں پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس کے آخر میں یعنی اوقات ورمحرز بھی دے دیئے ہیں جن سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ گئی۔

قواعد کے علاوہ انگریزی اردو ڈکشنری بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس قسم کی لغت اس سے پہلے بھی تھی لیکن اتنی معقول اور کامل نہیں تھی۔

ڈاکٹر عبدالحق نے اردو لغت کا کام بھی شروع کیا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک مرتب نہ ہوسکی۔ سال گزشتہ یعنی ۱۹۵۹ء سے اردو کی ایک بہت بڑی ڈکشنری جو ترقی اردو بورڈ کی نگرانی میں مرتب ہونی شروع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اس کے چیف ایڈیٹر ہیں

یہ لغت بڑے وسیع پیمانہ پر بنائی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ اردو لغات میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی مکمل اور جامع لغت ہوگی۔

" اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ اور اردو زبان میں علمی اصطلاحات کی تاریخ (انگریزی)" اگرچہ ضخیم کتابوں کی صورت میں نہیں ہیں۔ لیکن اپنی افادیت میں دوسری کتابوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ " اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں صوفی اور اس کی حیثیت، ہندوستان میں ان کی آمد اور ہندوستان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانے کی ضرورت اور اس سلسلہ میں ان کے ادبی کارنامے پیش کئے گئے ہیں تقریباً انتیس صوفیائے کرام کا حال اور کلام بیان کیا۔

ڈاکٹر عبدالحق نے تحقیق کے سلسلہ میں جس محنت اور کاوش سے ماخذ کا پتہ لگایا ہوگا اور مواد جمع کیا ہوگا اس کا اندازہ آج ہمیں نہیں ہو سکتا۔ آج تحقیقی کاموں کے لئے بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن جس وقت عبدالحق نے تحقیقی کام شروع کیا ان کے سامنے کوئی نمونہ مکمل صورت میں نہ تھا۔ جس سے وہ استفادہ کر سکتے۔ بڑی محنت اور تلاش کے بعد پرانی کتابوں کے نسخے مہیا کیے بہت سے الفاظ اور تحریریں ایسی تھیں جن کا پڑھنا کچھ کم مشکل نہ تھا۔

انھوں نے صرف ان کتابوں کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ ان پر تبصرہ لکھ کر اس وقت کے تمدن، تہذیب، لوگوں کے ذہنی اور مذہبی رجحانات، دربار کی زندگی، بادشاہ اور امرا کا طرز بود و باش مجلسی اور معاشرتی زندگی کے کئی پہلو ہمارے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ یہ تمام باتیں ان کی دو مشہور کتابوں سب رس اور قطب مشتری کے مقدمات میں ملتی ہیں۔ اگر عبدالحق جانفشانی سے ان کتابوں کو ترتیب دے کر منظر عام پر نہ لائے تو ہماری اردو نثر کا ایک قیمتی سرمایہ تلف ہو جاتا اور اس تاریخی دور کے یہ دو بڑے شاہکار پس منظر ہی میں رہتے۔ اس طرح انھوں نے قدیم تہذیب اور تمدن کے اثرات کو محفوظ کر لیا ہے۔ جو نہ صرف تاریخ بلکہ اردو ادب پر بھی بہت ہی بڑا احسان ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق کی تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریریں متین، بچی تلی سے پاک ہوتی ہے۔ اور ان میں ایسا ضبط اور اعتدال پایا جاتا ہے جو بڑی مشکل سے کسی کو نصیب ہوتا ہے

تحقیقی، اور تنقیدی کاموں کے لئے دماغ میں سنجیدگی و متانت، طبیعت میں ٹھہراؤ اور مزاج میں عدل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں وہ اچھے ناقد ثابت نہیں

ہوتے۔ وہ مبالغہ سے قصیدہ بھی لکھ سکتے ہیں اور ہجو بھی اور اصل بات کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اکثر اچھے لکھنے والے جذبات سے مغلوب ہوکر بھٹک جاتے ہیں۔ اور غیر متعلق باتیں کہنے لگتے ہیں۔ لیکن عبدالحق کی تحریر سے کہیں بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ مصنف اپنے مطلب سے دور جا رہا ہے یا جانبداری سے کام لے رہا ہے۔

نظم اور نثر دونوں پر عبدالحق کو عبور حاصل ہے۔ دونوں پر ان کی نظر بڑی گہری وسیع اور جامع ہے خصوصاً دو یکساں طرز کی نظموں کا مقابلہ کرنے میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ دونوں کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں کہ ہر ایک کی خوبیاں اور برائیاں واضح ہوجاتی ہیں۔ اور ان کی کہی ہوئی باتیں حرف آخر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ان کی تحریر کی یہ خوبی ہر تصنیف میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا منطقی انداز بیان ہے۔ دراصل وہ ایک فیصلہ کن بات مفید اور ٹھوس دلائل سے پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں" لغت لکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی علاوہ فارسی عربی کے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا سے بھی بخوبی واقف ہو کیونکہ اردو زبان میں اکثر اسما و افعال اور تراکیب زیادہ سنسکرت کی ہیں۔ اور جب تک اس زبان سے پوری واقفیت نہ ہوگی۔ اس کی تحقیق کبھی مستند نہیں ہوسکتی۔ اور اس حقیقت سے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا

عبدالحق کی تحریریں زبان کی صحت، موضوع اور مضمون کی جدت، اسلوب کی صفائی شوخی و ظرافت سب کچھ ہے۔ اور اکثر بے عیب ہے۔ ان کی تحریر میں جو شگفتگی اور ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اس سے ادبی مسرت اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس قسم کی ایک دو تحریریں ملاحظہ فرمائیں۔

میرن صاحب باتیں مزہ لے لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ جلدی ان کے مزاج میں نہ تھی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ شاید غدر میں بھاگتے وقت اس کی ضرورت پڑی ہو تو پڑی ہو۔ ورنہ یوں عام طور پر زندگی کے کاروبار میں انھیں اس "شیطانی حرکت" یعنی تعجیل سے کبھی واسطہ نہیں۔

پڑا۔" مسعود کی بسم اللہ پر جو مولوی صاحب تشریف لائے ان کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔

" بسم اللہ پڑھانے کے لئے جھنجھانے سے ایک دقیانوسی مولوی دہیر فرتوت، بلائے گئے تھے"

عبدالحق کو صرف اردو زبان اور ادب ہی عزیز نہیں بلکہ اپنی روایات تہذیب اور تمدن بھی۔ قدیم چیزوں میں انھیں اپنے شاندار ماضی کے نشانات ملتے ہیں۔" کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ کیا کھنڈر کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ کیا ہم گوارا کرسکتے ہیں کہ کسی زمانہ میں وہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں۔ ہماری تہذیب اور شائستگی کا دنیا سے نسبتاً منسیا ہو جائیں؟ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہوجانے اور اس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا۔ جتنا ایک کھنڈر کے مٹ جانے کا"

ڈاکٹر عبدالحق کی اردو کے ساتھ ان خدمات کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اردو زبان ادب کی عمر کئی سو سال بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کہ مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات نے ہماری ذہنیت کو غلامانہ بنا دیا تھا۔ زندگی کا ہر شعبہ مغربی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی زبان کو بھی انگریزی کے مقابلہ میں پست اور حقیر سمجھتے تھے۔ اس نازک حالت سے انھوں نے نہ صرف ہماری زبان کو بچایا بلکہ اسے ترقی کا راستہ بھی بتا دیا۔

وہ اردو زبان کو نہ صرف ادب کے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "کسی قوم کو اگر علم سے محروم رکھنا مقصود ہو تو سہل طریقہ یہ ہے کہ اسے غیر زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے"۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان کے ملک میں بھی یہی کچھ ہوا۔ "زبان کے ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن ذہنی اور روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔" یہی خیالات ان کی تحریر اور تقریر میں ملتے ہیں۔ جس کے پیش نظر تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ عبدالحق نہ صرف ایک بلند انشا پرداز ایک اچھے ناقد مقرر اور خطیب ہیں بلکہ اپنی قوم اور زبان کے مصلح اور مجتہد بھی ہیں۔

بقیہ:- روشنی کا مینار

غرض مولوی صاحب کا اسلوب بڑا باغ دبہار ہے ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں گھر لیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ مولوی صاحب کا اسلوب اُردو کے بنیادی اسالیب میں سے ہے میں اس پر صرف اس قدر اضافہ چاہوں گی کہ صرف اسی اسلوب سے اردو زبان کی صلاحیتوں اور وسعتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آنسہ نغمہ کیفی

بابائے اُردو

بابائے اردو کے متعلق اظہار خیال سے پیشتر اردو ہی کی ایک کہاوت "چھوٹا منھ اور بڑی بات" بار بار میرا ہاتھ روکتی ہے۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ جس بزرگ شخصیت پر سب کچھ لکھ کر بھی اہلِ قلم اور صاحبانِ رائے خود کو عاجز اور اپنے دامانِ قرطاس کو خالی خالی سمجھیں وہاں نومشقوں کو دم مارنے کی گنجائش کہاں۔ مگر عقیدت کا اظہار نہ خیال کی بلندیاں دیکھے نہ شگفتگیٔ تحریر۔ وہ ان تمام حد بندیوں سے دور اور بہت دور ہے۔ دل کی آواز تکلّف و تصنّع کی پابند نہیں۔

بابائے اُردو کے خطاب کو دہرائیے۔ از خود ذہن میں ایک پُر وجاہت تصویر ابھرنے لگے گی۔ سفید سفید چاندی کے تار جیسے بال، بھرا بھرا نورانی چہرہ، چہرے پر ایک متین سی مسکراہٹ۔ اختلافات و موانعات کو دعوتِ مقابلہ دیتی ہوئی آنکھیں ذہانت اور شفقتوں کا اتھاہ سمندر، چوڑی چوڑی پیشانی، بلند عزائم کی نشانی، لب و لہجہ میں ایک خاص

مٹھاس عجیب سی گھلاوٹ، وضع میں ایک مخصوص رکھ رکھاؤ، طبیعت
میں ایک خاص درویشانہ کسر نفسی کا رچاؤ۔ مگر عزّتِ نفس کے ساتھ۔
اب اس تصویر کو اگر آپ چاہیں تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق یا "بابائے اردو"
کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پُروقار و پُرعظمت شخصیت کے
سامنے الفاظ کی تمام تر وسعتیں سمٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مولوی صاحب
کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔ میں نے
انھیں صرف ایک ہی مرتبہ اپنے کالج میں دیکھا اور اسی وقت سے اپنے
آپ میں ایک انجانا سا غرور پاتی ہوں۔ واقعیؔ اس قوم کی لڑکیاں خود
کو خوش نصیب کیوں نہ سمجھیں جس میں بابائے اردو جیسے بزرگ موجود ہوں
جو اسّی سال کی عمر میں تقریباً پینتالیس ۴۵ سال تک مسلسل جدّوجہد پیہم
سعی و عمل کے بعد بھی جوانوں جیسی ہمّت اور ارادوں کے حامل ہوں، جن
کے بلند عزائم اس سن وسال میں بھی بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکّر لینے
کے آرزومند ہوں، جو اپنے خلوص وسادگی، حق گوئی و بیباکی اور کردار وگفتار
سے نہ صرف یہ کہ اسلاف کا آئینہ ہوں بلکہ آئندہ نسلوں کے حق میں
پیغام مجسّم، سرتاپا درس اور سرمایۂ افتخار و سربلندی ہوں۔

دیکھنے والوں نے بابائے اردو کو ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھا، ہر پہلو سے پرکھا اور ان کی قابلِ رشک خصوصیات
کا اعتراف کیا۔ ہم انسانوں کی زندگی میں خلوص ایک ایسی خوبی ہے جس کا فی زمانہ فقدان ہے مگر بابائے اردو

اپنے عمل و زندگی میں ہمہ تن خلوص ہیں۔ دُور کیوں جایئے اردو کی مثال ہی لے لیجئے۔ جس دن سے انھوں نے اس یتیم ولیسیر کو اپنے سینے سے لگایا ہے آج تک اسی طرح جان سے زیادہ عزیز سمجھے ہوئے ہیں اور نواب مہدی یار جنگ کے قول کے مطابق " انھوں نے فنا فی الاردو ہو کر بقا بالاردو کا درجہ حاصل کر لیا ہے "۔ مولوی صاحب کے تصوّر کے ساتھ اردو کا خیال یا اردو کے ذکر کے ساتھ مولوی صاحب کا تصوّر کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک دوسرے کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا ــــ اردو کی ترویج و بقا کے لئے انھوں نے کیا کچھ کیا یہ بات بڑی تفصیل طلب ہے مختصراً انھیں کے الفاظ میں کہ " انسان کا نام اس کے کام سے ہے "

> بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کاموں نے جو انھوں نے اُردو کے لیے انجام دیئے اگو انھیں زندۂ جاوید بنایا ہے تو خود ان کی انتھک محنتوں اور بے مثال جاں کاہیوں نے اردو کو حیاتِ جاوداں بخش دی۔

معرکۂ تقسیم ہند کے ماقبل و مابعد اردو پر اکثر بے پناہ یورشیں ہوئیں مگر یہ انھیں کے پائے استقامت تھے کہ کبھی ذرا جنبش نہ ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں بڑی بڑی ٹکریں لیں بڑے بڑے ایثار کئے۔ راتوں کی نیندیں اور دنوں کا چین اردو زبان کی بقا پر تصدّق کر دیا۔ یہ وہ بات ہے جو طبیعت کے خلوص کے بغیر ناممکن ہے

مولوی صاحب کے کردار کی ایک دوسری خصوصیت ان کی " لگن " ہے۔ وہ کام کے متوالے اور اپنی دُھن کے پکّے ہیں۔ ایک دفعہ جو بات دل پہ ٹھان لی بس ٹھان لی۔ یہی حال اکثر اکابرِ عالم کا بھی رہا ہے۔ قائداعظم میں بھی یہ خصوصیّت اسی طرح پائی جاتی تھی جس طرح کہ آج مولوی صاحب میں۔ کون نہیں جانتا کہ جب قائداعظم کو یہ یقین ہو گیا کہ حصولِ پاکستان کے بغیر مسلمانانِ ہند کی زندگی ناممکن ہے تو انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی ایک محاذ پر لگا دیں۔ انھوں نے نہ ہندو اکثریت کی پروا کی نہ انگریزی آمریّت کی اور آخر دنیا بھر کو یہ دکھا دیا کہ بلند ارادوں کے سامنے مخالفت کا کوئی پہاڑ نہیں ٹھہر سکتا۔ عزم اگر اپنی جگہ عزم ہو تو بڑھتے ہوئے طوفانوں کے رُخ پھیرے جا سکتے ہیں۔ مولوی صاحب نے بھی اردو کی بقا کی خاطر اسی عزم و اعتماد کے ساتھ جنگ کی ہے۔ وہ اپنے حصول کے لئے تَن مَن دھَن کی بازی لگا دیتے ہیں ان کی اس خصوصیت کی تائید میں کرشن چندر کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے " جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لیے مسٹر جناح نے پاکستان کے لئے کیا وہ کام اُردو کے لیے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا "۔ بات واقعیٔ بالکل سچ ہے مولوی صاحب کی ذات گرامی اسی حد تک پُر عزم و ہمّت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عالمی کارنامے کچھ یونہی وجود میں نہیں آگئے۔ ان کے حصول میں عالی ہمّت لوگوں کو جو کچھ سختیاں جھیلنی پڑی ہوں گی کچھ ان کا دل

ہی جانتا ہوگا۔ مخالفین کی بدولت کیسی کیسی رکاوٹوں سے انھیں واسطہ پڑا ہوگا یہ صرف ان کی قوتِ عمل ہی بتا سکتی ہے۔ مولوی صاحب کی زندگی بھی ایسے بے شمار واقعات سے پُر ہے مگر وہ مخالفین سے کبھی ہراساں نہیں ہوتے۔ وہ ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کو اپنے سمندِ شوق کے حق میں تازیانہ سمجھتے رہے بلکہ وہ تو مخالف کے وجود کو انسان کے لئے لازم جانتے ہیں اور فرماتے ہیں" وہ انسان ہی کیا جس کا کوئی مخالف نہ ہو" گویا ان کے نزدیک مخالف کا ہونا انسانیت کے لئے شرط ہے یا بہ الفاظ دیگر انسان وہی ہے جس کا کوئی مخالف ضرور ہو۔ اس چھوٹے سے جملے میں جس بلند آہنگی سے ایک ناگوار حقیقت کو گوارا بنا دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

یہ بات مدّتوں سے مشہور ہے کہ اگر کسی مُصنّف کی کتابِ زندگی پڑھنی ہے تو اس کی تصنیفات دیکھو۔ علیٰ ہٰذا بابائے اُردو کو بھی مشہور تصنیف "چند ہم عصر" میں بہ آسانی چلتے پھرتے دیکھا جا سکتا ہے اس کتاب میں اکثر مقام پر ان کی شخصیت بےنقاب ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی بڑائی کا معیار خلوص اور ذوق عمل کے علاوہ اہم ترین "انسان دوستی" ہے۔ اور یہی جذبہ "چند ہم عصر" کی اساسی خوبی ہے۔ اس کتاب میں بابائے اردو نے جہاں سرسیّد مرحوم، علامہ اقبال، مولانا حالی، سرراس مسعود، نواب محسن الملک اور مولانا محمد علی جوہر جیسی بزرگ و عظیم ہستیوں کے بارے میں اپنی بےباک رائے کا اظہار کیا ہے وہیں ان کی نگاہِ مردم شناس "نام دیو مالی" اور "نورخاں" جیسے لوگوں پر بھی پڑتی ہے اور وہ ان سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں" قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں کاش ہم میں بھی بہت سے نورخاں ہوتے"۔ "نام دیومالی" اور "نورخاں" نایاب نہیں ہیں مگر ان کو اس نظر سے دیکھنے والے البتہ کم یاب ہیں۔ ایسے بےجان کرداروں میں جان ڈالنا ایک انسان دوست ہی کا کام ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں میں انسانیت کا نور ہے اور جس کے دل میں آدمیّت کی تڑپ ہے۔

یہاں تک تو بابائے اردو کی شخصیت سے متعلق مجملاً تذکرہ تھا۔ آیئے اب ذرا سرسری طور پر اُن کے اُن کاموں کا بھی جائزہ لیتے چلیں جن کی وجہ سے وہ "بابائے اُردو" کہلائے جاتے ہیں اور جس کے لیے ادیبِ شہیر مولانا عبدالماجد دریا بادی کا قول ہے کہ

اردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں اچھی خاصی طویل ہے۔ سیکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسن اعظم کا لقب دیا جا سکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اردو عبدالحق ہی ہو سکتی ہے۔"

مولانا عبدالماجد نے بابائے اردو کی ذات کو بلا اختلاف اردو کا محسنِ اعظم بتایا ہے جو ان کی خدماتِ اُردو کی روشنی میں جن کی مدّت تقریباً نصف صدی ہے ایک منصفانہ فیصلہ ہے۔

بابائے اُردو نے اُردو کی نوک پلک درست کرنے میں واقعیؔ کیا کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے اردو ادب کے قدیم دکنی شعرا کے کلام کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ ان پر تحقیقی وتنقیدی مقدّمات لکھے جو خود اپنی جگہ ادب عالیہ کے شاہ کار ہیں۔ شعرائے اردو کے تذکرے جدید اصولِ ترتیب وتدوین کے مطابق شائع کر کے دل دادگانِ ادب کے ہاتھوں تک پہونچائے۔ بعض شعرا پر تنقیدی مقالات لکھے۔ تنقید کے وہ امام ہیں۔ ان سے پیشتر تنقید تنقید نہیں جذباتی کج بحثی ہوتی تھی جس میں کوئی اصول مدِّ نظر نہیں ہوتا تھا۔ بابائے اُردو نے تنقید کے انداز کو ایک نیا قالب عطا کیا اور جذبات پر عقل کو ترجیح دی۔ شعر کو تنقید کی کسوٹی پر کسنے سے پہلے شاعر کے ماحول اور زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالنا سکھایا۔ یہ وہ ڈھنگ تھا جو ان سے پہلے کہیں نہیں

پایا جاتا ــ یہی حال ان کی تحقیق کا ہے۔ اُردو ادب کے بہت سے بیش بہا خزانے پردۂ خفا میں تھے جن کی حقیقت قیاس آرائی سے زیادہ کچھ نہ تھی مولوی صاحب نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے اور اپنے بے پایاں شوق و تجسّس کے سہارے ان کو ڈھونڈ نکالا۔ ان قدیم مخطوطات کی تلاش کرکے اُردو ادب کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔ دنیا اب تک اُردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی کو سمجھتی تھی مگر ان کی محنتِ شاقہ نے اوّلیت کا سہرا قلی قطب شاہ کے سر باندھ دیا اور اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ آج تک کہیں سے کوئی تردید کی آواز بلند نہیں ہوئی۔

انھیں اُردو سے جو شغف ہے وہ عشق کی حد تک ہے وہ سوتے جاگتے بس اسی کے خواب دیکھتے ہیں اور اس زبان کو بہ ہر رنگ ایک محبوب و مقبول زبان دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ ساری خوبیاں تمام محاسن اس میں بھر دینا چاہتے ہیں جو دُنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی خصوصیات ہیں۔ اس ضمن میں جو معرکے کا کام انھوں نے کیا وہ اُردو زبان کی معیاری قواعد ہے۔ جسے انھوں نے بڑی کاوش سے لکھا۔ انھوں نے اُردو تحریر میں بھی بہت سی مناسب اصلاحیں کیں۔

ہماری زبان میں دوسری زبانوں سے منتقل شدہ ادبی سرمایہ جسے معیاری کہا جا سکے تقریباً مفقود ہے اس کا سبب خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ کمی زبردست کمی ہے۔ یہاں بالعموم جو ترجمے پائے جاتے ہیں وہ زبان و بیان کی اُن خوبیوں سے یکسر خالی ہوتے ہیں جو خود اس زبان میں ہوتی ہیں۔ ترجمہ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہوتے کہ مترجم لغات سے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر مترادفات استعمال کرتا چلا جائے خواہ قاری اس سے محظوظ ہو یا نہ ہو۔ مولوی صاحب نے جو اُردو کے دامن کو مختلف النّوع جواہرات سے مالا مال دیکھنا چاہتے ہیں اس طرف توجہ کی اور اس طرح کی کہ ترجمے کے اصول وضع

کر ڈالے۔ یہ اصول سامنے رکھیے اور با محاورہ سلیس زبان میں ترجمہ کرتے چلے جائیے جس کے بعد کتاب ترجمہ نہیں کہلائے گی بلکہ طبع زاد کہلانے کی متحق ہوجائے گی دراصل ترجمے کی خوبی بھی یہی ہے۔ نقل وہی اچھی ہے جو اصل کے عین مطابق ہو۔

بابائے اُردو اپنی محبوب اُردو کی ایک تاریخی، جامع نیز مکمّل لغت بھی ترتیب فرما رہے ہیں۔ جس پر کافی کام ہو چکا اور جو مستقبل قریب میں بہت سی لسانی مشکلات کا حل بن سکے گی۔ اُردو کی ان چند خدمات کے علاوہ بابائے اُردو کا ناقابلِ فراموش کارنامہ حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ اور کراچی میں اُردو کالج کا قیام ہے جن میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تجربہ کسی ایسی زبان میں جو خود نو عمر ہو جس کا ذخیرۂ الفاظ ناکافی ہو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس بھاری کام کے سلسلے میں بابائے اردو نے حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم فرمایا اور نامور ادیبوں کی خدمات حاصل کیں۔ یہ جذبہ مولوی صاحب میں آج بھی زندہ و پایندہ ہے وہ آج بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان ہو اس لئے رائٹرس کنونشن میں صدارت فرماتے ہوئے کتنے پُرزور الفاظ میں انھوں نے فرمایا۔ "آج کل صدیوں کی منزلیں برسوں بلکہ مہینوں میں طے ہونے لگی ہیں۔ جو نظام حکومت تین مہینے میں انقلابی قسم کی زرعی اصلاحات نافذ کرسکتا ہے وہ ایک مہینے میں اپنی زبانوں کو ان کا چھنا ہوا مقام دلا سکتا ہے۔ انگریزی زبان ایک علمی زبان کے طور پر باقی رہنی چاہیئے اور رہے گی لیکن ہماری درس گاہوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے فوراً ختم ہونی چاہیئے اور آج ہی ابھی غروبِ آفتاب سے قبل ختم ہونی چاہیئے۔ اگر یہ مشکل ہے تو زرعی اصلاحات بھی مشکل تھیں" ان الفاظ پر غور کیجیئے جن میں جہاں موجودہ دورِ حکومت کی قوتِ عمل پر اعتماد کا اظہار ہے وہیں کتنے ملائم اور

مناسب الفاظ میں اسے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے جو مولوی صاحب کی زندگی کا نصب العین ہے۔

> مولوی صاحب حالاں کہ نہایت سلیس و سادہ اردو لکھتے ہیں مگر اس میں جو خاص انداز پایا جاتا ہے وہ انھیں انشا پردازی کے ایک ایسے مقام پر پہونچا دیتا ہے جہاں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ان سے پہلے اس قسم کا اندازِ تحریر کسی حد تک حالؔی کے یہاں ہوتا ہے مگر جو روانی اور زور ان کے اسلوبِ بیان میں ہے وہ حالؔی کے یہاں ناپید ہے۔ ان کی زبان ایسی شستہ و رفتہ ہوتی ہے جو سمجھنے میں آسان اور لکھنے میں دشوار ہوتی ہے۔ یہی وہ اسلوب ہے جو اپنا حلقۂ اثر براہِ راست عوام کے دلوں کی گہرائیوں تک رکھتا ہے۔

زبان کے بارے میں ان کا تصوّر ہے کہ۔

> "زبان صرف بول چال ہی کے لئے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دور دور تک ہے اور اس کے شعبے اس قدر وسیع ہیں جس قدر کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جزو ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدّن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے اس لیے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہوسکتی ہے جو تہذیب و تمدّن کی ممد ہو اور ان تمام افعال و اعمال کے انجام دینے میں کار آمد ہو سکے جن کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے اگر وہ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتی اور حالاتِ زمانہ کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی تو ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعوا نہیں کرسکتی۔"

بابائے اردو تحریر و تقریر کے اعتبار سے منفرد ہیں ادیب ان کے اسلوب کو چراغِ راہ سمجھتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی "اردو لکھنے کا جو مفید، ممتاز اور مشکل اسلوب مولوی صاحب کا ھے اُسے اُردو کا بنیادی اسٹائل کہہ سکتے ہیں۔ اس اسٹائل نے اردو کو دنیا کی مشہور اور اھم زبانوں کی صف میں کھڑا ھونے کے قابل بنا دیا ھے" واقعہ بھی یہی ہے خود بابائے اردو اس طرف سے اس قدر پُر اُمید ہیں کہ انھوں نے دیگر ممالک جیسے ایران، افغانستان، ترکی، ملایا، عرب، امریکہ، روس اور اٹلی وغیرہ کی یونی ورسٹیوں اور علمی اداروں سے خط وکتابت

کرکے انھیں اُردو کی تعلیم کا انتظام کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں ساری دُنیا میں اُردو کا بول بالا ہو جائے، گھر گھر اُردو کا ڈنکا بجنے لگے۔ اب اُردو کی جانب سے وہ اس قدر مطمئن ہیں کہ ادیبوں سے تخاطب فرماتے ہیں "ہماری زبان اب اس نوبت پر ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے اظہار پر قادر ہے۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ہر طرف راہیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ اس بے بہا سرمایہ سے فایدہ اٹھا کر ادب کے نئے کوچوں میں قدم رکھ سکتے ہیں۔"

اردو کی یہ تمام گیرائی، ساری دلربائی انھیں کمزور اور نحیف ہاتھوں کی مرہونِ منّت ہے جو اس کے بناؤ سنگھار میں آج تک مصروف ہیں۔ یہ باباے اردو ہی کی ذات ہے جو اس عمر پر پہونچنے کے باوجود اُردو کی خدمت میں جوانوں سے زیادہ حوصلے اور جُرأت کا اظہار کرتی ہے جو اس کے بُرے وقت پر جوانوں کی طرح سینہ سپر ہو کر سامنے آتی ہے۔ خدا ان کی عمر میں ترقی عطا فرمائے اور اُردو کے سر پر ان کا سایہ تا قیامِ قیامت قائم رکھے۔ آمین۔

ترا ثبات کہ پیری میں بھی جواں ہے تو
وگرنہ وقت ٹھہرتا نہیں کسی کے لئے

سہ ماہی رسالہ

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جو اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالوں اور معیاری تبصروں کی بنا پر پاکستان اور غیر ممالک میں بھی خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چندہ سالانہ دس روپے ششماہی پانچ روپے محصول ڈاک علاوہ۔ فی پرچہ دو روپے آٹھ آنے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان ——— اردو روڈ کراچی

فن اور شخصیت

ممتاز حسین
ڈاکٹر ابوسعید نورالدین
رئیس خاور
ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی
پروفیسر خان رشید
سجاد مرزا
تابش دہلوی
عباس احمد عباسی
ضیاء الدین احمد برنی
منظر حیدر آبادی
منظر ایوبی

وحید چغتائی
شریف رزمی
محمد ایوب اولیا
نسیم ریاض
ظفر نیازی
تبسم نظامی
نیرنگ نیازی
مسعود جعفری
محمد طہٰ خاں
متین الرحمٰن مرتضٰے
معین الرحمٰن

آنسہ حفیظ خاتون
شمسہ کلثوم
فردوس خاتون
عوشیہ زریں لکھنوی
افروز شوکت
کنیز فاطمہ اشرف
عذرا کیفی
خان اقبال یوسفی
عزیز الرحمٰن
محمد احمد صدیقی (علیگ)
ڈاکٹر ریاض الحسن

ممتاز حسین

مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق جن کی اسّی دس نوئوین سال گرہ اس سال منائی جا رہی ہے گزشتہ پچاس سال سے انجمن ترقی
ردو سے وابستہ رہے ہیں، اور ان کی ادبی زندگی کی عمر تو اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔

> ایسے لوگ ہماری ادبی تاریخ میں کم گزرے ہیں جنھوں نے اتنی یک سوئی، محنت
> اور لگن سے اردو زبان اور ادب کی خدمت کی ہو۔ اور اپنی عمر کی اس منزل میں
> پہونچ کر بھی اتنے ہی مستعد، جوشیلے اور انقلابی رہے ہوں جتنے کہ مولوی صاحب
> آج بھی نظر آتے ہیں۔

ایک ایسے شخص کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ پھر یہ کہ مولوی صاحب صرف ایک شخصیت یا کوئی ایک ادارہ ہی نہیں
لکہ اپنی ذات سے پوری ایک تحریک ہیں، وہ تحریک اردو زبان کو ہندو پاک کے دور دراز حصّوں میں مقبول بنانے، اردو زبان کی
صلاحیت کو بروئے کار لانے، اور اس کے قدیم اور جدید سرمائے سے لوگوں کو آشنا کرانے اور ہندو پاک کی تاریخ میں اس کی تہذیبی
ور اتحادی قوّت کو اجاگر کرنے کی تھی۔ مولوی صاحب کی حیثیت اس تحریک میں انجمن کے ایک عہدے دار کی نہیں رہی ہے، بلکہ
وہ اس تحریک کے رہنما اور ہادی رہے ہیں۔ اس تحریک کی تاریخ اور اس کا سیاسی پس منظر کیا تھا، میں اس سے یہاں بحث کرنا نہیں
چاہتا، میرے سامنے تو اس وقت الماری بھر انجمن کی وہ مطبوعات اور مولوی صاحب کی خود اپنی وہ تالیفات ہیں جو اس تحریک کا عطیہ
ہیں، اور اگر کسی کو ان کی جوت نظر نہ آتی ہو، تو پھر تو یہ اس کی اپنی فطرت کا قصور ہے۔ ان دنوں جب کہ تحقیقات کا میدان بہت کچھ

مولوی عبدالحق ہی کی کوششوں سے وسیع تر ہوگیا ہے اور اس کے زیادہ سے زیادہ وسائل اور مآخذ مہیا ہو گئے ہیں۔ کسی بھی شخص کا اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ مولوی عبدالحق کوئی بڑے محقق نہیں ہیں۔ ایک بہت ہی آسان بات ہے، لیکن اس سے ان کے کارناموں کی اہمیت گھٹتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے کیوں کہ اُن کی حیثیت ایک محقق سے زیادہ، ایک مبلغ ایک ریفارمر، اور ایک مجاہد کی رہی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو کہ دقیانوسی خیالات کے ہیں اور تاریخ میں صرف سن نوٹ کرتے رہتے ہیں وہ مولوی صاحب کے کارناموں کو بھلا اس نظر سے کیوں دیکھیں۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے تحقیق کے میدان میں کہاں کہاں ٹھوکریں کھائی ہیں، اور یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ماضی کی دریافت بھی، ہر دریافت کی طرح اضافی ہوا کرتی ہے۔ یہ حضرات جو ان دنوں تاریخی کتب اور تذکروں کی چھان بین میں اپنا سر کھپا رہے ہیں، میں ان کی اس کوشش کی تحقیر نہیں چاہتا کہ یہ ایک نہایت ہی ضروری اور اہم کام ہے۔ لیکن میں ان کے اس ادعا کو تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ ان کی یہ عرق ریزی، کسی ایسے شخص کی ذہنی کاوش کے ہم پلہ ہے جس کا مقصد ماضی کے بارے میں صرف خام مواد اکٹھا کرنے ہی کا نہیں بلکہ ادبی ورثے کو سمجھنے اور سمجھانے کا بھی ہے۔ میر صاحب تھے یا کہ سیخ، اس سے زیادہ اہم اس بات کی دریافت ہے کہ میر کا ورثہ ہمارے لئے کیا معنی رکھتا ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو کچھ ناقدانہ بصیرت اور سماجی ویژن بھی رکھتا ہو۔

> مولوی عبدالحق کی ادبی تحقیقات میں جہاں خبر ہے وہاں نظر بھی ہے انھوں نے ادب کو ہمیشہ زندگی کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ اور اسی کو ارتقائی قوت کا ایک مظہر بنایا ہے یہی سبب ہے کہ ان کی ادبی تنقیدات میں قدامت پرستی کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد اور فرانسیسی انسائکلوپیڈسٹوں کی طرح معقولات پسندی اور روشن خیالی کے پھیلانے کی ایک پیہم کوشش ہے۔ خواہ وہ کسی کتاب کا مقدمہ ہو یا تبصرہ ان کی ہر تنقیدی نگارش میں اس کے اسی نقطۂ نظر کی جھلکیاں موجود ہیں۔

جو موڑ کہ سرسید اور حالی کے زمانے سے ہماری زندگی اور ادب میں آیا، معجزات کی دُنیا سے نکل کر عالم اسباب کی دُنیا میں آنے اور قوانین فطرت کے سمجھنے کا، اس کی اسپرٹ کو جیسا مولوی صاحب نے سمجھا ہے ویسا ان کے کسی دوسرے ہم عصر نے نہیں سمجھا۔۔ مولوی صاحب اس اسپرٹ کے صرف ایک ترجمان اور شارح ہی نہیں رہے ہیں، بلکہ اسے ایک قدم آگے بڑھانے اور اس کی محافظت میں مخالف قوت کے خلاف جدوجہد کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے ہر انقلابی تحریک کا ساتھ دیا ہے۔ لیکن چوں کہ مولوی صاحب کو اردو تحریک بہت عزیز رہی ہے، اس لئے انھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی خاطر ایسے لوگوں سے بھی سمجھوتا کیا جو سرسید اسپرٹ کے مخالف اور قدامت کے مارے ہوئے رہے ہیں، گزشتہ دنوں میں مولوی صاحب جس کرب و بلا سے گزرے ہیں، اس کی تہ میں یہی حقیقت کارفرما رہی ہے، مولوی صاحب ان سے کام لینا چاہتے تھے، وہ یہ سمجھے ہم مولوی صاحب پر حاوی ہو گئے۔ اور ہم جس طرح چاہیں انہیں استعمال کر سکتے ہیں، شروع شروع میں تو ان کا یہ غلبہ اس

طرح ظاہر ہوا کہ انھوں نے مولوی صاحب کو بنگالی زبان کے خلاف جارحانہ پالیسی اختیار کرنے کے لئے اُکسایا، اور ان سے یہ کہلوایا کہ بنگالی ہندوی تہذیب کی ترجمان ہے اور اردو اسلامی تہذیب کی ترجمان ہے۔ بنگالیوں نے اس کے جواب میں اپنی مسلم بنگلہ زکالی، اس طرح یہ لڑائی، کچھ دنوں تک اسلام اور کفر کی چلتی رہی، یہ ساری باتیں مولوی صاحب کے دیرینہ موقف کے خلاف تھیں، وہ جب تک ہندوستان میں رہے اردو کو ہندوی کہتے۔ اسے ہندی الاصل بتانے اور حالی کی طرح اس خیال کے موید تھے کہ اردو جاننے کے لئے جہاں عربی فارسی کا جاننا ضروری ہے۔ وہاں سنسکرت اور ہندی کا بھی جاننا ضروری ہے۔ اب جو مولوی صاحب نے یہ باتیں کہنی شروع کیں تو لوگوں کو ایک عجیب تضاد نظر آیا۔ لیکن مولوی صاحب نے اپنے اس انحراف پر بہت جلد قابو پالیا، اور اب وہ زبان کے معاملے میں بھی مذاکرے کے قابل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی کچھ غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ:۔

> مولوی صاحب کو افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ کیوں نہیں پاکستان کے عوام لوگ اردو کو اپنی مادری زبان نہیں بنا لیتے بلکہ اس بات کا ہے کہ انگریزی زبان کو جسے غلامی کے زمانے میں ہم پر مسلط کیا گیا تھا، اسے آج آزادی کے زمانے میں کیوں نہیں بچے پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

ان کا یہ خیال ہے کہ ایسا ہماری غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس میں ہماری غلامانہ ذہنیت کو بھی دخل ہے۔ لیکن صرف ایک یہی سبب نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری معیشت آزاد نہیں ہے۔ اس سے بیرونی اثرات کا دباؤ اتنا پڑتا ہے کہ ہماری زبان انگریزی کی حاکمیت سے آزاد نہیں ہو پاتی ہے، چناں چہ وہ سارے جیسے بہانے انگریزی کی حاکمیت کو قائم رکھنے، اور اپنی قومی زبانوں کو اس کے درجے پر نہ پہنچنے دینے کے اسی لئے کئے جاتے ہیں، اب مولوی صاحب کی یہ سمجھ تو رہی نہیں کہ وہ اپنی معیشت کو آزاد بنانے کی دھن میں، ہل بیل لے کر کھیت میں اتر آئیں، یا بڑی بڑی مشینوں کے ڈھالنے میں لگ جائیں اور یہ نعرہ لگانا شروع کر دیں، کہ "چلی شین چلی"۔ اس لئے بعض لوگوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ اردو زبان اس کی اہل نہیں ہے کہ اسے کسی یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔ انھوں نے ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے۔ مولوی صاحب اپنی دُھن کے پکے ہیں اور کیا عجب جو وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں، لیکن اس کی راہ میں جو مزاحمتیں ہیں وہ ان سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔

ہمارا تعلیمی نظام اب آہستہ آہستہ امریکی طرز تعلیم پر ڈھلنے لگا ہے اور یہاں تک کہ امریکی ماہرین تعلیم کا اثر۔ سوخ تعلیمی پالیسی میں کارگر ہونے لگا ہے اور ہمارے اپنے لوگوں کا رجحان ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا پیدا ہو گیا ہے، اس کے امکانات گھٹتے جا رہے ہیں کہ مولوی صاحب اپنے اس منصوبے میں کسی مستقبل قریب میں کامیاب ہو سکیں۔ کیوں کہ مولوی صاحب نے اس منصوبے سے، اس کو منصوبہ دو سال ہوتا ہے، لیکن اس سے مایوس بھی نہ ہونا چاہئے، آج جب کہ گھانا کی جمہوریہ جو کل تک جنگلی دور میں تھی

اپنی ہی قومی زبان کو تمام ریاستی کاموں اور تعلیم کا ذریعہ بنانے کا منصوبہ رکھتی ہے تو پھر ہم کچھ اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ ہمیں اس جائز حق سے بہت دنوں تک محروم رکھا جا سکے۔

یہ بات میں نے اس لئے اٹھائی کہ ادھر حال ہی میں مولوی صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس میری نظر سے گزرا جس کا ایک جملہ مجھے بڑا ہی پُر درد معلوم ہوا۔ وہ جملہ یہ ہے "جو شخص کہ اردو سے نفرت کرتا ہے وہ اپنی ماں سے نفرت کرتا ہے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اردو سے نفرت کرتا ہے تو اس پر اس جملے کا اطلاق ہونا چاہئے لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اردو سب کی مادری زبان نہیں ہے، مولوی صاحب کا یہ جملہ کسی اور حقیقت کا غماز ہے معلوم ہوتا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اردو یونی ورسٹی کے قیام میں جو مزاحمتیں کہ بعض جگہوں سے اٹھائی جا رہی ہیں اُن کا جھٹکا مولوی صاحب کے جذبات پر ابھی سے پڑنے لگا ہے۔ کوشش یہ کی جائے کہ مولوی صاحب اس جھٹکے سے محفوظ رہ سکیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم سب اس جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

مولوی صاحب کی جو اس قدر عزت اور تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اردو زبان کے بہت بڑے پرچارک ہیں اور اس کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں اور بڑے ایثار سے کام کیا ہے، بلکہ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ اردو زبان کی تاریخ، اس کی لغت اور قواعد کی تدوین میں ان کی ٹھوس خدمات ہیں جو انہیں اردو کے بڑے سے بڑے عالم کے پہلو میں بٹھاتی ہیں۔ اور یہ اسی قدردانی کا نتیجہ تھا کہ اس سال روس میں بھی ان کی سال گرہ منائی گئی اور وہاں کے مستشرقین نے ان کی خدمت میں اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔

مولوی صاحب کی کتاب "چند ہم عصر" ہمارے ادب میں کلاسیکی قدر و قیمت کی حامل ہے وہ چند ایک واقعات کی مصوّری سے آدمی کے صحیح کردار اور اس کی شخصیت کے بنیادی پہلو کو نمایاں کر دیتے ہیں، اس کتاب میں مولوی صاحب کی انسان دوستی بھی پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے، چوں کہ مولوی صاحب انسان ہیں اس لئے تقاضائے فطرت یہی ہے کہ ان میں بھی کچھ کمزوریاں ہوں گی۔ لیکن مجھے تو ان کی زندگی تمام تر ایک شہید راہ وفا ہی کی نظر آتی ہے کیا عجب جو اسی لئے رقیبوں نے ان کی تشہیر کا سامان بھی کیا ہو؟ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

—————— بالآخر ان کے پرے منتشر ہوئے اور مولوی صاحب اس گہن سے برآمد ہوئے یہ مولوی صاحب کی حیات نو ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ وہ ابھی ہمارے درمیان بہت دنوں تک رہیں گے، اور اپنے ذہن کے اس نور سے جو لازوال ہے ہمیں برابر فیض پہونچاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین

حیاتِ عبدالحق کے چند اہم پہلو

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے میری پہلی ملاقات اگست ۱۹۵۳ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان کے حین حیات تک وقتاً فوقتاً میں ان سے ملتا رہا۔

اس زمانے میں میں اقبال اکیڈیمی، پاکستان، کراچی میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور علامہ اقبال پر "اسلامی تصوف اور اقبال" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ[1] لکھ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر غلام سرور سے، جو اس وقت اردو کالج میں شعبہ فارسی کے صدر تھے، ملا، تو انہوں نے مشورہ دیا کہ صرف مقالہ لکھنے سے کیا فائدہ! کوئی ایسا انتظام ہونا چاہئیے، جس سے آپ کو اس پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری مل سکے۔ ان کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی مگر دقت یہ تھی کہ اسے عملی جامہ کیسے پہنایا جائے۔ اس مقصد کے لئے میرا کسی یونیورسٹی سے منسلک ہونا ضروری تھا، اور چونکہ میں اردو کا طالب علم تھا اور قاعدے کے لحاظ سے ڈگری مجھے اردو میں لینی تھی، اس لئے یہ بھی لازمی تھا کہ جس یونیورسٹی سے میرا تعلق ہو اس میں اردو کا شعبہ ہو، اور اس کا کوئی پروفیسر بھی۔ کراچی یونیورسٹی کوئی ڈیڑھ سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ اردو کا شعبہ ابھی تک قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہاں اردو کا کوئی پروفیسر بھی نہ تھا جس کے ماتحت میں کام کر سکتا۔ ادھر اقبال اکیڈمی نے الگ یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ ریسرچ کا کام میں کراچی میں رہ کر کروں کہیں باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لئے کسی دوسری یونیورسٹی میں داخلہ لے کر کام کرنے کا خیال عبث تھا۔

لامحالہ میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور رجسٹرار سے ملا، اور ان سے درخواست کی کہ میرے لئے کوئی مناسب انتظام کریں مگر وہ صرف یہی کہتے رہے کہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی ہے ابھی اردو کا شعبہ قائم نہیں ہو سکا۔ جب تک اردو کے کسی پروفیسر کا تقرر عمل میں نہ آئے، حبہ نہیں بن سکتا۔ اس صورت میں آپ کا پی ایچ ڈی میں داخلہ کیسے ہو سکتا ہے، کس کے زیر ہدایت کام کریں گے! مگر میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کر کے

---

[1] وہ مقالہ ۱۹۵۹ء میں اقبال اکیڈیمی، پاکستان، کراچی سے کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے اور اس پر مجھے مجلس ترقی ادب لاہور سے پانچ سو روپے کا انعام ملا ہے۔

اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کیا جائے، ورنہ میری ساری محنت اور جانفشانی رائگاں جائے گی۔

اس زمانہ میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے بی اے حلیم تھے ان کو جب یہ اندازہ ہوا کہ یہ شخص بڑا ضدی ہے آسانی سے ٹلنے والا نہیں، تو میری درخواست پر دوبارہ غور کیا اور کہا، "ایک ترکیب البتہ ہو سکتی ہے وہ یہ کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اگر اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ وہ یونیورسٹی میں اردو کی اعزازی پروفیسر شپ قبول کر لیں اور آپ کے کام کی ذمہ داری لے لیں، تو میں آپ کا یونیورسٹی میں داخلہ کر سکتا ہوں۔ شعبہ بعد میں قائم ہوتا رہے گا"۔ پھر مجھ سے کہا کہ "پہلے آپ جا کر ان سے ملئے، اور ان کا عندیہ معلوم کیجئے۔ اگر وہ راضی ہوں تو بعد میں یونیورسٹی کی طرف سے باضابطہ کارروائی کی جائے گی۔"

اس سے میرے دل میں امید کی ایک جھلک پیدا ہوئی۔ میں وہاں سے اٹھ کر سیدھا مولوی صاحب کے پاس گیا اور ان کی خدمت میں یونیورسٹی کی تجویز پیش کی۔ مجھے پھر بھی ساتھا کہ مولوی صاحب انکار نہیں کریں گے، اس لئے کہ اس سے قبل جب میں نے اس کام کا ذکر کیا تھا انہوں نے ہر طرح مدد دینے کا یقین دلایا تھا۔ مگر یونیورسٹی کی مذکورہ بالا تجویز سن کر وہ ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ شاید انہیں اپنی کبر سنی اور میری بے بضاعتی کا خیال آیا ہوگا، اور یہ کہ اس سے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جس سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہونا آسان کام نہ تھا۔ میں ذرا سا گھبرایا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انکار کر بیٹھیں! میں نے ان کی دلجوئی کی خاطر پھر کہا کہ "کام تو میں انشاء اللہ محنت سے خود کر لوں گا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر غلام سرور نے بھی اپنی غایت عنایت سے میری رہنمائی کرنے کا وعدہ کیا ہے، آپ کو زیادہ زحمت نہیں ہوگی۔ مجھے صرف آپ کی سرپرستی چاہیے۔ کبھی کبھی سلام کرنے اور اہم مسائل پر آپ سے مشورہ لینے حاضر ہو جایا کروں گا۔"

اس پر وہ مسکرائے، میری پشت پر دست شفقت پھیرا اور کہا، "اچھا بھئی، تمہاری اگر یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں، جاؤ، وائس چانسلر سے کہہ دو کہ میں راضی ہوں۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ فوراً بھاگا ہوا یونیورسٹی گیا، اور وائس چانسلر صاحب کو مولوی صاحب کی رضامندی کی اطلاع دے دی۔ وائس چانسلر نے کہا، "تو سمجھئے کہ آپ کی مشکل حل ہو گئی"۔ اس کے بعد یونیورسٹی کی طرف سے باقاعدہ کارروائی ہوئی اور مولوی صاحب کو اردو کا اعزازی پروفیسر مقرر کر لیا گیا۔ اس عہدے پر وہ کوئی ڈھائی سال تک فائز رہے۔ اس عرصے میں میرے علاوہ پی ایچ ڈی کے اور کئی طالب علم ان کی نگرانی میں کام کرتے رہے۔

میں نے اپنا مقالہ بابائے اردو کی نگرانی اور ڈاکٹر غلام سرور کی زیر ہدایت مکمل کر کے مارچ ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی میں داخل کر دیا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد یعنی غالباً جولائی ۱۹۵۶ء سے اردو کا شعبہ قائم ہوا، اور اس کے نئے صدر کا تقرر عمل میں آیا۔ مولوی صاحب کا یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے تقرر، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، عبوری دور کے لئے ہوا تھا۔ اردو کا شعبہ قائم ہونے اور اس کے نئے صدر کے آنے کے بعد انہوں نے مزید عرصے تک یونیورسٹی سے منسلک رہنا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی صاحب کے لئے اس میں کیا رکھا تھا۔ نہ تو ان کو اس کام کے لئے یونیورسٹی سے کوئی الاؤنس ملتا تھا اور نہ کسی قسم کی کوئی رعایت۔ جہاں تک عزت کا تعلق ہے مولوی صاحب اس سے قطعاً بے نیاز تھے۔ ان کا مرتبہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے منصب سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ انہوں نے

تو اس عہدے کو وقتی طور پر میرے اور کئی دوسرے لوگوں کے اصرار پر قبول کر لیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ محض میری خاطر اور میری بے بسی کا خیال کرتے ہوئے اس پر آمادہ ہوئے تھے، تو بے جا نہ ہوگا۔ میرا کام پورا ہو گیا تھا چنانچہ وہ اس عہدے سے غالباً ۱۹۵۶ء کے آخر میں سبکدوش ہو گئے اور ان کے ساتھ جو دوسرے ریسرچ اسکالر وابستہ تھے، سب کو نئے صدر صاحب کے حوالے کر دیا اور مجھے مزید تین سال تک یونیورسٹی کا چکر کاٹنا پڑا۔

بہرحال، نئے صدر صاحب کے آنے کے بعد ان کو جب علم ہوا کہ میں مقالہ لکھ کر یونیورسٹی میں داخل کر چکا ہوں تو انہوں نے کہا کہ وہ نکال کر ان کو دکھاؤں۔ لیکن چونکہ میں نے وہ مقالہ ان کے آنے سے پیشتر مکمل کر لیا تھا اور ان کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے میں اس پر راضی نہ ہوا، کیونکہ اس سے میرے خیال میں اور وقت ضائع ہوتا، اور سوائے اس کے کہ اس پر ان کا ایک ٹھپا لگ جاتا، مجھے اور کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ نتیجے کے طور پر ان کو ضد پیدا ہو گئی۔

مقالہ یونیورسٹی میں داخل کرنے سے پہلے ہی مولوی صاحب نے اس کے لئے ممتحنین کے نام تجویز کر کے یونیورسٹی کو اپنی سفارشات بھیجدی تھیں۔ نئے صدر صاحب نے اپنا عہدہ سنبھال کر پہلا کام یہ کیا کہ سوائے مولوی صاحب کے نام کے دوسرے ناموں کو بدل ڈالا۔ مولوی صاحب کے نام کو بدل نہ سکے، اس لئے کہ یونیورسٹی کے ضابطہ کی رو سے نگراں کا بھی ایک ممتحن رہنا لازمی ہے، کوشش تو انہوں نے بہت کی، مگر ناکام رہے۔ وہ کہتے تھے کہ "یہ کیا تک ہے کہ نگراں کا بھی ممتحن رہنا ضروری ہے۔"

وہ ضد پر اتر آئے تھے اس لئے ہر کام پر مشکلات پیدا کرتے رہے، تاکہ کسی طرح مقالہ پاس نہ ہوسکے۔ چنانچہ ان کے طفیل مجھے اس سلسلہ میں مزید تین سال تک یونیورسٹی کا چکر کاٹنا پڑا۔ اس دوران میں امید و بیم کی جانے کتنی ہی منزلیں پیش آئیں جن کو طے کرنے کے لئے میں پیہم جدوجہد کرتا رہا، اور اپنی سمجھ کے مطابق ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی لندن گئے ہوئے تھے۔ ان سے اکثر میری خط وکتابت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ مجھے انہوں نے اپنے ایک خط میں حافظ کے ایک شعر کا مندرجہ ذیل مصرع لکھ کر صبر و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی

ع: دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد

اس کے جواب میں میں نے لکھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے شعر کا دوسرا مصرعہ تو لکھا ہی نہیں، جس میں حافظ نے کہا ہے ع

ع: بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

پھر لکھا کہ شعر کے پہلے مصرع پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ زندگی دوسرے مصرع کے مفہوم سے ہم آہنگ ہو۔ ویسی زندگی ہم جیسے لوگوں کو کہاں زیب دیتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب وہ دے بھی کیا سکتے تھے؛ لیکن قطع نظر اس کے کہ میں حافظ کے اس شعر کے پہلے مصرع پر حتی المقدور عمل کرنے کی کوشش کرتا رہا، اس لئے کہ اس کا مفہوم اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ۔

ممکن ہے یہ سب باتیں بعض لوگوں کے نزدیک لغو ہوں مگر کیا کیا جائے، یہ سب میری زندگی کے تلخ حقائق ہیں۔ میری زندگی کے

روز و شب کی اس وقت یہی کیفیت تھی۔

(میں اپنے تئیں عہد کر چکا تھا کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے رہوں گا، اور جب تک میرا مدعا پورا نہ ہو جائے، چین سے نہ بیٹھوں گا۔ اور آرام و آسائش اپنے اوپر حرام سمجھوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن سپیدۂ سحر ضرور نمودار ہو کر رہے گا۔ دیر ہے، مگر اندھیر نہیں۔ اس کے علاوہ جو شخص اپنی ساری توجہات کو ایک مقصد کے حصول میں صرف کر دے، اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے نصب العین تک پہونچنے کے لئے کوشاں ہو، وہ کبھی زمانے کے پیچ و تاب میں نہیں کھو سکتا۔ وہ گردشِ ایام سے انجام کار ضرور شادمانی و کامرانی کے ساتھ نکل آئے گا۔ البتہ استقلال شرط ہے) اور ایک دن ایسا آیا، جب مجھے اپنی زندگی کا خواب پورا ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۵۸ء کا دن میرے لئے ایک یادگار دن ہے۔ اس روز مجھے سربراہ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے مبارک ہاتھوں کراچی یونیورسٹی سے اس مقالے پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعلیٰ ڈگری ملی۔

ڈگری ملنے سے پہلے مجھے جو مشکلات پیش آئی تھیں مولوی صاحب ان سے باخبر تھے۔ ان کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ کیوں خواہ مخواہ میرے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ بالواسطہ یا بلا واسطہ سمجھانے بجھانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن کوئی فائدہ برآمد نہ ہوا۔ مولوی صاحب چونکہ اس زمانے میں ایک لحاظ سے بے بس تھے، جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا، اس لئے ان کی باتوں کی بعض خود غرض لوگ کوئی پروا نہیں کرتے تھے بلکہ مولوی صاحب دوسروں کی بے بسی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر کے خود اپنی بے بسیاں زیادہ محسوس کرنے لگے تھے۔

۷ فروری ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے کہ جمعرات کا دن تھا۔ صبح گیارہ بجے میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حسب دستور انہیں صحن میں اخبار پڑھتے ہوئے پایا۔ میں سلام کر کے قریب ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے پوچھا "کیا ہوا مقالے کا؟" میں نے کہا "باہر کے دونوں ممتحنین کو بھیج دیا گیا ہے، آپ کے پاس بھی پہونچ گیا ہوگا۔" فرمایا "ہاں، میرے پاس بھی پہونچ گیا ہے۔"

اس کے بعد شعبۂ اردو کے نئے صدر صاحب کی مخالفتوں کا ذکر آیا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے۔

"یہ لوگ اُستاد بنے بیٹھے ہیں، اور ذمہ دار عہدے سنبھالے ہوئے ہیں، لیکن تنگ دل بہت ہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر ان کا دل جتنا وسیع ہونا چاہیئے، اتنا وسیع نہیں ہے، افسوس ہے کہ وہ لوگ دوسروں کو اخلاق کا درس دیتے ہیں لیکن خود اپنے اندر اخلاق نہیں رکھتے۔ ان کو تو لڑکوں سے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آنا چاہیئے، چہ جائیکہ مخالفت کریں۔ وہ لوگ دراصل ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ اپنی پوزیشن کی اہمیت کو جتائیں۔ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شعبۂ اردو کے صدر ہیں، اس لئے ان کے ہاتھ سے ہوئے بغیر کام کیسے نکل سکتا ہے۔"

اس کے بعد کہنے لگے

"تم بھی، یہ سب باتیں اپنی ڈائری میں لکھ لینا، کبھی کام آئیں گی۔"

مولوی صاحب مجھ سے بڑی شفقت اور مدارات کے ساتھ پیش آتے تھے، اور جہاں تک مجھے علم ہے، وہ ہر طالب علم کے ساتھ اسی

راہ پیش آتے تھے ان کی یہ عادت تھی کہ پہلے وہ پوری بات سن لیتے تھے۔ اس کے بعد جو مناسب جواب ہوتا، دیتے تھے ملاقات کے دوران میں ادبی، سیاسی، معاشی، غرضیکہ ہر قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے۔ انقلابی حکومت کے قائم ہونے سے پہلے ملک میں جو سیاسی افراتفری پھیلی ہوئی تھی، اس سے وہ بہت نالاں تھے۔ مگر موجودہ حکومت کے وہ بے حد مداح تھے۔ کہتے تھے، "فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کو خدا نے قوم کی بگڑی ہوئی حالت درست کرنے کے لئے بھیجا ہے۔" انجمن ترقی اردو کی جو ناگفتہ بہ حالت ہو گئی تھی، وہ سب کو معلوم ہے۔ یہ بھی موجودہ حکومت کی مداخلت پر درست ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور ان کی انقلابی حکومت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

یہ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ مولوی صاحب اور انجمن ترقی اردو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے مولوی صاحب کا تصور انجمن سے الگ کر کے کیا جائے، تو انجمن کچھ نہیں، اور انجمن کا خیال مولوی صاحب کی ہستی سے جدا کر کے کیا جائے تو ان کی شخصیت کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ مولوی صاحب کے شب و روز اسی انجمن میں گذرتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک دن میں نے دوسرے یا تیسرے روز دوسری مرتبہ ملنے کے لئے ان سے پوچھا تھا کہ پھر میں کس وقت حاضر ہوں تو انہوں نے جواب دیا تھا۔

"میں تو صبح و شام یہیں، اسی انجمن میں ہوتا ہوں، اور کہاں جاتا ہوں، آپ جب چاہیں مل لیں۔"

سچ ہے، جس شخص کی زندگی صرف ایک مقصد اور مشن کے لئے وقف ہو، اس کا اور کیا دھندا ہو سکتا ہے؛ دنیا کے اور کاموں سے اسے کیا کام؛ اسے نہ تو بیوی چاہئیے، نہ بچے، اور جو ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اسے نہ مال و دولت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ آرام کی اور نہ آسائش کے لئے گھر بنانے کی حاجت۔ اسے "قلندرانہ زندگی ہی اولیٰ" اگر کوئی برا نہ مانے، میں تو مولوی صاحب کو قلندر ہی کہوں گا، وہ بے شک ایک قلندر تھے اور قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے "قلندروں کی خاص صفات کیا ہوتی ہیں؛ ہمت، جرأت، اولوالعزمی، بلند حوصلگی، استقلال اور یقین محکم مولوی صاحب کی پوری زندگی کا جائزہ لے کر دیکھئے، وہ ان صفات کے آئینہ دار تھے۔ وہ گذشتہ نصف صدی تک تن تنہا اردو کے مخالفین سے جس طرح ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، وہ صرف ایک قلندر ہی کا کام تھا۔

مولوی صاحب نے انجمن کے ذریعہ اردو کی کیا بیش بہا خدمت انجام دیں، مجھے ان پر گفتگو کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس اہم کام کو بخوبی انجام دینے کے لئے زیادہ قابل اور باشعور لوگ موجود ہیں۔ میرا مقصد یہاں صرف مولوی صاحب کے اس انہماک کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، جو وہ انجمن کے کام سے رکھتے تھے، اور جس کا مجھ پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔

مولوی صاحب کا معمول تھا کہ صبح ناشتہ ذرا بھاری کر لیتے تھے۔ اس کے بعد نیچے دفتر میں آکر کام میں لگ جاتے تھے پھر دن بھر کھانا نہیں کھاتے تھے کام اس انہماک سے جاری رہتا تھا کہ اور کسی چیز کی خبر نہ ہوتی تھی۔ وہ دوپہر کو سوتے بھی نہ تھے شاید کام کا نقصان ہونے کے خیال سے۔

ایک دن کا ذکر ہے میں دن کے کوئی دو ڈھائی بجے انجمن کے دفتر میں ان سے ملنے گیا۔ دیکھا ایک طرف رکھے ہوئے صوفے اونگھ رہے ہیں۔ میں جا کر چپکے سے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا" تاکہ خلل نہ ہو۔ مگر ذرا سی آہٹ سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ مجھ کو دیکھا تو پوچھا کہئے، کیسے آنا ہوا۔ میں نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ مولوی صاحب! میں کہیں مخل تو نہیں ہوا؟ فرمایا، نہیں، کام کرتے کرتے ذرا تھک گیا تھا تو تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے یہاں آکر بیٹھ گیا۔

وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے اور میرا دل ان کی عظمت کے تصور میں غرق تھا میں سوچ رہا تھا کہ اس نوّے سالہ بوڑھے کو کام سے کیا جنون ہوگیا ہے کہ کھانا پینا، سونا سب اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ کام اور صرف کام۔ کام کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بار بار میرے دل میں یہی خیال آتا رہا کہ کیا ہم جیسے نوجوانوں سے ایسی محنت برداشت ہوگی۔ شاید نہیں، ہم کاہل ہیں، سست ہیں، آرام طلب ہیں، آسائش پسند ہیں، کام دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں، مگر کام سے اگر کسی کو مولوی صاحب کی طرح عشق ہو جائے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بقول بابائے اردو "مشکل اس وقت تک مشکل ہے، جب تک ہم اسے مشکل سمجھتے ہیں، انسان دل پر رکھ لے، تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے[1]"

مولوی صاحب محنت کو محنت نہیں سمجھتے تھے، ان کو کام سے لگن تھی، چنانچہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو انہوں نے پاکستان رائٹرس کنونشن کے آخری اجلاس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اس میں اس بات پر زور دیکر کہا تھا۔

"صرف انجمن بنا دینا، قرار دادیں منظور کر دینا، یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں کام کرنا ہوگا، کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ نو بجے آئے اور چار بجے چلتے بنے۔ یہ کام جو ہمیں کرنا ہے، پوری قوت اور استقلال سے کرنا ہوگا، دن رات، گرمی سردی، بارش سے بے نیاز ہو کر۔ کام سے عشق ہونا چاہیئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں، بیگار ہے۔"

بابائے اردو کی زندگی اس کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے، پوری قوت اور استقلال سے کام کرتے رہے۔ دن ہو یا رات گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا چلچلاتی دھوپ، وہ اپنے کام سے کبھی عاجز نہ آتے تھے۔ ان کو کام سے عشق تھا۔

مولوی صاحب کے سامنے ایک نصب العین تھا، جسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا وہ نصب العین تھا فروغ اردو۔ اردو، دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں کم مایہ زبان ہے۔ یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہونچنے کے لئے مولوی عبدالحق جیسے باہمت لوگوں کی قربانی چاہتی ہے۔ بقول علامہ اقبال

ع: شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے!

مولوی صاحب اردو زبان کو اسی نقطۂ عروج پر پہونچانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا عظیم ترین بلکہ واحد مقصد یا مشن تھا۔ اس مقصد یا مشن کے حصول کے لئے وہ عمر بھر جو کوشش کرتے رہے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ انہی بیش بہا خدمات کی بدولت اردو دنیا میں زندۂ جاوید ہو گئے۔ چنانچہ وہ اپنے اسی خطبۂ صدارت میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جو لوگ کسی بڑے مقصد کیلئے کر خلوص اور صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پروا نہیں کرتے وہ کبھی نہیں مرتے، ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"

مولوی صاحب شام کو کام سے فارغ ہو کر اوپر جاتے تھے تھوڑی دیر آرام کر کے کھانا کھاتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا معمول رہا۔ البتہ زندگی کے آخری ایک دو سال میں وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ نزلہ زکام کا اثر رہتا تھا۔ تپش کا عارضہ بھی ستاتا تھا۔ اس سے نقاہت بڑھ جاتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ حتی الامکان اپنے معمولات پر قائم رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

---

[1] خطبۂ صدارت، پاکستان رائٹرز کنونشن، ۱۹۵۹ء

کھانے کے معمول کے بارے میں وہ ایک دن مجھ سے کہہ رہے تھے کہ "میں شروع سے دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتا ہوں۔ جب حیدرآباد دکن میں تھا۔ تو ایک ڈاکٹر سے جو میرا دوست تھا، اس بات کا ذکر کیا۔ وہ سن کر کہنے لگا: اگر تم اس معمول پر قائم رہو گے تو سو سال تک زندہ رہ سکو گے۔

ڈاکٹر کی وہ پیشین گوئی بہت حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب کے سو سال پورے ہونے میں صرف چند ہی سال تو رہ گئے تھے، شاید وہ سو سال پورے کر ہی لیتے اگر انہیں غم و آلام سے اتنا سابقہ نہ پڑتا۔ پچھلے چند سالوں میں ان کو بہت برے دن دیکھنے پڑے۔ اپنے بیگانے اور دوست دشمن بن چکے تھے۔ اُن کو چاروں طرف سے اس قدر تنگ کیا گیا تھا کہ صرف ان کی سخت جانی تھی کہ اتنا عرصہ زندہ رہے۔ ورنہ کوئی اور بوڑھا ہوتا، تو یقیناً ان آلام و مصائب کا مقابلہ کر کے اتنے عرصے تک زندہ نہ رہ سکتا تھا۔

مولوی صاحب کی زندگی کا انحصار جس کام پر تھا، وہ کام ان سے چھین لیا گیا تھا۔ انجمن کے دفتر میں تالے پڑ گئے تھے کتب خانہ سے استفادہ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کی ذاتی لائبریری کا دروازہ بھی ان کے لئے بند ہو چکا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ ان کے لئے زندہ رہنے کا کوئی سامان باقی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ مخالفین نے باقاعدہ محاذ بنا رکھا تھا۔ تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ شاید ان لوگوں کا خیال تھا کہ بوڑھا ان ناسا عد حالات کا زیادہ عرصہ تک مقابلہ نہ کر پائے گا۔ اور غم و آلام میں گھل گھل کر فنا ہو جائے گا۔

مولوی صاحب کی نگاہ مستقبل پر تھی۔ ان کو امید تھی شاید کوئی وقت ایسا آئے گا جب حالات بدلیں گے۔ کہتے ہیں، دن سدا ایک سے نہیں رہتے۔ کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں۔

آخر وہ دن بھی آیا۔ مگر بقول شاعر: چہ وزدانہ با آئی!

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایک دن صبح آنکھ کھلی تو ملک کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ ناگہانی انقلاب آچکا تھا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے حالات بدل گئے، ظالم رو رہے تھے، مظلوم ہنسی اور خوشی میں وجد کرنے لگے تھے۔ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

مولوی صاحب جو چیرہ دستوں کے ہاتھوں ایک بے کس مظلوم بن کر رہ گئے تھے اور انجمن کی عمارت کی چھت پر دو کمروں میں، جہاں ان کی رہائش تھی، مقید ہو کر رہ گئے تھے، ان کے دل میں بھی انقلابی حکومت سے بہت سی توقعات وابستہ ہو گئیں۔ اب ان کا مستقبل ایک روشن نظر آنے لگا۔ رات کا اندھیرا اجالے میں تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

ان کی دور رس نگاہیں دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ ان کا مستقبل — اردو کا مستقبل واقعی روشن تھا۔ آج اگر ہوتے یہ ذرا دیر تھی، ان کو کوئی سال بھر اور انتظار کرنا پڑا۔ اگرچہ وہ انتظار ان کے لئے بہت ہی جاں گسل اور صبر آزما تھا۔ کوئی ایک سال کے بعد انقلابی حکومت کو ملک کے دوسرے اہم تعمیری کاموں سے ذرا فرصت ہوئی، تو نظر کرم ادھر بھی اٹھی۔ مولوی صاحب اس دوران میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے مل چکے تھے۔ اور انجمن، جو کہ ایک قومی ادارہ ہے۔ اس کی ناگفتہ بہ حالت سے ان کو آگاہ کر چکے تھے۔

حکومت نے ۱۹۵۹ء کے اخیر میں انجمن اور اردو کالج کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے کچھ پرانے لوگوں کو، جو بدعنوانیاں

پھیلانے میں پیش پیش تھے، الگ کر دیا، اور چند دوسرے مخلص کارکنوں کو رکنیت میں شامل کیا۔ مولوی صاحب کو پورا پورا اختیار دیا گیا کہ وہ جس طرح چاہیں نظام عمل مرتب کریں۔

اس زمانے میں ایک دن میں مولوی صاحب سے ملا۔ انجمن اور اردو کالج کا ذکر آیا تو کہنے لگے "اب ساری غلاظت نکل جائے گی۔" اس کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی دیر تک تعریف کرتے رہے۔

صبح و شام کی سیر صحت کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ بلا ناغہ دونوں وقت سمندر کے ساحل پر یا شہر کے اندر کسی باغ میں سیر کو جایا کرتے تھے، ان کے پاس جب گاڑی تھی تو سیر کے لئے کلفٹن جاتے تھے۔ شام کے وقت اکثر دیکھا گیا کہ وہ کسی کو ساتھ لے کر وہاں چہل قدمی کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ عموماً شیروانی اور نرکی ٹوپی میں ہوتے تھے۔ ہاتھ میں ہلکی سی چھڑی ہوتی تھی لیکن جب بدقسمتی سے ان کے پاس گاڑی نہیں رہی[1]، تو دور جانا چھوڑ دیا۔ شہر کے کسی باغ میں چلے جاتے تھے۔ بارہا علی الصباح وہ پرنس گارڈن میں سیر کرتے ہوئے نظر آئے۔ ملازم یا کوئی اور ساتھ ہوتا تھا۔ مرض الموت میں گرفتار ہونے سے پہلے تک وہ اس معمول پر کاربند رہے۔ اگر کبھی کسی مجبوری کی بنا پر باہر نہ جا سکتے، تو اپنے قیام گاہ کی چھت پر چہل قدمی کر لیتے تھے۔

انسان جب زیادہ سن رسیدہ ہو جاتا ہے تو گوشہ نشینی اختیار کر کے سوائے اللہ اللہ کرنے کے اور کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ کام تو درکنار وہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ جاتا ہے، اور بے کس و مجبور ہو کر ہمیشہ کسی کے سہارے کا محتاج رہتا ہے۔ مگر مولوی صاحب نے اپنے بڑھاپے میں بھی توی اور توانا رہنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب رہے، وہ اپنے حین حیات میں سپر انداز ہونے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوئے، اور صحت مندرہ کر صبح و شام مسلسل کام کرتے رہے۔ وہ موت سے کوئی ایک سال پہلے بھی کہا کرتے تھے کہ "حالات نے میرے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیئے۔ ورنہ مجھ میں ابھی تک اتنی ہمت ہے کہ دس سال کا کام ایک سال میں کر کے دکھا سکتا ہوں"۔ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ "طبیعت ذرا بحال ہو جائے تو میں پورے پاکستان کا سفر کروں گا، اور اردو یونیورسٹی کے لئے چندہ فراہم کروں گا۔ جب تک میں خود لوگوں سے در در جا کر نہ مانگوں گا، یہ کام انجام نہیں پا سکتا"

مگر جب انسان کے برے دن آتے ہیں، اور وہ ہر لحاظ سے بے بس و مجبور ہو جاتا ہے، تو وہ موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اس حالت میں وہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہ کر ذلت و رسوائی برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی غیرت اسے پکار پکار کر کہتی ہے: "اس دنیائے دوں کو خیر باد کہہ کر دارالبقا کا راستہ لے کہ تیری عافیت اسی میں ہے۔"

مولوی صاحب کو بھی وہ دن دیکھنے پڑے۔

---

[1] جہاں تک مجھے علم ہے گاڑی نہ رہنے کا سبب یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا جب انجمن کی مالی حالت حد سے زیادہ بگڑ گئی۔ ملازمین کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اس وقت مولوی صاحب نے مجبور ہو کر اپنی گاڑی بیچ دی اور جہاں تک ہو سکا ملازمین کی مالی امداد کی۔

یہ بھی اردو کی خاطر مولوی صاحب کی قربانیوں کی ایک نادر مثال ہے۔ انہوں نے انجمن کو بچانے کے لئے ذاتی آرام کی مطلق پرواہ نہ کی۔ حالانکہ گاڑی نہ رہنے کی وجہ سے ان کو کافی زحمت اٹھانی پڑی۔

یک دن کا ذکر ہے۔ میں ان سے ملنے گیا۔ وہ برآمدہ میں بیٹھے اپنے ایک پرانے رفیق کار سے جن کا نام میں بھول رہا ہوں، محو گفتگو تھے مگر گفتگو ایسی، جس میں جوش و خروش، تندی و تیزی بالکل مفقود تھی۔ گفتگو کرنے والوں میں زندہ دلی غائب تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ایک تھکا ماندہ اور ہارا ہوا سپاہی اپنے ایک ہمدرد دوست کو اپنی زندگی کی ناکامیوں اور بربادیوں کی دلگداز داستان سنا کر غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کا دوست محض اس کی دلجوئی کی خاطر خاموشی کے ساتھ اور بظاہر انہماک سے اس کی وہ پُر درد داستان سُن رہا ہے۔ تاکہ غمزدہ دل کو ٹھیس نہ پہونچے۔ گویا اسے یہ احساس ہے کہ وہ دل مزید غم سہنے کے قابل نہ رہا۔

میں پہونچا تو مولوی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ اتنے میں وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاید بہت دیر سے آئے ہوئے تھے جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب اکیلے ہیں اور موجودہ حالات میں تنہائی محسوس کر کے پریشان ہو جاتے ہیں۔ آپ جتنی دیر ممکن ہو سکے بیٹھیں اور ان سے باتیں کریں، دل بہلے گا۔

میں مولوی صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ لیکن مولوی صاحب کا یہ حال تھا کہ میری باتوں کا صرف ہاں یا نا میں مختصر جواب دے کر چپ ہو جاتے تھے اور زبانِ حال سے گویا یہ کہہ رہے تھے:

در محفلِ خود راہ مدہ ہم چوں منے را
کافسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر کس موضوع پر بات کروں۔ انسان کا دل زندہ ہو، تو نت نئے موضوعات نکلتے جاتے ہیں اور باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ مگر یہاں تو قصہ ہی اور تھا۔ مولوی صاحب کا دل گویا ایک لحاظ سے مر چکا تھا ان کی نگاہ کے سامنے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا انہیں انجمن کا مستقبل ــــ اردو اور اس کی ترقی ــــ زندگی کے واحد مشن کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا وہ شاید چپ سادھے یہ سوچ رہے تھے کہ خدایا! کیا ان حالات کے سدھرنے کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا! گویا انتشار سمندر میں بہت زور کا طوفان آیا ہوا ہے اور ہم منجدھار میں بے بس و بے سہارا ہو کر تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی بچانے والا نہیں۔ مگر اے خدا، تو آخر کس دن کیلئے ہے کیا تو بے یاروں کا یار اور بے سہاروں کا سہارا نہیں ہے!"

مجھے بیٹھے بیٹھے بار بار اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میں مولوی صاحب کا دل بہلانے کے لئے بیٹھا ہوا تھا طرح طرح کی باتیں کر کے، گو کہ وہ طفلانہ ہی سہی، تھوڑی دیر کے لئے خوش کرنا تھا۔ اس لئے میں سوچ سوچ کر نئے نئے موضوع چھیڑنے کی کوشش کرتا مگر ہر بار ناکام رہتا۔ کامیابی ہوتی تو کیسے ہوتی! یہاں تو وادیِ خموشاں کا سماں بندھا ہوا تھا

اہلِ علم میں سدا یہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی شخص ایک موضوع چھیڑ دیتا ہے اور صاحبِ علم اس پر گھنٹوں اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کرتا جاتا ہے۔ اس طرح گویا اس کے سینے سے معلومات کا ایک لامتناہی سلسلہ نکلنا شروع ہوتا ہے مولوی صاحب کا بھی اچھے دنوں میں یہی حال تھا۔ کوئی شخص ان کے سامنے ایک علمی مسئلہ چھیڑ دیتا، تو اس کے ہر پہلو پر دہ بر حاصل گفتگو کرتے اور جب تک زیر بحث مسئلہ اچھی طرح واضح نہ ہو جاتا، وہ بات کرنے سے نہیں تھکتے تھے۔ مگر ان اوراق میں جس زمانہ کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ زمانہ ان کے لئے

بالکل مختلف تھا اس زمانہ کو اگر مولوی صاحب کے لئے "ایامِ عُسر" کہا جائے تو میرے خیال میں حالات کی صحیح ترجمانی ہوگی۔ اس زمانہ میں اُن پر عرصۂ حیات بہت تنگ کر دیا گیا تھا۔

اس روز چونکہ اس نشست کو طول دینا میرا مقصد تھا، اس لئے طبیعت پر قدرے جبر کرکے بیٹھا رہا۔ اسی لئے قدرتی طور پر باتیں کم اور خاموشی زیادہ ہوتی تھی۔ باتیں جو ہوتی تھیں وہ بھی بہت ہی دھیمی دھیمی آواز میں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بالکل سناٹا تھا۔ آس پاس اور کوئی نہ تھا مولوی صاحب کا خاص ملازم سید بدر عالم بھی اس وقت کہیں نیچے گیا ہوا تھا۔ البتہ میرے اور مولوی صاحب کے علاوہ جاندار چیزوں میں مولوی صاحب کا سفید پیارا بلا ان کے پاؤں کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور کبھی کبھی میاؤں میاؤں کرکے پیار کا خواہاں ہوتا تھا اور اس بھیانک اور پُر سناٹے کو توڑتا ہوا اپنی موجودگی کا اعلان کرتا تھا۔ وہ شاید اپنے آقا کو اس بات کا یقین دلا رہا تھا کہ اس دنیا کے انسان لاکھ آپ سے بے وفائی کریں اور نمک حرامی کا ثبوت دیں، مگر میں آپ کا سو فیصدی وفادار ہوں۔ آپ کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ سامنے دیوار کے کنارے کنارے گملوں میں پھولوں کے گوناگوں پودے لگے ہوئے تھے۔ کسی پر لال، کسی پر پیلے اور کسی پر گلابی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے، مگر وہ بھی کمہلائے ہوئے سے۔ شاید اپنے بابا کا برا حال دیکھ کر غم کا اظہار کر رہے تھے اور یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنے آقا کا دل اب مردہ ہے تو ہم اپنے اندر شادابی و تر و تازگی رکھ کر کیا کریں گے۔ اپنا عاشق ہی نہ رہا تو ہماری سرپرستی کون کرے گا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے کہ میں نے یونیورسٹی میں ابھی تک اپنا مقالہ داخل نہیں کیا تھا اور آئندہ چھ مہینے میں داخل کرنے والا تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے ایک مرتبہ تمنا ظاہر کی کہ "مولوی صاحب، میں اپنے آپ کو کس قدر خوش نصیب سمجھتا اگر آپ کے ہاتھ سے مجھے ڈگری مل جاتی!" میں یہ بات غیر شعوری طور پر کہہ گیا تھا۔ مگر کیا اس میں ان کی موت کی بات پنہاں تھی؟ شاید وہ یہی سمجھے۔ کہنے لگے "گھبراؤ نہیں میں اگلے چھ مہینے تک نہیں مروں گا"[1] پھر ہنس پڑے۔ مجھے ندامت دامنگیر ہوئی کہ کیوں ایسی بات کہی جس سے ان کی موت کی طرف اشارہ صادر ہوتا ہو۔ میں نے معذرت کے لہجے میں کہا "نہیں مولوی صاحب، میرا یہ مقصد ہرگز نہ تھا۔ آپ تو جتنے دن بھی زندہ رہیں گے ملک اور قوم کے لئے غنیمت ہے۔"

اس پر وہ آبدیدہ ہو گئے۔ فرمانے لگے "نہیں نورالدین، اور کب تک زندہ رہوں گا۔ زمانہ کی پشت پر بوجھ بنا ہوا ہوں۔ اب جس قدر جلد مر جاؤں، زمانہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

مولوی صاحب کی اس بات سے میں پریشان سا ہو گیا۔ کوئی خاطر خواہ جواب بن نہ پڑا۔ اتنے میں دیکھا کہ آنسوؤں کے قطرے اُن کی سفید داڑھی پر سے نیچے ٹپکنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر میں ضبط نہ کر سکا میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ بہت زیادہ مصیبت آئے تو کہا جاتا ہے کہ مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب پر واقعی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ جس کے نیچے دب کر وہ کراہ رہے تھے اور سسکتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے کہ "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ"۔ مگر اس سنسان میدان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نہ تھا، جو ان کو ان مصیبتوں سے نجات دلا سکتا۔

---

[1] معلوم نہیں انہوں نے یہ بات کیسے کہی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔ وہ لبعد میں بھی کافی عرصہ تک زندہ رہے اور مجھے ان کے ہاتھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی جس پر مجھے فخر ہے۔

مولوی صاحب کی اس مختصر سی بات میں ان کی اس وقت کی حالت زار کی پوری داستان پنہاں تھی۔ وہ زندگی سے بہت تنگ آ چکے تھے۔
میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔ آخر جھجکتے ہوئے کہا "مولوی صاحب، آپ قوم کے ایک بہت بڑے محسن ہیں۔ آپ کی زندگی ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔ چند لوگ برے ہیں اور در پئے آزار ہیں اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ پوری قوم آپ کے خلاف ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔" میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مولوی صاحب ذرا سنبھلے۔ تو میں ان سے اجازت لے کر اٹھا۔ مگر اس حالت میں جیسے میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور دل پر ایک بہت بڑا بار تھا۔

مولوی صاحب اپنے ہم جنسوں کے انسانیت سوز مظالم سے تنگ آ کر زندگی کے آخری ایام میں موت کی تمنّا کرنے لگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کبھی موت کے خیال سے گھبرا بھی جاتے تھے۔ شاید یہ بشریت کا تقاضا تھا۔ دنیا میں ہر انسان، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مسلم ہو یا غیر مسلم، یہودی ہو یا نصاریٰ، موت کے نام سے ڈرتا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کم مایہ انسان بہت زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اور موت سے بچنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتا ہے۔ اور ایک عظیم شخصیت کا مالک ثابت قدم رہ کر ملک الموت کا سامنا کرتا ہے، اگر قضا آگئی ہو تو گریز پا نہیں ہوتا، بلکہ مسکراتا ہوا اپنی جانِ عزیز جاں آفریں کے حوالے کر دیتا ہے۔

۷، فروری ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے، جس کا حوالہ پہلے بھی ایک جگہ آ چکا ہے، میں نے اپنی ملاقات کے دوران ایک مرتبہ پوچھا کہ "مولوی صاحب آج کل آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

یہ میں نے اس لئے پوچھا تھا کہ کچھ دن پہلے ان کو پیچش کی شکایت ہو گئی تھی جس سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے، اس کے علاوہ کوئی کسی کے ہاں ملنے جاتا ہے، تو مزاج پرسی کا یہی طریقہ ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ مخاطب اکثر بیمار رہتا ہو اور بڑھاپے کے سبب اس کے سفرِ حیات کی آخری منزل قریب دکھائی دیتی ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس قسم کے سوال کا ان پر ایک خاص اثر ہوگا۔ یا اس کے پس منظر میں بالواسطہ کوئی اور بات مضمر تھی۔

لیکن میرے اس سوال پر وہ چونک پڑے، کہنے لگے۔ "یہ کیوں پوچھتے ہو؟" میں نے کہا "کچھ نہیں، یونہی پوچھا" اس پر وہ کہنے لگے" اور کئی لوگوں نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا۔ اس قسم کے سوالات سے مجھے تشویش ہونے لگتی ہے کہ کہیں موت تو نہیں آ رہی!"

اس وقت مولوی صاحب کی عمر غالباً ۸۸ سال کی تھی۔ اس عمر تک بہت کم لوگ زندہ رہتے ہیں اس لئے ہم لوگوں کو ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ اردو زبان و ادب کا یہ آفتاب کب غروب ہو جائے۔ لیکن باتوں میں کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ مبادا ان کے دل کو چوٹ لگے۔ پھر بھی کبھی غیر شعوری طور پر منہ سے اس قسم کی بات نکل ہی جاتی تھی، جس سے بعد میں شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

مولوی صاحب کی وضعداری ایک مثالی نوعیت رکھتی تھی۔ پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح وہ بھی اس شئے عزیز کو کسی قیمت پر اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

مولوی صاحب کو ہم نے دفتر میں عموماً کرتے اور پاجامے میں ملبوس دیکھا۔ سردیوں میں کرتے پر ایک گرم سوئٹر اور چڑھا لیتے تھے شاید اس لئے کہ سادہ لباس میں دیر تک بیٹھنے، اور کام کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی تھی۔ مگر کسی خاص آدمی سے ملنے کا پروگرام ہوتا تھا، تو اپنی

وضع داری پوری طرح برقرار رکھتے تھے۔ اس وقت شیروانی بھی ہوتی تھی، اور ان کی خاص ترکی ٹوپی بھی۔ اس ملاقات کے لئے وہ خاص اہتمام بھی کرتے تھے۔ اتفاق سے کوئی دوسرا آدمی آجاتا تو خلل محسوس کرتے تھے۔

۱۹۵۵ء کا ذکر ہے رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکا سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب کی مزاج پرسی کے لئے جانا چاہیے۔ طے ہوا، اگلے روز صبح گیارہ بارہ بجے کے درمیان چلیں گے۔ خیال تھا مولوی صاحب حسب معمول انجمن کے دفتر میں کام کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ اس لئے پہلے سے وقت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مگر ہم پہنچے، تو خلاف توقع دیکھا کہ رنگ بدلا ہوا ہے۔ مولوی صاحب عموماً جہاں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ وہاں نہیں تھے، بلکہ دوسری طرف رکھے ہوئے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھے تھے، شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس۔ قرآن مجید کا ایک نسخہ ہاتھ میں لے کر دیکھ رہے تھے، شاید کوئی قدیم نسخہ تھا۔ ہم نے غور نہیں کیا۔ ان کے سامنے نیچے قالین پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کچھ کتابیں دوسرے صوفوں اور تپائی پر بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں حیران تھا، معلوم نہیں کیا بات ہے۔ مولوی صاحب تو اس حالت میں کبھی دفتر میں نہیں ملتے! البتہ شادانی صاحب کو اس سے کوئی تعجب نہ ہوا۔ میں نے ایک مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی، "پتا نہیں آج کیا بات ہے؟" مگر شادانی صاحب نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ ہمارے ساتھ ابوالفضل صدیقی بھی تھے، وہ بھی چپ تھے۔

بہرحال، ہم نے سلام کیا، ہاتھ ملائے، مزاج پرسی کی۔ اس کے بعد ان کے دائیں بائیں پڑے ہوئے صوفوں پر سے کتابیں ہٹا کر ہم بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ مولوی صاحب جلدی سے اٹھ گئے۔ اور بڑی میز کی طرف جہاں بیٹھ کر وہ عموماً کام کرتے تھے چل دیئے۔ ہم نے بھی آمنا و صدقنا کہہ کر ان کی پیروی کی۔ بڑی میز کے ارد گرد لکڑی کی سخت کرسیاں رکھی ہوئی تھیں وہ خود ایک پر بیٹھ گئے اور اشارہ کیا کہ ہم بھی دوسری کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ ہم بیٹھ گئے۔ رسمی باتیں ہوتی رہیں مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب کی توجہ ان باتوں کی طرف نہیں تھی۔ ان کا دھیان کہیں اور لگا ہوا تھا۔ مگر بات کیا تھی؟ نہ تو خود انہوں نے کچھ بتایا، نہ ہم میں سے کسی نے پوچھنے کی جرأت کی۔ بے تکی سی بات معلوم ہو رہی تھی۔ ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے! وہ آرام سے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے، ہم بھی وہیں بیٹھ جاتے تو کیا حرج تھا؟ خود بھی آکر لکڑی کی سخت کرسی پر بیٹھ گئے، اور ہم کو بھی بٹھا دیا۔ یہ ایک عجیب راز تھا جو ہم پر کسی طرح فی الفور فاش نہیں ہو رہا تھا۔

اس حالت میں چند ہی منٹ گذرے تھے کہ ایک آدمی اوپر سے گھبراتا ہوا آیا اور کہا "وہ آگئے"۔ مولوی صاحب ہڑبڑا کر اٹھے اور کہا "آگئے؟" اتنے میں وہ شخص افسرانہ رعب داب کے ساتھ تیز قدم چلتا ہوا اندر آگیا۔ اب ہم سمجھے کہ ہو نہ ہو مولوی صاحب کو اسی شخص کا انتظار تھا، چنانچہ وہ لپکے، اس شخص کا استقبال کیا اور خیریت پوچھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کے آنے سے مولوی صاحب یکایک بے حد خوش ہو گئے تھے اور ان کی ساری افسردگی اور سراسیمگی ایک دم رفع ہو گئی تھی۔

اتفاق سے وہ شخص شادانی صاحب کا بڑا گہرا دوست نکلا۔ چنانچہ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دو دوست کہیں اچانک مل جاتے ہیں۔ نہ ملنے ملانے کے شکوے ہوئے گلے کئے گئے، اور ایک دوسرے کو طعنے دیئے گئے۔ وہ شخص شادانی صاحب سے

کہنے لگا: "تم کو میں نے فلاں روز گھر پر بلایا تھا لیکن تم نہیں آئے۔ وعدہ کرکے پورا نہیں کرتے۔" سچ ہے، وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا!

شادانی صاحب نے کہا "بھئی، میں نے تو تمہارے حکم کی تعمیل کی تھی اور مقررہ وقت پر تمہارے گھر پر پہونچ گیا تھا۔ ابوالفضل صدیقی سے پوچھ لو، وہ گواہ ہیں۔ وہ بھی اس روز میرے ساتھ تھے۔ مگر بدقسمتی دیکھو کہ سنتری نے اندر گھسنے ہی نہیں دیا۔ وہ کہنے لگا کہ صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں اور ذرا دور پڑی ہوئی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، اگر کوئی ضروری کام ہے تو ادھر بیٹھ جائیے۔ صاحب آجائیں تو ملاقات ہوگی۔"

سنتری کے اس غیر شریفانہ برتاؤ کے باوجود ہم نے اصرار کیا کہ کم سے کم اندر بیگم صاحبہ ہی کو اطلاع بھیجدو کہ کوئی ملنے آیا ہے لیکن وہ خدا کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ بدستور اپنی بات پر اڑا رہا۔ شاید وہ اپنے موقف کی خلاف ورزی اپنے منصب کے لئے باعث توہین سمجھتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس شخص سے حجّت کرکے اپنی عزّت کھونی ہے، اور خواہ مخواہ وقت بھی ضائع کرنا ہے اس سے بہتر ہے کہ چلے چلو، چنانچہ ہم بادل نخواستہ وہاں سے لوٹ آئے البتہ تمہارے نہ ملنے کا بڑا افسوس رہا۔"

اس شخص نے شرمندگی کا اظہار کیا، معافی مانگی اور کہا "آپ نے نام نہیں بتایا ہوگا۔"

شادانی صاحب نے جواب دیا "نام بتاتا تو کیا وہ سنتری مجھے پہچان لیتا؟"

بہر حال، اس کے بعد ایک دو باتیں اور ہوئیں۔ ابوالفضل صدیقی کچھ بول تو نہیں رہے تھے۔ مگر خوش ضرور تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس شخص سے واقف تھے۔

ہم سب باتوں میں لگے ہوئے تھے اور مولوی صاحب کے چہرے سے قدرے بے اطمینانی سی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اشارۃً کہہ رہے تھے، کہ چلے بیٹھے، مگر باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں خاموش تھا، سوچ رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ شخص کون تھا؛ یہ خیال نہیں کیا آیا کہ اور کسی سے نہیں دم از کم ابوالفضل صدیقی ہی سے پوچھ کر معلوم کر لیتا کہ وہ شخص کون ہے؟

اتنے میں شادانی صاحب کو غالباً اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ مخل ہو رہے تھے، مولوی صاحب شاید ناراض ہو رہے تھے چنانچہ انہوں نے اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا "اچھا بھئی خدا حافظ۔ انشاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" پھر مولوی صاحب سے کہا "اچھا مولوی صاحب اب اجازت دیں۔" مولوی صاحب اس شخص کو ساتھ لے کر صوفوں کی طرف بڑھے، اور ہم تینوں نیچے چلے آئے۔

نیچے آکر میں نے شادانی صاحب سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب، وہ شخص کون تھا، جن کی مولوی صاحب نے اتنی آؤ بھگت کی" کہنے لگے "ارے تم انہیں نہیں جانتے؟" قبل اس کے کہ شادانی صاحب، اس شخص کا نام بتاتے، ابوالفضل صدیقی بولے "وہ تو بھئی الطاف گوہر ہیں، کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ[1]۔" مجھے شرمندگی ہوئی کہ کراچی میں رہ کر الطاف گوہر کو نہیں جانتا۔ جانتا تو ضرور تھا۔ مگر صرف نام سے شکل سے نہیں یہ محض اتفاق تھا۔

اردو کالج کے احاطے سے نکلے تو ملاقات پر تبصرہ ہونے لگا۔ سب سے پہلے وہ راز والی بات گفتگو کا موضوع بنی۔ ابوالفضل صدیقی

---

[1] اس زمانہ میں الطاف گوہر کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔

ہنس کر کہنے لگے "مولوی صاحب کو یہ کیا سوجھی، اچھے خاصے آرام سے بیٹھے ہوئے تھے، ہم بھی ان کے پاس صوفوں پر بیٹھ جاتے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم بیٹھنے پاتے، وہ خود اٹھ گئے اور بڑی میز کے پاس جا کر جہاں لکڑی کی سخت کرسیاں رکھی ہوئی تھیں بیٹھ گئے، گویا خود بھی *attention* ہو گئے اور ہم لوگوں کو بھی *attention* کر دیا۔"

اس پر ہم سب خوب ہنسے۔ شادانی صاحب نے کہا: "پتا نہیں مولوی صاحب نے کیوں ایسا کیا؟" میں نے مولوی صاحب کی طرفداری کرتے ہوئے کہا "کیوں ایسا نہ کرتے؛ ہم تو تھے ہی بن بلائے مہمان، مولوی صاحب سے نہ تو پہلے سے وقت لیا تھا، نہ پیشگی اطلاع دی تھی، یکا یک جا دھمکے، اور خصوصاً ایسے وقت پر جب کہ وہ خاص اہتمام کے ساتھ الطاف گوہر کا انتظار کر رہے تھے۔ نہ جانے ان کا کیا پروگرام تھا، اردو کی ترقی کے بارے میں کیا کیا باتیں کرنی تھیں اور ان کو کون کون سے پرانے نسخے اور کتابیں دکھانی تھیں اور ہم لوگ بلائے ناگہانی کی طرح عین وقت پر پہونچ گئے۔ اگر پہلے سے اطلاع دے دیتے تو مولوی صاحب ہم لوگوں سے ملنے کے لئے ضرور کوئی اور مناسب وقت مقرر کرتے، یہ تو محض ان کی شرافت تھی، بلکہ یوں کہیے کہ شادانی صاحب کی عزت کا خیال تھا کہ کچھ نہیں کہا۔ ورنہ وہ ہم کو کوئی بات کئے بغیر ہی ٹال دیتے۔ اس لئے کہ یہ ادابِ مجلس کے خلاف ہے کہ ملنے کے لئے وقت تو دیا جائے کسی اور کو، اور آ دھمکے کوئی اور۔

مولوی صاحب کی عادت میں ایک بات اور تھی، اسے ان کی وضعداری کہہ لیجئے یا کچھ اور۔ وہ سیڑھیوں پر سے چڑھنے اور اترنے سے ہمیشہ کتراتے تھے، ممکن ہے بڑھاپے کی وجہ سے ایسا ہو، لیکن وہ اس کی تعبیر کچھ اور کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ کا انتظام کیا گیا، اور مولوی صاحب سے درخواست کی گئی کہ اس کی صدارت قبول فرمائیں۔ انہوں نے منتظمین سے پوچھا کہ "جلسہ کس جگہ ہوگا، مجھے اوپر چڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر جلسہ کا انتظام کہیں نیچے ہو؛ تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ میں آجاؤں گا، اور اگر اوپر ہو، تو مجھے معذور رکھا جائے۔"

منتظمین نے کہا کہ یونیورسٹی کے جلسے وغیرہ کا انتظام تو عام طور پر اوپر کیمسٹری ہال ہی میں ہوا کرتا ہے[1]، لیکن آپ کی خاطر یہ جلسہ نیچے رکھ لیا جائے گا، شعبۂ تاریخ کے سامنے خالی جگہ ہے وہیں شامیانہ لگا کر انتظام کر لیں گے۔ آپ کو کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

مولوی صاحب راضی ہو گئے۔

جلسے کے روز دو ایک طالب علم مولوی صاحب کو بلانے آئے۔ مولوی صاحب تیار تھے، لیکن چلنے سے پہلے احتیاطاً پوچھا کہ جلسہ نیچے ہی رکھا ہے نا؟ وہ لوگ چونکے، معذرت کے لہجے میں کہا "نہیں مولوی صاحب، نیچے انتظام نہ ہو سکا، بعض مجبوریوں کی بنا پر آخر اوپر کیمسٹری ہال ہی میں رکھنا پڑا۔ آپ چلئے ہم لوگ سہارا دے کر اوپر چڑھائیں گے۔"

اس پر مولوی صاحب کو سخت غصہ آیا، کہا: "مجھ سے تو وعدہ کچھ کیا گیا تھا اور عملاً کچھ اور ہوا۔ کیا عجیب تماشا ہے۔" چنانچہ انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ان لوگوں سے کہا "آپ لوگ چلے جائیے، میں نہیں جاتا۔ اس کے بعد جلسے کے اور نمائندے پہونچے۔ اور مولوی صاحب کو منانے کی بہت کوشش کی، لیکن مولوی صاحب اپنی بات پر قائم رہے۔

---

[1] یہ اس زمانے کی بات ہے جب یونیورسٹی کنٹری کلب روڈ پر منتقل نہیں ہوئی تھی۔

اس جلسے میں مجھے کبھی شرکت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ایک دو روز کے بعد میں مولوی صاحب سے ملنے گیا تو ان سے پوچھا کہ "مجلس مذاکرہ کی صدارت کے لئے آپ کو بلایا گیا تھا، تشریف لے گئے تھے یا نہیں؟" اس پر انہوں نے پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ "یہاں سے نیچے اترنا پھر اوپر چڑھنا میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ میں ان بیکار باتوں میں اپنی انرجی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔" پھر ہنس کر کہنے لگے "یہ بات میں نے گاندھی سے سیکھی ہے۔ وہ ایک مرتبہ میرے پاس آیا، تو بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک دفعہ میں نے اس سے پوچھا، اچھا یہ تو بتاؤ، تم ہمیشہ بیٹھ کے کیوں تقریر کرتے ہو؛ اس کا کیا راز ہے؟ اس نے کہا، راز یہ ہے کہ میں اپنی انرجی کو ویسٹ (waste) کرنا نہیں چاہتا۔ گاندھی کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی۔ اس کے بعد سے میں ہر معاملے میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھتا ہوں کہ انرجی بیجا صرف نہ ہو، اس طریقے پر عمل کر کے میں اپنے ملک اور قوم کو زیادہ فائدہ پہونچا سکوں گا۔"

وقت کی پابندی شاید کسی زمانے میں ہماری تہذیب کا لازمی جزو تھی۔ مرور ایام سے اس میں تبدیلی پیدا ہوئی، دوسرے ممالک کا تو خیر یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ برصغیر پاکستان و ہند کا یہ عام رواج ہے کہ اگر کسی بات یا کام کے لئے چار بجے کا وقت مقرر کیا جائے تو اس کا مطلب چھ بجے لیا جاتا ہے۔ بات کہنے والے یا کام بتانے والے بھی یہی مطلب نکالتے ہیں اور اس پر عمل کرنے والے بھی۔ یہ ہمارے قومی کردار کی ایک بڑی کمزوری ہے۔ آپ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں چلے جائیے یہ بات عام نظر آئے گی۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اس بات کے سخت خلاف تھے وقت کی عدم پابندی ان کے لئے بے حد برہمی کا باعث ہوتی تھی۔ ان کو کسی طرح گوارا نہ تھا کہ وقت تو کچھ بتایا جائے۔ اور اس سے مراد کچھ اور لی جائے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

شروع شروع میں جب پروفیسر اے بی اے حلیم کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، مولوی صاحب یونیورسٹی کی کسی کمیٹی کے رکن تھے، ایک مرتبہ دن کے تین بجے میٹنگ بلائی گئی۔ مولوی صاحب ٹھیک تین بجے یونیورسٹی پہونچ گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے اولاً تو کچھ دیر انتظار کیا، اس کے بعد وائس چانسلر کے کمرے میں گئے۔ پوچھا کہ تین بجے کمیٹی کی میٹنگ بلائی گئی تھی، اس کا کیا ہوا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا، کیا میٹنگ نہیں ہو رہی؟ وائس چانسلر نے اس کے جواب میں کہا کہ آج کل وقت کی پابندی کون کرتا ہے۔ امید ہے چار بجے تک سب ممبران آ جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب سخت برہم ہوئے، اور یہ کہہ کر چل دیئے کہ "یونیورسٹی میں بھی، جہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اور تنظیم کا درس دیا جاتا ہے اگر پابندیٔ اوقات کا یہی حال ہے تو بہت افسوس کی بات ہے۔"

مولوی صاحب نے ایک دن مجھ سے اس واقعہ کا ذکر کر کے کہا کہ "اب میں یونیورسٹی کی کسی میٹنگ میں نہیں جاتا۔ کئی مرتبہ بلاوا آیا ہے۔ مگر جہاں تین بجے کا وقت دے کر لوگ چار بجے آتے ہیں وہاں میرا جانا بیکار ہے۔" انہی دنوں ایک مرتبہ وائس چانسلر سے مولوی صاحب کا ذکر آیا تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دن غصہ ہو کر چلے گئے۔ میٹنگ میں شرکت نہیں کی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ بلایا گیا مگر وہ پھر کبھی نہیں آئے۔"

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اپریل ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ ڈھاکا کے مشہور بنگلہ شاعر غلام مصطفیٰ یوم اقبال کے سلسلے میں اقبال اکیڈیمی کی دعوت پر کراچی آئے ہوئے تھے۔ باباے اردو کو معلوم ہوا، تو انہوں نے ایک دن ان کو رات کے کھانے پر بلایا۔ مقصد یہ تھا کہ ان سے بات چیت کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے حالات کہاں تک سازگار ہیں، اور اگر تحریک چلائی جائے تو وہ اس میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔

غلام مصطفیٰ کو وقت پر لانے کا بار انہوں نے مجھ پر ڈالا تھا۔ چنانچہ میں نے مولوی صاحب کا وہ پیغام پہونچا کر ان کو تاکید کر دی تھی کہ وہ وقت سے ذرا پہلے میری قیام گاہ پر پہونچ جائیں دونوں اکٹھے چلیں گے۔

شام ہو گئی تھی مگر غلام مصطفیٰ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ میں بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا، مگر انہوں نے آخر شاعر ہونے کا پورا ثبوت دیا۔ ان کو وقت پر نہ آنا تھا، نہ آئے۔ مولوی صاحب ادھر انتظار کر رہے تھے، اس لئے مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی نہ جانے وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ مولوی صاحب جیسے وضعدار اور وقت کے پابند انسان کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ کسی کو ایک خاص مقصد کے لئے بلایا جائے اور وہ وقت پر نہ آئے۔

بہر حال، نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن والی بات تھی۔ پھر بھی جہاں جہاں ان کے ملنے کا امکان تھا فون کر کے دریافت کیا مگر کوئی پتہ نہ چلا۔ اسی کشمکش میں رات کے آٹھ بج گئے بڑی ندامت محسوس ہو رہی تھی، سوچا مولوی صاحب سے جا کر معذرت کر دوں کہ میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکا۔

میں ادھر پہونچا تو دیکھا۔ کمرے کے سامنے صحن میں مولوی صاحب تشریف فرما ہیں۔ وہاں بتّی نہیں تھی۔ کمرے کے اندر سے ہلکی ہلکی سی روشنی آ کر صرف کسی کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی مولوی صاحب کو تو میں نے دور ہی سے پہچان لیا تھا شاید ان کے سفید بالوں کی وجہ سے، جو اندھیرے میں بھی چمک رہے تھے، یا اس لئے کہ اس وقت ان کا وہاں موجود ہونا لازمی تھا۔ ایک دو قدم اور آگے بڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کے روبرو ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اور وہ دونوں خاموش تھے۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہ دوسرا شخص کوئی نہیں بلکہ غلام مصطفیٰ ہیں۔ میں نے ان سے حیرت سے پوچھا کب آئے؟ میں تو آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حیران ہو گیا۔ آج واقعی آپ نے بڑا پریشان کیا۔" انہوں نے کہا: "ابھی کوئی چھ سات منٹ ہوئے آیا ایک جگہ کسی سے ملنے گیا تھا۔ وہاں سے آنے میں دیر ہو گئی۔"

مولوی صاحب اب بھی خاموش تھے۔ میں بھانپ گیا کہ غصہ میں ہیں اور غصہ بھی وہ جو آسانی سے اترنے والا نہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وقت پر نہ آسکنے کی وجہ سے غلام مصطفیٰ نے جو معافی مانگی تھی وہ قبول نہیں ہوئی۔ وہ اب ہتھیار ڈال کر ندامت اور شرمندگی کے ساتھ گم سم بیٹھے ہوئے تھے، شاید وہ اس سوچ میں تھے کہ مولوی صاحب کو کیسے منایا جائے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا تھا، اب قصور معاف ہو جاتا تو بہتر تھا۔

تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ کون سا وقت ہے آنے کا؟" میں نے عرض کیا کہ غلام مصطفیٰ کو تلاش کرتے کرتے دیر ہو گئی۔ اس پر وہ اور کچھ نہیں بولے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ نہ غلام مصطفیٰ بات کر رہے تھے اور نہ مولوی صاحب ہی گفتگو کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ البتہ غصے پر قابو پانے کی کوشش ضرور کر رہے تھے۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں سکوت اختیار کر لینا ہی دانشمندوں کا شیوہ

ہوتا ہے۔ میں نے سوچا، یہ تو بڑی مشکل کی بات ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ یہ مقام ادب ہے۔ کسی قسم کی گستاخی سرزد نہ ہونی چاہیئے۔ مگر آخر کب تک، خاموشی کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے ایک مرتبہ جرأت سے کام لے کر مولوی صاحب سے کہا: "اگر مناسب سمجھیں تو گفتگو کا آغاز کیا جائے"، اس پر کہنے لگے: "اب کیا گفتگو کریں!"

غرض مختصر سا جواب دے کر وہ بار بار خاموش ہو جاتے تھے۔ اس پر مجھ سے زیادہ غلام مصطفےٰ پریشان معلوم ہو رہے تھے کیونکہ وہی اصل میں مہمان خصوصی تھے۔ انھی کو بلایا گیا تھا۔ اس لئے ان کو تسلی دلانے کی خاطر میں نے ان سے ذرا قریب ہو کر آہستہ سے کہا: "آپ فکر نہ کریں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں مولوی صاحب کو منا لوں گا۔" ان کو تعجب ہوا۔ پوچھا: "وہ کیسے؟" میں نے ان سے کہا: "وہ نہ پوچھئے، آپ صرف دیکھتے رہئیے۔"

اتنے میں مولوی صاحب نے اپنے دیرینہ ملازم سید بدر عالم صاحب کو آواز دی۔ وہ آیا تو کہا "کھانا لگا دو"۔ کھانا لگ گیا تو اس نے آکر اطلاع دی۔ مولوی صاحب نے ہم سے کہا: "چلیئے"۔ ہم دونوں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے ساتھ کھانے کی میز پر پہونچے۔ تینوں کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب خود بیٹھ گئے اور کھاتے رہے، اور "یہ لیجئے"، "وہ لیجئے"، کہہ کر ہم دونوں کو اصرار کر کے کھلاتے رہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر پھر صحن میں آکر بیٹھ گئے۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ اردو، بابائے اردو کی ایک فطری کمزوری تھی۔ کوئی اردو اور اس کی ترقی سے متعلق باتیں کرتا تو وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے دل میں ایک ایسا ولولہ اور جوش پیدا ہوتا کہ وہ زیر بحث مسئلے پر بیساختہ بولنے لگتے تھے۔ اس وقت وہ دوسری ساری باتیں بھول جاتے تھے۔ صرف اردو کا راج ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔

میں نے آہستہ آہستہ ایک طرفہ باتیں کرنی شروع کیں۔ مولوی صاحب خاموشی سے سن رہے تھے، غلام مصطفےٰ انتظار میں تھے کہ آخر وہ کون سا جادو تھا جس کے اثر سے مولوی صاحب یکایک خوش ہو جاتے۔ غصہ کا بادل چھٹ جاتا۔ پھر ہنسنے اور بولنے لگتے تھے کبھی آہستہ، کبھی زور سے۔ اور انہیں اس بات کا احساس بھی نہ رہتا کہ تھوڑی دیر پہلے ان کا موڈ کیا تھا، اور اب کیا ہے۔

میں نے اپنے طور پر، بلکہ یوں کہیئے کہ زبردستی مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کی باتیں کرنی شروع کیں۔ ڈھاکا میں انجمن ترقی اردو کی جو شاخ ہے اس کا ذکر چھیڑا۔ مشرقی پاکستان میں اردو کی موجودہ حالت کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اسکولوں، کالجوں اور دینی مدرسوں میں اردو کی روز افزوں مقبولیت کی داستان سرائی کی۔ کئی منصوبوں اور اسکیموں پر غور کرنے کے لئے اکسایا۔ غرض کہ وہاں اردو کی ترقی سے متعلق جو باتیں میری ناقص فہم میں آسکتی تھیں ان کے سامنے پیش کیں۔

مولوی صاحب پہلے تو بدستور خاموش رہے، مگر میری باتیں سن کر آخر ان سے رہا نہ گیا۔ یکایک تکدر کا بادل ہٹ گیا، غصہ کافور ہو گیا اور بے ساختہ بولنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب بڑے خوش ہیں۔ کرسی پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پوری توجہ اور انہماک سے باتیں کرنے اور ہماری باتیں سننے پر آمادہ ہو گئے۔ اتنے میں غلام مصطفےٰ بھی، جو اب تک چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے، فضا کو سازگار دیکھ کر میدان میں اتر آئے۔ کبھی ہاں میں ہاں ملاتے، اور کبھی ایک آدھ بات کا جواب دے کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے۔ اب یہ عالم تھا کہ باتوں کا سلسلہ

ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ باتیں مولوی صاحب ہی کر رہے تھے ہم صرف گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے کبھی کبھی لقمہ دیتے تھے۔

بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اب مولوی صاحب بھی خوش تھے۔ اور غلام مصطفیٰ بھی۔ اور میں بھی اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ ذرا دیر بعد میں غلام مصطفیٰ سے پوچھا "کیوں جناب، کیسا رہا؟" وہ کیا جواب دیتے۔ وہ تو اس بات سے خوش تھے کہ مولوی صاحب خوش تھے اور کسی طرح ان کا وقت پر نہ آنے کا قصور معاف ہو گیا تھا

مولوی صاحب ہمارے بزرگوں کے بزرگ تھے، وہ ناراض ہوتے، یہ ہم کیسے برداشت کر سکتے تھے، ان کا دل دکھانا، انفرادی نہیں بلکہ قومی جرم تھا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اس کے باوجود چند روز قبل یعنی انجمن کے حالات درست ہونے تک بعض شر پسند لوگ ہر لحاظ سے ان کو تکلیف پہونچانے پر تلے ہوئے تھے۔

زبان کے مسئلے پر چند سال مشرقی پاکستان میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی وجہ سے وہاں اردو کے لئے فضا بے حد مکدر ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود مشرقی پاکستان میں اردو کی ترقی سے متعلق اس روز میں نے جو باتیں کی تھیں وہ محض مولوی صاحب کا غصہ دور کرنے کے لئے تھیں۔

مندرجہ بالا دو واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب پابندیٔ اوقات پر کس قدر سختی سے عمل کرتے تھے، ان کا یہ طرز عمل دوسروں کے لئے دلیل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

آزادی ملنے کے بعد اردو کے واحد سرکاری زبان قرار دیئے جانے اور مشرقی پاکستان میں اس کے زیادہ سے زیادہ رواج پانے کا مولوی صاحب کو پورا یقین تھا لیکن حالات کے بدل جانے کی وجہ سے وہ امید یں پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھیں اور اسی کا مولوی صاحب کو بڑا صدمہ تھا اور اسی صدمے نے ان سے "پاکستان میں اردو کا المیہ" لکھوایا۔

اس سلسلے میں ۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو وہ میرے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"موجودہ حکومت[1] سابق حکومت سے بھی زیادہ نااہل نکلی۔ یہ حکومت محض اپنے استقلال کے لئے طرح طرح کی غلطیاں کر رہی ہے جس کے نتائج بہت خوفناک ہوں گے۔ اس وقت آثار اچھے نہیں۔ آپ کا خیال صحیح ہے کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں اردو کے متعلق کسی قسم کی تحریک کرنا مناسب نہ ہوگا۔ جب آپ وہاں جم جائیں گے اور آپ کو ایک گونہ اطمینان خاطر نصیب ہو جائے گا تو اس مسئلے پر غور کریں گے اور ضرورت ہوئی تو میں مشرقی پاکستان پہونچ کر ان صاحبوں سے مشورہ کروں گا جو اردو کے بہی خواہ ہیں۔"

اس کے بعد ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"فضلی صاحب[2] حال ہی میں مشرقی پاکستان کے دورے سے واپس آئے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہاں اردو کے لئے کام کرنے کے لئے حالات سازگار ہیں وہ اس بارے میں مفصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں کسی روز ان سے مل کر تمام حالات دریافت کرونگا۔"

---

[1] اس وقت صوبے میں ابو حسین سرکار کی منسٹری برسر اقتدار تھی۔

[2] فضل احمد کریم فضلی۔ جو اس زمانے میں وزارت قانون کے سیکریٹری تھے۔

زبان کے مسئلے پر جو جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں اردو کی ترقی کی رفتار ذرا سست ہو گئی تھی مگر زمانہ جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے اردو وہاں زیادہ سے زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ اب وہاں کے لوگ اردو سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں جہاں تک میرا اندازہ ہے اس معاملہ میں آج کا مشرقی پاکستان ویسا نہیں ہے جو چودہ سال پہلے تھا۔ اس لئے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک زمانہ یقیناً ایسا آئے گا جب وہاں کا کوئی فرد اردو سے نابلد نہیں رہے گا، اردو وہاں اتنی مقبول ہو جائے گی جتنی پاکستان کے کسی دوسرے حصے میں۔

انسان دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اپنی موت بھی ساتھ لے کر آتا ہے۔ بابائے اردو بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ آخر وہ دن بھی آیا جب انہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ اردو یتیم ہو گئی۔ اس کا سہارا ٹوٹ گیا، وہ مرد مجاہد جو نصف صدی تک مسلسل اردو کی بے غرض خدمت کرتا رہا، آج انجمن کے نیچے ایک گوشے میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

اردو کا ہر ادیب اور شاعر بقدر استعداد برابر اردو کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لے رہا ہے۔ مگر ایسا کون ہے جو صرف اردو کے لئے جیتا اور مرتا ہو۔ ہمارے ملک میں بیشک ایسے لوگ گذرے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں، جو ممکن ہے، بحیثیت ادیب بابائے اردو سے زیادہ بڑے ہوں، مگر کوئی بابائے اردو نہ بن سکا۔ اردو کے لئے وہ جنون اور لگن کس کو ہے جو بابائے اردو کو تھی۔ بابائے اردو کی عظمت اور ان کی شخصیت کی بلندی دراصل اسی بات میں مضمر ہے خلوص، صداقت اور ایثار جیسے خصائل حمیدہ، جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں، بابائے اردو کا دین اور ایمان تھے۔ انسان دنیا میں کتنا ہی کچھ کرے مگر اس کے کام میں اگر خود غرضی شامل ہو، تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ بابائے اردو کی شخصیت میں خود غرضی کا شائبہ تک نہ تھا انہوں نے زندگی بھر اپنی ذاتی اغراض کو بالائے طاق رکھ کر اردو کی خدمت کی۔ زندگی میں جو کچھ کمایا اردو کی خاطر خرچ کر ڈالا۔ وہ زندگی بھر صرف اُردو اُردو کرتے رہے۔ علامہ اقبالؔ اپنے فلسفہ خودی کو دنیا کے سامنے بیّن ترین شکل میں پیش کرنے کے لئے جیسے خودی کے علاوہ اور کوئی بات نہ کرتے تھے اور ان کی ساری باتوں کا محور نظریہ خودی ہوتا تھا، اسی طرح بابائے اُردو بھی اُردو کو درجۂ کمال تک پہونچانے کے لئے عمر بھر اُردو اُردو کی رٹ لگاتے رہے۔ اُردو کے معاملے میں ان کی یہ انتہا پسندی ملک کے بعض طبقوں کو ناگوار بھی گذری، مگر مولوی صاحب نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ کوئی شخص اگر دنیا میں کوئی عظیم مقصد حاصل کرنا چاہے تو اس میں ایسے جنون کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر عظیم مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ دور کیوں جائیے، سامنے ہی کی مثال لے لیجئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان حاصل کرنے کا جذبہ اگر جنون کی حد تک نہ پہنچا ہوا ہوتا، تو شاید پاکستان نہ بن سکتا۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد ہماری اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ پُر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ان کی شخصیت ایک عظیم شخصیت تھی۔ ایسے لوگ دنیا میں خال خال پیدا ہوتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

بالفرض کوئی مولوی صاحب کا جانشین بننا چاہے تو بن سکتا ہے، مگر ان کی سی وسعت نظر کہاں سے لائے گا؟ ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ قدیم ادب کہیے یا جدید، دونوں پر انہیں یکساں عبور حاصل تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے مولوی صاحب تنہا کتب خانے میں بیٹھے کام کر رہے تھے، میں ملنے گیا، تو کام چھوڑ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ کتب خانہ کا ذکر آیا تو کہنے لگے "اس کتب خانے میں ایسے ایسے قدیم نسخے موجود ہیں جو میرے علاوہ اور کوئی نہیں پڑھ سکتا۔"

مولوی صاحب کی عظمت اور بلند شخصیت کا ذکر آیا، تو اسی سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔

مولوی صاحب کے دیرینہ ملازم سید بدر عالم صاحب ایک دن دوپہر کو میرے پاس آئے اور میرا نام لے لے کر زور زور سے آواز دینے لگا۔ وہ جب بھی آتے تھے۔ اسی طرح باہر کھڑے ہو کر زور زور سے آواز دیتا تھا۔ یہ عادت شاید اس لئے پڑ گئی ہے کہ انہیں مولوی صاحب سے ہمیشہ زور زور سے باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ یا اس لئے کہ وہ خود بھی کم سنتے تھے اور سب بہرا سمجھتے ہیں۔ اس وقت میں کھانا کھا کر قیلولہ کر رہا تھا — ان کی آواز سن کر آنکھ کھل گئی۔ سر اٹھا کے باہر دیکھا تو بدر عالم صاحب کھڑے تھے، میں نے ان سے پوچھا "کہو کیسے آئے؟" انھوں نے کہا "مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر ایک پرچی میری طرف بڑھا دی۔ اس میں لکھا ہوا تھا "اگر زحمت نہ ہو، تو چند منٹ کے لئے تشریف لائیے۔"

ان دنوں میں انجمن کے پیچھے مشن روڈ پر کراچی یونیورسٹی کے عارضی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اس لئے سہولت تھی جب ضرورت پڑتی تھی مولوی صاحب بدر عالم صاحب کو بھیج کر فوراً بلا لیتے تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ تم دو منٹ ٹھہر جاؤ۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں تو تمہارے ساتھ چلوں۔ رک گئے۔ اور میں کپڑے بدلنے لگا اتنے میں پتا نہیں انہیں کیا خیال آیا، کہنے لگا۔

"یہ پرچی جو میں نے آپ کو ابھی دی ہے، ضائع نہ کیجئے گا، یہ مولوی صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور اس میں ان کے دستخط موجود ہیں۔ یادگار کے طور پر اسے اپنے خاص فائل میں حفاظت سے رکھئے اور اس پر تاریخ ڈال کر لکھ لیجئے کہ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یہ پرچی ان کے پرانے ملازم سید بدر عالم کی معرفت ملی۔"

یہ چند جملے انھوں نے اپنی عادت کے مطابق اتنے زور سے کہے تھے کہ دیر تک میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میں نے سوچا۔ بات تو انھوں نے پتے کی کہی ہے چنانچہ میں نے ان سے کہا "اچھا بھئی، میں لکھے لیتا ہوں" فوراً قلم اٹھا کر وہ بات لکھ لی اور تاریخ ڈال دی۔ ۲۵ مئی ۱۹۵۶ء۔ اس کے بعد وہ پرچی اپنے فائل میں رکھ دی۔

اس وقت جب کہ میں مولوی صاحب پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں، وہ پرچی میرے سامنے ہے اور رہ رہ کر یہ خیال آ رہا ہے۔ کہ مولوی صاحب کی شخصیت اور مرتبے کا اندازہ ان کے ملازم سید بدر عالم صاحب کو بھی بخوبی تھا۔

"جب کوئی غیر زبان کسی پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے تو اس میں قومی حمیت اور عصبیت نہیں رہتی اور وہ اپنی قوم سے الگ ایک دوسرا شخص ہو جاتا ہے۔"

بابائے اردو

رفیق خاور

بابائے اُردو ——— ایک تجریدی خاکہ

شاعری اور اس کے ساتھ ادب بھی کیا ہیں؟ گنجینۂ معنی کا طلسم۔ غالبؔ نے اپنی شاعری کے متعلق بھی یہی کہا تھا۔ اور صرف غالب ہی نہیں۔ اکثر لوگ صدہا سال سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں۔ اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً۔ لیکن کیا شاعری یا ادب صرف یہی کچھ ہیں؟ معنی و حکمت۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں؟ کیا یہ دونوں طلسمِ الفاظ نہیں ہیں؟ اور الفاظ میں کیا کچھ نہیں۔ ان کی اپنی ہی ایک دنیا ہے۔ نہایت وسیع، رنگا رنگ، متنوع، پیچیدہ۔ اور جب یہ آپس میں مل جاتے ہیں، تو کیا کیا روپ نہیں دھارتے، کیا کیا تیور نہیں پیدا کرتے۔ کبھی ظاہر کبھی پنہاں۔ ان کی تہہ میں اشارات و کنایات کی ایک دنیا جھلکتی نظر آتی ہے۔ اگر ہم کسی تحریر پر غور کرنے لگیں تو الفاظ سے کتنی ہی باتیں پتہ چلتی ہیں۔ بڑی پتے کی باتیں۔ ہر ہر لفظ لکھنے والے کی شبیہہ ہوتا ہے اس کی شخصیت کا آئینہ دار، اس کے دل و دماغ کا عکس۔ مگر شخصیت کے معنی صرف افکار و خیالات یا جذبات و احساسات ہی نہیں اس میں قوائے فکر بھی تو شامل ہیں اور وہ پر اسرار ہستی جسے فن کار کہتے ہیں، ایک کاری گر۔ وہ ذوق رکھتا ہے، مزاج رکھتا ہے، اس کا تخیّل بھی ہوتا ہے۔ اس کے شعور و لاشعور میں آویزشیں بھی ہوتی ہیں۔ اس کی ذات میں فکر و احساس کے ساتھ ساتھ، جنھیں ہم اس کی ساری شخصیت کا مترادف سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ذوق، یہ مزاج، یہ صد حیثیتیں برابر موجود رہتی ہیں۔ ان کا عملِ تخلیق میں ایک بنیادی حصّہ ہے۔ کیوں کہ ان کے بغیر کوئی چیز بروئے کار آہی نہیں سکتی اور معنی و حکمت کا گنجینہ نظروں سے پنہاں ہی رہتا ہے۔ ان سے بھی صاحبِ فن کے متعلق اتنا ہی معلوم ہوتا ہے جتنا براہِ راست اس کے افکار و احساسات سے۔ دونوں ایک ہی منزل کے رہنما ہیں۔ ایک بلا واسطہ اور دوسرا بالواسطہ ایک میں ہم اپنے موضوع کو سامنے کے رُخ سے دیکھتے ہیں۔ اور دوسرے میں گھوم پھر کر کنکھیوں سے۔ جیسے ہم اسے دیکھ ہی نہ رہے

ہوں۔ اور قیاس یا قیافہ شناسی سے کام لے کر اس کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

پہلی قسم کی شناسائی نسبتاً آسان ہے۔ کیوں کہ ہم اپنے موضوع کو بالمشافہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے افکار و احساسات ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ہم ان کے متعلق رائے قائم کر سکتے ہیں۔ دوسری طرح کا جائزہ ایک بڑا ہی دل چسپ کھیل ہے۔ ایک زاویہ تلاش جس میں ہم دھندلکوں میں ہاتھ پاؤں مارتے، اَن جانے، اَن بوجھے رشتوں کا سہارا لیتے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ مطلب فن کے جوہر، اس کے تیور، اس کا لب و لہجہ، اس کا مشاہدہ، اس کے داؤ پیچ۔ یہ بھی تو اس شخصیت کا جزو ہیں اور بہت اہم جزو۔ کچھ عجب نہیں ہماری حقیقی دل چسپی انہی میں ہو۔ ہم اس صناع سے دو چار ہونا چاہتے ہیں جو پس پردہ بیٹھا ہوا یہ سارا طلسم پیدا کرتا ہے۔ کہیں یہ وہی چیز تو نہیں جسے "فن برائے فن" کہتے ہیں۔ وہ جمالیاتی قدریں جن کو ہم ٹھیک طرح پہچان نہیں سکتے اور ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے ہیں یا محض ثانوی اہمیت دیتے رہے ہیں۔

کوئی آرنلڈ، کوئی اقبالؔ یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے: یہ ہے ایک دانائے راز کا پیغام، یہ ہے اس کا تصور، اس کا نظریہ، وہ تفسیرِ حیات کرتا ہے۔ زندگی پر تنقید کرتا ہے۔ کائنات کا انکشاف کرتا ہے۔ مشاہدہ حق، معنی ہی معنی، مواد ہی مواد۔ یہی اس کا مقصود ہے اور اسی پر اس کی اہمیت موقوف ہے۔ مگر تصویر کا ایک اور پہلو بھی تو ہے۔ ان تمام امور کو اجاگر کرنے کے لئے کوئی آلۂ کار بھی تو لازم ہے۔ اور کوئی مصنف اس کی کوشش کرے یا نہ کرے، اس کی صلاحیتیں، اس کی تمام شخصیت ان لفظوں، پیرایوں، طریقوں، تشبیہوں، استعاروں میں ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی جنھیں وہ ان مقاصد کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس کا حقیقی منشا خواہ کچھ ہو، اس کی تخلیقی قوتیں اس سے عنانِ اختیار چھین لیتی ہیں۔ اور اس کی ذات کے ساتھ گنجینۂ معنی کی حریف بھی بن جاتی ہیں۔ ہماری توجہ نادانستہ اس کے افکار و احساسات کی بجائے کسی اور بات کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ اس اداکار کی طرف جو اپنی ترجمانی کے لئے طرح طرح کے ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ اور ہم اس کی ڈرامائی حرکات و سکنات میں خود بخود دل چسپی لینے لگتے ہیں۔ حرکات و سکنات اپنے اندر ایک ابدی دل چسپی کا سامان لئے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے اعصاب، ہماری جبلت ان سے تسکین پاتی ہے۔ اور ذوقِ فن اور تخیل کی حد تک تو یہ بلا شرکتِ غیرے ہماری توجہ کے طالب ہیں۔ شعور کی کسمساہٹیں، — ذہنی جھمیلے، دل کے ہنگامے، لاشعور کی کروٹیں، تیزیاں اور نرمیاں، پریشانیاں اور شادکامیاں، سکون و اضطراب، خلوتیں جلوتیں، مشاہدہ سب لکھنے والے کی پوری پوری داستان سناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں آلۂ کار کو نظر انداز کرنے میں فاش غلطی کی گئی ہے۔

آیئے ہم کچھ دیر کے لئے یہ بھول جائیں کہ کوئی فن کار اپنے خیالات و محسوسات کی شکل میں خود کیا کہتا ہے اور محض اس کی تحریر پر غور کریں۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ الفاظ کس طرح اپنے خالق کی غمازی کرتے ہیں۔ بدیہی طور پر نہیں بلکہ تجریدی طور پر۔ وہ نمونے جنھیں تجریدی کہتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح اہلِ ہنر کی مصوری کا انکشاف کرتے ہیں اور کسی معنی یا مقصد کی ترجمانی کئے بغیر محض خطوط، طرح ہیئت، ترتیب اور توازن سے اپنا جواز پیش کرتے ہیں جن کی حیثیت خالص فنی و جمالیاتی ہے۔ جو لوگ فن اور معنی کو لازم و ملزوم خیال کرتے ہیں، اس اہم حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ اربابِ فن نے کئی فنون — مصوری، سنگ تراشی، عمارت سازی —

ان کے معنی ومقصد سے بے نیاز نمونے پیش کرکے اس نظریہ کی بنیادی غلطی واضح کردی ہے۔ اور ہماری کلاسیکی موسیقی تو پہلے بڑی حد تک اس التزام سے آزاد تھی۔ عام دستکاریاں مثلاً مسروف پارچہ جات، زیورات وغیرہ اس سے ہمیشہ ہی آزاد رہے ہیں۔ بے ذوقِ آرائش نے کبھی کسی معنی کا تحمل نہیں کیا۔ خود دنیائے آب و گل میں لالہ و گل یا قوس و قزح خالص حسن ہی کے مظہر ہیں۔ جن میں کوئی معنی یا مقصد تلاش کرنا بے سود ہے۔ ہم ان سے اسی لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ وہ خوب صورت ہیں۔

اب دیکھیں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی تحریر سے ان کے متعلق کیا عیاں ہوتا ہے۔ ان کا رنگ طبیعت چند ہی پاروں سے ضح ہو جائے گا۔ لکھتے ہیں۔

"سادگی و پُرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنے نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اس کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر ہو یا تقریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہے:

یہ پارہ شاید مولوی صاحب نے اپنے ہی بارے میں لکھا ہے۔ اور اپنے مسلک کو پیش نظر رکھے ہوئے۔ صاف صاف، چچے تلے، ہلکے پھلکے الفاظ۔ کوئی لفظ بھاری بھر کم مشکل یا غریب نہیں۔ عربی فارسی الفاظ کی کوئی بھرمار نہیں اور جو ہیں وہ بھی بالکل ضرورت کے مطابق اور برمحل۔ سرسید اور حالی کے برعکس جن کے وہ ہم وضع اور ہم مشرب ہیں۔ وہ مولویانہ اور عالمانہ الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ نہ انگریزی الفاظ کا چاؤ ہے جس سے پڑھنے والوں پر رعب طاری کرنے کی کوشش ہو نہ عام بول چال کا اس درجہ شوق کہ وہ معمولی روکھے پھیکے یا بے کیف قسم کے الفاظ برتیں۔ وہ نہ نمود کے قائل ہیں نہ خاکساری کی دھن میں اپنے آپ کو گرانے پر آمادہ۔ اسی لئے نہ ان کے یہاں ٹیپ ٹاپ ہے نہ معیوب حد تک سادگی۔ نہ عالمانہ وفاضلانہ دھوم دھام ہے نہ چھچھورا پن۔ ہر انتہا سے دور۔ حشو وزوائد سے گریزاں، میانہ رو۔ دھیمی دھیمی رفتار۔ دھیمی دھیمی لے۔ نہ زیادہ اونچی نہ نیچی زبان صاف سیدھی سلجھی ہوئی۔ مگر ایسی نہیں کہ وہ خشک یا روکھی پھیکی ہو جائے۔

حالی کی تحریر زیادہ متین، مضبوط، گٹھی ہوئی اور بالعموم باوقار ہے۔ مولوی صاحب نے اس انداز کو چمکا کر زیادہ نفیس بنا دیا ہے۔ جس سے توانائی کم ہو گئی ہے ـــ اور یہ ایک بڑی وسیع قدر ہے جو حالی کو جوہر قابل اور انشا پرداز دونوں کی حیثیت سے زیادہ ممتاز کرتی ہے، لیکن سلاست و صفائی کافی بڑھ گئی ہے۔ اسی لئے جب ان کی طبیعت چمک اٹھتی ہے تو وہ ہمیں ایسے پارے بھی دے جاتے ہیں جن میں کہیں زیادہ نکھار پایا جاتا ہے۔

"مولوی سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے لیکن صوفی ہر ایک کے رنگ طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی رفتار ہوتی ہے اسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے ـــ وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں۔ جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے۔ مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اس میں صوفی کی جیت ہے۔"

یہ تو ظاہر ہے کہ مولوی صاحب آج کے نہیں کل کے ادیب ہیں،

وہ ایک پرانی محفل کی یادگار ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر میں بھی اسی دور کا رنگ روپ ہے اور اس کی وضع بھی ان کی اپنی وضع کی طرح ہے۔ لیکن زمانے کے نئے نئے تیور، نئے نئے رنگ دیکھ کر وسیع تجربے اور طبیعت میں لوچ لچک، نکھار نے تحریر میں بھی ایک صفائی، ایک جوت پیدا کر دی ہے۔ اور قدیم وضع کے ساتھ اس سے جدید تیور بھی جھلکتے ہیں۔

دیکھئے اوپر جو پارہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں الفاظ کس قدر بے ساختہ ہیں۔ اور اس کے باوجود کہ ان کو بڑی احتیاط سے چن چن کر رکھا گیا ہے۔ وہ بالکل بے تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ زبان اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ہر فقرہ پچھلے فقرہ کے ساتھ توازن پیدا کرتے ہوئے روانی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ پے در پے چھوٹے چھوٹے برجستہ ایک جیسے فقرے رفتار کو تیز تر کرتے ہیں جس سے خود لکھنے والے کے مزاج میں حرکت معلوم ہوتی ہے۔

آخری جملہ پر غور کیجئے۔ آج کل کا لکھنے والا اسے کیسے ادا کرتا۔ وہ اس میں جدید نفسیات کی بڑی بڑی مرعوب کن، بعید از فہم اصطلاحیں استعمال کرتا لاشعور، تحت الشعور، زیر نفسی اور خبر نہیں اور کیا کیا کچھ۔ مگر بابائے اردو نے کس طرح کوئی پیچیدگی پیدا کئے بغیر بات ادا کر دی ہے۔

بابائے اردو کے یہاں ایسے مواقع نسبتاً کم ہی آئے ہیں جب وہ پابندی وضع کو چھوڑ کر جولانی طبع پر آ جائیں۔ اور چمک دمک پیدا ہو۔ چنانچہ پیدا کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور وہ طبعاً اس کی طرف مائل بھی نہیں

وہ اسی وضع کو نباہتے ہیں جو ان میں اور ان کے "یارانِ سر ہوا" سرسید اور حالی میں مشترک ہے۔ ان بزرگوں کی طرح ان کی تحریر بھی یادگاری حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ اصلیت پرست تھے۔ ان کو تمام تر نفس الامر سے سروکار تھا۔ نمود طرازی، چلبلا پن، تیکھاپن، شوخی، طرح طرح کے داؤ گھات، کیف و رنگ، شاعری، زبان آوری، زیبِ داستان، اشارات و کنایات، کروفر، طمطراق، گھن گرج، سنسنی خیز، جوش وخروش، یہ سب ان کے مزاج سے بہت دور تھے۔ وہ بلند قسم کی سنجیدگی جو ٹھوس صداقت اور امر واقعہ میں رچ بس جاتی ہے، ان کی طبیعت پر پوری شدت سے غالب تھی۔ اس لئے حالی تو اس سنجیدگی کے خول سے شاذ و نادر باہر نکلتے میں تاوقتیکہ وہ وقتی طور پر اپنے استاد غالب کی زندہ دلی سے متاثر ہوکر ان کی رو میں نہ بہہ نکلیں اور ان کے لطائف و ظرائف کا ذکر کرتے ہوئے تھوڑی دیر ان کے لبوں پر بھی ہنسی نہ آجائے۔ لیکن سرسید فطرتاً خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ جو ایک کامیاب قائد کے لئے، جس کو ہر طرح کے انسانوں سے میل جول رکھنا پڑتا ہے، بہت ہی ضروری چیز ہے۔ بابائے اردو بھی حق پرست یعنی سنجیدہ مزاج ہونے کے باوجود بذلہ سنجی کے لطیف جوہر سے بہرہ ور ہیں۔ اور جب ان کی طبیعت کسی دل چسپ واقعہ یا خوش کن بات سے چٹک اٹھتی ہے تو وہ ہمیں ایک اور رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔
ایک بار خاطر کی حیثیت سے جو ہمیشہ بزرگانہ وعظ و نصیحت کرتے ہوئے—

"صاحبو! جنگ آزادی کے بعد ہمارے ملک پر ایک سخت آزمائش کا وقت آیا ہے—"

"نوجوانو! مجھے معاف کر دینا اگر کام کا لفظ زیادہ برا لگا ہو—"

(اگرچہ یہ طرزِ خطاب بھی ان کی ملنسار طبیعت، رکھ رکھاؤ، تپاک اور انسان دوستی ظاہر کرتا ہے جو ان کی پسندیدہ و محبوب شخصیت، سرسید کا طرۂ امتیاز تھی) بار خاطر ثابت نہیں ہوتا۔ دیکھئے وہ ان پاروں میں پابندیٔ وضع اور اوڑھنا دینے والی سنجیدگی کے دائرے سے کس طرح باہر نکل گئے ہیں۔

لیکن تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریز قوم ووٹ دیتی ہوئی پیدا

نہیں ہوتی تھی"

ایک بڑی خصوصیت ان میں یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے۔ گالی ان کا تکیہ کلام تھا۔ بے چارے مزدوروں پر اس کی خوب مشق ہوتی تھی گالی میں نئی نئی ایجادیں بھی کرتے تھے"

یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے گھٹا ٹوپ بادلوں میں اچانک بجلی کی لہر ——

بابائے اردو کی طبیعت میں ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ ہے۔ ایک ضبط، ایک وضع احتیاط۔ وہ اصلیت اور سلامت روی کے راستے سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے۔ نہ ان میں کائیاں پن ہے نہ ٹیڑھی چال چلنے کی طرف میلان۔

وہ جو بات کہنے میں برملا کہتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ۔ کیوں کہ وہ عیاری مکاری جانتے ہی نہیں۔ اسی لئے ان کی عبارت میں بھی کوئی انوکھا کرتب کوئی ٹیڑھی چال، کوئی باریک، کوئی الجھن نہیں۔ اور وہ سپاٹ ہونے کی حد تک صاف گو اور صاف بیان ہیں۔ شاید وہ کسی داستان کے لئے کچھ گھٹا دینا یا زیب داستان کے لئے بڑھا دینا کفر سمجھتے ہیں۔

کیوں کہ یہ حق کو چھپا کر ٹیپ ٹاپ کرنے کے مترادف ہے۔ الفاظ ان کے لئے محض الفاظ ہیں۔ وہ ان کے لغوی مفہوم سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان الٹی سیدھی دلالتوں سے نہیں جو مجاز سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر کہاں اور شاعری کہاں؟ شاعری تو محض رنگ آمیزی ہے، تصرّف ہے۔ شعری فکر کے معنی ہیں بات کو کسی اور ڈھب سے ادا کرنا، سوچ میں ایک ٹیڑھ پن، ایک مصنوعی ذھنی کاوش، ایک عارضہ۔ کوئی اصلیت پرست ایسا روگ نہیں پالنا چاہتا۔ وہ ذہن کو ایسے لاابالیانہ پن سے روکتا ہے۔ اس کی طبیعت روشنی کو روشنی ہی دیکھنا پسند کرتی ہے۔ توڑ پھوڑ کو رنگوں کی شکل میں نہیں دیکھنا چاہتی کیوں کہ یہ حقیقت سے گریز ہے۔ لہذا وہ تصویر سے بھی کوئی مس نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس میں حواس اور تخیل جیسے غیر عنصر داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا مطمح نظر صرف ایک ہے — تجرید۔ ایسے لوگ پیدا ہی نثر کے لئے ہوتے ہیں۔ بابائے اردو کہیں اتفاق ہی سے تصویروں میں بات کرتے ہیں۔ جیسے وہ بھول کر اس طرف نکل آئے ہوں۔

"اگر اس وقت سرسید نے انگریز کے ہتھیار اسی کی ڈھالوں پر نہ روکے ہوتے تو آج مسلمان قوم کا نشان تک نہ ہوتا۔ اس وقت انگریز اور ہندی چکی کے دو پاٹ بنے ہوتے تھے مگر سرسید قوم کو ان دو پاٹوں کے بیچ سے صاف بچا کر لے گئے"

"لیکن یہ چند روز کی بہار تھی۔ آفتاب اقبال گو غروب ہو گیا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا"

باباۓ اردو کے یہاں بھی ایسے تصویر پارے چند لمحوں کی ہی بہار ہوتے ہیں۔ یہ آتے ہی گزر جاتے ہیں۔ اور پھر وہی صاف چٹیل میدان۔

باباۓ اردو کی طبیعت جس طرح ایک سیدھی لکیر ہے، اسی طرح ان کی تحریر بھی ہے۔ اس میں دائیں بائیں، اوپر نیچے کوئی سمتیں نہیں۔ ایک مسلسل ہمواری ہی ہمواری ہے۔ نہ زیر ہے نہ بم۔ نہ اُتار نہ چڑھاؤ۔ نہ پیچ نہ خم، نہ ہچکولے نہ جھکولے۔ نہ ترت پھرت نہ ٹھاٹ باٹ۔ نہ کوئی دھیمی سی نوا ہے نہ گونج۔ نہ لااُبالیانہ پن نہ رومانویت۔ وہ الفاظ کے طوطے مینا نہیں بناتے۔ نہ ان میں ڈرامائیت ہے نہ میکانیئت۔ نہ لمبے چوڑے اُلجھے پیچ در پیچ جملے اور نہ پُرکار استعارے اور ترکیبیں۔ ان کی تحریر کیا ہے — بالکل اکہرا تار، نہ اس میں کئی کئی تاروں کی مرکب یافت ہے نہ گنجلک کیفیت۔ جیسے موضوعات کا ایک خاص دائرہ ہے ویسے ہی انشا کے طور طریق بھی ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ وہ ذرا بھی حقیقت سے اُبھر کر حسُن و جمال کی رنگین رومانوی دُنیا میں داخل ہو جائیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے نہ وہ شبلی بن سکتے ہیں نہ مہدی الافادی، نہ ابوالکلام آزاد، نہ بجنوری ان کے قلم سے کبھی "غیر فانیوں" "لوح سے تحت" "افتاں و خیزاں بجریں" جیسے طمطراق آمیز الفاظ نہیں نکل سکتے۔ یہ معمولی الفاظ لیجئے:۔ رقم طراز۔ جلوہ گر۔ شاہد رعنا۔ باباۓ اردو کے یہاں ایسے الفاظ بھی شاید ہی دکھائی دیں۔ اس لئے کہ یہ بھی من و عن اصلیت پر اضافہ ہیں۔ ان کی سنجیدہ طبیعت کدال کو کدال ہی کہنا پسند کرتی ہے۔ اسی طرح وہ گراں بار الفاظ و تراکیب سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اضافتیں، عطف، معلق الفاظ، مکررات اور

لچھے دار فقرے ان کی میانہ روطبیعت سے کوسوں دُور ہیں۔

ہاں کبھی کبھی اتفاق سے ایک آدھ فقرہ ایسا دکھائی دے جاتا ہے جس میں علمیت اپنا رنگ دکھا جاتی ہے۔

"طرح طرح کے توہمات، تعصبات اور اختلافات میں مبتلا تھے
اور بلاخوف لائم بڑی اخلاقی جرأت، دلیری اور باک سے وہ
بات کہہ دی"

یہاں بھی الفاظ کی کثرت اور تکرار کا جواز موجود ہے۔جس چیز کی طرف ہم خاص طور پر اشارہ کرنا چاہتے تھے وہ ایک ہی قسم کے الفاظ سے پیدا ہونے والی قافیہ کی آواز ہے۔توہمات۔تعصبات۔اختلافات کیوں کہ بابائے اُردو اس قسم کی معمولی زبان آوری اور گُونجار سے بھی گریز کرتے ہیں۔ہر ادیب کو خواہ وہ کتنا ہی اعتدال پسند کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی نمود کا شوق ہو جاتا ہے۔اور وہ کوئی بلند بانگ لفظ، کوئی انوکھی ترکیب، کوئی چست فقرہ برتے بغیر نہیں رہ سکتا۔کوئی ایسی بات جس سے چٹخارہ پیدا ہو، جو ذوق کو گدگدائے وجد و مستی پیدا کرے، تاکہ ان باتوں سے اس کی برائی ظاہر ہو۔ اس کے انا کی تسکین ہو، دل کی گرہیں وا ہو جائیں، نفسی اُلجھنیں دُور ہوں یا دوسروں پر رُعب طاری ہو اور اس کا سر بلند ہو۔ کہیں دُور وادئ خیال میں لے جائے یا فن کی نزاکت پیدا کرے۔ مگر بابائے اُردو کو یہ خواہش نہیں تڑپاتی۔ وہ نہ اس سے بہکتے ہیں نہ بہک سکتے ہیں۔ نہ سلگتے ہیں نہ بھڑکتے ہیں۔ ان کو خدا نے کفایت کا مجسمہ پیدا کیا ہے۔اس لئے ان کی تحریر بھی اسی کا نمونہ ہے۔ نہ ان کا تخیل بے قابو، نہ مزاج لااُبالی۔ ممکن ہے یہ ایک لحاظ سے محرومی بھی ہو اور معذوری بھی۔ ہم منتظر ہی رہتے ہیں کہ کب بیان غیر متوقع حدوں کو چھو لے۔ ایک ادیب کے اس جملے میں:۔

"مگر ابھی چرخ نیلی فام سے پرے اس کی شاعرانہ اختراعات فائقہ کے ایسے
دُور از چشم جزیرے بھی موجود ہیں جو بدستور دیدۂ انتظار وا کئے۔تازہ
دم قافلوں کی راہ دیکھ رہے ہیں"

مگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی۔اس لئے کہ جس سانچے میں بابائے اُردو کی طبیعت ڈھلی ہے۔ وہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ شروع ہی سے ایسی رفتار اختیار کرتے ہیں جس میں کمی وبیشی کی ضرورت پیش نہ آئے۔ بے شک ایسی تحریریں جن میں بے حد طمطراق ہو تھوڑی دیر کے لئے ہمیں مبہوت کر دیتی ہیں اور ان میں بعض فرقانی قسم کے اثرات ہوتے ہیں جو عام تحریر سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان میں

ایک بے پناہ شان جلالی پائی جاتی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تیز رفتاری طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے جیسے کسی تیز رفتار طیارہ میں پرواز کرنے سے سر چکرانے لگے۔ تب ہم محسوس کرتے ہیں کہ اونچی فضاؤں میں پرواز کرنے کی بجائے ٹھوس زمین پر میانہ روی زیادہ پُر لطف اور تسکین بخش ثابت ہوتی ہے۔ اس سے طبیعت ایک آسودگی، ایک فرحت محسوس کرتی ہے۔ لکھنے والے کا معتدل مزاج اور تحریر کی متانت ایک خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔ اس طرح ادیب کی طبیعت کا نظم و ضبط قاری کی طبیعت کا نظم و ضبط بن جاتا ہے۔ جو شعر و ادب کے اثر کا ایک اور پہلو ہے۔ کارلائل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے وہ بدہضمی کا شکار ہے۔

یہ پھٹ اڑا اڑا دھوں۔ تمام گولے بارود کی فضا۔ بابائے اردو کی تحریر اس کے برعکس ایک صحت مند جسم کی خبر دیتی ہے۔ اور یہی تندرستی صرف اس کی نوّے سال سے اوپر زندگی بلکہ سرگرم و مصروف زندگی اور غیر معمولی علمی، ادبی اور قومی سرگرمیوں کی راز دار ہے۔ نہ ان کے قویٰ مضمحل ہیں نہ عناصر میں بے اعتدالی ہے اور نہ دل ہی الجھنوں کا شکار۔

اگر کوئی ایسا شخص ہو جو نباضِ نفس (PSYCHIATRIST) کی طرح نباضِ اسلوب (STYLIATRIST) ہو۔ (اور یہ تجزیہ کچھ نبض ہی سے اندازہ لگانے کی بات ہے) تو وہ محسوس کرے گا کہ جس طرح انسانی نفس میں کوئی اُلجھن، کوئی پیچ یا رکاوٹ عمل میں مانع ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخصیت کو دو لخت بھی کر دیتی ہے، اس طرح ذہن میں بھی کوئی رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ یا اعصابی نظام ہی میں کوئی ایسی گڑبڑ یا گرہ پڑ سکتی ہے جو سوچ اور بیان کی بے ساختہ روانی میں مانع ہو۔ مثال کے طور پر محمد حسین آزاد کے بے تحاشا بولے جانے اور الفاظ کے طوطے مینا بنانے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ شخص آگے چل کر بہک نہ جائے۔ سو وہی ہوا۔ بہرحال اس ذہنی اور نفسی رکاوٹ کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے تناؤ۔ اس رکاوٹ پر غالب آنے کی کوشش لازماً دباؤ پیدا کرے گی۔ جو جسم کی اضطراری حرکات کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی طرح طرح کی کسمساہٹیں پیدا کرے گی۔ یہ باتیں تصنع کا پیش خیمہ ہیں۔ کارلائل کا جو فقرہ اوپر پیش کیا گیا ہے اُس سے کس طرح واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حروف، الفاظ اور آوازیں آپس میں لڑ رہی ہیں، رگ رگ اور ریشے ریشے میں رگڑ، تناؤ ہی تناؤ۔ جبھی وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں ایک دوزخ ہے دوزخ! اس کی تحریر کے دھاکے اس کی بین شہادت ہیں۔ جبھی اسے لکھنے میں بے حد زحمت کرنی پڑتی تھی۔ لکھنا اس کے لئے مستقل عذاب تھا۔ الفاظ میں ہر بے احتیاطی، ہر زیادتی، ہر خرابی، بے تکا پن، بے ڈھنگا پن، اور جملوں میں ہر جھول، ہر الجھاؤ، ان کی ٹوٹی وضع، بوجھل پن، بے تحاشا لمبائی، بے ہنگم پیراگراف،

دل و دماغ اور حواس اعصاب میں کوئی ایسا ہی بے کینڈا پن ظاہر کرتے ہیں۔ افراط ہو یا تفریط، بہرحال اعتدال سے دُور ہیں۔ زیادہ اور مشکل الفاظ کی بھرمار درحقیقت قدرت کا فقدان ظاہر کرتی ہے جتنا لکھنے والے کو اپنے آپ اور الفاظ پر کم اعتماد ہوگا اتنا ہی وہ اثر پیدا کرنے کے لئے زیادہ الفاظ برتے گا غریب اور بلند بانگ۔ تحریر میں تشنگی کا احساس اسے مبالغہ پر اکسائے گا۔ جو ظاہر ہے توانائی نہیں ناتوانی کی علامت ہے۔
یک گیرو محکم گیر۔ باکمال ادیب جسے اپنے آپ اور اپنی تحریر پر اعتماد ہو، کم سے کم الفاظ برت کر ان سے بھرپور اثر پیدا کرے گا۔ ہمارے یہاں ابوالکلام آزادؔ کی زبان آوری اور ڈاکٹر تاثیر کا دھمکی آمیز لہجہ بھی کچھ ایسی ہی ذہنی یا باطنی بندش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ان کے برعکس عبدالمجید سالکؔ، چراغ حسن حسرتؔ اور بابائے اردو ایسے لکھنے والے ہیں جن کے ذہن کی صفائی اور روانی میں کوئی چیز حائل نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پانی کی لہر بے ساختہ بہتی چلی آرہی ہو۔ اسی لئے وہ کاوش یا آورد سے کام نہیں لیتے۔ اور بظاہر انہیں عبارت میں کاٹ چھانٹ کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ قلم اٹھاتے ہی الفاظ امڈتے چلے آتے ہیں۔ اور بعینہ وہ بات ٹھیک پڑتی ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ نظرثانی سے بے نیاز۔ ان کے یہاں مبالغہ، تکلف یا کوئی غیر عادی بات نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سوچنے یا لکھنے میں کوئی بات آڑے ہی نہ آئے تو عبارت قدرتی طور پر بے تکان ہوگی۔ سرسری صحافتی بیان سے گزر کر ادبی ہوتے ہوتے ہوئے بھی ان کا طرز بیان سائنٹفک ہوتا ہے۔ صاف اور تیر بہدف۔ اس میں ایک کمی بھی ہوتی ہے۔ یہ کہ بیان زیادہ چست اور مضبوط نہیں ہوتا اور نہ وہ زائد خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کاوش ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ تاوان ہے جو انھیں اپنی حاضر طبعی کے لئے ادا کرنا پڑتا ہے اور بہت کاوش سے لکھنے والوں کو اُن پر فوقیت حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے۔ کیوں کہ طبیعت میں جس قدر ہیجان ہوگا، اتنے ہی لکھنے والے کے جوہر اور طبعی کیفیتیں زیادہ نمود پائیں گی۔ اس کا اسلوب زیادہ پُرکار ہوگا۔ یہاں ایک اور لطیف فرق بھی پیدا ہوتا ہے۔ سادہ اور پُرکار اسلوب ذہنوں کے مفرد و مرکب ہونے کی علامت ہے۔ یہ درحقیقت صناعانہ قدرت کا فرق ہے۔ سادہ ذہن میں اختراعی قوت لازماً کم ہوگی۔ اس کی نئی نئی رشتوں، ترکیبوں اور طرحوں تک پہنچ نہیں ہوتی۔ مرکب ذہن زیادہ خلاق بھی ہے اور صناع بھی۔ وہ اپنے ساز و سامان میں نئے نئے رشتے اور رابطے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جو زیادہ قدرت اور متنوع کمالات کی متقاضی ہے۔ فن جبھی پیدا ہوگا کہ ہم کوئی بات ادا کرنے کے لئے برجستہ الفاظ یا اسلوب تلاش کریں۔ اگر بات سیدھے سبھاؤ کہہ دی جائے تو اس میں فن کیا ہوگا؟ کیوں کہ ذہن کوئی حسن کارانہ اثر پیدا کرنے کے لئے کام ہی نہیں آتا۔ کیا ہم ایسی پُرکاری کے مقابلے میں سیدھی سادھی وضع کو "اسلوب"

قرار دے سکتے ہیں ؟ اسلوب کے لئے ایک شرط ضروری ہے ۔ پیش کش میں حکمت عملی یا چابک دستی ۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو کہ لکھنے والے نے اثر پیدا کرنے کے لئے کوئی اچھوتا طریقہ برتا ہے ۔ وہ لفظوں کے انتخاب، ان کے استعمال، دروبست، نشست و ترتیب اور تحریر کی وضع و ہیئت میں کوئی خاص بات پیدا کرتا ہے ۔ جیسی تحریروں کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ عموماً سیدھے سبھاؤ ہی لکھی جاتی ہیں ۔ اس لئے وہ بمشکل اسلوب کے تحت آ سکتی ہیں ۔ اور نہ وہ کچھ ایسی ممیز ہی ہوتی ہیں ۔ اسلوب کے لئے یہ شرط تو لازم نہیں گردانی جا سکتی کہ اس میں ضرور کوئی سبھاؤ ہو یعنی جو بات کہی جائے بڑے ہی نفیس انداز سے کہی جائے جس سے لکھنے والے کا سلیقہ اور استادی ظاہر ہو ۔ اسلوب کی نوعیّت صاحب تحریر پر موقوف ہوتی ہے ۔ اور وہ اپنی افتاد طبع اور صلاحیتوں کے مطابق ہی اپنی نگارش میں کوئی خاص انداز پیدا کر سکتا ہے ۔ اس کا سبھاؤ اسی مخصوص نفاست یا خوش اسلوبی پر موقوف نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کے تحت ایک نرالی طرح اور امتیاز پر موقوف ہے ۔ اور یہ پُرتکلف سے پُرتکلّف تحریر میں بھی موجود ہو سکتا ہے جس میں سبھاؤ کی کوئی علامت نہ ہو ۔ اسلوب کی برجستگی کا دار و مدار انشا پرداز کے مزاج اور طبعی جوہروں کے مطابق مطلوبہ مضمون کی ادائگی پر ہے جس سے کوئی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوں ۔ بابائے اُردو کی تحریر اس کی نوع سے الگ ایک معروضی حیثیت رکھتی ہے ۔ والٹر بیگ ہاٹ نے سادہ و جلیل اسالیب کا موازنہ کرتے ہوئے بالآخر سادہ اندازِ بیان ہی کو ترجیح دی ہے ۔ کیوں کہ اس کی عنصری وضع میں ایک قدرتی ادا ہے جس سے پُرجلال انداز محروم ہے ۔ پھر بھی مرکب موسیقی کی طرح مرکب اسلوب سے بھی زیادہ مخترع شعور ظاہر ہوتا ہے ۔ جو متعدد اجزا کو ترتیب دینے اور آپس میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ وہ موسیقی ہی کی اصطلاح میں آرکسٹرا کا سا تنظیمی اثر پیدا کرتا ہے جو ترقی یافتہ تعمیری شعور کے بغیر ممکن نہیں ۔ سادہ شعور رکھنے والا صرف اُستھائی سے مس رکھتا ہے ۔ انترہ نہیں اٹھا سکتا ۔

اگر اس سلسلہ میں ہم نے ایک بات بیان نہیں کی تو کچھ بھی نہیں کیا ۔ یہ کہ بابائے اُردو سنجیدگی ہی نہیں بذلہ سنجی میں بھی سرسیّد کے جانشین ہیں ۔ اور بالطبع لطائف کی طرف مائل ۔

ان کا ذہن خود بخود حرف و حکایت کی طرف نکل جاتا ہے ۔ اور ہم ان کی باتوں میں بڑے بوڑھوں کی داستانوں کا سا لطف پاتے ہیں ۔ اور پند پیر دانا کا وعظ و نصیحت بھی سعدی کا سا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔ ایک جہاں دیدہ پیر کہن سال کی زندگی اس کے ماضی ہی

کے پر تو پر مشتمل ہوتی ہے۔ وہ نئی نسلوں کو اپنے قصّے کہانیوں اور جادو بیانیوں سے مسحور کرتا ہے۔ (شاید اسے کمزوری پر بھی محمول کیا جائے کیوں کہ اس سے ذہن کا وژن فکر سے ہٹ کر سہاروں پر آ رہتا ہے) جو اس کی سو سال کے لگ بھگ زندگی کا حاصل ہیں۔ بابائے اردو باتیں کرتے کرتے کس طرح آپ ہی آپ چٹکلوں اور لطیفوں پر آ جاتے ہیں۔ جس سے ان کی بات چیت میں بڑی پُر لطف چہک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ سرسیّد کی روحِ جواں، ان کی بذلہ سنجی بدستور زندہ ہے۔ اور بابائے اردو کی باغ و بہار طبیعت ان کی نمائندگی کرتی ہے۔

مگر کبھی کبھی اس پیر نود و ائد سالہ میں جوانی بھی عود کر آتی ہے۔ اس کی خاکستر سے چنگاریاں چھٹنے لگتی ہیں۔ اس کی ذکاوت پوری طرح لو دے اٹھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی شدید جذبہ یا تحریک کے تحت وہ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے دل و دماغ کی رگیں تن جاتی ہیں۔ اس کے جذبات کو یک بیک اشتعال لک ہوتی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی بات اس کو برہم کر دے۔ اور یہ اردو کے سوا اور کون ہو سکتی ہے! اس زبان ــــ بابائے اردو کی واحد محبوب ــــ پر کوئی آنچ آئے۔ اور وہ خاموش رہیں؟ وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چپ چاپ، صلح پسند، نرم خو ہستی جس کی بردباری اور تحمل پر ہم چھوٹے ہوئے تھے، یک دم تلملا اٹھتی ہے، اس کا سارا وجود آگ بگولا ہو جاتا ہے، چہرے پر خشونت کے آثار شدید تر ہو جاتے ہیں، سر سے پاؤں تک صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم! اس کے منھ سے شعلے لپکتے ہیں، اس کی طنزیہ حس جو عموماً اس کی بردبار طبیعت کے ضبط میں رہتی ہے، تیز ہو جاتی ہے۔ ایسے عوامل اس کی تحریر میں بے پناہ تیکھا پن پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی نشتریت جو کند رگوں کو بری طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس کی طعن و تشنیع کبھی کبھی جھنجھلاہٹ یا بوچھاڑ کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس سے ایک نیا عبدالحق پیدا ہوتا ہے۔ مولوی اور ڈاکٹر
نہیں بلکہ ایک محبوب کی آن پر مر مٹنے والا عاشق۔ عام
عبدالحق سے کہیں زیادہ توانا اور پُرجلال۔ ایک نئے توجہ

کا مستحق۔ وہ نرم دمِ گفتگو، یہ گرم دم کارزار۔ اُردو کے
سلسلہ میں اسے ذرا چھیڑ دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔
اس کی زادی و بے باکی جو معتدل لمحات میں صرف صداقت
و انصاف کی خاطر سنجیدہ تحریر کے لئے وقف رہتی ہے،
اس شدّت سے مظاہرہ کرتی ہے جیسے ایک طوفان برپا ہو؛
یہ وہ آزاد روی اور خشونت ہے جو زندگی میں کسی انتہا
تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ اگر جلوت میں نہیں تو خلوت
ہی میں سہی۔ تجرد کی حد تک! ایسے موقعوں پر بابائے مِلّت
کی تحریر اُن کے اندرونی ہیجان کا پورا پورا نقشہ پیش کرتی
ہے۔ دل کے شعلے زبان کے شعلوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔

یہ شعلے، یہ شبنم ایک ہی ذات میں! جوئے شیر
بھی اور جوئے آتشیں بھی۔ مگر ہماری زبان، ہمارے ادب،
ہماری قوم کو ان دونوں کی ضرورت ہے اور رہے گی۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان کا پندرہ روزہ ترجمان۔

قومی زبان

انجمن کا پندرہ روزہ اخبار جو اپنی
سنجیدہ تحریر، وقیع رائے اور دلچسپ علمی و
ادبی مضامین کے لئے مشہور ہے۔ اُردو
زبان و ادب سے متعلق مختلف تحریکوں
اور نئے ادبی رجحانات سے واقفیت
رکھنے کے لئے اس کا مستقل مطالعہ لازمی ہے

چندہ سالانہ
پانچ روپے

فی کاپی
۲۵ پیسے، انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی

ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی

مجاہدِ اُردو

"مرنے کو کہو تو مرجاؤں لیکن بے کسیٔ زبان پر رونا آتا ہے"
(ڈاکٹر عبدالحق)

"یہ اُردو دوستی اور ظرافت کا کیا ذائقہ دار مرکب ہے، جس کا نام عبدالحق نہیں انجمن ترقی اُردو ہے۔"
(سیّد ہاشمی فرید آبادی)

مندرجہ بالا اقتباس کے بعد اب میں آپ کو انجمن ترقی اُردو ہند کی کہانی میں بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کی ہمت و ہمدردی، خلوص و ایثار اور عزم و استقلال بتادوں کہ جن کا سرمایہ زیست "انجمن ترقی اُردو" ہے۔

۱۹۰۲ء میں کنگ ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کی تقریب میں جب لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے دہلی میں شاہی دربار منعقد کیا اور نواب محسن الملک بہادر نے اس موقع پر "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" (دسمبر) منعقد کرائی جس کی صدارت ہز ہائنس سر آغا خاں نے کی تھی۔ تو اس کانفرنس کے انعقاد کے نتیجہ میں چند شعبے قائم کرنے کا تصفیہ کیا گیا جس میں ایک شعبہ "انجمن ترقی اردو" بھی تھا۔ اس کے بعد ضمنی طور پر جنوری ۱۹۰۳ء میں اس کی ابتدا ہوئی۔ جس کے حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے

۱- مسٹر آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔ صدر

۲- شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد۔ نائب صدر

دیگر عہدہ دار

۱- شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ۔

۲- شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

پہلے پہل سیکرٹری کے عہدہ پر مولانا شبلی نعمانی کا انتخاب ہوا جن کی وجہ سے انجمن ترقی اردو کو کافی ترقی ہوئی۔ اور عوام میں اس کا جوش اُبھرا۔ ہر قوم و مذہب کے لوگوں نے اس انجمن کی ترقی اور درازیٔ عمر کے نعرے لگائے خصوصاً مولانا شبلی نے جب معترضین کو یہ منہ توڑ جواب دیا کہ انجمن کسی خاص فرقہ یا شخص کی نہیں بلکہ ہر اُس آدمی کی ہے جو اس سے محبت کرتا ہے۔ تو اُس کی ملک گیر اہمیت اور ابھاگر ہوئی۔ چنانچہ ترجمہ کا پہلا انعام منشی نرائن پرشاد کو دیا گیا جو "رہ نمایان ہند" کے مترجم تھے۔ اس ترجمہ میں کرشن جی اور گوتم بدھ کے تذکروں کے علاوہ ہندو مذہب پر بھی تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ اس عمل سے مخالفین و معترضین اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مزید ایک رکن کا اضافہ ہوا۔ جس پر تہال چند رئیس میرٹھ کا انتخاب ہوا۔ اس طرح اس کا پیدائشی سال بہت شاد و کامیاب رہا۔

لیکن پہلے ایک سال کے بعد ہی اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی جب کہ مولانا شبلی نعمانی "ندوہ" کے دیوانے ہو گئے اور ان کی توجہ انجمن سے ہٹنے لگی۔ اور اُس کی حالت روز بہ روز خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ چار و ناچار مولانا کو معتمدی کے عہدے سے استعفیٰ دے دینا پڑا۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں مولوی حبیب الرحمان شروانی یعنی نواب صدر یار جنگ بہادر نے انجمن کی معتمدی کی باگ ڈور سنبھالی۔ نواب صاحب کو اس سے خلوص تو تھا لیکن انہیں یہ خدمت راس نہ آئی۔ مجبوراً وہ بھی انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ حسنِ اتفاق سے اب انجمن ایک ایسے بزرگ محسنِ قوم کے ہاتھ میں آئی جو اگر دستِ اجل سے مہلت پاتے تو ضرور کچھ نہ کچھ کر دکھاتے۔ لیکن مولوی عزیز مرزا تو پا بہ رکاب نکلے۔ اس طرح انجمن ترقی اردو بے یار و مددگار رہ گئی۔ اور اس گردش میں اُس کی ساری توانائیاں اور رعنائیاں رو بزوال ہو گئیں۔ اس افراتفری میں کوئی دس برس گزر گئے۔ اور اس کی حیثیت ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک بے جان شعبہ کی ہو کر رہ گئی۔ اس کی سالانہ آمدنی برائے نام پانچسو روپے جاریہ مقرر تھی۔ جو کبھی ملتی اور کبھی نہ ملتی تھی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس کا وجود ہی مشتبہ ہونے لگا۔ کیوں کہ اس کے قیام کا جو مقصد تھا، وہ تقریباً نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اور پھر جب اس کی سنبھال اور دیکھ بھال کے لئے قرعہ اندازی ہوئی۔ تو یہ ایک ایسے مستقل مزاج، راسخ الاعتقاد، دھن کے پکے، کام کے دیوانے اور خواب و خیال کو عملی جامہ پہنانے والے شخص کے ہاتھ میں آئی۔ جو بعد کو عبدالحق نہیں بلکہ انجمن ترقی اردو کے روپ میں

"بابائے اُردو" کہلائے۔ بقول بابائے اُردو کہ:-

"میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہوگیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا۔ خواہ میں سیکرٹری رہوں یا نہ رہوں۔"

(ماخوذ از جوہر عبدالحق نمبر ص۵۶)

انجمن کے جائزہ میں جو اثاثہ ملا۔ اُس سے اُس وقت کی انجمن کا پوشیدہ راز عیاں ہوتا ہے جس میں ایک دو ٹوٹے ہوئے قلم، ایک رجسٹر اور ایک بوسیدہ و شکستہ صندوق تھا۔ جب بابائے اردو نے یہ سرمایہ انجمن سے حاصل کر لیا تو اس کے بعد انہوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ اپنی سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو ۱۹۱۳ء میں بتاتے ہیں:-

"میں نے ڈرتے ڈرتے اس بارگراں کو اپنے ذمہ لیا۔ کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری ہے اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ اُردو زبان میں علوم و فنون لانے کے لئے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں ماہر ہوں۔ اور ایسے لوگ ہماری قوم میں شاذ و نادر ہیں۔ دوسری مشکل اس کام میں کافی سرمایہ بہم پہنچانے کی ہے یہ کام اس قدر بڑا، اس قدر وسیع اور ایسا اہم ہے کہ جب تک ہزاروں نہیں لاکھوں کا سرمایہ نہ ہو اس کا خاطر خواہ چلانا ناممکن۔ تاہم چند مہینوں میں اپنی بساط کے موافق جو کوشش اس بارے میں میں نے کی ہے۔ اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس شعبہ کا کام استقلال اور ہمدردی سے چلایا جائے تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ چند سال بعد کانفرنس کا یہ شعبہ سب سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو۔"

(ماخوذ از رپورٹ انجمن ترقی اردو بابتہ ۱۹۱۳ء ص۳)

بابائے اُردو کی مندرجہ بالا رپورٹ سے انجمن کے موقف (جس میں مالی حالت بھی شامل ہے) کے علاوہ بابائے اُردو کی جواں ہمتی اور عزم کا ثبوت آنکھوں دیکھے حال کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بابائے اردو نے انجمن میں چند تبدیلیاں کیں۔ اور رکنیت سازی کی مہم بھرپور جوش و خروش اور ولولے سے شروع کر دی۔ جن کے بعض اہم نکات یہ ہیں۔

۱۔ اس کی سرپرستی کے لئے اُمرا اور روسا کو چنا جو یکمشت ایک ہزار روپے کا نقد عطیہ دیں۔

۲۔ ارکان حامی کے لئے ایسے اشخاص کو قبول کیا جو یکمشت پانچ صد روپے دیں۔

۳۔ ارکان شوریٰ کے انتخاب میں ایسے نامور ارباب قلم اور صاحبانِ علم و فن کی خدمات حاصل کیں جن سے انجمن کی بنیاد

مستحکم ہوئی۔

۴۔ بدل اشتراک کے سلسلہ میں معاون ارکان کو ہی جمع کیا حتیٰ کہ رکنیت سازی کے لئے ایک روپیہ کی معمولی رقم مقرر کر دی، بلکہ اورنگ آباد کے مقام پر تو دو دو چار چار آنوں کی مرادی رقموں کو بھی قبول کیا۔

اس طرح بابائے اردو ہاتھ دھو کر انجمن کے استحکام اور اس کی ترقی کے پیچھے پڑ گئے، اور یہیں سے انجمن کی ترقی شروع ہوئی۔ ختم سال تک کافی سرمایہ جمع ہو گیا۔ ایک طرف انہیں فراہمی سرمایہ کی دھن تھی تو دوسری طرف انہوں نے اپنی توجہ سرمایہ داروں کی تلاش، اور اس کی طباعت اشاعت پر مبذول کی۔ ابتدا میں یہ سرگرمیاں اورنگ آباد میں شروع ہوئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان میں دور دور تک پھیل گئیں۔ مولوی صاحب نے خود دورے کئے اور اراکین مہیا کئے۔ اور دوسروں میں ترقی اُردو کا ولولہ پیدا کیا۔ اس کے علاوہ اس انجمن کو جاندار بنانے کے لئے نواب عماد الملک بہادر کی سرپرستی بھی حاصل کی۔ جب کہ وہ نواب میر یوسف علی خان سالار جنگ بہادر مدار المہام وقت ریاست حیدرآباد دکن کے مشیر خاص تھے۔ عماد الملک کی ذات سے انجمن کو بہت فائدہ پہنچا۔ وہ زندگی بھر انجمن سے برابر دلچسپی لیتے رہے اس کے بعد انجمن کا ذکر اخباروں میں بھی ہونے لگا۔ اور دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ ایسے وقت بابائے اُردو نے دن کو نہ دن جانا اور نہ رات کو رات سمجھا۔ حتیٰ کہ اپنی صحت کا خیال بھی نہ کیا، رات دن اسی کی دھن۔ اسی کی مشکلات۔ اسی کی اُلجھن اور اسی کی پریشانیوں میں لگے رہتے تھے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ خط و کتابت کرنے کے علاوہ جاریہ نمبر تک خود ہی ڈالا کرتے تھے۔ خود ہی خاکے کھینچتے اور بناتے، ان پر پہلے خود عمل کرتے اور پھر دوسروں کو اس پر عمل پیرا کرتے۔ خود ہی مخدوم اور خود ہی خادم تھے جس نے ان کی ذات اور انجمن سے دوئی کا فرق مٹا دیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا۔ انجمن کا قصہ لے کر بیٹھ جاتے۔ حتیٰ کہ بات میں فریاد کی سی خو آ گئی۔ دلی لگن تپش بن کر نکلنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ دکن نواب میر عثمان علی خاں نے اس انجمن کی سرپرستی قبول کر لی۔ نواب کا فرمان جو اس خصوص میں جاری ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "انجمن ترقی اردو کا سرپرست ہونا میں بہت خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہوں اور اس انجمن کے مقاصد کی کامیابی کا میں دلچسپی سے خواہاں ہوں۔
>
> فرمان واجب الاذعان
>
> اعلیٰحضرت عثمان علی خان بہادر"

اس سرپرستی کے ساتھ ساتھ نواب عماد الملک بہادر کی تحریک پر حکومت سرکار عالی نے انجمن کو سالانہ بارہ سو روپے مالی امداد دینا منظور کر لیا۔ اس وقت کے مشہور اخبارات و رسائل مثلاً زمیندار، وکیل، خطیب، عصر جدید، نیر اعظم، مساوات، صداقت، ذوالقرنین، دلگداز، ظل السلطان اور الناظر وغیرہ نے بھی انجمن کی تائید و حمایت کی پھر

کیا تھا انجمن دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور یہ سب نتیجہ تھا بابائے اُردو کے خلوص نیت اور جوشِ عمل کا۔ کام ہی اُن کی جان اور کام ہی ان کا ایمان جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔

"کام سے راحت ملتی ہے۔ راحت ایک رُوحانی مسرت کا نام ہے۔
اور کام ایک رُوحانی مسرت بخشتا ہے، اور یہ مسرت ہی انسانیت
کی معراج ہے"

(ماخوذ از گفتگو عبادت بریلوی و ڈاکٹر عبدالحق)

اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں سر اکبر حیدری سابق وزیر اعلیٰ ریاست حیدرآباد دکن کے زمانے میں انجمن کو پانچ ہزار روپے سالانہ کی گراں قدر رقم حکومت کی جانب سے منظور ہوئی اور فرمانروائے بھوپال نے بھی ماہانہ پچاس روپے کی امداد مقرر کی۔ ان مستقل عطیات سے انجمن میں جان پیدا ہوگئی۔ اسی زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا حیدرآباد دکن میں سب سے بڑا عملی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کا ڈول ڈالنا ہے۔ پس پردہ بابائے اُردو نے جامعہ عثمانیہ کے قیام میں جو خاموش کوشش کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اور اب یہ راز فاش ہوچکا ہے۔

ایک طرف انجمن کی مالی امداد میں اضافہ ہوتا گیا تو دوسری طرف اس کی رکنیت سازی اور ان کی کتابوں کی اشاعت میں بھی ترقی ہوئی، اور اس کا سالانہ چندہ بارہ ۱۲ روپے کے بجائے چھ ۶ روپے کردیا گیا۔ دورانِ رکنیت انجمن کی مطبوعات نصف قیمت پر دی جانے لگیں۔ یہ اسکیم بہت کامیاب ہوئی۔ جس کا آئندہ مالیہ پر بہت عمدہ اثر پڑا۔ اس کے نتیجہ میں انجمن کی نشر و اشاعت کے کام میں اضافہ ہوا۔ اُسی زمانے میں دوسری زبانوں کے چند قابل ذکر شہ پارے بھی اردو میں منتقل ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اورنگ آباد کی آب و ہوا، انجمن کو خوب راس آئی، اور اس کا حلقہ اثر آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیل گیا۔ اورنگ آباد کے علاوہ دوسرے اہم مقامات پر بھی اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ اورنگ آباد میں انجمن کے لئے آبادی سے دور ایک موزوں مکان رابعہ دورانی کے مقبرہ میں حاصل کیا گیا۔ جس کا نام "اردو باغ" رکھا گیا۔ اور اس کا افتتاح سر اکبر حیدری سابق وزیر اعلیٰ نے کیا۔

انجمن کا ایک ذاتی پریس بھی قائم ہوگیا اور ۱۹۲۱ء میں سہ ماہی رسالہ "اُردو" کا اجرا عمل میں آیا جو اب بھی جاری ہے اور برعظیم کا ایک معیاری پرچہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مولوی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے جس کے بارے میں منشی پریم چند مرحوم نے کہا تھا کہ:۔

"یہ سب رسالوں کا قافلہ سالار ہے"

۱۹۲۴ء میں انجمن کا اپنا "ٹائپ پریس" بھی ہوگیا تھا۔ اس کے قیام کی وجہ سے نہ صرف انجمن کی طباعت کا کام آسانی سے ہونے لگا۔ بلکہ باہر کی مطبوعات بھی طبع ہونے لگیں۔ ۱۹۲۹ء میں "سائنس" سہ ماہی جس کو مولوی محمود احمد خاں

پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ انجمن سے طبع ہونے لگا۔ اور ۱۹۳۰ء میں "دربیہ عثمانیہ" کے نام سے اُردو کی تمام نصابی کتب اسی انجمن سے شائع ہونے لگیں۔ اس تحریک میں مولوی سجاد مرزا کا بھی بڑا دخل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بابائے اُردو نے کھود کھود کر اُردو کی جڑوں کو تازہ کیا اور اپنے تحقیقی کارناموں سے اُردو ادب کی تاریخ کو کئی سو سال آگے کر دیا۔ اس ذیل میں قلمی نسخوں کی چھان بین نادر کتابوں کا ذخیرہ اور دوسری زبانوں کے ترجمے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جب انجمن کی شاخیں چاروں طرف پھیل گئیں تو اس کی بنیادی تعمیر کو وسعت دی گئی اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بابائے اُردو نے ہر طرح کی زحمت برداشت کی کبھی خطیب بن کر اُردو زبان کی درد بھری کہانی سنائی تو کبھی مقرر کی حیثیت میں جوش و خروش سے گھر گھر اُس کا پیغام پہنچایا اور ہر اُس موقع سے فائدہ اٹھایا جس میں انجمن ترقی اُردو کو چھوٹا سے چھوٹا فائدہ نظر آیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء کا وہ تاریخی دہلی کا مشاعرہ جو مرزا فرحت اللہ بیگ کا زندۂ جاوید شاہکار ہے۔ اس کو پہلی مرتبہ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق نے اورنگ آباد کالج ڈے کے موقع پر اسٹیج کرایا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اسٹیج ڈائرکٹر تھے اور مرزا عصمت اللہ بیگ نے مرزا غالب کا پارٹ ادا کیا تھا۔ جس میں وہ بالکلیہ غالب کی طرح ڈاڑھی، مونچھ، کلاہ پاپاخ، بر کا ریشمی پاجامہ، انگرکھا اور جامہ وار کا چغہ پہنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس ٹھاٹھ کا ڈرامہ تھا کہ اس کی تصویریں بھی لی گئیں تھیں۔ جب اس مشاعرے کی ایک تصویر مہاراجہ سر کشن پرشاد آنجہانی کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے دکھائی تو مہاراجہ کے آنسو بے اختیار نکل آئے اور فرمایا کہ یہ بھی اُس مصور فطرت کی قدرت تھی۔ کہ ان تمام شعر و سخن کے بادشاہوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع دیا، پھر یہ تصویر بھی لی گئی۔ وہ تصویر فرحت کے پاس پہنچی، اُسے دیکھ کر پھر تم نے مشاعرہ لکھا اور پھر آج ہمیں اُن کی زیارت کرنے کا موقع ملا — مرزا فرحت نے کہا کہ جناب! یہ بزرگ اصل نہیں ہیں۔ یہ سب کے سب نقلی ڈاڑھیاں لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اس مشاعرے کے تمام واقعات سنائے۔ تو مہاراجہ بہت مسکرائے، اور فرمایا کہ مرزا صاحب! یہ مشاعرہ تو ہمارے محل میں بھی کیجئے۔ اسے دیکھ کر میرا دل تو تڑپ گیا۔

اس مثال سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔ کہ انجمن ترقی اُردو کے تحت جو کام ہوا کرتے تھے۔ ان میں خلوص اور محنت کا کس قدر وافر حصہ ہوتا تھا کہ نقل کو اصل کر دکھاتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں انہیں بعض مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں دو مسئلوں پر توجہ دینی پڑی۔ ایک تو یہ کہ انجمن ترقی اُردو کی علمی و ادبی اور نشری خدمات، دوسرے تحفظِ زبان کا مسئلہ پھر ایک سال کے بعد علی گڑھ کے مقام پر ایک "کل ہند کانفرنس" منعقد ہوئی تھی جس میں انجمن کے مستقر کی تبدیلی کے مسئلہ پر حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

۱۔ انجمن کی شاخیں ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی ہیں جن پر نگرانی رکھنے اور سرگرمی پیدا کرنے کیلئے دہلی کا مرکز

موزوں رہے گا۔

۲۔ مخالف ہواؤں کی روک تھام کا بھی بندوبست کیا جائے۔

۳۔ یہ کل ہند انجمن بن چکی تھی۔

۴۔ انجمن کا اشاعت خانہ (Publishing House) وسیع پیمانے پر دلی میں قائم کیا جائے۔

ان مقاصد کے تحت انجمن کے چلانے کے لئے مرکزی مقام بہت موزوں و مناسب تھا۔ اس لئے ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوا

(ماخوذ از "ہماری زبان" ۱۵ فروری ۱۹۵۲ء ص۳)

انجمن کے صدر دفتر کے نقل مقام کے بعد بابائے اُردو نے مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل میں شاخوں کی نگرانی اور ان کی سرگرمی و نشر و اشاعت پر پوری پوری توجہ صرف کر دی۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں زبان "اُردو" پر ذرا بھی اثر پڑتے دیکھا۔ دوڑ دھوپ شروع کر دی، بند مدرسے کھلوا دیئے۔ اساتذہ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں دہلی میں نوجوان کی تربیت کا انتظام کیا۔ وقت بے وقت حاکمان وقت سے ملتے ملاتے رہتے اور اردو کے تحفظ، اشاعت، ترقی، تکمیل و تحقیق سے کبھی منہ نہ موڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلا مبالغہ کشمیر سے راس کماری تک اور پشاور سے چاٹگام تک انجمن ترقی اُردو کی شاخیں پھیل گئیں یہاں تک کہ شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ٹراونکور اور کوچین کی انجمنوں نے وہ کام انجام دیا اور ترقیاں کیں کہ تاریخ انجمن ترقی اُردو اس کی شاہد ہے۔ نیز خود بابائے اُردو نے راس کماری میں سمندر کے کنارے بچوں کو اُردو تعلیم دی۔ مگر سب سے زیادہ موثر کام چھوٹا ناگپور میں ہوا جہاں رومن کیتھلک مشنریوں کی تعلیم کا تسلّط، اثر و رسوخ تھا۔ وہاں انجمن نے وہ یادگار تاریخی کارنامہ انجام دیا کہ خود ان مشنریوں کے لڑکے اُردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ سی، پی میں تو انجمن کا کام ایسا چمکا کہ جہاں اُردو کا نام و نشان نہ تھا وہاں کئی اُردو مدارس قائم ہوئے۔ مرہٹی کے ساتھ ساتھ اردو ہی کا بول بالا ہوا۔ اُردو مشاعرے ہوئے۔ کانفرنسیں ہوئیں، مباحثے اور تقریریں ہوئیں۔ غرض اُردو زبان کی نشر و اشاعت نے ایسی طاقت پیدا کر لی تھی کہ وہ سارے صوبے پر چھا گئی تھی۔ اس سلسلہ میں بابائے اُردو نے "قومی زبان" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ کہ کچھ حصہ ناظرین کے مطالعہ کے لئے دیا جا رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"افسوس کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس نہیں کہ اردو میں کیسی کیسی قوتیں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ صرف زبان نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جہاں اس کی اشاعت زیادہ ہے وہیں قومی عصبیت، حمیت اور روشن خیالی بھی زیادہ اور جہاں اس کا رواج کم ہے وہاں قومی عصبیت اور روشن خیالی بھی کم ہے۔"

(ماخوذ "قومی زبان" یکم مئی ۱۹۵۲ء ص۱۵)

انجمن کا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اس کی اشاعت میں ادب، تاریخ، تنقید، فلسفہ، سائنس، لغات، اصطلاحات، فضاعت تعلیم، سوانح، معلوماتِ عامہ، معاشیات، صرف و نحو اور سیاسیات کی اعلیٰ اعلیٰ کتابیں پیش کی جائیں۔ چنانچہ اس مقصد میں انجمن ترقی اُردو کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ جہاں آثاثہ میں اس کا ایک صندوق تھا وہاں اب سیکڑوں الماریوں کی ضرورت درپیش ہوئی۔ انجمن سے ایسی ایسی نایاب کتابیں شائع ہونے لگیں کہ جس کا گمان کسی کو نہ تھا۔ اور ایسے ایسے انمول رتن سامنے آئے کہ ان کا شمار "ادب عالیہ" میں ہوگیا۔ اس کے علاوہ اُردو کے قدیم قلمی مخطوطات لاتعداد جمع ہوگئیں اور مختلف مجلّے مثلاً "ہماری زبان" "اُردو سہ ماہی" اور "معاشیات و سائنس" شائع ہونے لگے۔

غرض بابائے اُردو نے انجمن ترقی اُردو کے لئے اپنا تن، من اور دھن سب کچھ وقف کردیا اور بقول نواب مہدی یار جنگ وہ "فنا فی الاردو" ہوکر "بقا بالاُردو" کا درجہ حاصل کرچکے ہیں۔ جب ملک تقسیم ہوا تو ڈاکٹر عبدالحق نے پاکستان کو اپنا ملک بنالیا۔ اور وہاں "اُردو" کے لئے آزادی سے کام کرنے لگے۔ از سرِنو "انجمن ترقی اُردو" کی بنیاد ڈالی۔ اور اردو کالج بناڈالا۔ اب وہاں اُردو کی حفاظت اور بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں جنہیں اس فوجی حکومت میں ان کے مقاصد میں بڑی حد تک کامیابی نصیب ہوئی جس کے نتیجہ میں اکثر ادارے "عبدالحق نمبر" پیش کرکے خراجِ عقیدت پیش کررہے ہیں۔ گزشتہ سال ماہ اگست میں ماہنامہ "الشجاع" کراچی نے نواسی سالگرہ کے موقع پر "عبدالحق نمبر" زندہ شخصیت سے متعلق پیش کرکے خراجِ عقیدت حاصل کیا تھا۔ اور اب کارکنانِ "برگِ گل" اُردو کالج کراچی نوے سالہ سالگرہ پر اپنا یہ شمارہ ڈاکٹر عبدالحق بابائے اُردو کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔ اس لئے ان کے اس اقدام پر مبارک باد دی جاتی ہے۔ کیونکہ بابائے اُردو اس کالج کے بانی ہیں اور کالج ان کی خدمات کے اعتراف میں یہ شمارہ پیش کررہا ہے خدا بابائے اُردو کو مدتِ دراز تک باصحت و سلامت رکھے۔

ہندوستان میں بابائے اُردو کی انجمن سے متعلق سرگرمیوں اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے، تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اس لئے طوالت کے خوف سے مضمون مختصر کردیا گیا ہے۔ البتہ بابائے اُردو اور انجمن ترقی اُردو ہند کے بارے میں بعض علماء و مشاہیر کے تاثرات کے چند اقتباسات دئے جاتے ہیں جس سے ان کی انجمن کارکردگی پر روشنی پڑتی ہے۔

سر تیج بہادر سپرو

"میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے، کہ ایسے اعتدال پسند اور منصف مزاج ادیب فی زمانہ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی صُلح کُن پالیسی سے اُمید ہے کہ اُردو زبان ان خطروں سے جن کا مقابلہ اس کو آج کرنا پڑ رہا ہے محفوظ رہ کر روز بروز ترقی کرے گی۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

"مولوی صاحب نے نہ صرف اُردو کے حال کو استوار کیا بلکہ اس کے مستقبل کو پائدار بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی یعنی اُردو کی محبت جو ان کے دل میں تھی۔ اس کی لگن لاکھوں دلوں میں لگا دی۔ اور اس کا پیام سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیا۔ ان کی عمر بھر کی محنت کا ثمرہ "انجمن ترقی اُردو" اب خدا کے فضل سے ایک جاندار اور جان بخش ادارہ ہے۔ جو دہلی کے مرکز سے اپنی متعدد شاخوں کے ذریعہ ملک کے ہر گوشہ میں علم و ادب کی روشنی پھیلا رہا ہے۔"

علامہ سید سلیمان ندوی

"انہوں نے سادہ نگاری کو ترقی دی۔ نقد و تبصرہ کی نئی راہ نکالی۔ اُردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھا دی۔ اردب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے، اُردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اُردو لغت۔ اُردو تذکرے۔ اُردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اُردو کو اس حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا ایک زندہ ادارہ ہے۔"

(ماخوذ از جوہر عبدالحق نمبر)

روایت کی اہمیت

از:۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ کتاب اردو ادب کی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے اس میں روایت کی اہمیت اردو شاعری میں گل و بلبل کے استعارے، دلی کا دبستان شاعری، اردو شاعری میں حب وطن کی روایت اور اردو تنقید میں روایت اور تجربے کے ایسے پُر مغز اور خیال افروز مقالات شامل ہیں جن سے اُردو ادب کی تاریخی مد و جزر کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے مختصر الفاظ میں یہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے قیمت ۸ روپے آنے

انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی

پروفیسر خان رشید

مولوی عبدالحق

سوچتا ہوں مولوی عبدالحق صاحب کی شخصیت پر تبصرہ کروں ۔ یعنی سورج کو چراغ دکھاؤں ۔ اور اس جرأت گستاخ کا ۔۔ صرف یہ ہے کہ لوگ سورج سے نگاہیں نہ ملا سکے بلکہ بعض کی نگاہیں تو ایسی خیرہ ہوئیں کہ انہیں دن کی روشنی میں بھی تاریکی ہی نظر آئی ۔ ممکن ہے ایسی نگاہیں چراغ کی مدھم روشنی کی متحمل ہو سکیں اور اگر تجلیوں کا ادراک نہیں تو کم از کم اتنا تو دیکھ لیں کہ اس کی لو میں کتنا بانکپن، کتنی لپک ہے ۔۔ !

میں افقِ علم کے اس درخشاں آفتاب کی ان ضو فشانیوں کا ذکر نہیں کرتا جن کے طفیل نہ جانے کتنے ستارے روشن ہو گئے ۔ بلکہ اس چراغِ سحری کا ذکر منظور ہے جس کی سرفراز لو لرز رہی ہے ۔ کانپ رہی ہے بجھنے کے خوف سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ کہیں میرے بعد اندھیرا تو نہ ہو جائے گا ۔۔ ؟

یہ چراغ اسوقت تک نہیں بجھ سکتا ۔ جب تک کہ ذرہ ذرہ جہاں تاب نہ ہو جائے اور فروغِ صبح کا نور گوشے گوشے کو منور کر کے اسے مطمئن نہ کر دے ۔۔ ! تنگ نظری اور عصبیت کے عفریت کمر ہمت توڑنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ بادِ مخالف کے تیز اور تند جھونکے اسے بجھانے کے لئے اپنی سب کچھ کر گذرے لیکن اسنے مسکرا مسکرا کر یہی کہا کہ تم سے پہلے میں پوربی اور پچھمی ہواؤں کے تیز جھکڑوں کو بھی شرمسار کر چکا ہوں ۔ تم مجھے بوڑھا اور کمزور سمجھتے ہو لیکن ۔۔

بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا ۔ جوانی عزم و ہمت سے ہوتی ہے جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے ۔ میں اپنی جوانی پھر واپس لاؤں گا ۔ جوانی قائم رکھنے کے لئے کوئی بلند مقصد

ہونا چاہئیے۔ مقصد سے زندگی بنتی ہے بڑھتی ہے اور قایم بھی رہتی ہے ...... (خطبۂ اردو کالج)

بلندیٔ نگاہ، خلوص، عزم اور عمل ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اور کردار سے عزم و عمل کی جو روح پھونکدی ہے وہ آج نہ جانے کتنے دلوں میں امنگیں پیدا کر رہی ہے۔ اُمید و بیم کی کشمکش میں رجائیت کا پلّہ بھاری ہے۔ سرگوشیاں پیکرِ آواز میں ڈھل چکی ہیں اور ہر گوشے سے ایک مترنم گونج انھیں بھی سنائی دے رہی ہے کہ ؎

چراغِ آخرِ شب اسقدر اداس نہ ہو کہ تیرے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

لیکن وہ اسوقت تک اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے جب تک اپنے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا دیں۔ اور خوابوں کو حقیقت میں نہ بدل دیں۔

جینا کوئی مولوی صاحب سے سیکھے تو مر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اسلئے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دنیا کو جینے کا گر سکھاتے ہیں کہ "ماز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم"۔

وہ جس مقصد کو لے کر اٹھے اسے کبھی ادھورا نہ چھوڑا خواہ کتنی ہی مخالفتوں کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ بلکہ عموماً ایسے ہی مقاصد کا حصول پیشِ نظر رہا جن میں زیادہ سے زیادہ دقتوں کا امکان ہوتا۔

سہل پسندی نہ طبیعت میں ہے نہ سیرت میں اور یہی ان کی کامیابی کا اصل راز ہے۔

ان کی شخصیت ہمیشہ ایک چیلنج بھی رہی اور چیلنج کا ایک کامیاب جواب بھی۔

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ۔

"کارزارِ دنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں اور زخم بھی کھانے پڑتے ہیں۔ سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لئے تیار نہیں۔ اس کے لئے پسپا ہوجانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہئیے" ص۱۷۵ چند ہمعصر۔

اسی لئے ان کی زندگی ہر موڑ پر یہی پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ ؎

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ مولوی صاحب کبھی ناکام ہی نہیں ہوئے۔ ہوئے ہیں اور ضرور ہوئے ہونگے۔ اور وہ لاکھ دوسروں کو ذمّہ دار گردانیں پر ذمّہ داری خود انھیں کی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایسے مواقع پر عموماً مقصد ہی ایسا رہا جو ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ اورینٹل کالج اور انجمن ترقی اردو خواتین کالج کا قیام ایسے ہی مقاصد تھے۔ رفقاء کے اصرار پر مولوی صاحب 'ہوں' 'ہاں' کہتے ہوئے تحریک کے ساتھ ہو لیے۔ لیکن اول تو وہ خود غرضیاں اور خلوص کا فقدان بھانپ چکے تھے دوسرے دل بار بار کہتا کہ یہ بھی کوئی ایسا مقصد ہے جس کے لئے عبدالحق کی ضرورت پیش آئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی مقصد ہی اتنا چھوٹا تھا کہ مولوی صاحب کی رفعتِ نگاہ نے اسے قابلِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کردیا۔ ہاں اگر مقصد بلند اور مشکل الحصول ہو

ب ضرور بتاتے کہ مولوی عبدالحق کسے کہتے ہیں۔

حق و باطل کے معرکوں میں انھوں نے زندگی بھر یہی ثابت کیا ہے کہ وہ نام کے عبدالحق نہیں عمل کے بھی ہیں
لح جوئی اور مصالحت پسندی سرشت ہے۔ اس حد تک کہ گاندھی جی نے بھی انھیں سادہ لوح سمجھ لیا اور " ہندی اتھوا ہندوستانی
ریک کا جال بچھایا۔ مولوی صاحب کو رام کرنے کے لئے اول تو یہ فرمایا کہ " میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے پریم ہے"
ہندوستانی کا جو نمونہ اپنے بھاشنڑ میں پیش کیا وہ یہ تھا کہ " اس پردیش ے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار آپس میں کچھ ملیں
دھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھایوگیہ دوراسیوا کیوں نہ کریں . . . . . ." مولوی صاحب پہلے تو خاموش تھے
ین جب دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہوا جا رہا ہے اور ہندوستانی تحریک کی آڑ میں مسلمانوں کی ثقافت، تہذیب اور تمدن کی
ڑیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں تو ایسے گرج کر میدان میں آئے کہ مخالفین کی زبان بند ہو گئی۔ یعنی ہندی ہندوستانی تحریک کی جس دماغ
یں پیدا ہوئی تھی وہیں دفن ہو کر رہ گئی۔

ہم مشکل بھر ہو مولوی صاحب فوراً اسے سر کرنے کا بیڑہ اٹھا لیں گے۔ اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر ہرگز دم نہ لیں گے
سی نے چھوٹا ناگپور کی متعصب فضا کا ذکر کر دیا جہاں مشنریوں کی حکومت کسی کو پر مارنے کی بھی اجازت نہ دیتی تھی۔ اور
مولوی صاحب نے نہ صرف اسی وقت طے کر لیا بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں اردو کا چرچا عام کر دیا۔ مولوی صاحب کی مجاہدانہ
زندگی اور خدمات کا تجزیہ کیجئے تو ہم کبھی ان کی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ " خطاب اور نام الٹکل سے رکھ دئے
جاتے ہیں" (چند ہمعصر ص ۱۱۶)

مولوی صاحب جتنے خود عظیم ہیں ویسے ہی ان کے مقاصد بلند رہے۔ اور جتنا بلند مقصد رہا اسی اعتبار سے
اس سے مولوی صاحب کا عشق شدت پکڑتا گیا۔ اسی لیے انھوں نے کبھی ایسا گلہ نہیں کیا کہ ؎

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

وہ عظمت و جلال کے کتنے قائل ہیں اسکا اندازہ ذیل کے فقروں سے کیجئے۔

" عظیم الشان چیزیں گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں لیکن صرف ان
کے وجود ہی سے دنیا پر اسقدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل
نہیں ہو سکتا " ص ۲۳

مقصد سے عشق ہونا بڑی نعمت ہے۔ اور مولوی صاحب اپنے قول اور فعل سے اسی کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے
ہیں اور اس وقت تک کسی کام میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرتے جب تک اس میں لذت نہ آنے لگے اس لیے کہ

" شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں۔ جنھیں ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد

ہے " جفاکشی اور محنت خود ان کا دطیرہ ہے اس لئے یہ خوبیاں جہاں نظر آئیں دل سے پسند کرتے ہیں ۔ عزیز مرزا کے ذکر میں لکھتے ہیں ۔ ص۱۰۴

" وہ جہاں کہیں رہے اپنے فرض منصبی کو ایسی مستعدی دجفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہوگئے " ص۶۳

مرزا حیرت کا یہ شعار بھی بہت پسند آیا کہ " انھیں اپنے فرض منصبی کا بہت بڑا خیال تھا ۔ اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی صحت تک کی پروا نہ کرتے تھے " ص۱۲۱

" چند ہمعصر میں جتنے افراد ہیں ان سب میں یہ خوبی ضرور موجود ہے ۔ پھر بھلا مولوی صاحب انھیں کیوں نہ پسند کرتے ۔ جبکہ اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ

" کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے ۔ اسی لئے اس کے دماغی اور اخلاقی قوی کی جلا ہوتی ہے " ص۲۶۲

مولوی صاحب بڑے وضعدار اور بعض معاملات میں بڑے نازک دماغ بھی واقع ہوئے ہیں ۔ طبیعت میں غیرت اور انکسار ہے ۔ جھوٹ نہیں بولتے ہیں مگر اسوقت جب کوئی ان کی تعریف کر رہا ہو ۔ بعض امور سے صاف انکار کر دیں اس لئے مناسب یہی ہوگا کہ ان کی شخصیت کا تجزیہ خود انھیں کی تحریروں کی روشنی میں کیا جائے ۔ اور شخصیت کی عظمت کا تصور جو ان کے ذہن میں ہے وہ ان خاکوں سے واضح ہوجاتا ہے ۔ جو انھوں نے چند ہمعصر میں پیش کئے ہیں ۔ چند ہمعصر میں مولوی صاحب نے صرف چند معاصرین کا ذکر کیا ہے لیکن انہیں چند کا جنھیں وہ صحیح معنوں میں انسان سمجھتے تھے ۔ اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں ۔ مولوی صاحب اتنی عمر میں ہزار ہا نفوس سے ملے ہوں گے لیکن کہا کرتے کہ

" ایسے دو چار ہی ملے جن میں انسانیت بھی ہے ۔ اور یہ وہ شے ہے جو بہت کمیاب ہے "

ان کا تذکرہ بھی محض ذکر کی خاطر نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے کیا گیا ہے کہ ہم ان کی زندگیوں سے سبق لے سکیں ۔ ایک انسان کی زندگی ہمیشہ سبق آموز ہوتی ہے ۔

" دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہے ۔ " انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں " ص۱۰۵

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ انھوں نے محسن الملک اور سر سید کے دوش بدوش نور خاں اور نامدیو مالی کو کیوں جگہ دی ہے ۔ چند ہمعصر میں ان ہی عظیم انسانوں کے جاندار خاکے ہیں ۔

جاندار اس لئے کہ ان خاکوں کی رگ رگ میں خود مولوی عبدالحق کا جاندار
خون دوڑ رہا ہے ۔ الفاظ میں تصویر کشی شخصیت نگاری کا کمال ہے لیکن
اس میں جان خود فنکار کی داخلی عظمت کی وجہ سے پڑتی ہے ۔

اسے یوں سمجھئے کہ ایک ماہر اور چابکدست مصور تصویر بنانے سے پہلے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے پیش نظر ماڈل یا منظر کا جائزہ لیتا ہے ۔ پھر حسب توفیق اپنی ذہنی استعداد اور جمالیاتی شعور سے کام لے کر کسی خاص زاویے کا انتخاب کرتا ہے اور پیش نظر ماڈل یا منظر کے صرف انھیں خدوخال پر اس کی نگاہیں مرکوز ہوتی ہیں جو اس کے اپنے داخلی احساس سے ہم آہنگ اور اس کے اپنے شعور کے مطابق حسن وقبح کے نمایاں نقوش ہوتے ہیں ۔ اب وہ موقلم کو ہاتھ لگاتا ہے اور الٹے سیدھے خطوط اور رنگوں سے کام لے کر تصویر بناتا ہے ۔ بے شمار غیر ضروری اجزا د مبہم خطوط کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور صرف وہی حصے نمایاں ہوتے ہیں جو مصور کے حسن انتخاب کے مطابق قابل نمائش ہوتے ہیں ۔ حسن وقبح کا یہ معیار فنکار کی خود اپنی داخلیت کا امانتدار ہوتا ہے ۔ اسطرح تصویر ہو یا تصنیف فنکار بظاہر دوسروں کی سیرت اور صورت کا جائزہ لیتا ہے لیکن غیر شعوری طور پر خود اپنی سیرت کا مظاہرہ بھی کر جاتا ہے ۔ تفصیل جسقدر اجمال میں بدلتی ہے یہ پہلو زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے' اس اعتبار سے تفصیلی سوانح عمریوں کے مقابلے میں مختصر خاکے فنکار کی داخلیت کے زیادہ امین ہوتے ہیں ۔ رنگوں سے بنی ہوئی تصویر کے مقابلے میں لفظی خاکوں کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے ۔ تصوری الفاظ کے فن سے قدیم ہے لیکن خارجیت اور صورت سے بے نیاز نہ ہوسکی ۔ لیکن الفاظ وہ پراسرار تصاویر ہیں جن میں داخلیت کا پلہ بھاری ہے ۔ انسان کی خواہش اظہار نے ایک مدت کی کشمکش اور ارتقاء کے بعد الفاظ کا فن سیکھا ۔ اور اس بات پر قادر ہوا کہ صورت کے علاوہ سیرت کو ان کوزوں میں بند کرے ۔ سیرت الفاظ میں ڈھل کر نہ صرف شخصیت کے ایسے رخ بھی بے نقاب کر جاتی ہے جو کسی اور طرح ظاہر نہ ہوسکتے تھے بلکہ شخصیت نگاری کی اوٹ سے خود شخصیت نگار کی اپنی شخصیت بھی جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے ۔

مولوی صاحب بھی چند ہمعصر کی اوٹ سے جھانک رہے ہیں ۔ اور اگر آپ دیکھنا چاہیں تو بعض ایسی باتیں بھی دیکھ سکتے ہیں جنھیں مولوی صاحب شاید ویسے کبھی نہ بتاتے ۔ مثال کے طور پر مولوی صاحب کے ساتھ کھانے کا اتفاق میری طرح خواہ آپ کو بھی نہ ہوا ہو لیکن آپ بلاتکلف کہہ سکتے ہیں کہ " مولوی صاحب انگریزی کھانے پسند نہیں کرتے اور کھانے کے معاملے میں بڑے نفاست پسند اور شوقین ہیں' اول تو وہ انکار نہ کریں گے کہ جھوٹ نہیں بولتے لیکن بہ پاس وضعداری اعتراف میں تامل ہو تو ان کا تحریری بیان پیش کر دیجئے ۔

" (راس مسعود) کھانے کے بڑے شوقین تھے ۔ خوب کھاتے اور کھلاتے تھے ۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے کھلاتا تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے " صفحہ ۱۶۸

"(محسن الملک) لیکن کھانا ان کا وہی ہندوستانی رہا۔ اسے نہ بدل سکے۔ یہ چٹخارے انگریزی کھانوں میں کہاں؟ نواب صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے اور بہت نفیس اور عمدہ کھانا کھاتے تھے" ص ۱۲۳

"(میرن صاحب) کھانا بہت مزے کا اور سلیقے کا ہوتا تھا" ص ۱۷۷

"(مرزا حیرت) ایرانی کھانے پکانا بھی خوب جانتے تھے" ص ۱۵

"(وحید الدین سلیم) کبھی صحت و صفائی کا خیال نہ رکھا اور نہ کبھی اپنے کھانے پینے کا کوئی معقول انتظام کیا وہ ان چیزوں کو جانتے ہی نہ تھے کوئی بھی ہو۔ مولوی صاحب خاکے کو مکمل ہی نہیں سمجھتے جب تک کھانے کا ذکر نہ کریں۔ اور بعض مقامات پر تو اس طرح ذکر کیا ہے کہ منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ آپ کہیں گے میں نے ساری باتیں چھوڑ کر کھانے ہی کا ذکر کیوں کیا؟ میں کیوں بتاؤں کہ اس وقت بھوکا ہوں — مگر معاف کیجئے گا مولوی صاحب نے مختلف خاکے مختلف اوقات میں مرتب کیے ہیں۔ یعنی ہر موقع پر کھانے کے ذکر کا باعث بھوک نہیں ہو سکتی —

کھانا اور کپڑا کچھ لازم و ملزوم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے اگر مولوی صاحب کی پوشاک کے بارے میں جاننا چاہیں تو میں کہوں گا ان کی تحریر اور اسلوب میں سلیقہ، شرافت، سادگی، صفائی اور نفاست ہے حیران نہ ہوں شاید آپ نہیں جانتے کہ مولوی صاحب کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آپ محسوس کر رہے ہونگے کہ میرا قلم قدرے شوخ ہوتا جا رہا ہے! قلم قصور وار ہے نہ میں۔ بلکہ مولوی صاحب کی شخصیت کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے ہنس ہنس کر جیتے ہیں اور ہنسا ہنسا کر حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں ان کی ظرافت کی ہلکی چشم زدن میں اضمحلال کی کثافتوں کو دور کر دیتی ہے۔ آپ کتنے ہی پریشان کیوں نہ ہوں ان کی صحبت میں سارے غم بھول جائیں گے۔ کیسی ہی پریشانی کیوں نہ ہو زندہ دلی اور ظرافت ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں شاید جان بھی اس وقت تک نہ دیں گے جب تک ایک مرتبہ ملک الموت کو ہنسا نہ دیں یا پھر اس کے برعکس حضرت عزرائیل کھسیانہ جائیں۔ اس لئے کہ حسب موقع طنز و ظرافت دونوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دونوں میں بڑا اعتدال ہے شوخی عود کر آئے تو ضلع جگت سے بھی نہیں چوکتے لیکن کہیں بھی ابتذال نہیں پیدا ہوتا۔ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ظرافت شوخی کی حد تک کب تجاوز کرتی ہے اور طنز نشتر کب بنتا ہے اس کا اندازہ آپ خود کریں۔

حیدرآباد دکن میں بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کی آمد پر چائے کا لوازمانہ اہتمام کیا گیا۔ اور یہ بھی انتظام تھا کہ جو چاہے وہ پسند کریں وہی پیش کی جائے۔ استفسار پر بلبل ہند نے مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا (جو قریب ہی بیٹھے تھے) کہ ان سے پوچھو۔ مولوی صاحب نے ہنستے ہوئے بلبل ہند سے برجستہ فرمایا۔ ہمیں تو بیسن زدہ مرغ ملا پسند ہے۔ سروجنی نائیڈو سے جواب نہ بن پڑا پھر بھی مسکرا کر اتنا ضرور کہا کہ "تلخی نہ ہو" مولوی صاحب نے سنا نہیں سب کے ساتھ خود بھی قہقہہ لگاتے رہے

کراچی میں ایک مشہور مصنف مولوی صاحب کے پاس پہنچے۔ انھیں اپنے بارے میں کچھ
مغالطہ ہوگیا تھا۔ اس لئے مولوی صاحب ان سے کچھ خفا تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب
سے فرمایا کہ اپنی زندگی کے کچھ حالات بتائیں اور ارادہ ظاہر کیا کہ مولوی صاحب پر کتاب
لکھنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول گئے کہ عنقارا بلنداست آشیانہ۔ مولوی صاحب نے
انھیں جواب دیا۔ "بھائی مجھ پر لکھ کر کیا کروگے۔ اب تک جتنی زندگی گذاری سوچتا
ہوں بیکار ضایع ہوئی ـــ اور جو باقی بچی ہے اسے اب تم برباد کرنا چاہتے ہو؟

بہر حال مولوی صاحب خود بھی ہنس ہنس کر جیتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنستا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں مگر بے اعتدالی اور پھکڑپن کو پسند نہیں کرتے۔ مولوی وحید الدین سلیم کے ذکر میں رقمطراز ہیں کہ

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت
میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے"

سرسید کے بارے میں لکھا ہے کہ

"زندہ دلی ان کی فطرت میں تھی۔ . . . . . وہ اپنے بعض ہم عمر بے تکلف دوستوں
سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ بلکہ چھوٹوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔
یہ زندہ دلی ان کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی تھی۔" ص۱۹۳

آخری فقرے سے اندازہ ہوگا کہ مولوی صاحب ظرافت سے کیا کام لیتے ہیں۔ ظرافت کے معاملے میں وہ سرسید کے صحیح جانشین ہیں۔ سرسید سے متعلق ایک بات اور بھی لکھی ہے کہ

"بعض اوقات وہ لڑکوں کی سی شرارتیں کر بیٹھتے تھے جو باتوں سے بڑھ کر عمل
تک پہنچ جاتی تھیں میں اگر ان کو ذکر کروں تو شاید بعض سنجیدہ مزاج حضرات ناک
بھوں چڑھائیں . . . اس قسم کی حرکتیں زیادہ تر مولوی سید زین العابدین
سے ہوتی تھیں جو سید ... سے ... عقیدت اور خلوص رکھتے تھے" ص۱۹۳

یہ بات بھی مولوی صاحب کے بارے میں حرف بحرف صحیح نکلے گی بشرطیکہ مولوی ہاشمی فریدآبادی صاحب چھپانہ چاہیں!

مولوی صاحب کی شخصیت کا سب سے درخشاں پہلو ان کی انسانیت ہے۔ اس معاملے میں حالی کے بہت مداح ہیں۔ "سرسید کی جماعت میں بہ حیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچے" ص۱۳۳ مولوی صاحب انسانیت کے اعتبار سے حالی ثانی ہیں تو چند ہمعصروں کی تمام شخصیتوں سے انھوں نے خود کیا کیا سیکھا اس کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ اس لئے صرف چند اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ حالی کے بعد ان کی شخصیت سب سے زیادہ

سرسید سے متاثر ہوئی ہے ۔ بلکہ بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ

> اگر سرسید کے دماغ اور حالی کے دل کا ایک صالح امتزاج دیکھنا ہو تو
> مولوی عبدالحق کے علاوہ کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی ۔ وہ سرسید
> "جن کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا' ایسا جامع صفات اور
> جامع حیثیات بے لوث، بے نفس' پرعزم واستقلال' سراپا خلوص وصداقت اور
> ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا ..... " ص۲۸۳

اور وہ حالی " جن کی سیرت کی دو نمایاں خصوصیتیں تھیں ایک سادگی اور دوسری درد دل " ص۱۳۳
مولوی عبدالحق نے اردو اور قوم کی خدمت کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کرکے ثابت کر دیا کہ قومی ہمدردی اور ایثار
کے معاملے میں وہ سرسید کے حقیقی جانشین ہیں ۔ اور انسان دوستی اور درد دل کے میدان میں حالی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں

> بلکہ حالی سے اس قدر متاثر ہیں کہ بعض اوقات ان کا دل دماغ پر غالب آتا
> ہے ۔ اور بد توفیق اور خود غرض افراد انھیں بآسانی بہکا لے جاتے ہیں ۔

انھیں انسانیت سے والہانہ عشق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو غم زدہ نہیں دیکھ سکتے اور جب تک اس کے مسکرانے کا
سامان نہ کر دیں چین سے نہیں بیٹھتے ۔ فیاضی کا یہ انداز انھیں دل سے پسند ہے ۔

> " سرسید بڑے فیاض اور سیر چشم تھے ۔ غریبوں' مستحقوں اور مفلوک الحال
> شرفا کی ہمیشہ مدد کی لاکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ داہنے
> ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو " ص۲۷۱

اور مولوی سید علی بلگرامی کے لئے کس محبت سے لکھا ہے کہ

> " سب سے زیادہ اس کے غریب دوست اس کا ماتم کریں گے " ص۱۰۰

خود مولوی صاحب کی فیاضی کا یہی عالم ہے ۔ جو لوگ ان کے قریب رہ چکے ہیں وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ مرزا حیرت کی
یہ بات انھیں کس قدر اور کیوں پسند ہے کہ

> " ان کی نظروں میں روپے کی کچھ حقیقت نہ تھی سوا اس حالت کے جب وہ کسی بے کس مظلوم کی امداد میں خرچ کرتے تھے
> طمع اور حرص کو کتنا برا سمجھتے ہیں اس کا اندازہ جا بجا ایسے فقروں سے ہوتا ہے ۔

> " (مولوی سید علی بلگرامی) حُبِ جاہ میں ایسی باتیں کر گذرتے تھے جو ان کے شایانِ شان نہ ہوتی تھیں ..ص۹۱

خود دیانت دار' سچے اور نیک دل ہیں اس لئے دوسروں پر اعتماد کرنے میں انھیں ذرا تکلف نہیں ہوتا ۔ ان کی زندگی ہمدردی
خلوص اور محبت سے عبارت ہے اس لیے جہاں ان کا شائبہ بھی نظر آیا مولوی صاحب بچھ جاتے ہیں ۔ وضعداری گھٹی میں

پڑی ہے اس لئے دوستی نبھانا خوب جانتے ہیں یہ خوبی اتنی پسندیدہ ہے کہ جا بجا اسے سراہا ہے

"ان کے دوست بہت کم تھے۔ شاید دو چار ہی ہوں گے۔ مگر جن کے دوست تھے

دل سے تھے" "دوستی کے بڑے پکے اور وضعدار تھے" ص۱۰۳

مگر یہ ساری ایسی خوبیاں ہیں جو فی زمانہ خامیاں متصور ہوتی ہیں۔ انسان دوستی اور دردِ دل ان کی ایسی کمزوریاں ہیں کہ وہ مگرمچھ کے آنسو پوچھنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ ایسے ہی مواقع پر ان کی سادہ دلی، سادہ لوحی بن جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ مصلحت اندیش اور مردم شناس نہیں ہیں۔ مگر وہ کریں بھی تو کیا کریں کہ انکار کا دل ہی نہیں پایا۔ خیر کا معاملہ ہو تو جو چاہیں بخش دیں انھیں زیبا ہے۔

صداقت، دیانت اور شرافت کے پرستار ہیں۔ بد دیانتی اور بد طینتی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ بات مرزا حیرت کے لئے نہیں کہی بلکہ اپنے لئے کہی ہے کہ

"وہ ہر ایک چیز سے درگزر کرسکتے تھے۔ مگر جھوٹ، ریا، اور دناءت کے متحمل

نہیں ہوسکتے تھے" ص۱۲

نور خاں کی شخصیت میں ایسی خوبیوں کو بہت سراہا ہے۔

"سچائی بات کی اور معاملے کی ان کی سرشت تھی" ص۱۱۳

"حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے" ص۱۱۴

مولوی صاحب خود انھیں اصولوں پر کاربند ہیں۔ ان کی حق پرستی، حق گوئی اور بے باکی کو دیکھ کر سعدی کا قول غلط معلوم ہوتا ہے کہ "دروغِ مصلحت اندیش بہ از راستیٔ فتنہ انگیز" اس لئے کہ دروغ اور مصلحت اندیشی نیز راستی اور فتنہ انگیزی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور مولوی عبدالحق حقیقی معنوں میں اسم بامسمیٰ ہیں۔

وہ نفاست، بے باکی، استقلال اور وضعداری کا ایک ایسا مجسمہ ہیں جس

میں تاج محل کا جمال بھی ہے اور ابوالہول کا جلال بھی۔ ان کی شخصیت میں قطب مینار

کا بانکپن بھی ہے اور الورا کے تیور بھی۔ محبت اور شفقت ان کا خمیر ہے لیکن خفا

ہونا بھی ایسا جانتے ہیں کہ ان کے جلال کے سامنے آفتاب بھی منہ چھپالے۔

طبیعت میں بلا کی خودداری ہے۔ اور یہ جوہر دل سے عزیز ہے۔

"(نور خاں) خوددار ایسے تھے کہ کسی کے ایک پیسے کے روادار نہ تھے" ص۱۱۳

لیکن اس خودداری کی وجہ سے خود مولوی صاحب نے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی ان کا اندازہ ذیل کے نقروں سے کیجئے۔

"سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات اس کی

خوبیاں بھی اسے دے ڈیتی ہیں " ص۱۰۹

" ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے " ص۱۰۷

پھر بھی انھیں خودداری سے گلہ نہیں اس لیئے کہ جانتے ہیں کہ یہ جوہر شرافت ہے ۔ انگریزوں نے حکومت کے زعم میں اس کی قدر نہ کی تو انھیں ان کی معذوری پر ترس آتا ہے کہ

" ایسے لوگ اپنی قوم والوں کی خودداری کو تو جوہر شرافت سمجھتے ہیں لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا ہے تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں " ص۱۰۱

حالی کی شخصیت سے انھوں نے ضبط، تحمل اور غیرت کا بھی سبق لیا ہے ۔ پچھلے دنوں ایک جگہ میزبانوں نے کھانے کے وقت نہ پوچھا ۔ تو مولوی صاحب کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ خود طلب کر لیں ۔ تاہم چونکہ تربیت مقصود تھی اس لیئے طلباء کو خطاب کرتے وقت فرمایا ۔ " ضبط و تحمل بڑی نعمتیں ہیں ۔ آپ لوگوں کو اس کی عادت ڈالنی چاہیئے ۔ مثلاً اگر کبھی آپ کا میزبان کھانے کے وقت نہ پوچھے تو قطعاً پروا نہ کرنی چاہیئے اور کام سے جی نہ چرانا چاہیئے "

متلون مزاجی ناپسند ہے ۔ اس کمزوری پر کبھی نہیں بخشتے ۔ مولانا محمد علی کی یہ بات انھیں بڑی ناگوار تھی ۔ مولوی سید علی بلگرامی کے لیئے بھی لکھا ہے کہ " مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے " ص۹۱

وہ شخصیت کی عظمت تو اس میں مضمر سمجھتے ہیں کہ اس میں پارس پتھر کی سی خاصیت ہو ۔ جو دوسروں کو بھی کندن بنا دے ۔

" (محسن الملک) ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی ۔ کوئی ہو کہیں کا ہو ۔ ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں " ص۹۶

" (سید محمود) اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے " اس لیئے مولوی چراغ علی بھی خود بخود امام وقت کی طرف جھکے اور وحدت ذوق سرسید سے ان کے تعارف کا باعث ہوئی " ص۱۳۱

مولوی صاحب ایک عظیم انسان ہیں اسی لیئے انھیں عظمت اور انسانیت دونوں سے محبت ہے ۔ انھوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ان سے فیض اٹھایا ہے ۔

ان کے تصورِ انسانیت اور نظریۂ اخلاق میں سوائے صداقت کے کچھ اور نہیں ۔ ایسی صداقت جو اٹل ہے اور زمان و مکاں کے تغیرات اسے بدل نہیں سکتے ۔ ان کی تحریروں سے ان کے مختلف رجحانات کی حقیقت مترشح ہوتی ہے ۔ مثلاً کیا اس سے کبھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ

" اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے

خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کردے۔ زبان وقلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنجان مرنج ہو۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم واستقلال، ضبط وتحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری انصاف، ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے"

یہ محض قول نہیں بلکہ مولوی صاحب کی زندگی اس کی عملی تفسیر ہے۔ جو ان کا ظاہر ہے وہی ان کا باطن ہے۔ جو بات دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ جو سادگی اور شرافت قلب میں ہے وہی زندگی میں ہے۔ اور جو بات زندگی میں ہے وہی تحریروں میں۔

سب سے زیادہ ان کی شخصیت کا اندازہ چند ہمعصر سے ہوتا ہے۔

بلا مبالغہ شخصیت اور سیرت کا جو معیار اس کتاب سے مستنبط ہوتا ہے وہی خود مولوی صاحب ہیں۔ دونوں اس حد تک ہم آہنگ ہیں کہ جو لوگ مولوی صاحب کی سیرت اور کردار کے بارے میں جاننا چاہیں ان سے کہا جا سکتا ہے کہ کیا تم نے "چند ہم عصر" نہیں پڑھی؟ ــــــ

اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام

موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام نے جو قابل قدر حصہ لیا اور اسے اس قابل بنایا کہ آگے چل کر وہ ایک مہذب زبان کی حیثیت حاصل کر سکے اس موضوع پر ایک معلومات افزا مقالہ ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ تیسرا ایڈیشن قیمت ۱/۴

انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی

سجاد مرزا

اُردو کا زخمی سپاہی

بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق جن کو ہماری حیدرآبادیوں کی زبان میں "مولوی صاحب" کہتے ہیں، درحقیقت ایک سپاہی ہیں جو اُردو زبان کی نصف صدی کی خدمت میں بارہا زخمی ہو چکے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ ان کو گھائل کرنے میں اُردو دشمنوں سے زیادہ ان اشخاص نے حصّہ لیا ہے جو اُردو داں ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنھوں نے مولوی صاحب کی نظرِ عنایت کی بدولت اپنی علمی اور معاشی زندگی سُدھاری۔

اُردو کی خدمت، اس کے تحفّظ اور ترقّی کے لیے مولوی صاحب ہمیشہ موزوں میدانِ عمل کی تلاش میں رہے ہیں۔ سب سے پہلے جنوبی ہند کے خطّہ حیدرآباد دکن کو موزوں پایا اور اُردو زبان کا کام اورنگ آباد کی گھاٹیوں کے دامن میں رابعہ دُرّانی کے مقبرہ کے باغ میں شروع کیا۔ یہ انتخاب ہر نقطۂ نظر سے اب کامیاب اور اُمّید افزا ثابت ہوا کہ اصلاح اور ترقی کی خاطر اُردو کا صدر مقام حضور نظام کی ریاست کا صدر مقام حیدرآباد اردو زبان کا مستقر قرار دیا۔ اندرونی اور بیرونی مخالفت کے باوجود مولوی صاحب کی لگاتار کوشش کے باعث، حکومت نے دارالترجمہ اور اُردو زبان کی پہلی اور ہندوستان میں آخری یونی ورسٹی قائم کی جو آج بھی "عثمانیہ یونی ورسٹی" کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن جس کا ذریعۂ تعلیم اُردو کے بجائے غیر زبان ہے۔

مولوی صاحب نے جب یہ محسوس کیا کہ حیدرآباد میں اُردو زبان اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی ہے۔ اور اس کے استحکام اور توسیع کے لئے کسی اور صدر مقام کی تلاش کی ضرورت ہے تو مشورہ کے بعد دہلی کو منتخب

کیا۔ اور حیدرآبادیوں کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرکے دہلی منتقل ہو گئے اور اُردو زبان کو اس کے وطن مالوف
میں عزت و آبرو کے ساتھ پہنچا دیا۔

کسی کو کیا خبر تھی کہ برصغیر ہند کی آزادی، اُردو کی جلاوطنی کا باعث ہو گی چناں چہ دہلی کے ہنگاموں،
قتل و غارت گری نے مولوی صاحب کو مجبور کیا کہ وہ پڑوسی ملک میں نہ صرف اپنی جان بچانے کے لئے بلکہ
اُردو کا جو سرمایہ انھوں نے ذاتی ایثار اور عرق ریزی سے جمع کیا ہے اس کو بھی حتی الامکان محفوظ کر دیں۔
مولوی صاحب اپنے اس منصوبے میں کامیاب ہوئے اور کراچی میں بیک بینی و دوگوش آ دھمکے۔ ایک نئے اور
آزاد ملک میں نئے خواب دیکھنے لگے اور اپنے دلی خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک ہو گئے۔

میں نے مولوی صاحب کو اورنگ آباد میں دیکھا ہے بلکہ ان کی ماتحتی بھی کی ہے جب کہ وہ حکومت نظام
کی طرف سے صدر مہتمم تعلیمات (چیف انسپکٹر ایجوکیشن) تھے۔ جب وہ حیدرآباد منتقل ہوئے تو حسب حیثیت
ان سے تعاون کار کیا۔

> بہت کم یہ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نے چپکے چپکے عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام
> کے لئے کیا کیا کارہائے نمایاں خود اُردو کے استحکام کے لئے سب کچھ کیا جو کوئی
> شخص ہر آدمی کے لئے کر سکتا تھا لیکن نام و نمود کا میدان دوسروں کے لئے
> خالی چھوڑ دیا۔ خود پس پردہ رہے۔

اور جب اس کا اطمینان کر لیا کہ حیدرآباد میں اُردو کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں تو دہلی کی راہ لی۔

مولوی صاحب کی اُردو سے والہانہ دلچسپی اور خدمت کے جوش نے اردو کو قومی زبان کے مرتبہ
پر پہنچایا لیکن ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب نے ان کا دہلی میں قیام ناممکن کر دیا۔ مولوی صاحب نے
ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مکان واقع دریا گنج دہلی میں انجمن ترقیٔ اُردو کا دفتر اور کتب خانہ قائم فرمایا تھا۔
اور اسی کوٹھی میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن زیادہ تر وقت ہندوستان کے طول و عرض میں اُردو کی اشاعت
کے لئے دورے کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا کانفرنس کی جس نے مولوی صاحب کی تحریک پر اُردو
زبان کے متعلق چند اہم تحریکات منظور کیں جن کے خد و خال پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔ قیام دہلی کے زمانہ
میں مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور ٹائپ کے استعمال اور اُردو کے لیے
یعنی "رسم الخط" رومن اختیار کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا چناں چہ ایک سربرآوردہ کمیٹی مقرر کی
گئی جس میں مری تجاویز پر غور کر کے سفارشات پیش کیں۔

مولوی صاحب سیاست سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے ہیں۔ ہاں اُردو کا معاملہ الجھ جائے یا اُردو

کے لیے کوئی خطرہ نظر آئے تو دہکتی آگ میں کود پڑتے ہیں۔

مولوی صاحب کا کیا مذہب ہے؟ ان کی سفید داڑھی سے بڑا دھوکا ہوتا ہے۔
مولوی صاحب زبردست قوم پرست ہیں۔ اُردو کو ہندو مسلم تہذیب کا مشترکہ
ورثہ خیال کرتے ہیں۔ اُردو زبان کا اگر کوئی مذہب ہے تو بس وہی مولوی صاحب
کا مذہب ہے۔ اُردو زبان کا کوئی وطن ہے تو بس وہی مولوی صاحب کا وطن ہے۔ اُردو کیلئے جہاں حالات
سازگار دیکھتے ہیں وہیں جا دھمکتے ہیں چنانچہ دہلی چھوڑنی پڑی تو کراچی میں ڈیرہ ڈال دیا۔

مجھے عرصہ سے خواہش تھی کہ اپنی عمر کی آخری منزل میں مولوی صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ ان کی زبان سے اُردو کا حال سنوں اور ہندوستان میں اردو کا حال ان کو سناؤں جب کہ وہ خود عمر طبعی کے لب بام پر ہیں۔ روس کی سیاحت کے بعد جہاں میں نے اُردو کی چہل پہل دیکھی تھی۔ کابل میں ہوائی جہاز بدلنا تھا میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کراچی ہوتا ہوا حیدر آباد آیا۔ کابل کے چند روزہ قیام میں یہ دیکھ کر بڑی مسرّت ہوئی کہ کابل میں امیر اور غریب، وزیر اور ادنا ملازم اُردو سے ایسے ہی واقف ہیں جیسے کہ آندھرا اسٹیٹ میں۔

۴ر نومبر ۱۹۵۹ء کا دن مجھے ہمیشہ یاد رہے گا جب کہ میں کراچی میں مولوی صاحب سے ملا۔ اردو کالج کی عمارت کی پشت پر ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر اور کتب خانہ ہے۔ اوپر کی منزل پر مولوی صاحب رہتے ہیں۔ تاریک سیڑھیوں پر سے گزرتا ہوا جب میں اوپر کی منزل کے دروازہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو چھوٹے کمروں کے سامنے ایک ورانڈہ ہے اور اس ورانڈے میں ایک کرسی پر مولوی صاحب اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حسبِ معمول ننگے سر۔ کرتا پاجامہ پہنے ہوئے سوچ میں غرق ہیں سر کے بال ہمیشہ کی طرح پریشان۔ چہرہ گھنی داڑھی سے ڈھکا ہوا۔ خلافِ عادت عینک لگی ہوئی حالاں کہ اخبار تھا نہ کتاب یہ سماں دیکھ کر میں ذرا ٹھٹکا لیکن وقت کم تھا اور میں ملاقات کے لیے بے چین۔ ہلکے قدم ڈالتا ہوا قریب پہنچا اور سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس پر بھی جب جنبش نہ ہوئی تو بلند آواز سے آداب کرتے ہوئے خود اپنا نام لیا۔ مولوی صاحب ایک دم کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے سے لگا لیا اور بار بار کہتے رہے، "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ہو اور مجھ سے ملنے آؤ گے"۔

مولوی صاحب آب دیدہ ہو گئے، میرا بھی دل بھر آیا۔ مولوی صاحب بہت دُبلے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ بال اب بھی گھنے ہیں لیکن سفیدی بڑھ گئی ہے بینائی کی کمزوری

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

تمکین دہلوی

عبدالحق ـــــ ایک تاثر

حیدرآباد دکن کے دوران قیام میں غالباً ۱۹۲۹-۳۰ء میں مجھے مولانا عبدالحق کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں اُس زمانے میں اپنے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ کے ساتھ حیدرگوڑہ (نرائن گوڑہ) میں رہتا تھا۔

اس زمانے میں عثمانیہ یونی ورسٹی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی، اور اس کے مختلف شعبے مسرت منزل اور راحت منزل میں تھے اور اس کے شعبۂ تدریس میں نظم طباطبائی، مرزا ہادی رسوا، عظمت اللہ خاں، وحیدالدین سلیم، سجاد مرزا، اور الیاس برنی، جیسی شخصیتیں موجود تھیں۔ ان بزرگوں نے یونی ورسٹی ہی میں نہیں بلکہ پورے شہر میں ایک عجیب علمی و ادبی ماحول پیدا کر دیا تھا

یونیورسٹی کے اس ماحول کے علاوہ شہر میں بھی مشاہیر جمع تھے۔ ایک طرف دارالترجمہ میں اُردو میں دوسری زبانوں کی منتقلی کے سلسلہ میں بہت سے باکمال موجود تھے۔ ان میں مولوی عنایت اللہ صاحب، مختارالدین صاحب، ہاشمی صاحب فریدآبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، عبداللہ عمادی صاحب وغیرہ تھے۔ دوسری طرف مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی وجہ سے بعض لوگ اُن کے دربار سے منسلک تھے ان میں فانی بدایونی (جو ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آچکے تھے) علّامہ حیرت بدایونی، کرنل اشرف الحق، ماہرالقادری، آزاد انصاری، علامہ مسعود علی محوی اور راجہ نرسنگراج وغیرہ تھے۔

ان بزرگوں اور باکمالوں کے علاوہ بعض جو سر قابل ابھر رہے تھے! ور ان میں بدرالدین بدر، بدر شکیب، عبدالقیوم باقی، اکبر وفاقانی، وزیر حسن، جی۔ ایم خاں، میر حسن، مخدوم محی الدین، تمکین کاظمی اور تمکین سرمست قابل ذکر ہیں۔

یونی ورسٹی اور شہر کے اس علمی ادبی ماحول نے ہر فرد کو علم و ادب کے شوق میں رنگ دیا تھا۔ آئے دن کوئی نہ

کوئی جلسہ کوئی نہ کوئی مشاعرہ اور کوئی نہ کوئی علمی وادبی مجلس مذاکرہ ہوتی رہتی ۔

مولانا عبدالحق کی تمام توجہ اُس وقت عثمانیہ یونی ورسٹی کو مکمل اُردو یونی ورسٹی بنانے کی طرف منعطف تھی اور وہ علوم کے تمام شعبوں کو اُردو ذریعۂ تعلیم ہی سے خود کفیل بنا دینا چاہتے تھے یہ وہ زمانہ ہے جب انجمن ترقی اُردو کا دفتر اورنگ آباد سے منتقل نہیں ہوا تھا ۔

دارالترجمہ بھی اُردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ ہر روز نئی نئی کتابیں ترجمہ ہوتیں اور یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کی ضروریات پوری کرتی جاتیں۔ اسی سلسلہ میں مولانا عنایت اللہ اور مولوی عبدالحق کے درمیان کوئی شکر رنجی بھی ہوجاتی۔ کیونکہ مولوی عبدالحق ترجمہ کمیٹی میں بھی تھے مگر وہ کسی دیر پا رنجش کا سبب نہ بنتی اور اس طرح یہ دونوں حضرات علمی ادبی خدمت میں مصروف رہتے ۔

وزارتِ عظمیٰ سے مہاراجہ کشن پرشاد کے ہٹنے کے بعد سر اکبر حیدری فائز ہوئے ۔ سر اکبر کے زمانے میں حیدرآباد دکن میں ہر طرح ترقی ہوئی کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اصلاحیں نہ ہوئی ہوں اسی زمانے میں عثمانیہ یونی ورسٹی کی نئی عمارت بن کر تیار ہوئی جو دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

عثمانیہ یونی ورسٹی اور انجمن ترقی اُردو نے بھی اس دوران میں غیر معمولی ترقی کی اور یہ ساری ترقی ایک طرح سے مولوی عبدالحق ہی کی رہین منت تھی کیونکہ سر اکبر انہیں عزیز رکھتے تھے اور اکثر اُن سے مشورت کرتے تھے ۔

حیدرآباد کی اس ہمہ جہتی ترقی کی وجہ سے ہندوستان کے اور مشاہیر بھی جوق در جوق حیدرآباد پہنچنے شروع ہوئے۔ فانی بدایونی ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد آچکے تھے۔ جگر مرادآبادی پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد پہنچے اور فانی کے یہاں مقیم ہوئے۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ انھیں لیا۔ آئے دن شعری صحبتوں اور مشاعروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے بھی ایک مخصوص مشاعرہ ترتیب دیا اور راجہ پرتاب گیرجی کی عالی شان سنگ مرمر کی کوٹھی کے بڑے ہال میں صرف ڈیڑھ سو مہمانوں کی نشست کا انتظام کیا گیا ہال مشرقی سامانِ آرائش سے سجایا گیا۔ مولوی عبدالحق کو صدر بنایا گیا۔ اور اس مشاعرہ کی خاص بات یہ رکھی گئی کہ اس میں شعراء صرف چار پانچ ہی مدعو کیے گئے۔ چنانچہ پڑھنے والوں میں فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، سکندر علی وجد، علامہ حیرت بدایونی، اور شام اکبرآبادی تھے۔ شام اکبرآبادی فانی کے ہندو دوست تھے اور ان کے یہاں مقیم تھے۔ سامعین میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد، راجہ پرتاب گیرجی، اور یونیورسٹی کے پروفیسر، اور شہر کے صاحب ذوق حضرات کو مدعو کیا گیا۔ اس مشاعرہ کی خوبی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فانی نے جو بہت کم شعر سنانے کے عادی تھے کم از کم دس غزلیں پڑھی ہوں گی۔ مشاعرہ میں مولانا عبدالحق کی بذلہ سنجی نے اور جان ڈال دی تھی اور جب رات کے ایک بجے یہ صحبت ختم ہوئی تو فانی نے کہا" میں نے اپنی عمر میں ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا"۔ یہی حال جگر مرادآبادی کا تھا وہ بہت محظوظ اُٹھے اور اپنے کلام سے لوگوں کو بھی دیر تک لطف اندوز رکھا۔ مولانا عبدالحق نے اتنے

مشاعروں کی صدارت کی ہے کہ ان کو شاید یہ مشاعرہ یاد بھی نہ ہو لیکن میرے لئے یہ مشاعرہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا کو جب میں نے پہلی بار دیکھا ہے تو میں نے ان کو مذہبی آدمی خیال کیا۔ یہ تاثر بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ مولانا وضع قطع سے پرانے اسلامی تمدن کے آدمی ہیں۔ اُن کی اِس وضع قطع میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس، صاف ستھرا رہن سہن ان کا طریق زندگی رہا ہے اور مولانا عمدہ کھانا کھانے اور کھلانے کے عادی ہیں۔ غالبًا ایک وقت کھاتے ہیں اور یہی اُن کی صحت کا راز ہے۔

حیدرآباد کی ملاقاتوں کے بعد دہلی میں جب انجمن کا دفتر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں تھا میں اوعلی حسنین زیبا اکثر حاضر خدمت ہوئے وہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، رحم علی ہاشمی اور سید ہاشمی فریدآبادی جیسے بزرگوں سے بھی شرف نیاز حاصل رہتا دلی کی بربادی کے بعد کراچی میں اردو کالج کی بعض علمی ادبی تقریبوں میں بھی مولانا سے نیاز حاصل رہا ہے اور مولانا ہمیشہ اُسی محبت اور شفقت سے پیش آئے جس محبت او شفقت سے پہلی بار ملے تھے۔ بڑی شخصیتوں کا دیکھ لینا بھی عظمت ہے چہ جائیکہ اُن سے نیاز و ملاقات کا شرف حاصل رہنا۔

بقیہ:- اردو کا زخمی سپاہی

کی بہت شکایت کرتے ہیں۔ سماعت میں بھی بہت زیادہ فرق ہو گیا ہے۔ وظیفہ بند ہونے کے باعث معاشی مشکلات کا شکار ہیں۔ عسرت کی زندگی نے صحت کم زور کر دی ہے۔ لیکن اُردو کی خدمت کا جذبہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکتا رہتا ہے۔

اُردو زبان کا یہ سپاہی اپنی پچاس سالہ جنگ میں بڑی طرح مجروح ہو چکا ہے لیکن اس کی ہمت اور استقلال میں بال برابر فرق نہیں آیا۔ سر سیّد کی طرح مولوی صاحب کی بھی ان کی زندگی میں قدر نہیں ہوئی۔ یہ تعجب خیز بھی نہیں کیوں کہ ہم لوگ روایتاً قبر پرست ہو گئے ہیں۔ بڑی ہستیوں کو ان کی زندگی میں تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان کی قدر ان کے فنا ہو جانے کے بعد کرتے ہیں۔

قابلِ ستائش ہے انقلابی حکومتِ پاکستان جس نے مولوی صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا۔ قابلِ مشکریہ ہیں صدر محمد ایوب خاں جنھوں نے اُردو کے زخمی سپاہی کو "وکٹوریہ کراس" کے مساوی امتیاز دیا

زندہ باد "اُردو"

عباس احمد عباسی

سنجیدگی مقصدیت اور محنت

یہ کوئی ۴۴ء کی بات ہے۔ دلّی میں جمنا کے کنارے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا۔ اس دفتر میں دو حضرات دن رات رہتے تھے۔ ایک برجموہن دتاتریہ کیفی اور دوسرے مولوی عبدالحق، اور اس دفتر میں دن رات لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ محفلیں ہوتی تھیں۔ بحثیں ہوتی تھیں، کام ہوتا تھا تفریح ہوتی تھی، کوئی ایسا بڑا آدمی نہ تھا جو دلّی آئے اور انجمن ترقی اردو کے دفتر نہ جائے۔ طالب علمی کا زمانہ اس لحاظ سے بہت خوش گوار ہوتا ہے کہ جس محفل میں چاہے چلے جائیے اور جس آدمی سے چاہے مل لیجئے آپ کو کوئی محفل سے نہیں نکالتا۔ اور کوئی آپ سے بد اخلاقی سے پیش نہیں آتا اور پھر طالب علم بھی استفادہ کی غرض سے جاتے ہیں اور ہر محفل سے کچھ لے کر ہی آتے ہیں اب تو نہ جانے یہ ماحول ہر با نہیں اور نہ جانے طالب علم بھی کیا ہوتے جا رہے ہیں۔ پرچہ مشکل ہو تو امتحان نہیں دیتے اور پرچہ اگر خراب ہو جائے تو ممتحنوں کے پاس سفارشیں لے جاتے ہیں اور بہت سے تو اس زحمت سے بچنے کے لئے پہلے ہی پرچہ آؤٹ کر لیتے ہیں غرض یہ ہے کہ علم سے زیادہ ڈگری کا شوق ہو گیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ کسی دفتر میں کلرکی مل جائے۔ خیر ذکر ۴۴ء کا تھا۔ میں عربک کالج دلّی میں پڑھتا تھا اور بزم ادب کا نائب صدر تھا۔ ہم نے سوچا کہ ایک سہ روزہ اد.بی کانفرنس کر لی جائے جس کی چھ نشستوں میں سے ایک کی صدارت مولوی صاحب سے کرائی جائے۔ بس یہ خیال ذہن میں آیا اور چل دئے۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر پہونچ گئے تو پوچھا مولوی صاحب کہاں ہیں؟ چپراسی نے بتایا پچھلے برآمدے میں ہیں اور اکیلے ہیں۔ اب جو دیکھا تو مولوی صاحب زور زور سے ٹہل رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات پر خفا ہیں۔ اور جو سامنے پڑا اس پر غصہ اتار دیں گے۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی چپکے سے

کھسک لئے اسی دفتر میں میرے بڑے بھائی کے دوست رفیق صاحب بھی کام کرتے تھے ان کے پاس پہونچا۔ اور مولوی صاحب کا عالم بتایا۔ انھوں نے ہنس کر کہا نہیں وہ تو یونہی ٹہلا کرتے ہیں۔ عربک کالج کے چند انتظامی امور کی وجہ سے وہ ادبی کانفرنس منعقد نہ ہو سکی۔ لیکن مولوی صاحب کے متعلق یہ بات یاد رہی اب سوچتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ

مولوی صاحب ہر کام سنجیدگی سے کرتے ہیں ان کے ہر کام کا مقصد ہوتا ہے۔ اور اس لئے ہر کام محنت سے کرتے ہیں۔ گویا مولوی صاحب کی زندگی کے تین عناصر ہیں۔ سنجیدگی، مقصدیت اور محنت۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی اُردو کا نام لے تو عبدالحق کا نام ذہن میں ضرور اُبھر آتا ہے۔ اور مولوی صاحب کا تصور کیجئے تو اُردو خواہ مخواہ سامنے آجاتی ہے۔

مولوی صاحب ایک فرد نہیں اب وہ ایک تحریک ہیں۔ اور تحریک جاری و ساری رہتی ہے۔ کیونکہ تحریک کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اس کی ترقی کی نشان دہی سنگ میل ضرور کرتے ہیں۔ مگر اس میں جمود ناممکن ہے۔ ہماری تاریخ میں مولوی صاحب

سے پہلے ایک اور شخص بھی گذرا ہے جسے ہم نے یہی انداز سے دیکھا ہے وہ تھے سرسید احمد خاں۔ سر سید احمد خاں نے

ایک کام شروع کیا تھا۔ اور وہ کام آج بھی جاری ہے۔ انھوں نے خود کو ایک تحریک بنا لیا تھا انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا تھا کہ مسلمانوں کو اقتصادی اور سماجی طور پر ہندوستان کی دوسری قوموں کا ہم پلہ بنا دیں انھوں نے طعنے سہے تضحیک برداشت کی تکلیفیں اٹھائیں۔ مگر وہ دھن کے پکے تھے ان کے دل میں لگن تھی اور ان کے دن رات اسی کوشش میں گذرتے تھے۔ انھوں نے قوم سے چندے لے کر یونیورسٹی بنائی۔ بڑے بڑے لوگوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دیں تاکہ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی یہی روش اختیار کریں۔ یہ سرسید ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان آزاد اور اقتصادی طور پر مستحکم ہیں۔ سرسید نے جس کالج کی بنیاد ڈالی تھی مولوی صاحب نے اسی کالج میں تربیت پائی اور شروع سے ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اجنبی زبان میں علم کی تحصیل دشوار بھی ہے اور اس میں تضیع اوقات بھی، لہٰذا اپنی زبان کو اس قابل بنایا جانے کہ تمام علوم

اس میں سما سکیں۔ انھوں نے ترجمے کئے اور کرائے انگریزی کی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ انگریزی سے اردو ڈکشنری مرتب کی۔

> اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو لکھنے کا ایسا انداز بخشا کہ بڑی سے بڑی بات آسان زبان میں کہی جا سکے۔ اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات ہر ایک کی سمجھ میں آئے۔

مولوی صاحب اردو لکھتے ہیں۔ فارسی یا عربی یا انگریزی نہیں لکھتے۔ ویسے ہمارے ہاں کے لکھنے والے یا فارسی عربی لکھتے ہیں یا انگریزی اردو نہیں لکھتے۔ یہ بات چاہے کتنی ہی تکلیف دہ ہو حقیقت ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے ہمیں اپنی زبان پر قدرت نہیں اور پھر جو کچھ ہم لکھتے ہیں اس پر محنت نہیں کرتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم جلد سے جلد بات کہہ دینا چاہتے ہیں چاہے کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اچھا لکھنے والا اپنی بات اس طرح کہتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کو پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مولوی صاحب کی تحریر کا یہی کمال ہے۔

۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو ادیبوں کے کنونشن کے آخری اجلاس کی صدارت مولوی صاحب کر رہے تھے۔ خطبہ صدارت میں اُردو کی محبت میں کہنے لگے کہ آج ابھی سورج غروب ہونے سے پہلے اردو کو دفتری اور تعلیمی زبان بنا دیا جائے۔ یہ فقرہ انھوں نے اس جوش سے کہا اور آواز میں اتنا خلوص تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے واقعی یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اس اجلاس میں صدر پاکستان بھی موجود تھے۔ اور میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مولوی صاحب کے جملہ پر ان کے

> چہرے کے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے ان کا جی مولوی صاحب کی بات پوری کر دینے کو چاہتا ہے ان کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔

اور سچ پوچھئے تو مولوی صاحب کے احترام سے زیادہ ان پر پیار آتا ہے اور یہ احترام اور عقیدت کی دو منزل جب معاملات دل تک پہنچ جاتے ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے ان کے ساتھ کام کیا ہے انھیں کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ سعادت نصیب نہیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آج قوم کو بہت سے عبدالحق چاہئیں۔ یہ طلب ہی ہیں سے پیدا ہوں گے۔ ہم اقتصادی طور پر بدحال ہیں۔ تعلیمی طور پر پست ہیں اور اخلاقی طور پر کنگال ہیں ہمیں ایسے رضاکاروں کی ضرورت ہے جن کے دل میں خدمت کی لگن ہو اور وہ اپنی پوری زندگی کا ایک مطمع نظر بنا لیں اسے حاصل کرنے کے لئے دن رات محنت کریں۔ اور مقصد کے سلسلے میں سنجیدہ رہیں

ضیاء الدین احمد برنی

افکارِ عالیہ

مولوی عبدالحق کی زندگی کا بہت بڑا حصہ میرے سامنے گزرا ہے اور مجھے فخر ہے کہ برسوں سے مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے اگرچہ میری ان کی عمر میں تقریباً بیس سال کا فرق ہے، لیکن وہ مجھ پر اتنی شفقت برتتے ہیں کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیتے کہ میں ان سے چھوٹا ہوں یا وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ ہم دونوں بے تکلف ہوکر باتیں کرتے ہیں۔ میرا ایک کام یہ بھی ہے کہ میں مولوی صاحب کو کبھی کبھار خوب ہنسا دیا کرتا ہوں۔ خوش رہنے سے غم غلط ہو جاتے ہیں اور انسان کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔

مولوی صاحب ہمارے زمانہ میں ہیں۔ وہ ہم سے اس قدر قریب ہیں کہ ہم ان کی عظمت کا پورا پورا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رسم یہی رہی ہے کہ صحیح اندازہ مرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ اس

لئے میں ان دوستوں کو جو مولوی صاحب کے نوّے سالہ جشن کے سلسلہ میں ایک کتاب شائع کر رہے ہیں، قابلِ مبارک باد سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے ملک کی اس عام ریت کے خلاف قدم اٹھایا اور ایک شخص کی زندگی ہی میں اس کی عظمت پر مہر ثبت کر دی۔

مولوی کی شخصیّت کے بُہت سے دل آویز پہلو ہیں اور وہ سب اس قابل ہیں کہ انہیں پوری طرح اُجاگر کیا جائے۔ لیکن میں نے اختصار سے کام لے کر، اپنے لئے ایسا موضوع منتخب کیا ہے جو مولوی صاحب ہی کے افکارِ عالیہ پر مشتمل ہے۔ یہ افکار صرف ایک کتاب (چند ہمعصر) سے لئے گئے ہیں جو مولوی کی بعض دوسری کتابوں کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ افکارِ عالیہ اپنے اندر ابدی حقیقتیں پنہاں رکھتے ہیں۔

بعض افکار اپنی بلندی اور ادبیّت کے اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے مُجھے پورا یقین ہے کہ وہ دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔

میرا ارادہ تھا کہ میں مولوی صاحب کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ پر طویل مضمون لکھوں۔ لیکن وقت کم ہے اور اس لئے انھی چند سطور پر کفایت کرتا ہوں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب کے مدّاحوں اور نیاز مندوں کی صف میں مُجھے بھی ذرا سی جگہ مل جائے اور بس۔

موت

"اس میں شک نہیں کہ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لئے کوئی ڈر کی چیز نہیں۔ لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو خصوصاً جب کہ اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیم النظیر ہو اور خاص کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جہاں پہلے ہی سے قحط الرّجال ہے تو ایسی موت غضب ہے اور قیامت ہے۔"

اپنی مدد آپ کرنا

اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے

وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پایا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔

بیرونی امداد

"بیرونی امداد بڑی کار آمد اور مفید چیز ہے بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لئے سب کچھ ہوتا رہے، تو محض خیالِ خام ہے۔"

انسان کے اعمال

"انسان نہیں رہتا، لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔"

وقت کی قیمت

"وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا، اور قدر نہیں اس وقت ہوتی جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔"

یادگار کام

"یادگار دنیا میں وہی کام رہیں گے جن کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔"

انسانی خواہشات

"انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اُسے ایسا معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ رات دن سرگرداں و حیراں رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا، اور وہ کوششیں جن کے لئے اس نے اپنی جان تک کھپا دی، پانی کے بلبلہ سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں۔"

شہرت اور بڑائی

"بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں جو محض نام و نمود کے لئے زمین

آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔"

وکالت کا پیشہ

"وکالت کا پیشہ ایسا ظالم پیشہ ہے کہ وہ انسان کو کسی دوسرے کام کا نہیں رکھتا۔"

سچ اور جھوٹ کا امتحان

"ہمارے ملک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ ہر بڑے صاحبِ اقتدار آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں۔ لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب وہ بڑا آدمی اپنے اقتدار یا منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔"

نیک و بد

"دُنیا نیکوں ہی کے لئے نہیں ہے، اس میں بَدوں کا بھی حصّہ ہے اور شاید دُنیا کی رونق انہی کے دَم سے ہے۔"

مزید تربیت کی ضرورت

"جب ہم اپنے نفسوں کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سیرتیں خام، ہماری طبیعتیں ناتربیت یافتہ اور ہمارے نفس چور ہیں۔ ہمیں ابھی بہت سی ٹھوکروں اور بہت کچھ تربیت کی ضرورت ہے۔ جس چیز کی ہم خواہش کر رہے ہیں، اس کے لئے پختہ سیرت اور اعتدالِ طبع کی ضرورت ہے اور وہ ابھی ہم سے کوسوں دُور ہے۔"

بے تعصّبی

"بے تعصّبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔"

دُنیا اچھّوں سے خالی نہیں

"کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھّوں سے خالی نہیں ہوتی۔"

زوال یافتہ اقوام کی خصوصیات

"زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیّت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بڑھتے ہوئے کو گراتا اور اُٹھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں انہیں خوشی ہوتی ہے کُبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے ہی سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے۔"

کارزارِ دُنیا

"کارزار دُنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لئے تیار نہیں اس کے لئے پسپا ہوجانا ہی بہتر ہے، بلکہ سرے سے اُسے میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے۔"

آدمی کی نشانی

"آدمی جب برسراقتدار ہوتا ہے تو خوشامد میں ہزاروں، استقبال اور مشایعت کے لئے آموجود ہوتے ہیں۔ لیکن جب اقتدار و اختیار سے کنارہ کش ہوکر معمولی شخص رہ جاتے اور پھر اسے قبولِ عام حاصل ہو تو سمجھو کہ وہ آدمی ہے۔

خدمت النّاس

"اپنے کو مٹا کر دوسروں کی خدمت کرنا یہی جوہرِ انسانیت ہے۔"

کام کا معیار

"کام اس وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام نہیں بیگار ہے۔"

نیکی کا مفہوم

"نیکی اس وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ ج
سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔"

درجۂ کمال

"درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہ
انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کُندن ہو جاتا ہے۔"

انسان کی اصلی فضیلت

"انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق
ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و رفعت ہے۔"

اخلاق و انسانیت

"اخلاق سے صرف یہی مُراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، م
وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے، زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جی
کے طور پر کہا جاتا ہے، 'مرنج و مرنجاں' ہو۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔
ضبط و تحمّل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت)، کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، روادا
ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے، یعنی ذاتی اغراض
ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھُول
اسی سے عبارت ہے۔"

شخصی سلطنتیں اور سازش

"شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھولتی پھ

صحیح ذوق

"آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام محنت سے مل جاتا ہے۔ لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا
ہ۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے، نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے
ندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ
ھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔"

بے غرض لوگ

"پاکستان میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہوں کہ، کاش ایسے (جو نام و نمود کے خواہاں نہ ہوں) دو چار
ی مل جائیں۔ اب تک جن سے سابقہ پڑا اُن میں سے اکثر ایسے ملے جن کی سرشت میں کسی ایسے عنصر کی ملاوٹ
ہے جو اُن کو تعمیر کی بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں رہی۔ جس کام کو
یں نے اپنا مقصدِ حیات قرار دیا ہے، میں اگر اُسے پورا نہ کر سکا تو مجھے یقین ہے کہ خدا کے کچھ بندے ایسے
ٹھیں گے جو مجھ سے بہتر اسے پورا کر دکھائیں گے۔ مجھے اس پر ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ سورج کے مشرق سے
نکلنے اور مغرب میں غروب ہونے کا۔"

اُردو کی فضیلت

پاکستان کی قومی زبان کے مسئلے پر بنگالی اہلِ نظر کے
افکار و خیالات کا مجموعہ انگریزی و اردو ایڈیشن
قیمت ہر ایک۔ ایک روپیہ۔

پولر
گریزی اُردو
شنری

مرتبہ جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب
یہ اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری کے مبتدی عام طلبہ کیلئے تیار کی گئی ہے۔
صفحات تقریباً .. قیمت پانچ روپے آٹھ آنے
انجمن ترقی اُردو پاکستان، اردو روڈ ــــــ کراچی

نظر حیدر آبادی

مولوی عبدالحق

ایک ادارہ ——— ایک تحریک

مولوی عبدالحق جیسی عظیم المرتبت شخصیتیں خطّوں اور صوبوں سے وابستہ نہیں کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم حیدر آبادی لوگ اگر انھیں "ملکی" بنا ڈالیں تو اس پر کسی کو ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ مولوی عبدالحق پیدا تو ہاپوڑ میں ہوئے اور طالب علمی کا زمانہ علی گڑھ میں گذارا لیکن اس کے بعد ہی وہ حیدر آباد آ گئے اور وہیں کے ہو رہے اور خاکِ دکن اُس وقت تک ان کی دامن گیر رہی جب تک ان کی محبوب اُردو زبان پر کسی آنچ کے آنے کا اندیشہ جاتا رہا، وہ اورنگ آباد کی پُرسکون فضاؤں میں آبادی سے دور، مقبرۂ رابعہ دورانی کے ایک خاموش گوشے میں مدّتوں علم و تحقیق کا چراغ روشن کئے مرکزِ اہلِ نظر بنے رہے! ــــ لیکن جب اُردو زبان پر سیاسی بازی گروں کی یلغار شروع ہوئی تو وہ میدانِ عمل میں کود پڑے اور دکن سے دہلی منتقل ہو گئے۔ لیکن اس نقلِ مکانی تک مولوی عبدالحق اپنی زندگی کے لگ بھگ پچاس برس حیدر آباد کی نذر کر چکے تھے آصفیہ ہائی اسکول حیدر آباد کی ہیڈ ماسٹری سے لے کر انجمنِ ترقی اُردو کی اعزازی سکریٹری شپ، اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی اور آخر میں جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اُردو کی صدارت تک وہ حیدر آباد میں جو چاہتے بن جاتے، لیکن عجیب بات ہے کہ "حاکم گر" عبدالحق نے صرف اُردو زبان و ادب کی خدمت ہی کو ہر منصب سے اعلیٰ جانا، بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حیدر آباد کی بڑی بڑی سیاسی تبدیلیوں میں مولوی عبدالحق کی چشم و ابرو کے اشاروں کو کتنا دخل حاصل رہا ہے!

انجمن ترقی اُردو آج ایک ادارہ ہے، ایک تحریک ہے، لیکن جب مولوی عبدالحق نے اس کا جائزہ مولانا شبلی نعمانی سے

حاصل کیا تو انھیں کیا ملا تھا، اس کی تفصیلات آپ کو انجمن کی شائع کردہ رپورٹ میں ملیں گی۔ چوں کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں، اس لیے اسے بھی اُن کی اَن تھک کوششوں کا اعجاز کہنا چاہیئے کہ چند علم دوست حضرات کا ایک خیال ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ تحریک جامعۂ عثمانیہ جیسے عظیم الشان کامیاب علمی تجربے کا بنیادی پتھر بن گئی!

حق بات یہ ہے کہ مولوی عبدالحق ہی کو جامعۂ عثمانیہ کا بانی سمجھنا چاہیئے۔ کہنے والے کہیں گے کہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس اور مدرسۂ دارالعلوم حیدرآباد کے اولڈ بوائز نے سب سے پہلے حکومتِ حیدرآباد کو ایک اردو یونی ورسٹی کے قیام کی جانب متوجہ کیا تھا۔ لیکن آج سے تیس چالیس برس پہلے کے حیدرآباد کو جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ اس زمانے کی حکومت حیدرآباد کے ایوانوں میں چند "سر پھرے نوجوانوں" کی درخواستوں کی جگہ "ردی دان" کے سوا کہیں نہیں تھی۔ بمبئی کے ایک بوہری باشندے اور اُردو زبان کی نزاکتوں اور وسعتوں سے ناآشنائے محض وزیرِ مالیات سر اکبر حیدری کو کروڑوں روپوں کے صَرف پر ایک نئے علمی تجربے کے لئے تیار کرنا، صرف مولوی عبدالحق کا کارنامہ ہے!

مولوی عبدالحق انسان بڑے ہیں یا انشاپرداز، اس میں سے اوّل الذکر بات کے بارے میں تو وہی لوگ کچھ بتا سکیں گے جنھیں عرصۂ دراز تک ان کی قربت کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میرے حصے میں تو دُور کے جلوے آئے ہیں۔ رہی دوسری بات، سو یہ ہمارے نقّادوں کا کام ہے کہ اس سلسلے میں اپنی جودتِ انشاء کے جوہر دکھائیں۔ البتہ خون لگا کر میں بھی شہیدوں میں شامل ہو جاؤں تو کیا حرج ہے۔!

"صدی اُدھر کی بات ہے۔ سٹی کالج حیدرآباد کے احاطے میں ایک شان دار پنڈال سجایا گیا ہے۔ نواب سالار جنگ کی صدارت میں "یومِ ولی دکنی" منایا جا رہا ہے۔ ڈائس کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ، کاروبار میں مصروف حضرات، مقررین اور شاعر صاحبان، سبھی حیدرآباد کے درباری لباس میں یعنی "دستار" پہنے اور "بگلس" لگائے نظر آ رہے ہیں۔ دو چار تقریروں اور نظموں کے بعد مولوی عبدالحق کا نام پکارا گیا۔ تالیوں کی گونج میں میں نے دیکھا کہ علی گڈھ فیشن کی بغیر استری کی ٹوپی اور معمولی سی قیمت کی سادہ سی شیروانی پہنے اور قدیم وضع کے سلیپر سُپڑ سُپڑ کرتے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ ڈائس پر نمودار ہوئے۔ تالیاں پھر بجنے لگیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مولوی عبدالحق کو اسی جلسے اور اسی جلسے میں دیکھا۔

دستاروں، بگلسوں اور زرق برق لباسوں کے اس تماشا گاہ میں ان کی اس ادائے بے نیازی اور شانِ قلندری کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ "واقعی یہ بہت بڑا انسان ہے"۔!!

حیدرآباد میں اکثر بزرگوں سے سُنا کہ مولوی عبدالحق اپنی نجی صحبتوں میں نٹ کھٹ منسوئر اور بذلہ سنج قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں اور فقرہ بازی میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی بدیہہ گوئی کے بہت سے لطیفے حیدرآباد میں مشہور رہتے۔

دروغ برگردنِ راوی، ایک دل چسپ سنی سنائی آپ کو بھی سناتا چلوں۔

موجودہ نظامِ دکن کو اُن کے حواریوں اور درباریوں نے جہاں "ارسطوئے زماں" "افلاطونِ جہاں" اور "حکیم السیاست" وغیرہ بنا رکھا تھا، وہیں اُن کے خبط شاعری کو حد سے بڑھتا ہوا دیکھ کر انھیں "سلطان الشعراء" بھی بنا ڈالا تھا۔ ہوا یہ کہ نظام کے چند درباریوں نے از راہِ تفنّن مولوی عبدالحق کی برجستہ گوئی کی آزمائش کے لئے ایک خطرناک سازش تیار کی، ان لوگوں نے نظام کے دل میں بات بٹھا دی کہ اُن کا کلام بلاغت نظام بھی جامعۂ عثمانیہ کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ نوجوان نسل "کلام الملوک ملوک الکلام" سے محروم نہ رہ جائے۔ اس سلسلے میں مشورے کے لئے اچانک مولوی عبدالحق کو دربار میں طلب کیا گیا اور نظام نے اُن کی رائے دریافت کی۔ مولوی صاحب نے فوری جواب دیا "مشورہ تو بہت صائب ہے لیکن حضور کے کلام بلاغت نظام کے نکات کو سمجھنے اور سمجھانے والے اُستاد کہاں سے ملیں گے۔" اس دل چسپ جواب پر اعلیٰ حضرت اُچھل پڑے اور بھڑکنے کی بجائے پھڑک گئے!

اگر موجودہ صدی کے بڑے نثر نگاروں کی کوئی فہرست بنائے اور اُس میں سے مجھے اپنی پسند کے چند نام چُن لینے کی اجازت دی جائے تو یقین جانیئے میری نظرِ انتخاب صرف تین ناموں پر رُک جائے گی۔ ابوالکلام آزاد، عبدالحق اور رشید احمد صدیقی۔ ان میں سے ہر شخصیت اپنے ایک اندازِ نظر، طریقِ فکر اور مخصوص طرزِ ادا کی مالک ہے، اور ان میں سے ہر طرزِ ادا ایک ایسے رنگ کی غمازی کرتی ہے جس پر اُردو نثر کی شاعری۔ ساحری اور کافری ختم ہے!

عبدالحق سے پہلے کسی کتاب کا مقدمہ یا دیباچہ لکھنا صاحبِ کتاب کی "مدلل مداحی" کے سوا کیا تھا۔ مولوی عبدالحق ہی نے مقدمہ نگاری کو ایک فن بنایا۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی اس صنف میں کوئی ان کا مدِمقابل نہیں۔

اُردو نثر کی ابتداء سے آج تک کتنے مترجم نہیں پیدا ہوئے۔ مرحوم حیدرآباد نے تو دارالترجمہ کے نام سے ایک محکمہ ہی بنا ڈالا تھا، لیکن جو شگفتگی، روانی اور سادگی و پُرکاری مولوی عبدالحق کے تراجم کہیں نظر آتی ہے وہ کم از کم مجھے تو کہیں اور نظر نہیں آئی۔ مولوی چراغ علی کے دقیق مسائل اور مذہبی مضامین کے ترجمے اگر آپ کی نظر سے گذرے ہوں تو آپ بھی میرے اس دعوے کی تائید کریں گے۔

قدیم اُردو زبان و ادب کی تحقیق، تدوین اور اشاعت کے سلسلے میں تو مولوی عبدالحق کا کام اتنا اہم و بالشان ہے کہ بعض بڑے بڑے علمی ادارے اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ اُن کا تخلیقی ادب بھی بہت گراں مایہ ہے۔ "چند ہم عصر" کو بلا تامل اُردو ادب میں فنِ کردار نگاری کا سنگِ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ مولوی عبدالحق کے قلم کی باتیں تھیں۔ اُن کے کردار و عمل پر غور کیجئے تو یہ شخصیت اور بلند و بالا ہو جاتی ہے۔

حمد سے رند گر کو جنت بنانا کوئی مولوی صاحب سے سیکھے۔ اپنی دُھن سے ایسی لگن رکھنے والا کوئی دوسرا شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔

اپنی دُھن سے یہی لگن تھی جس نے اُنھیں دکن کی پُرسکون اور باغ و بہار زندگی سے چھڑا کر پہلے دہلی کے خارزاروں اور اُس کے بعد

سلام ،مسلم تہذیب اور اُردو کے نام پر حاصل کردہ پاکستان کی سرزمین پر لا پھینکا۔

اب اُردو اور عبدالحق ، وجُدا چیزوں کے نام نہیں رہے۔

س ہجرت اور اس نقلِ مکانی میں ان دونوں پر کیا بیتی ، اس کے تصوّر ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں ان کی ہجرت کے بارے میں چند دلچسپ اور عبرت انگیز باتیں سناتا چلوں۔

انجمن ترقی اُردو کی دکن سے منتقلی کے سلسلے میں انھوں نے تخیلِ پاکستان کے خالق اقبالؔ سے بھی مشورہ کیا تھا اور اقبالؔ نے اس خیال کو سراہتے ہوئے انھیں لکھا تھا۔

" آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں۔ میرے خیال میں صرف دو باتیں زیرِ بحث آئیں گی۔ اوّل یہ کہ فنڈ کہاں سے آئے گا ؟ عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ امراء توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان امراء مقروض ہیں ــــ دوم یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو ؟ میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیے۔ اور اس کے لئے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں کو اپنے تحفّظ کے لئے جو لڑائیاں آئندہ لڑنی پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی کیوں کہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔"

(اقبال نامہ صفحہ ۹۷)

اس کے بعد اقبالؔ نے دو اور وجُوہ بیان کی تھیں۔ ایک یہ کہ لاہور پبلشنگ کا بڑا مرکز ہے اور دوسری یہ کہ اہلِ پنجاب صحرا نشینوں کی طرح سادہ دل ہوتے ہیں اور ان میں اثرات قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ معلوم نہیں حالات نے کیا رخ اختیار کیا کہ شاعرِ اعظم کے اس "پیمبرانہ" مشورے کو مولوی عبدالحق قبول نہ کر سکے۔ اور دہلی کو انجمن کا مستقر قرار دے دیا گیا۔ پھر تقسیمِ ملک کے بعد جو قیامت دہلی اور انجمن پر ٹوٹی اس کا سب کو علم ہے۔ اقبالؔ کی بصیرت نے تو بہت پہلے دیکھ لیا تھا لیکن خود مولوی صاحب کو بھی یہ روزِ بد دیکھنا پڑا کہ اپنے ہی گھر اور دفتر میں فوجی پہرہ داروں کی نظر بچا کر انھیں بعض پسندیدہ مخطوطات کو اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے جانا پڑا اور اپنے ایک قدیم کرم فرما مولانا ابوالکلام آزاد کی شانِ میزبانی کی اس طرح پذیرائی کرنی پڑی کہ ایک طرف مولانا آزاد کی کوٹھی مختلف مہمانوں کے قہقہوں سے گونج رہی ہے اور کلام و طعام کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور دوسری طرف ایک خاموش کمرے میں مولوی عبدالحق اپنے "کھانے" کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں اور ان پر شاید ہی کسی کو یقین آئے اور ہو سکتا ہے کہ وسیع مشرب اور وسیع دسترخوان مولوی عبدالحق بھی ان باتوں کو من گھڑت کہہ کر ٹال جائیں، لیکن ایک خضر صورت بزرگ کا محض اپنے ذوقِ علم کی تسکین کے لئے چند مخطوطات کا کپڑوں میں چھپا کر لے آنا اور نازک حالات میں مولانا آزاد کی مصلحت اندیشی کی وجہ سے ان کا ایک گوشے میں خاموش بیٹھے رہنا۔ یہ اتنی عجیب اور غیر معمولی باتیں ہیں کہ اگر واقعی یہ سب کچھ نہیں ہوا

تھا تو جی یہی چاہتا ہے کہ کاش ایسا ہو سکتا۔!

ساری خوش بختیاں ایک ہی شخص کے حصے میں نہیں آتیں۔ مولوی عبدالحق پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ اُن کی ساری کامرانیوں اور سرفرازیوں کی پیشانی پر بھی میں نے غم کی دھندلی سی لکیر دیکھی ہے۔ غم کی یہ لکیر ــــــ جس کا آخری نقطہ دل کی انتہا گہرائیوں میں ہوتا ہے اور جس کی ایک آدھ جھلک تلاش کرنے والوں کو کبھی کبھی متفکر آنکھوں کی خشک جھیلوں میں نظر آجاتی ہے۔ یہ غم، غمِ عشق بھی ہوسکتا ہے اور غمِ یاداں بھی، اس غم کو غمِ دوراں بھی کہہ سکتے ہیں اور اپنے آدرش کی پسپائی کا غم بھی، اور مجھے تو کبھی کبھی یہ سارے ہی غم مولوی عبدالحق کی آنکھوں میں سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کی مثال ایک ہرے بھرے تناور درخت کی سی ہے، جس پر بھانت بھانت کے پنچھی آکر بسیرا لیتے اور وقت آنے پر اُڑ جاتے ہیں اور ان کے دل پر ایک تازہ داغ چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں تک میں نے سنا اور دیکھا ہے، مولوی عبدالحق کو ان کے "بہی خواہوں" سے زیادہ کسی نے نقصان نہیں پہنچایا۔ ہندوستان میں بھی یہی صورتِ حال تھی اور جب یہاں آئے تو

ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس ہوا کی لپیٹ میں اُن کا ادارہ، اُن کی تحریک، اُن کی زبان اور اُن کا ادب بھی آگیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اتنے سارے غم مل کر بھی مولوی عبدالحق کی شخصیت کو شکست نہیں دے سکے۔ یہ عظیم شخصیت آج بھی اپنے ناقابلِ تسخیر آدرش کا علم اٹھائے، ایک بوڑھے لیکن جوان ہمت سپہ سالار کی طرح، اُردو زبان کے دشمنوں کو دعوتِ مبارزت دے رہی ہے۔ اُردو کے نیم جاں سپاہیو! آؤ! دل کی ساری قوتوں کو مجتمع کرکے نعرہ لگائیں ــ!

مولوی عبدالحق زندہ باد ــــــــ اُردو پائندہ باد !!

اضافیت

سائنس کے مشہور مسئلۂ اضافیت پر مستند کتاب، مشہور سائنس داں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کے قلم سے۔

قیمت تین روپے

انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، اردو روڈ، کراچی

منظر ایوبی

لفظوں کا جوہری

طرزِ تحریر مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ جس طرح شخصیت، مختلف اوصاف و عیوب کا مجموعہ، زماں و مکاں کی پابند اور ماحول، معاشرے کی پروردہ و پرداختہ ہوتی ہے اسی طرح طرزِ ادا مصنف کے گوناگوں خیالات، زندگی کے مختلف تجربات اور کائنات کے متعدد مظاہر سے مترتب ہوتا ہے۔ مصنف چونکہ معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے لہٰذا اس کے خیالات، احساسات، افکار اور جذبات ہیئت اجتماعی یا سماجی زندگی کی پیداوار بھی ہوتے ہیں اور پوری سماجی زندگی کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ادیب یا مصنف کے یہ افکار و خیالات اس وقت تک کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے جب تک کہ ان کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا دیا جائے۔ پھر ادیب اپنے خیال کو صرف ایک لفظ کے ذریعہ ظاہر بھی نہیں کر سکتا، اسے پوری بات کہنے کیلئے مختلف الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح جو ملفوظی خاکہ مترتب ہوتا ہے وہ مصنف کے انفرادی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے گویا اس میں ادیب کی دونوں حیثیتیں شامل ہوتی ہیں۔ داخلی اور خارجی یا انفرادی اور اجتماعی۔ ان جذبوں کے اشتراکِ عمل کا نتیجہ ایک ادبی تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ادب کی تخلیق میں جس طرح زمانہ، ماحول، معاشرہ اور سماجی زندگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ادیب کے انفرادی، ذاتی اور شعوری کوششوں کو ا بھی یہیں سے طرزِ ادا کا آغاز ہوتا ہے۔

کہنے کو ہر ادیب اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے خیال یا جذبہ کو ان الفاظ کا جامہ پہنائے جو اس کے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ظاہر

کردیں اور سامع کے دل و دماغ میں اس کی حقیقی تصویر رقص کرنے لگے۔ بادی النظر میں یہ کام بڑا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے۔ یہ کام تو صرف وہی فن کار کر سکتا ہے جو ایک عظیم شخصیت کا مالک ہو جو زندگی کے نشیب و فراز سے کلیتہً واقف ہو، جو فن، ادب اور زندگی کے باہمی ارتباط اور رشتہ کو سمجھتا ہو، جو مظاہر فطرت اور مشاہدات عالم سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جس کے ذہن میں زندگی اور کائنات کی ایک واضح بھرپور اور مکمل تصویر ہو، جو زندگی کے نصب العین اور کائنات کے ارتقاء کا علم رکھتا ہو۔ یہ تمام خصوصیتیں کسی فرد واحد میں بڑی مشکل سے جمع ہوتی ہیں۔ ایسے فن کار کہیں مدتوں میں جاکے پیدا ہوتے ہیں۔

یوں تو ہر دور اور ہر زمانہ میں فنکاروں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے مگر ان میں معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جنھیں زمانہ کبھی فراموش یا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان کی شخصیت کے بنانے اور سنوارنے میں زمانہ کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ زندگی ایک ہی محور پر نہیں گھومتی، اس کا ارتقا ضروری ہے عظیم شخصیتیں زندگی اور زمانہ کو متاثر بھی کرتی ہیں اور خود بھی متاثر ہوتی ہیں۔ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ خود بھی بدلتی ہیں۔ ہر فن کار اس تبدیلی کو محسوس نہیں کر سکتا صرف بڑا فن کار ہی زندگی، ادب اور فن کے تغیر و تبدل اور اس کے ارتقاء پر کڑی نگاہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے جذبہ یا خیال کی شدت سے دوسرے ذہنوں کو اس طرح متاثر کرتا ہے جس طرح وہ خود متاثر ہوا ہے۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے کہ لفظوں کا انتخاب، ان کی دروبست اور ان کی ترتیب و تنظیم کسی طرح اس کے افکار، احساسات اور جذبات کی مکمل طور پر عکاسی کر سکتی ہے اور کس درجہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسے اپنے پیغام کو موثر طریقہ پر دوسروں تک پہنچانے کا فن آتا ہے۔ اور یہ فن اسے زمانہ سکھاتا ہے۔ انگریزوں کا قائم کردہ جوزف ولیم کالج ہو یا سر سید و حالی کی اصلاحی تحریک، دونوں اپنے وقت اور زمانے کی پیداوار ہیں۔

سر سید سے قبل اردو نثر کے جو نمونے ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل برصغیر ہند و پاک کی زندگی میں کبھی اتنا زبردست انقلاب رونما نہیں ہوا تھا۔ جو اُردو ادیبوں کو نثر کی اصطلاح کی طرف متوجہ کرتا۔ سر سید پہلے شخص تھے جنھوں نے اصلاحی مقاصد کے پیش نظر اُردو نثر کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے جس اسکول کی بنیاد ڈالی تھی اس کی عمارت تو حالی اور شبلی ہی کے ہاتھوں استوار ہو گئی تھی لیکن اس کی آب و تاب اور اس کا رنگ و روغن مولوی عبدالحق کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا۔

مولوی صاحب نے اگر سر سید اور حالی ہی کے حلقۂ اثر میں تربیت حاصل کی ہے مگر ان کی شخصیت سر سید اور حالی کی طرح ایک ہی ماحول اور ایک ہی زمانے کی پابند نہیں رہی ہے۔ مولوی صاحب نے نئے اور پرانے دونوں زمانے دیکھے ہیں، انھوں نے قدیم روایات کو مٹتے اور جدید روایات کو جنم لیتے دیکھا ہے۔ اسی لئے وہ نہ صد فی صد نئے ہیں اور نہ بالکل پرانے۔

> بلکہ انھوں نے زندگی اور زمانہ کے ساتھ خود کو بدلا ہے اور ایک ایسی راہ اختیار کی ہے جہاں قدیم و جدید دونوں کے ڈانڈے آکر ملتے ہیں۔ وہ سر سید اور حالی اسکول کے پروردہ ضرور ہیں۔ انھیں نثر نگاری کا گُر اسی دبستان سے ضرور سکھایا ہے مگر انھوں نے سر سید اور حالی کی قائم کردہ روایات ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ خود نئی روایتیں قائم کی ہیں۔

مولوی صاحب کی ادبی اور علمی زندگی کا آغاز دراصل ۱۸۹۶ء سے ہوتا ہے جب انھوں نے پہلی مرتبہ حیدرآباد دکن سے

...افسر کا اجرا کیا۔ بعدازاں بہ حیثیت معلم اپنی ادبی و علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس عرصہ میں انھیں اُردو زبان و ادب کی خدمت کرنے کا
... موقع ملا۔ کم و بیش اسی زمانے میں انھوں نے تین سو صفحات پر مشتمل ایک نہایت ہی عالمانہ و فاضلانہ مقالہ دکن ریویو میں لکھا جو ادبی دنیا میں کافی مقبول
ہوا۔ اس مقالہ میں مولوی صاحب نے اپنی انشا پردازی کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جسے دیکھکر ادبی حلقوں میں ایک ہلچل مچ گئی۔ بعدازاں مولوی صاحب
نے اردو کی بعض بہت ہی پرانی کتابوں کا کھوج لگایا اور انھیں دستیاب کرکے ان پر مقدمے لکھے۔ مولوی صاحب کے یہ مقدمات اردو ادب میں سنگِ میل
کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کو اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور ادبی تحقیق و فکر سے شروع ہی سے شغف رہا ہے۔ ان کے اس فطری رجحان اور میلانِ
طبع نے ان کے طرزِ تحریر کے ارتقاء پر بھی کافی اثر ڈالا ہے۔ وہ اپنے مقدمات، تذکرے، تنقید و تراجم، خطبات و مکاتیب غرض ہر میدان میں ایک خاص
منفرد طرزِ ادا کے مالک ہیں۔ مولوی صاحب تنقید لکھتے وقت تنقید کی زبان استعمال کرتے ہیں، اور مقدمات لکھتے وقت مقدمات کی! ان میں سوجھ بوجھ
کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ چونکہ وہ ہر صنف نثر کی زبان اس کے مزاج اور اس کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا وہ موضوع کی مناسبت سے طرزِ ادا
اختیار کرتے اور خشک سے خشک مضمون کو بھی دل کش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ البتہ چند خصوصیتیں مولوی صاحب کی تمام تحریروں میں یکساں طور پر
پائی جاتی ہیں۔ ان میں پہلی خصوصیت ہے سلاست اور شگفتگی۔ نثر میں یہ شان اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نثر نگار زبان پر پوری طرح قادر ہو۔ اور ہر
پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مولوی صاحب کی زبان دانی اور قادر الکلامی پر شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ انھوں نے زندگی کا
بیشتر حصہ بالخصوص اردو زبان کو سنوارنے، بنانے اور نکھارنے میں اور بالعموم مطالعہ میں گذارا ہے۔ وہ زندگی اور ادب کے تقریباً تمام مسائل سے نہ صرف
واقف ہیں بلکہ ان کو حل کرنے کی بہترین صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن اور شعور نے سرسید، شبلی اور حالی کی صحبتوں میں جلا پائی ہے۔ اس سے
ان کے اندر غیر معمولی قوتِ ارادی، عزم و استقلال، جوش، ولولہ، حوصلہ، اور استقامت کی شان پیدا ہوئی ہے۔

> وہ سرسید کی طرح روشن خیال اور وسیع القلب ہیں۔ ان میں حالی کی سی سنجیدگی اور بردباری پائی جاتی ہے۔
> ایک طرف ان کے منطقیانہ اور فلسفیانہ خیالات سرسید سے مشابہت رکھتے ہیں تو دوسری طرف ان کے نظریات
> میلانات اور رجحانات حالی کی طرح پاک، سبک، صحت مند اور تعمیری ہیں۔ غرض انھوں نے تہذیب، تمدن، ثقافت
> سیاست، تاریخ، معاشیات، سائنس، آرٹ اور فن سب کے قدیم اور جدید دونوں زمانے دیکھے ہیں اس سے ان
> کی نظر میں بصیرت، دل میں گہرائی، ارادوں میں استقامت اور پختگی پیدا ہوئی ہے۔

اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور فروغ دینے کے لئے سرسید اور حالی نے جس تحریک کا آغاز کیا تھا مولوی عبدالحق نے اسے زندگی
دی اور اسے آگے بڑھایا۔ سرسید اور حالی نے اردو ادب میں جو روایات قائم کی تھیں مولوی صاحب نے انھیں ہمیشہ اپنے سینہ سے چمٹائے
رکھا اور انھیں روایات کو بنیاد بنا کر نئی روایات کو جنم دیا۔

سرسید سے پہلے اردو نثر اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ زندگی کے گوناگوں مسائل اور وقت کے متنوع
موضوعات کا بوجھ اٹھا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ فورٹ ولیم کالج دلّی کالج اور مرزا غالب کی شخصی اور ذاتی نثر نگاری نے بیان و اظہار کی نئی

نئی راہیں کھول دی تھیں لیکن اس کے باوجود اُردو نثر کا دامن تنگ اور محدود تھا۔ سرسید کی جدت پسند طبیعت اور تنقیدی زاویۂ نگاہ نے اُردو نثر کی مروجہ روایات سے بغاوت کی۔ انھوں نے حالی، شبلی، محسن الملک اور دیگر رفقائے کار کی معاونت سے ملک و قوم، تہذیب و اخلاق، نیچر اور مذہب جیسے موضوعات پر قلم اٹھا کر اردو نثر میں ایک ایسے پائیدار اسٹائل کی بنیاد ڈالی جس کا تتبع خود ان کے زمانہ میں ہوا اور ان کے بعد تو اس اسکول سے تعلق رکھنے والے تقریبًا تمام ادیبوں نے اس کا اتباع کیا۔ اس میں نثر نگاری کی تقریبًا تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس میں سادگی بھی ہے اور فصاحت بھی، متانت بھی پائی جاتی ہے اور اختصار بھی، دل کشی بھی موجود ہے اور رعنائی بھی۔ نہ کہیں بناوٹ ہے اور نہ کہیں پند و وعظ کا غالب عنصر۔ ایک سنجیدہ، سیدھا اور ٹھیرا ہوا انداز ہر جگہ ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق کے طرزِ تحریر میں بھی مذکورہ خصوصیاتِ نثر بدرجۂ اتم موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب کی تحریریں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان پر سرسید اور حالی کی چھاپ پڑی ہوئی ہے مگر مولوی صاحب کی نثر ان تمام چیزوں سے مبرا ہے جنھیں سرسید اور حالی کی تحریروں کا نقص کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دونوں بزرگ اپنی تحریروں میں انگریزی زبان کے بعض ان الفاظ کو بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں جن کے نعم البدل الفاظ اُردو زبان میں پہلے سے موجود ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے شعوری طور پر اردو الفاظ کے ذخیرہ کو وسیع کرنے کے لئے ایسا کیا ہو لیکن ان کی اس روش سے اُردو نثر میں ایک قسم کی ثقالت پیدا ہو گئی جس کے سبب ان کی عبارتوں کے بعض ٹکڑے سماعت پر گراں گذرتے ہیں۔ اس کے برعکس مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں انگریزی زبان کے صرف انھیں سبک، رواں اور عام فہم لفظوں کو استعمال کیا ہے جن کے متبادل الفاظ اردو زبان میں نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ہندی کے بعض ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو عام فہم ہیں اور روزمرہ اور بول چال سے بہت زیادہ قریب ہیں جن کے استعمال سے اُردو نثر کی سلاست، شگفتگی اور روانی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ "سڑاند" کو لیجئے۔ بادی النظر میں اس لفظ کا آہنگ بڑا عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن مولوی صاحب نے "بدبو" کی جگہ اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے اس کی خوبی اسے داد دیتی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب الفاظ کے صحیح مزاج داں ہیں اور ان کے برمحل استعمال پر بڑی قدرت رکھتے ہیں جو مشکل اور سادے سے سادے لفظ کو استعمال کر کے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

مزید برآں سرسید اور حالی کی تمام تحریروں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کے فلسفیانہ اندازِ بیان میں کہیں کہیں اکتا دینے والی کیفیت ملتی ہے اور سپاٹ پن بھی! اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی اور سرسید تمام مسائل کو ایک ہی انداز، ایک ہی لب و لہجہ اور ایک ہی طریقہ پر معرضِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اس کے برعکس

مولوی عبدالحق اپنی باغ و بہار طبیعت کے باعث واقعات کی اہمیت اور مسئلہ کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے لب و لہجہ اپنے اندازِ بیان اور اپنے طرزِ تحریر میں لچک پیدا کرتے ہیں جس کے سبب ان کی تحریریں دلچسپ، دل کش اور اثر انگیز ہو جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایسا کرنے کے لئے دقت ضرورت تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں سے بھی کام لیتے ہیں لیکن ان کا یہ عمل قاری یا سامع کو ان کے مقصد اور پیغام کے اور قریب پہنچا دیتا ہے اور یہی چیز نثر نگاری کا ایک معجزہ قرار دی جاتی ہے۔ نثر نگار کا کام ہی یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل بات کو کم سے کم الفاظ میں ادا کر دے۔ مولوی صاحب

تشبیہوں استعاروں اور کنایوں کا برمحل استعمال ان کے مفہوم کو اور زیادہ واضح کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے جا طوالت، تکرار لفظی، عبارت آرائی، تشبیہ و استعارہ کی بھرمار، ابہام، مشکل پسندی، ثقالت، اشاریت اور بے ترتیبی سے احتراز برتتے ہیں۔ دراصل مولوی صاحب بات کو نہایت سیدھے طریقے سے کہنے کے عادی ہیں۔ کیونکہ ان کا ذہن الجھا ہوا نہیں ہے۔ وہ پہلے ہر مسئلہ پر غور کرتے ہیں اس کے بعد سیدھے سادے انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری یا سامع ان کے پیغام کو بخوبی سمجھ لیتا ہے۔ وہ بات کو مختلف طریقوں سے کہنے کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں حقیقت، واقعیت اور صداقت پائی جاتی ہے۔

بعض مصنفین جب طنزیہ انداز بیان اختیار کرتے ہیں تو ان کی تحریروں میں غم و غصہ اور جھنجلاہٹ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب کی تحریروں میں بھی طنزیہ اشارے ملتے ہیں مگر کسی جگہ بھی ان کا انداز بیان تلخ نہیں ہونے پاتا۔ ان کے اس انداز بیان میں بھی ایک لئے دئے والا انداز، ایک خاص قسم کا توازن، ایک مخصوص قسم کا اعتدال، اور ایک خاص قسم کی آہنگ اور غنائیت پائی جاتی ہے۔

غرض مولوی صاحب کا طرز تحریر حسین بھی ہے اور صحت مند بھی، جاندار بھی ہے اور پائیدار بھی، سیدھا سادا ہلکا پھلکا لیکن حد درجہ باوقار، ملمع کاری اور صنعت گری سے پاک، رواں رواں، شگفتہ اور دل نشیں دیکھنے میں بہت آسان پھر بھی اس کی پیروی اتنی مشکل کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جائے۔

کتاب الطبیعہ

انسان کی فطری قوتوں اور ان کے وظائف و حرکات پر یونانی فلاسفہ ارسطو، جالینوس، بقراط وغیرہ کی آرا کا خلاصہ از ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم بی بی۔ ایس۔

قیمت دو روپے چار آنے

طبیعیات کی داستان

سائنس کی ترقی کی ضخیم تاریخ سائنسدانوں کی تصاویر اور نقشوں کے ساتھ
مرتبہ پروفیسر مصبر احمد صاحب عثمانی۔ صفحات مجموعی ۵۴۰
قیمت آٹھ روپے بارہ آنے

شائع کردہ:۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ ——— کراچی

وجاہت چغتائی

بابائے اُردو

کسی کو ورثے میں جائداد ملتی ہے، مجھے ورثہ میں نزلہ ملا ہے۔ اور اسی نزلہ کا شکار، دلّی میں اپنی گرمیوں کی چھٹیاں گزار رہا تھا۔ ایک روز صبح، دس ساڑھے دس بجے چھینکتا ہوا لوجبلہ پہاڑی اور حویلی اعظم خاں والے تراہے پر چلا جا رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے میرے اُستاد محترم جاں نثار اختؔر صاحب ہرے چوخانے کی کھادی کی شیروانی پہنے، بالوں پہ ہاتھ پھیرتے، مسکراتے چلے آرہے ہیں۔ یقین جانئے اُنھیں دیکھ کر میں ہی نہیں، میرا نزلہ بھی ششدر رہ گیا اور کچھ ایسا بھونچکا ہوا کہ چھینکیں آنا بند ہوگئیں۔ میں ادباً کھڑا ہوگیا۔ اُستاد سے پوچھا "کب تشریف لائے۔ کہاں ٹھہرے ہیں؟" وہ حسبِ عادت بہت ہی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ فرمانے لگے۔ "کل آیا ہوں، بابائے اُردو نے بلایا ہے، آج شام کو اُن سے ملوں گا، اور تراہے بیرم خاں میں چاندمیاں (مکرم شان الحق حقی) کے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں، چلو وہیں غپ رہے گی۔" میں ساتھ ہولیا۔ چاندمیاں کے یہاں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں اُستاد سے شام کو آنے کا وعدہ کرکے چلا آیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ کون سے سنہ کا ذکر ہے۔ ہاں اتنا البتہ یاد ہے کہ اس وقت میں فرسٹ ایئر یا سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ اور انجمن ترقی اُردو کا دفتر دریا گنج میں تھا، اور دفتر ہی کے علاقہ میں بابائے اُردو کی رہائش گاہ بھی تھی۔

شام کو پانچ بجے کے قریب میں حضرت جاں نثار اختؔر اور شان الحق حقی صاحب (جو اس زمانے میں اپنے لااُبالی ہونے اور مرضِ نسیان میں مبتلا مشہور تھے) انجمن ترقی اُردو کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھے راستہ میں اُستاد نے مجھ سے پوچھا۔ "چاندمیاں کہاں غائب ہوگئے۔" میں نے بتایا کہ وہ پنواڑی کی دکان پر سگریٹ لینے رُک گئے تھے۔ چلتے

انجمن کے دفتر پہونچ کر انتظار کریں گے۔" دفتر کے قریب پہونچتے پہونچتے شان صاحب نے ہمیں آ لیا۔ چہرہ پر بے پناہ بدحواسی نمایاں تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس بہ حفاظت پنواڑی کی دُکان پر رکھ آئے تھے۔ جاں نثار اختر صاحب چوں کہ شان صاحب کے عزیز ہیں اور اُن سے بخوبی واقف تھے بڑے ڈھارس بندھانے کے انداز میں بولے "پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں تو ڈاکٹر صاحب کے سامنے سگریٹ پیتا نہیں۔ تمھیں اللہ بلوا ہی دے گا" اور شان صاحب بچوں کی طرح ساتھ ہولئے جیسے واقعی بہل گئے ہوں۔ جب یہ مختصر جماعت بابائے اُردو کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ایک چارپائی پر بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ چارپائی پر ایک دری سفید شفاف چادر، ایک تکیہ، سامنے چھوٹی سی معمولی میز رکھی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی قلم رکھ دیا اور کھل گئے۔ میرے اُستاد آگے بڑھ کر بغل گیر ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بڑے خلوص اور شفقت سے پاس بٹھا لیا۔ جاں نثار صاحب سے وہ بخوبی واقف تھے، چوں کہ شان صاحب مختلف موقعوں پر انجمن کا کام بھی کرتے رہتے تھے نیز ان کے والد محترم جناب احتشام الحق حقی بابائے اُردو کے مشورے سے عظیم لغت مرتب کر رہے تھے۔ اور غالباً اُس کی دو یا تین جلدیں مرتب ہو چکی تھیں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے اُستاد نے فرمایا "یہ میرے کالج کے طالب علم ہیں، ادب کے شیدائیوں میں سے ہیں" میں نے جھک کر کورنش کی۔ بابائے اُردو نے یونہی سی نگاہ ڈالی اور پھر جاں نثار اختر صاحب سے فرمانے لگے "میاں میں نے تمھیں اس لئے بلایا ہے کہ مضطر خیر آبادی کا کلام تم سے اچھا کون مرتب کرے گا۔ خود شعر کہتے ہو۔ مجھ سے زیادہ شعر سمجھتے ہو۔ اپنے باپ کے کلام کو، ان کے رنگ کو، موجودہ زمانے اور اس کے رنگ کو بخوبی سمجھتے ہو۔ میں نے انجمن سے منظوری لے لی ہے۔ اچھا ہے میرے سامنے ان کا کلام شائع ہو جائے۔" اور میرے اُستاد نہایت سعادت مندانہ انداز میں "جی ہاں — جی ہاں" کہتے رہے۔

یہ تھا وہ پہلا لمحہ، جب میں نے بابائے اُردو کو دیکھا۔ اور یہ کم و بیش پندرہ یا سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اب جب اپنے ذہن کے گوشوں کو ٹٹولتا ہوں تو ایسا کچھ نقش ملتا ہے۔

(۱) ان کے چہرے پر متانت، سنجیدگی اور درشتی کی حد سے بڑھ کر جلال کی حد تک۔

(۲) بات کرنے میں لہجہ میں شگفتگی، بعد فصاحت تھی جس سے ان کے نظریات کی صفائی اور عزم کی پختگی ٹپکتی تھی

بابائے اُردو سے میری دوسری ملاقات، پاکستان آنے کے بعد، ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ جب کہ میں ریڈیو پاکستان میں مسودہ نگار کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اور اُردو کالج کے ایم۔ اے (فائنل) کا طالب علم بھی تھا۔ اس ملاقات میں میری ایک ذاتی غرض وابستہ تھی۔ اور وہ یہ کہ میں اپنی فیس معاف کرانا چاہتا تھا، اور اس کے لئے جو بورڈ تھا، اس میں

اُردو شعبہ کے صدر جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، پرنسپل نمی الدین صاحب اور بابائے اُردو تھے۔ اس ملاقات میں، نہ میں نے پچھلی ملاقات کا حوالہ دیا، اور نہ ذکر ہی آیا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ مجھے پہچانتے یا نہیں۔ بہرحال اتنا جانتا ہوں کہ مجھ پر سے فیس کے بقایا کا بار معاف کر دیا گیا۔

اس مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ عام لوگوں کی طرح، ڈاکٹر صاحب پر بھی تقسیم کا اثر پڑا تھا، ان کی عمر جلدی میں سیڑھیاں چڑھ کر، اصل عمر سے آگے نکل گئی تھی۔ لہجہ میں شگفتگی اور بشاشت کی جگہ چڑچڑا پن اور کھُردرا پن آ گیا تھا۔ اور یہ چیزیں سمٹ کر پیشانی پر سلوٹوں کی شکل میں جم گئی تھیں۔ پہلے کی بہ نسبت داڑھی بے ترتیب ہو گئی تھی۔ کنپٹیوں اور ہاتھوں کی رگیں بہت زیادہ نمایاں ہو گئی تھیں۔ پاکستان میں اُردو کالج قائم ہوئے غالباً یہ پہلا سال تھا۔

مجھے عبدالحق نام، بچپن ہی سے بہت پسند ہے۔ اتنا پسند ہے، کہ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کاش میرا نام عبدالحق ہوتا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ میں اب تک صرف دو عبدالحق، نام کے دو آدمیوں کو جانتا ہوں۔ ایک کو بہت زیادہ —— اور دوسرے کو برائے نام —— لیکن جب موازنہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جسے برائے نام جانتا ہوں اُسی کو زیادہ جانتا ہوں۔ چوں کہ اُن کا کام سب کے سامنے ہے اور میں بھی اُسی سے زیادہ واقف ہوں اور جسے میں زیادہ جانتا ہوں اسے بالکل ہی نہیں جانتا۔ اور وہ ہے وہ عبدالحق جو میرے وطن مالوف گوالیار میں، ٹاؤن ہال کے نیچے ایک بڑی ہی خوب صورت دکان کا مالک تھا۔ میں نے جب اُسے دیکھا، تب وہ تندرست و توانا، خوب صورت، بھولا بھالا، قانع، سوداگر تھا۔ جس کے منھ سے میں نے کبھی خُدا، وقت یا تجارت کے نفع نقصان کا شکوہ نہیں سُنا، اس کا وہ زمانہ بھی میں نے دیکھا ہے، جب میں بستہ بغل میں دبائے اسکول جاتا تھا اور اس کی دکان جو وہ علی الصبح کھولتا تھا، اپنی سجاوٹ اور مال بھرا ہونے کی وجہ سے سب سے نمایاں نظر آتی تھی۔ اور صبح سے شام تک اُس کے آگے بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اِس کے بعد اُس کا وہ زمانہ بھی دیکھا، جب میں کالج جاتا تھا اور اس کی یہ دکان گھاٹے کی نذر ہو کر آدھی بھی نہ رہی تھی اب اُس کے ساتھ، اُس کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا بھی بیٹھا رہتا تھا۔ جو شکل و صورت میں بالکل اس کا مشابہہ تھا لیکن عبدالحق جیسے پہلے بھولی بھالی سیدھی سادھی باتیں کرتا تھا۔ وہ اُسی طرح خسارہ اٹھانے کے بعد بھی دکان میں شگفتہ لہجہ میں باتیں کرتا تھا۔ اُس کے بعد ۴۷ء کے ہنگامے میں سب سے پہلے جس کی دُکان لوٹی گئی وہ اسی عبدالحق کی دُکان تھی۔ مجھے اس کی خبر لگی، میں پہنچا، دیکھا کہ عبدالحق اپنے بیٹے کے ساتھ ایک طرف صبر و رضا کی تصویر بنا مسکرا رہا تھا۔ اس کے بعد یہ دکان بہت ہی سستے داموں بیچنا پڑی۔ وہ پاکستان آ گیا

یہاں حیدرآباد سندھ میں اُس نے دوسری دکان شروع کی۔ وہ بھی نہ چلی۔ اُس سے جب میری ملاقات کراچی میں ہوئی۔ تو وہ حج کرنے جارہا تھا۔ اُس نے اُسی ہنساش بشاش اور بھولے بھالے انداز میں مجھے بتایا کہ اُس کا جوان کڑیل بیٹا اچانک مرگیا۔ دکان ختم ہوگئی۔ اور اُس کی بیوی بیٹے کے غم میں نیم پاگل ہے۔ کہنے لگا "ذرا رسولؐ کی بارگاہ میں حاضری دے آؤں۔ نہ جانے میری بیوی کو کیا ہوگیا ہے۔ خدا رسولؐ سب کو بھول گئی ہے۔ کہتی ہے بیٹا کیا مرا میرے لئے سارے بچے مرگئے دُنیا مرگئی تم بھی مرگئے۔"

تو دیکھا آپ نے یہ اُس سوداگر عبدالحق کی تصویر، جس نے بغیر ایک حرف پڑھے، بغیر کوئی بڑا سرمایہ لگائے تجارت شروع کی — اُسے بلند منزلوں پر بھی دیکھا — پھر یہ تمام عمارت اُس کے سامنے مسمار ہوئی، ملیامیٹ ہوئی۔ لیکن وہ پہلے بھی خوش تھا، بھولا بھالا تھا، قانع تھا، صابر تھا۔ اور اب جب کہ اُس کے کپڑے میلے ہیں۔ بیٹا مرچکا ہے۔ بیوی کے دوبہ صحت ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے، وہ اُسی طرح زندگی کے راستہ پر گامزن ہے اور قدم بڑھاتا ہنستا کھیلتا چلا جارہا ہے۔

اب سنئیے اُس دوسرے عبدالحق کا حال جس کی دو ملاقاتوں کا حال عرض کرچکا ہوں۔ اور اُس کے نام سے میں اس وقت واقف ہوا جب شاید پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور اُردو کی کتاب میں بلّی اور لومڑی کا مکالمہ پڑھا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں انسان کی عمر اور شعور ہی کیا ہوتا ہے۔ کہ کسی مضمون کی اچھّے یا بُرے ہونے کو پرکھ سکے۔ لیکن ہاں شاید ہے کہ میں اپنی چھوٹی بہنوں کو بلّی اور لومڑی بناکر، وہ مکالمے اداکراتا، اور خود ہدایت کاری کے فرائض انجام دیتا۔ اس مضمون میں لومڑی نے اُس انسان پر جو اشرف المخلوقات ہوتے ہوتے انسانیت پر کیا کیا ستم ڈھاتا ہے، کیا کیا طنز کئے تھے۔ آج تک اس کا چٹخارہ نہیں بھولتا۔ میں جب سے اس مصنف کا شیدائی بن گیا۔

پھر معلوم ہوا، یہ ہی عبدالحق "انسپکٹر آف اسکولز رہے — پروفیسر ہوئے صدر شعبۂ اُردو ہوئے — اور پھر نہ جانے کیا سوجھی — گوتم کی طرح۔ گھر بار پر لات مار، زندگی کو تج کر، اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لئے زندگی وقف کردی۔

خدا کی پناہ — کتنی گہرائی — پاکیزگی اور دور رسی ہے۔ اُن آنکھوں میں، جنھوں نے سرسیّد۔ حالی۔ نذیر احمد، غرض

اُن تمام قافلہ سالاروں کی آنکھیں دیکھیں، جو اپنی جگہ ہر صنف کا
ایک میرِ کارواں تھے۔ وہ مصلح اور صاحب کردار لوگ جنہوں نے
نہ کبھی ادب بیچا اور نہ کبھی خود بکے۔ اور عبدالحق بھی اسی
جماعت کے آخری صاحبِ ایمان بزرگ ہیں۔ اِن کے علم،
اِن کے مزاج، اِن کی تربیت، اُن کے کردار سب اُن ہی بزرگوں
کی فیضِ صحبت میں پروان چڑھے

کوئی عبدالحق کے دل سے پوچھے ــــ کہ انھوں نے اُردو کی خدمت کا یہ طویل عرصہ کیسے گزارا ہوگا، کون سا وہ داغ ہوگا، جو اُن کے دل پہ نہ لگا ہوگا، لیکن وہ اپنے مسلک کی گہرائی اور پختگی کے بل بوتے پر چٹان بنا کھڑا ہے۔ زمانہ کی، سیاست کی لہریں اُس سے ٹکراتی ہیں، سر پھوڑتی ہیں اور واپس ہو جاتی ہیں۔ اُس کی زندگی سب کو یہی سبق دیتی ہے۔ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

ناقد جب اُس کی زندگی اور اُس کے کارناموں پر محاکمہ کرے گا، تو اُسے اُس کی شخصیت لاثانی نظر آئے گی ــــ ایک طرف انگریزی دور کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانا، اُردو ہندی کے جھگڑوں میں نپٹانا ــــ زبان کو سہل اور بااثر بنانے کے نئے نئے وسائل تلاش کرنا۔ پھر قوم میں پُرخلوص اور بے لوث رضا کاروں کی کمی، فنڈ کی کمی، بدلتی ہوئی قدروں کا ساتھ دینا۔ دوسری طرف دفتر کے کام پر نظر رکھنا۔ یہ دیکھتے رہنا کہ زبان و ادب کے لئے کام ہو رہا ہے یا نہیں، ساتھ ہی ساتھ، ادیب، شاعر اور عالموں میں سے جو انجمن کے کام کے قابل نظر آئے، اُس کی صلاحیت دیکھ کر اُس سے کام لینا وغیرہ وغیرہ۔

عبدالحق نے انتظامیہ بکھیڑوں کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ، سوائے شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری کے ایسی صنف نہیں چھوڑی جس پر خود کام نہ کیا ہو۔ لغت۔ قواعد۔ مقدمات۔ خطبات تنقیدات۔ تحقیقات۔ سیرت۔ غرض اُردو ادب کی ہر صنف پر نظر رکھی، اور اُسے فراموش نہ کیا، خدا کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔ اُس نے اپنی زندگی زبان کی ترقی کے لئے وقف کی، خدا اُسے اِس کا اجر دے گا۔ اُس کی زندگی اور اُس کے عمل کی کتاب دُنیا کے سامنے ہے۔

کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تقسیم سے پہلے بابائے جو کچھ کیا، عثمانیہ یونی ورسٹی کی خدمات، سب کچھ ایک لمحہ کے لئے ضائع گئیں، لیکن نہیں درخت کی مضبوطی اُس کی جڑوں اور تنے سے دیکھی جاتی ہے۔ جتنا پودا قلم ہوگا اتنا ہی زیادہ پھلے پھولے گا۔ زندگی جتنی مشکلوں میں سے ہو کر گزرے گی مضبوط ہوگی۔

پاکستان بننے کے بعد جو بڑا وقت اُردو پر قومی زبان کی حیثیت سے آیا، وہ دُنیا میں کسی بھی قوم

بڑا انقلاب کے بعد نہ آیا ہوگا۔ ایسا بڑا وقت آیا، کہ جس پر پاکستان میں عبدالحق تو عبدالحق، ہندوستان میں دیوان سنگھ مفتون، اور کنہیا لال کپور۔ بھی چیخ اٹھے۔ اور پھر محمد حسن عسکری نے تو اپنے اداریوں میں یہاں تک لکھ دیا کہ وہ لوگ جو قوم کے ستون کہلاتے ہیں، اب اپنے بچّوں کو اردو پڑھانا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سب وہی تھے، جن کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح سرسیّد کے خوشہ چینوں سے ملتا تھا۔ اور کیوں نہ ہو، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا، اور قوم گھبرا کر، سب کچھ بھول گئی۔ اپنا ماضی — اپنا حال — اپنا مستقبل — تمام قوم بے پیندی کا بدھنا ہو کر رہ گئی۔ اور نئی نسل کا کوئی حسرت موہانی اور نذرالاسلام نہیں اٹھا۔ جو جہاد کرتا — خطرات مول لیتا — ایثار کی تصویر بن کر دکھاتا، لیکن بابا اب چیخ رہا تھا۔ بے پناہ قوتوں کے ساتھ چیخ رہا تھا — ایک دیوانے کی طرح اپنی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

اسی دوران میں مجھے ایک بار پھر، شرف ملاقات حاصل ہوا، انجمن کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور ریڈیو پاکستان کی طرف سے، آنکھوں دیکھا حال لکھنے بھیجا گیا۔ اردو کالج کی نیچے کی منزل میں نادر نسخے سجائے گئے تھے۔ آج کی نشست کی صدارت، کراچی کے سابق چیف کمشنر جناب اے۔ ٹی۔ نقوی، کر رہے تھے۔ میں نے نظر ڈالی، مجمع تسلی بخش نہ تھا۔ ہر صوبے کے نمائندہ، چند ادیب اور شاعر، اردو کالج کے اساتذہ، لیکن شہر کی چیدہ شخصیتوں میں سے کوئی نہ تھا۔ انہیں سیاست، تجارت غرض زر کمانے سے کہاں مہلت تھی، اور پھر یہ کلب کا کوئی نیم عریاں رقص نہ تھا۔ یہ تو ایک بوڑھے مداری کا تماشہ تھا، جس میں وہ بوڑھی بندریا، نچا رہا تھا۔ جلسہ شروع ہوا،

بابا نے مختصر سی تقریر کی۔ چہرہ بے نور تھا۔ آنکھیں ویران تھیں، لہجہ بجھا ہوا تھا بابا کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جوبلی کا موقع اور حاضرین کی یہ تعداد، اس تقریر میں حاکم کے سامنے، ناقدری کا رونا رویا۔ کہیں عجز و انکساری سے کام لیا، کہیں استدعا کی اور کہیں کہیں طنز بھی کر گئے۔

اس کے بعد نقوی صاحب نے ایک مختصر سی جوابیہ تقریر کی۔ پھر بابا، نقوی صاحب اور باہر کے نمائندوں کے ساتھ گشت پر نکلے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بابا ایک ایک نادر نسخے کے متعلق نقوی صاحب اور دیگر حضرات کو

تفصیلی طور پر بتاتے جاتے تھے۔ ساتھ ہی کبیدہ خاطر ہو کر یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ "ہماری لاپرواہی سے نہ جانے کتنے ایسے نادر نسخے تلف ہو گئے" مسکراتے جاتے تھے اور نسخوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے جاتے تھے۔ "نقوی صاحب! ان نسخوں میں ان کے مصنفوں کی روحیں ہیں، انہیں شیشوں میں محفوظ کرنا بڑا ضروری ہے۔ اور میں جو انجمن کے دفتر کی جھونپڑی لئے بیٹھا ہوں اس میں ہر طرف سے بوچھار آتی ہے۔ ٹپکا لگ رہا ہے۔ میں بوڑھا آدمی، قبر میں پاؤں لٹکائے، کب تک اسے سہارا دیتا رہوں گا۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ سب کی نگاہیں آپ لوگوں پر ہیں"۔ معلوم ہوتا تھا، بابا کسی ضرورت مند فقیر کی طرح اپیل کر رہا ہے کہ بابا اگر تم ترس کھا کر مدد کرو گے تو میرے بچوں کو کفن نصیب ہو جائے گا۔

غالباً رات کے نو بجے آنکھوں دیکھا حال نشر ہوا، اور میں سوتے وقت تک خدا سے اُن کی درازیٔ عمر کی دُعا مانگتا رہا۔

دیکھا آپ نے، حادثات کی لپیٹ میں، سوداگر عبدالحق ہی نہیں آیا، بلکہ بابا عبدالحق بھی آ گیا۔ اور بابا نوّے سال کی عمر پاتے، اور اس میں مسلسل جدوجہد کے بعد، وہیں کھڑا ہے، جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ اُس کا مشن آج بھی مکمل نہیں ہوا، وہ آج بھی، کھڑا چیخ رہا ہے۔ ؎

"حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو چلو تو اپنے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

اور زمانہ اُس کی آواز پر لبیک کہہ رہا تھا۔ لیکن بہت آہستہ، وقت کی نبض اور رفتار دونوں تیز ہیں۔ لیکن ہماری رفتار سُست، کاش بابا کو میری عمر بھی مل جاتے اور بابا اپنے مشن میں کام یاب ہو۔

اصطلاحاتِ کیمیا

فن کیمیا (کیمسٹری) کی انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل اُردو اصطلاحات انجمن نے ماہرین فن فن کی ایک جماعت سے تیار کرائی ہیں حتی الامکان اردو اصطلاحات کو عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات کتاب ۱۳۰۔ قیمت غیر مجلّد دو روپے چار آنے، مجلد تین روپے

شائع کردہ:۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، اردو روڈ — کراچی

شریف رزمجو

محسنِ اُردو

زندگی میں کسی مخصوص نصب العین کو اپنانا اور عمر بھر اس کے حصول میں کوشاں رہنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ایسے افراد ہر دور میں خال خال ہی ہوا کرتے ہیں۔ زمانہ ان کی قدر کرے یا نہ کرے خواہ زندگی میں انھیں اپنا جائز مقام میسّر آئے یا نہیں انھیں اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کی راہیں متعین ہوتی ہیں اور نصب العین پیشِ نظر جس کے حصول کے لئے ان کی سرفروشانہ جدو جہد ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ یہ لوگ رہبر یا سالار کارواں ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کرتے ان کی مثال ایسے بے غرض سپاہی کے مانند ہوتی ہے جو راہ طلب میں سر دینا جانتا ہو۔ ایسے باہمت۔ جری اور جانباز سپاہی ملک وملّت پر وہ احسان عظیم کر جاتے ہیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے۔

بابائے اُردو کی داستان حیات کسی تنہا فرد کی کہانی نہیں ایک قوم کے تہذیبی وتمدنی زوال وعروج کی داستان ہے۔ ایک زبان کے تدریجی ارتقا کا فسانہ ہے جس میں ہمیں جابجا بے مثال قربانی۔ انتھک تگ ودو اور مخلصانہ سرگرمیوں کے نقوش ملتے ہیں۔ مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی وادبی کارناموں کی عظمت کو سمجھنے کیلئے ہمیں ان کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھ کر ان عوامل ومحرکات کا جائزہ لینا پڑیگا جن کا مولوی صاحب کی ذات اور شخصیت پر براہ راست اثر پڑا ہے۔ ان رشتوں کی تلاش میں اب سے تقریباً ایک صدی پیچھے لوٹنا پڑیگا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نتائج پورے مسلمانان ہند کے حق میں بے حد ہولناک نکلے۔ اس جنگ نے مسلمانوں کو صرف سیاسی اقتدار

سے محروم نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے اُن کی تہذیبی و تمدنی اقدارِ حیات کو بھی تنزل کر ڈالا۔ سیاسی انقلاب اپنے ساتھ ایک نیا معاشی، اقتصادی اور اخلاقی نظامِ حیات لے کر آیا جس کا مسلمانانِ ہند کو من حیث القوم ساتھ دینا تقریباً ناممکن تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور معاشی دونوں سے سوا کچھ اور نہ نکلتا۔ اس خطرے کو سب سے پہلے سر سید کی دور بین آنکھ نے دیکھا ان کے دردمند اور خدمت کے جذبات سے معمور دل نے محسوس کیا کل کی حکمراں قوم کی موجودہ زبوں حالی اور اخلاقی انحطاط نے انھیں خون کے آنسو رلائے۔ بالآخر وہ ہمت فرداں مددِ خدا کہہ کر میدانِ عمل میں کود پڑے۔ انھوں نے اپنی اصلاحی تحریک اور تعلیمی مشن سے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو نہ صرف سنبھال ہی لیا بلکہ ترقی کی ان گنت راہیں بھی ان پر کھول دیں۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں کا ذہنی نشاۃ ثانیہ کا دور کہنا چاہیئے جس میں سر سید کو ذہین معمار کی حیثیت حاصل ہے۔ سر سید کی دور بینی، علو ہمتی، روشن خیالی اور وسیع المشربی نے مسلمانانِ ہند میں صرف سیاسی بیداری کی لہر ہی نہیں دوڑائیں بلکہ ان کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا دھارا بھی بدل کر رکھدیا۔ سر سید نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے وہ کام لیا جس نے ایک مردہ قوم کے جسم بے روح میں پھر سے جان ڈالدی۔ اس تحریک نے محسن الملک، وقار الملک، حالی اور شبلی جیسی ممتاز ہستیوں کو جنم دینے کے علاوہ علومِ جدیدہ سے مزین اور نئے تہذیب سے آراستہ ایک ایسی نسل کو بھی پروان چڑھایا جس نے آگے چل کر ملک و قوم کی رہبری کے فرائض انجام دیئے۔

مولوی عبد الحق اس تحریک کے بہت بڑے اور پر جوش مبلغ ہیں جنھیں اس وقت اس ترکش کا سب سے آخری تیر سمجھنا چاہیئے کیونکہ جس چراغ کو سر سید اور ان کے رفقاء کار نے ہوا کے رخ پر جلایا تھا اسے مولوی صاحب نے اب تک اپنے لہو سے روشن کر رکھا ہے۔

مولوی صاحب کا سن ولادت ۱۸۷۰ء ہے انھوں نے ۱۸۹۴ء میں علی گڈھ کالج سے تاریخ اور فلسفہ میں بی۔ اے کیا۔ دورانِ تعلیم میں انھیں سر سید اور ان کے دیگر رفقاء مولانا حالی و مولانا شبلی وغیرہ سے فیض اٹھانے کا موقعہ ملا جس نے موصوف کی زندگی کے ہر شعبہ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ موصوف کو اُردو ادب سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ فطری رجحان پر علی گڈھ کا تعلیمی ماحول اور ان بزرگوں کی صحبت گویا سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔

انھوں نے سب سے زیادہ اثر مولانا حالی کا قبول کیا اور بالآخر ان کے اندازِ بیان اور اسلوبِ تحریر کو اپنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں صفائی، سادگی، سلاست، پر متانت شگفتگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے اور مشکل مضمون کو اس قدر عام فہم اور سلیس انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ تنقیدیں ہوں یا تبصرے، خطبات ہوں یا مقالات یہی اندازِ نگارش ہر جگہ نظر آئے گا۔ حالی کے اندازِ تحریر کو جتنی تکمیل اور جامعیت کے ساتھ مولوی صاحب نے برتا اس کی دوسری مثال ہمارے ادب میں ملنا مشکل ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولوی صاحب ۱۸۹۵ء میں مدرسہ آصفیہ سے منسلک ہوگئے۔ ان کے فطری شوق نے صحیح معنوں میں یہیں جلا پائی۔ اس ملازمت کے دوران میں انھیں اردو ادب کے قدیم سرمائے کا جائزہ لینے کا بڑا اچھا موقعہ میسر آیا اور انھوں نے بھی اس بحرِ بیکراں میں غواصی کے خوب خوب جوہر دکھائے اور دنیا کے سامنے ایسے ایسے نادر گہر آبدار لاکر ڈھیر کر دئے جن کی چمک سے

آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ذوقِ تحقیق اور جستجو نے انھیں ایسی ان گنت راہوں سے روشناس کرا دیا جن پر ابھی تک کسی کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ اس میدان میں مولوی صاحب نے جس کاوش، تحقیق، فراست، علمی بصیرت اور قوتِ تنقید کا ثبوت دیا اس کی مثال ان متعدد کتابوں سے ملیگی جو محض مولوی صاحب کی کوششوں سے منظرِ عام پر آسکیں۔ ان کتابوں کی چھان بین اور ترتیب و تدوین سے بے کران پر دیباچے، مقدمے اور تبصرے تحریر کرنے میں جس قدر عرق ریزی اور کاوش سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب نظر کر سکتا ہے۔

کسی ایسی درس گاہ کے قیام کی تجویز جہاں تمام علومِ جدید کی اعلیٰ تعلیم اُردو زبان میں دی جا سکے مولوی صاحب کے ذہن میں اب تک سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی جو بالآخر سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری کی کوششوں کے طفیل "جامعہ عثمانیہ" کی صورت میں رونما ہوئی۔ حالانکہ اُردو کا دامن اس وقت تک اتنا وسیع نہیں تھا جہاں وہ متنوع اور جدید خیالات کو بآسانی ادا کرنے پر قادر ہوتی۔ بالخصوص علومِ جدید کی وضع اصطلاحات اس راہ کی سب سے بڑی دشواری تھی۔ لیکن یہ مولوی صاحب کا استقلال اور جذبۂ صادق تھا جس نے ہر مشکل کو آسان بنا دیا اور ثابت کر دیا کہ ؎ بے لوث ارادے ہوں تو ہر موڑ ہے منزل۔

ان کی سرکردگی میں قائم کئے گئے دارالترجمہ نے ہر قسم کی نصابی کتابوں کی تصنیف و تالیف، وضع اصطلاحات اور تدوین لغتِ جدید کا صبر آزما و کٹھن کام محض دو سال کے قلیل عرصے میں انجام دے ڈالا۔ اور اردو زبان کا دامن ہزارہا نئے الفاظ سے مالا مال کر دیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود اُردو زبان پر ایسا عظیم احسان ہے جسے آنے والی نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اردو کو ایک ترقی یافتہ زبان بنایا اور اُسے متمدن دنیا کی جملہ ضروریات پورا کرنے کے قابل بنانا محض اسی ادارے کی بدولت ممکن ہوا۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور مولوی صاحب کے ہاتھ میں سونپی گئی۔ مولوی صاحب کا معتمد بننا تھا کہ گویا انجمن کو پر لگ گئے۔ اس کی تنظیم ملک گیر پیمانے پر کی گئی اور اُردو کو ہر لحاظ سے مکمل زبان بنانے کی منظم کوششیں شروع کر دی گئیں۔ اس انجمن نے مولوی صاحب کی سرکردگی میں اُردو کی جو عظیم خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل کے لئے الگ دفتر درکار ہے۔

۱۹۳۷ء میں عام انتخابات کے بعد متعدد صوبوں میں کانگریس وزارتیں برسرِ اقتدار آچکی تھیں جنھوں نے اُردو کے خلاف نفرت اور بدگمانی کی فضا کو عام کرنے میں بڑا حصہ لینا شروع کر دیا۔ اُردو ہندی کش مکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ حکومت کی سرپرستی میں ہندی نواز طبقہ کھلم کھلا اردو دشمنی پر اتر آیا تھا۔ یہ طبقہ اس زبان کی مخالفت کر رہا تھا جو اس ملک کے تمام بسنے والوں کی مشترکہ میراث اور ہندو مسلم و دیگر اقوام کے اتحاد کی سب سے بڑی یادگار تھی۔

اُردو زبان پر یہ بہت ہی بڑا نازک وقت پڑا تھا جس کے خلاف اجتماعی اور منظم کوششوں کی ضرورت تھی۔ یہ مولوی صاحب کی ذات بابرکات تھی جو اس آڑے وقت پر کام آئی۔ اُردو کے تحفظ کے لئے جس منظم مہم کو چلانے کی ضرورت تھی اس کے لئے حیدرآباد کا ماحول موزوں نہیں تھا لہٰذا جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری سے مستعفی ہو کر وہ دہلی آ گئے اور ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر بھی وہیں منتقل کر دیا۔ اس سے قبل مولوی صاحب کے کاموں کی نوعیت صرف علمی و ادبی تھی لیکن دہلی کے دس سالہ دورِ قیام میں ان کی نوعیت میں قدرے سیاسی رنگ بھی شامل رہا۔ ترقی اور فروغ کے اعتبار سے انجمن ترقی اردو کا یہ دور زرّین ہے۔ انجمن نے

اس عرصے میں بڑی ہی قابل قدر خدمات انجام دیں جن کا ہمیشہ اعتراف کیا جائیگا . . . . . تا آنکہ ملک کی تقسیم عمل میں آگئی ۔

بوقتِ تقسیم فسادات نے جہاں اور بہت سے نقصانات پہنچائے وہاں ان کی دست برد سے انجمن بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ مذہبی دیوانوں نے صرف انجمن کا دفتر ہی نہس نہیں اس کا کتب خانہ بھی پھونک ڈالا جس میں مولوی صاحب کی پچاس سالہ کوششوں کا عزیز سرمایہ تھا۔ اس گرانقدر ادبی سرمائے کا زیاں بہت بڑا قومی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں لٹا پٹا کارواں کراچی پہنچا۔ ملک کی سیاسی حالات نے عوام کے دماغوں کو ماؤف کر رکھا تھا۔ بددلی اور بے حسی کی فضا عام تھی۔ ہر چند اُردو کے لئے زمین تنگ اور آسماں دور والا مضمون تھا۔ لیکن اس بوڑھے مجاہد نے ہمت نہ ہاری۔ شاید اس خاکستر میں امتداد زمانے کے ہاتھوں سے محفوظ بچی کھچی چند چنگاریاں رہ گئی تھیں جو وقت پر خود بہ خود مشتعل ہوگئیں بالاخر ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اُردو کا قیام پھر سے عمل میں لایا گیا۔ ہر چند کہ اس سلسلے میں مولوی صاحب کو سخت دشوار۔ حوصلہ شکن اور نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے حوصلے پست نہ ہوئے۔ کراچی میں اردو کالج کا قیام ان کی مخلصانہ کوششوں اور سرگرمیوں کا رہین منت ہے ۔ یہ کالج ایک عرصے سے اُردو کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ذہنی ارتقا میں بڑا نمایاں حصہ لے رہا ہے اور ملک و قوم کی ترقی میں گران قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ تاہم اسے مولوی صاحب کی بھرپور امنگوں اور دلی آرزؤں کا آئینہ دار نہیں کہا جا سکتا۔ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کا خیال ایک عرصے سے مولوی صاحب کے سینے میں چٹکیاں لے رہا ہے۔

جامعہ اُردو کے قیام کا مطالبہ اُردو کے اس محسن کا آخری نعرہ ہے۔ حالانکہ مولوی صاحب اپنی عمر کے لحاظ سے اب اس منزل پہ پہنچ چکے ہیں جہاں دل میں جوش و خروش تو کجا عناصر میں بھی اعتدال باقی نہیں رہتا۔ لیکن اردو یونیورسٹی کے قیام کے خوش کن تصور نے ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی ہے اور وہ نئی امنگوں اور تازہ حوصلوں کے ساتھ پھر میدان عمل میں آگئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوم کے غیور افراد کہاں تک اس قومی فریضے کی ادائیگی کی طرف توجہ دیتے ہیں جو یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔

اس مختصر سے مضمون میں مولوی صاحب کی تصنیفات و تالیفات کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ ان کی تعداد خاصی طویل ہے جن پر الگ الگ طویل و مبسوط مضامین لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جائیں گے۔ مجھے تو ان کی ستر سالہ اُردو خدمات کا صرف سرسری جائزہ لینا مقصود ہے۔

اُردو کی اس طویل خدمت کی بنا پر وہ اب تک ایک LEGEND کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں جس کا تذکرہ اُردو تاریخ میں ہمیشہ سنہری الفاظ میں کیا جائے گا۔

*

اردو زبان میں علمی اصطلاحات کی تاریخ

(بزبان انگریزی)

از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب صدر انجمن ترقی اردو پاکستان، قیمت آٹھ آنے

محمد ایوب اولیا

بابائے اردو مولوی عبدالحق

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مولوی صاحب کے ممدوح میر تقی میر کا یہ شعر ان کی اپنی شخصیت کی مکمل طور پر عکاسی کرتا ہے۔ مولوی صاحب جیسی نادرِ روزگار ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں، صدیوں بعد ان جیسی قتیلِ عشق شخصیت عالم سے منصۂ شہود پر آتی ہے۔ جس سے قدرت کو بہت بڑا کام لینا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی خیال کو کس خوبی سے نبھا گئے ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

اس مضمون میں مولوی صاحب کی شخصیت کا دو طریقوں سے تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا اوّلاً ذاتی تاثرات کی بنا پر۔ ثانیاً "زبان خلق" کے توسط سے۔ ذاتی تاثرات اور ملاقاتوں کے تذکرہ کی اوٹ میں مجھے اپنی "تشہیر" مقصود نہیں ہے۔ حاشا و کلّا ہرگز نہیں ہے۔ اس سے صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ مولوی صاحب عام طالب علموں سے کیسے پیش آتے ہیں۔ ان سے کس قسم کا سلوک کرتے ہیں۔ اور ان کے معاملات میں کہاں تک دلچسپی لیتے ہیں، اس طریقے سے ان کی سیرت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اور اگر کچھ اصحاب

اس بات پر مصر رہیں کہ میں "درمدح خود" لکھ رہا ہوں۔ تو بھی یہ میرے لئے وجہ شرم نہیں بلکہ انبساط ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم "

بابائے اردو سے میری سب سے پہلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی۔ ان دنوں میں میٹرک کا طالب علم تھا اور شخصیتوں سے ملنے کا شوق جنون کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ اس اولین ملاقات کے متعلق میں نے کالج میگزین میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا۔ وہ بھی نقل کردینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ تدریجی طور پر مولوی صاحب کی شخصیت کا تجزیہ ہو سکے۔

" ۲۶ راگست ۱۹۵۵ء (بروز جمعہ) میں نے دفتر انجمن ترقی اردو میں فون کیا۔ آپریٹر صاحب سے کہا کہ میں بابائے اردو جناب مولوی عبدالحق صاحب سے ملاقات کرنے کا خواہاں ہوں۔ جواب ملا کہ اس وقت تو مولوی صاحب آرام فرما رہے ہیں آپ کل نو سے بارہ بجے تک کسی وقت بھی تشریف لائیے۔ چنانچہ میں ۲۷ راگست کو دفتر انجمن ترقی اردو پہونچ گیا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ جن کا نام سید وارث حسین شاہ تھا۔ وہ احسن مارہروی کے برادر خورد ہیں۔ ہمیں مولوی صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری جناب عبدالعلی کے پاس بٹھایا گیا۔ اور مولوی صاحب کو اطلاع کی گئی۔ انھوں نے کہلا بھیجا کہ تھوڑی دیر کے بعد بلوا بھیجوں گا۔ چند منٹ کے بعد ہماری طلبی ہوگئی۔ مولوی صاحب ایک کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ ان کے سامنے بڑی سی میز تھی۔ جس پر ایک مسودہ رکھا تھا۔ جس کی اصلاح کررہے تھے۔ الماریوں میں نایاب، کم یاب کتابیں رکھی تھیں۔ اور ہر قسم کی کتابوں کے لئے علیحدہ علیحدہ شلف لگے تھے۔ درمیان میں ایک دروازہ تھا جس پر جلی حروف میں "مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ" رقم تھا مولوی صاحب نے دبیز شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی جو اس بات کی غمازی کررہی تھی کہ مولوی صاحب کی نظر بہت زیادہ کمزور ہوچکی ہے۔ داڑھی سے معلوم ہوتا تھا کہ مولوی صاحب شائد بال نہیں چنوایا کرتے۔ خیر آمدم برسر مطلب۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مختلف موضوعات گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں میں نے درخواست کی کہ میری بیاض پر کچھ لکھ دیجئے۔ انھوں نے ازراہ شفقت ذیل کی دعا تحریر فرمادی ؎

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو (میرؔ)

اس کے بعد انھوں نے میرے مشاغل وغیرہ پوچھے اور تعلیم کے متعلق چند ایک سوال کئے۔

موجودہ دور میں جب کہ اردو پر ہر طرف سے حملے اور یلغاریں ہو رہی ہیں۔ بابائے اردو ہی کی ذات ہے جو ان تمام شورشوں کا دندان شکن جواب دے رہی ہے۔ اس پُر آشوب دور میں جب کہ ان کے معدودے چند ساتھی ہیں اردو کی بقا اور بہتری و بہبودی کے لئے تن تنہا چومکھی لڑ رہے ہیں۔ فضا اور ماحول سازگار نہیں۔ لیکن یہ مردِ ارد و کا پرانا مجاہد اب بھی اپنے لب و لہجے کی بیباکیت و اشگاف الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کر رہا ہے اس کے ہزاروں اور لاکھوں دشمن ہیں۔ مگر وہ اپنی دھن میں رواں دواں ہے۔ اس نے ایک نعرہ لگایا تھا کہ "اردو اور صرف اردو ہی پاکستان کی سرکاری و قومی زبان بننے کی مستحق ہے" اور وہ برابر اپنے موقف پر ڈٹا رہا ہے۔ اس کی پلکیں تک سفید ہو چکی ہیں مگر اسے اردو کے ساتھ عشق ہے۔ اور وہ عشق کی توہین نہیں چاہتا۔ اپنے نصب العین سے ایک انچ نہیں ہٹا ـــ ہٹے بھی کیوں ؟؟؟

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو"

("کارواں" کالج میگزین اسلامیہ کالج
گوجرانوالہ ۔ نومبر ۱۹۵۷ء)

مندرجہ بالا اقتباس اولین ملاقات کا وہ تاثر ہے ۔ جو آج بھی میرے دل پر نقش ہے۔ اس میں آپ کو خامہ کاری ضرور ملے گی۔ لیکن مبالغہ آرائی نہیں۔ ان کے حسن اخلاق سے میں اس قدر متاثر ہوں کہ جب بھی مجھے کراچی جانے کا موقع ملا۔ ان کی زیارت سے شادکام ہوا ہوں اور ہر ملاقات مجھے اور بھی ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے ۔ اس عقیدت کے طوق کو میں کسی طور بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔

ان کی ساحرانہ شخصیت میں کچھ ایسی کشش ہے ۔ کہ ان کے ساتھ گزارے ہوئے چند لمحے زندگی کے بہترین اور خوش گوار ترین لمحے بن جاتے ہیں۔ ان کی صحبت سے کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اور کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا کے دوش بدوش چلنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ میں جب بھی ان کے متعلق سوچتا ہوں۔ ان کی یہ دعا سائن بورڈ کی طرح میرے ذہن میں ابھر آتی ہے ؎

یارب دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

مصرعہ ثانی عمل کا پیغام ہے۔ اور سمندِ ذہن و فکر کے لئے مہمیز!!

اس پہلی زیارت کے بعد مجھے کامل دو سال تک مولانا کے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ سیکنڈ ایریں مجھے پھران کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ دفتر جا پہونچا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بالائی منزل پر آج کل مقیم ہیں۔ بغیر اطلاع دیئے آہستہ آہستہ ڈرتا جھجکتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ خوف تھا کہ مولوی صاحب ڈانٹیں گے کہ بغیر پوچھے کیوں آ گئے۔ مگر چوں کہ ملاقاتوں کا لپکا پڑ چکا تھا۔ اور مولوی صاحب سے خصوصی ملنے کی لگن بھی، اس لئے جی کڑا کرکے اوپر چھت پر جا پہونچا۔ دیکھا کہ مولوی صاحب ایک مونڈھے پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ میں نے ارادتاً کھڑکھڑاہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ متوجہ ہوں آہٹ پاکر نظریں کتاب سے ہٹائیں۔ مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے خود ہی تعارف کروایا۔ کچھ کچھ پہچانا۔ اور پوچھا آج کل کیا کرتے ہو۔ عرض کیا سائنس لے رکھی ہے۔ ایف ایس سی کرنے کا ارادہ ہے۔ بولے خوب۔ بڑا اچھا ہے۔ ہمارے ملک کو سائنس دانوں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

مگر بیگانی زبان میں تعلیم دینے سے صحیح خطوط پر سوچنے کی صلاحیت بہت حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ اور صرف رٹنے رٹانے تک ہی نوبت پہونچتی ہے۔ تحقیق و تفکر کے لئے اپنی زبان میں تعلیم نہایت ضروری ہے۔ افہام و تفہیم اور ادائیگی خیالات کے لئے پرائی زبان بڑی دقت کا باعث ہوتی ہے اس طرح ہمیں ایک اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ ہے ــــ ترجمہ ــ چاہے وہ ذہنی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور توانائی بھی خواہ مخواہ صرف ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم دل کی بات نہیں کہہ پاتے اچھا خاصہ لطیفہ بن جاتا ہے۔ ذہن ایک کا زباں کسی دوسرے کی۔ قلم کسی تیسرے کا، اور کاغذ چوتھے کا ...

کسی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ مولوی صاحب ہمارے شہر گوجرانوالہ میں پڑھتے رہے ہیں۔ تحقیق کی خاطر میں نے اس کا تذکرہ کیا۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ ہاں بھئی! ابتدائی تعلیم مشن اسکول گوجرانوالہ سے حاصل کی تھی۔ مزید استفسار کرنے پر بتایا کہ زیادہ کیا پوچھتے ہو! بس گردشِ لیل و نہار لے گئی تھی ــــــ یہ جان کر میں نے طفلانہ شوخی سے کہا کہ مولوی صاحب! گوجرانوالہ کے لئے کتنے فخر کی بات ہے کہ آپ جیسے بزرگ نے وہاں ابتدائی تعلیم پائی ہو۔ وارث شاہ جیسے عظیم شاعر نے اس کی فضا میں پرورش پائی ہو۔ مولانا ظفر علی (مرحوم) سردار دیوان سنگھ مفتون۔ میراجی۔ ن۔م راشد، سیّد عبدالحمید عدمؔ، مالک رام صاحب، حامد علی خاں جیسے بے بدل ادیبوں نے وہاں جنم لیا ہو۔ شیخ دین محمد (سابق گورنر سندھ)

نس ایس اے رحمٰن ، ممتاز حسین (سکریٹری وزارت مالیات) ۔ جیسے مشاہیر وہاں پیدا ہوئے
ہوں — ہنس کر کہنے لگے میاں کیا بات کرتے ہو — تم تو یہاں تک کہہ دو گے کہ محمد علی جناح بھی
و جرانوالے میں پیدا ہوئے تھے !!!

اس وقت میرے پاس کیمرہ بھی تھا ۔ میں نے مولوی صاحب کی چند تصاویر لیں ۔ خواہش تھی کہ ایک آدھ
صویر مولوی صاحب کے ساتھ کھنچواؤں ۔ مولوی صاحب کو اس کے متعلق کہا ، مسکرانے لگے ۔ فرمایا کہ اس وقت
ہاں آپ ہیں یا میں ہوں ۔ کیسے بات بنے گی — ہاں نوکر ہے لیکن وہ اس فن سے نا آشنا ہے — میں نے
اسی کو بلوا لیجئے ۔ معمر سا نوکر تھا ۔ بڑی دیر تک مغز ماری کے بعد اس کے پلے کچھ پڑا اور وہ تصویر کھینچنے
کے قابل ہوا ۔ دوسرے روز تصویریں دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ کیمرہ تو ہل گیا تھا ۔ پھر جا دھمکا ۔ کہنے لگے
یوں پیسے ضائع کرتے ہو ۔ لیکن میں اڑا رہا ۔ پھر اجازت دے دی ۔ اس دفعہ ان کے نوکر نے کچھ
چلاؤ قسم کی تصویر کھینچ دی — جسے دیکھ کر اب بھی مجھے اپنی ضد اور ان کی دلآویز مسکراہٹ
یاد آجاتی ہے ۔

اب بھی وہ مطالعہ کرتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ اس وقت ان کے زیر مطالعہ گوئٹے تھا ۔
مہد سے لحد تک علم حاصل کرنا اسے کہتے ہیں ۔

ان دنوں میں نے بڑا لمبا چوڑا مضمون "مثنوی زہر عشق" پر لکھا تھا ۔ اور اس پر
شیخیں مارا کرتا تھا — ہر ملنے والے کو سنا کر بور کیا کرتا تھا ۔ مولوی صاحب کو بھی میں نے
کہا کہ میرا مضمون ایک نظر دیکھ لیجئے ۔ دبی دبی مسکراہٹ سے فرمایا کیا سائنس کی رُو سے
اس کی اہمیت ثابت کرو گے ؟

انہی دنوں مجھے لفظ گھائل کی تحقیق کا جنون ہوا ۔ بعض اصحاب اس لفظ کے ہندی
تلفظ گھائل پر مصر تھے ، اور کچھ مروج و مستعمل تلفظ گھائِل کے حق میں تھے ۔ میں نے مولوی
صاحب سے بھی اس کے بارے رائے طلب کی ۔ کہنے لگے کہ اس معاملے میں انشاء اللہ خاں انشا
کے اس اصول کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ اردو زبان میں جو لفظ آگیا وہ اردو کا ہو گیا ۔ خواہ وہ بلحاظ
اصل صحیح ہو یا غلط — جب انیس ، حالی ، سودا ، نظیر وغیرہ نے گھائِل بکسرِ چہارم باندھا ہے
تو پھر اس کے اصل ہندی تلفظ گھائل پر اصرار کرنا سراسر تکلیف ہے — اس سے اردو زبان
کی ترقی رک جائے گی اور ہم لکھتے بولتے وقت صحیح تلفظ کے لئے اس زبان کی طرف رجوع کریں گے جس سے وہ لفظ حاصل کیا گیا ہے اس سے خاصی گڑبڑ پیدا ہو جانے کا
امکان ہے ۔ مولانا حالی کو پتہ تھا کہ عربی زبان میں حرکت کا تلفظ حرکت ہے ۔ مگر افسوس

نے حرکت میں استعمال کیا جو روزمرہ کی بول چال میں بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔ فرمایا ہر زبان میں لچک ہوتی
ہے۔ اردو میں بھی یہ بے پناہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ تھوڑی سی تبدیلی کے
ساتھ اپنا لیتی ہے۔ جو اردو کے اپنے ہو جاتے ہیں۔ اس کی اصل جڑ ضرور تلاش کیجیے۔ لیکن موجودہ بہتر
کا فیصلہ زمانہ اور زبان خود کرتے ہیں۔ اور اس پر ہرگز ہرگز پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ شفقت کو شفقہ
اور شکوہ کو شکوہ یا شکوئی پڑھنا کہاں تک مناسب ہوگا۔ اس قسم کے کھیل زبان کے لئے از حد مضر ہیں
اپنی علمی استعداد "ظاہر" کرنے کے اور بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب داد سخن بھی دیتے ہیں یعنی شعر بھی کہتے ہیں۔ شاید
اس کی ابتدا کالج کے زمانے سے ہوئی ہے۔ کیونکہ شعر کہنے کا جنون اکثر کالج میں آکر ہی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں
مولوی صاحب اب بھی شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ مگر ایک زمانہ ضرور تھا جب وہ شعر کہتے تھے۔ اور اچھے شعر
کہتے تھے۔ مجھے اس کی بھنک پڑ چکی تھی کہ موصوف شعر گوئی کی طرف بھی مائل رہے ہیں۔ تھرڈ ایئر میں جب
ان سے ملا۔ تو اس کی تصدیق چاہی۔ ہنس کر کہنے لگے تمھیں کیسے پتہ چلا! تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد
گویا ہوئے کہ ہاں بھئی! میں بھی یہ جرم کرتا رہا ہوں۔ میں نے مولوی صاحب سے التماس کی کہ مجھے بھی اپنا کوئی
شعر عنایت فرمائیے۔ انھوں نے کمال شفقت سے اپنا یہ شعر لکھ کر دیا ؎

نہ عشقِ بتاں ہے نہ فکرِ معیشت
گزرتی ہے کیوں جاگتے رات ساری

ایک اور ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ بی۔ اے میں مولوی صاحب نے ریاضی لے رکھی تھی۔ اور ریاضی
میں بڑے تیز اور اس قدر درک رکھتے تھے۔ کہ ان کے مدِ مقابل کوئی صاحب تھے تو صرف ایک صاحب جو
موجودہ دور کے بہت بڑے ریاضی دان ہیں۔ یعنی رضی الدین صدیقی صاحب۔ بڑا تعجب تھا کہ مولوی صاحب
جیسا بڑا ادیب ہو۔ اور ریاضی میں اتنا قابل ہو۔ لیکن عمر خیام کا نام ذہن میں آگیا۔ وہ بھی تو بہت بڑا شاعر
ساتھ ہی ساتھ عظیم المرتبت ریاضی دان تھا۔ یہ سوچ کر ذرا اطمینان ہوا کہ ادیب اور حساب داں ہونا
حیرت کی بات نہیں۔ مزید اطمینان کے لئے مولوی صاحب سے پوچھا۔ ان کی پرکشش آنکھوں میں چمک
آگئی۔ چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ کہنے لگے ہاں میاں! میں ریاضی میں خاصا ہوتا تھا۔ لیکن تم نے رضی
الدین کا نام کیسے لے لیا۔ وہ تو کل کا بچہ ہے۔ ہمارے دیکھتے پیدا ہوا۔ وہ کس طرح میرا ہم درس ہو
تھا۔ وہ تو مجھ سے بہت ہی چھوٹا ہے۔ یہ سب کچھ انھوں نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا جس میں
مسرت و انبساط اور حجاب کے عناصر شامل تھے۔ پھر انھوں نے کھنکار کر ذرا بلند آواز سے کہا۔ وہ

بہترین دوست وائس چانسلر سر ضیاء الدین تھا۔ جو آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور ہم اس کی باتیں یہاں بیٹھے کر رہے ہیں۔ بڑا پیارا انسان تھا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ اچھوں کو جلد موت آجاتی ہے۔ اب ہمارا بھی چل چلاؤ ہے۔ مگر دوست یہاں بھی آگے نکل گئے ؎

داغؔ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوٹی
ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

مولوی صاحب ۱۸۷۵ء میں شہر ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرواہ اور کچھ عرصہ کے لئے گوجرانوالہ (سابق پنجاب) میں پائی۔ علم کا شوق انھیں علی گڑھ لے آیا۔ یہیں سے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کی سند لی۔ طالب علمی کے زمانے میں مولوی صاحب بہت ہی کم گو اور کم آمیز تھے۔ کھیلوں وغیرہ سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ کالج کی سیاسیات سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اگر کسی چیز سے ان کی بنتی تھی تو وہ تھی تعلیم — پڑھنا۔ پڑھنا اور پڑھنا۔ طالب علمی کے زمانہ کا ان کا یہی ایک مشغلہ تھا۔ علی گڑھ میں رہ کر مولوی صاحب نے علم کی تشنگی خوب بجھائی۔ یہیں مولانا حالیؔ۔ سرسیدؔ احمد خان اور مولانا شبلیؔ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ مولانا حالیؔ اور سرسیدؔ احمد خان سے انھوں نے بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ بعد میں اور بزرگوں سے بھی ان کے مراسم ہوئے۔ مگر ان دونوں اصحاب کی چھاپ مولوی صاحب پر سب سے زیادہ ہے۔ مولانا حالیؔ کے تو وہ مثنیٰ کہے جا سکتے ہیں۔ طبیعت میں بالکل ویسی ہی سادگی، درویشی اور استغنا پائی جاتی ہے — حالیؔ کی انکساری کے بھی یہی مالک ہوئے۔ کام کرنے کی دھن میں بھی دونوں مشترک ہیں۔ تحریر میں بھی حالیؔ کی سی سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں

> "وہ (مولوی عبدالحق) زبان پر حیرت انگیز عبور رکھتے ہیں۔ اور اسلوب میں استادی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا انداز بیان مولانا حالیؔ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ مگر بعض اوقات ان سے آگے نکل جاتے ہیں۔"

مولانا حالیؔ سرسیدؔ احمد خان اور مولانا شبلیؔ بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ سرسیدؔ احمد خاں تو بہت زیادہ مہربان تھے۔ تعطیلات میں انھیں گھر بھی نہ جانے دیتے۔ اور ان کے چاؤ چونچلے بھی دیکھتے،

> یہی وجہ ہے کہ سرسیدؔ احمد خان کی آزاد خیالی، روشن دماغی کا حصۂ کثیر مولوی صاحب کے ہاں پایا جاتا ہے۔ قومی خدمت کے جذبہ کی جو لگن سرسیدؔ کے دل میں تھی۔ اس کی شمع مولوی صاحب کے دل میں جلنے لگی۔ اور یہ سب سیدؔ صاحب کے خلوص و صداقت کا مظہر تھا۔ دوسری طرف

انھوں نے حالی کے ہاں بھی ڈاکہ ڈالا۔ اور ان کی حق گوئی ، بے باکی اور متانت بھی ہتیا لی۔ شبلی سے علمی کاموں کا چسکا لگا۔ اور ان تینوں بزرگوں کی صحبت سے مولوی صاحب کندن بن گئے۔

طالب علمی کے زمانے میں وہ ریاضی (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) اور فلسفہ کے بہت اچھے طالبعلم تھے۔ فلسفہ کی جانب اس قدر راغب تھے کہ شمس العلما، مولوی خلیل احمد انھیں " فلاسفر" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ریاضی اور فلسفے جیسے مشکل اور دقیق مضامین میں ہی تحقیق و تجسس کا جذبہ پروان چڑھا۔ اور انھوں نے اردو ادب کو وہ کچھ دیا جو اور کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اور یہ جواں ہمت بڈھا آج تک انہی راہوں پر گامزن ہے۔ جو حالی، سرسید احمد خان اور شبلی جیسے باکمالوں کی وجہ سے متعین ہوئے۔

بی۔ اے کرنے کے بعد مولوی صاحب بیٹھ نہیں گئے بلکہ انھوں نے اپنے لئے اور میدان تلاش کرنا شروع کئے۔ عربی ادب پڑھا۔ صرف و نحو اور ہندی زبان کی تحصیل کی۔ دکنی اور گجراتی اردو (گجری) پڑھی یہاں تک کہ ایک پنڈت کی مدد سے تلسی داس کی رامائن بھی پڑھی۔ اور اس طرح اردو ادب میں رائے دینے کا حق پیدا کر لیا۔ فارسی ادب کی طرف بھی کسی زمانے میں ان کی توجہ اچھی خاصی رہی ہے۔ اردو شعرا کے تذکرے جو فارسی زبان میں تھے ایڈٹ کروائے۔ دیباچے لکھ کر ان کو شائع کرایا۔ اس طرح ان نادر ادبی تحفوں کو اہل ذوق تک پہونچایا۔ انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ " لنس ڈاؤن میڈل" حاصل کر کے اپنی انگریزی دانی کا لوہا بھی منوالیا۔ اور اردو تو ہے ہی ان کی اپنی زبان۔ اس کے لئے انھوں نے ایک عمر میں اتنا کام کیا ہے کہ اس کے لئے کئی عمریں بھی ہو تیں۔ تو بھی کسی اور سے اس اس خوش اسلوبی سے نہ ہوتا جیسے مولوی صاحب نے کر کے دکھایا ہے۔ عمل و حرکت کی وہ جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اور مستقل مزاجی ان کی عادت ثانیہ۔ انھوں نے کام کرنے کا ولولہ دوسروں میں بھی پیدا کیا ہے — اپنے شاگردوں سے ایسے کام کرائے ہیں کہ وہ آج کل کے پروفیسروں سے نہیں ہو پائے۔ شیخ چاند مرحوم سے اردو کے شہرہ آفاق شاعر سودا پر " سودا" جیسی مبسوط اور جامع کتاب لکھوائی۔ اس سے بہتر اس موضوع پر کتاب آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اور اگر کوئی لکھ سکتا ہے۔ تو اس سے لکھوانے والا کوئی نہیں۔

۱۸۹۵ء میں مولوی صاحب مدرسہ آصفیہ حیدر آباد چلے گئے۔ صدر مدرسی سے آپ مہتمم ہو گئے۔ مہتمم سے صدر مہتمم اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے۔ اس کے بعد پنشن لے لی۔ مگر ان کے دوست جو ان کے علم و فضل سے واقف تھے ان کو کیسے چھوڑنے والے تھے۔ انھیں جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا ایک ہزار تنخواہ پر ان کو صرف ۲ گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا۔ یہ آسائش ان کو راس نہ آئی۔ کیوں کہ وہ حیدر آباد میں رہ کر ترقی اردو کے لئے صحیح جدوجہد نہ کر سکتے تھے۔ وہ دہلی کو مرکز بنا کر اردو کی ترویج و ترقی کی کوشش

کرنا چاہتے تھے - چناں چہ اس ۳۵ سالہ تعلق کو توڑنا پڑا - اور ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔

سر اکبر حیدری اور سید راس مسعود کے تعاون سے جامعہ عثمانیہ میں مولوی صاحب نے بہت کام کیا ان دونوں حضرات کی وجہ سے مالی امداد خوب ملی اور مولانا نے بڑی خاموشی سے بنیادی ضروریات کے لئے سر توڑ کوشش شروع کردی - جس سے جامعہ کو تقویت پہونچ سکتی تھی - مترادفات اور مصطلحات کے لئے بورڈ قائم ہوا - لغات کی ترتیب کے لئے ماہرین کو دعوت دی گئی - ایک دارالترجمہ قائم کیا - جس کے ناظم وہ خود تھے - تھوڑی ہی مدت میں قانون، تاریخ، ریاضی، طبیعات، کیمیا اور فلسفے کی بیسیوں کتابیں اردو میں ترجمہ کردی گئیں، اور اردو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ذریعہ تعلیم بن سکے - یہ ایک رفیع الشان کامیابی تھی - اور اس کا سہرا مولوی صاحب کے ہی سر ہے ان کے خلوص اور انتھک کوشش نے وہ کام کر دکھایا جو بادی النظر میں نہایت ہی مشکل سمجھا جاتا تھا - سچ ہے خلوص اور محنت و دیانت رائیگاں نہیں جاتے -

مولوی عبدالحق ۴۵ سال سے انجمن ترقی اردو سے منسلک ہیں - جس کی ابتدا چند ٹوٹے قلموں بوسیدہ رجسٹر اور ایک دوات سے ہوئی تھی - آج وہ ہند و پاک کا سب سے بڑا ادارہ ہے - جو اردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہے پاکستان میں جس کے تحت ایک اردو کالج بڑی کامیابی سے چل رہا ہے - جس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے - اور اب اسی کو وسعت دے کر یونی ورسٹی بنانے کی کوشش ہو رہی ہے - یہی انجمن ان سینکڑوں نادر کتابوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کی ذمہ دار ہے - جو اگر نہ چھپوائی جائیں تو دست برد زمانہ سے تباہ ہو جائیں - اسی انجمن نے لاکھوں روپے کے مخطوطات اور نایاب مسودات خرید کر اپنی لائبریری کو گراں بہا بنا دیا - جس سے آج بھی ہزاروں اشخاص استفادہ کر رہے ہیں - اتنا علم کسی اور ادارہ نے محفوظ نہیں کیا ہوگا - جتنا کہ انجمن ترقی اردو نے کیا ہے - یہ ٹھیک ہے کہ اتنے بڑے کام کو صرف ایک شخص کا رہین منت نہیں کہا جا سکتا - مگر یہ ماننا پڑے گا - کہ روح رواں مولوی صاحب ہی تھے - جن کی نگرانی میں اس قدر عظیم کام سلیقگی اور خوش اسلوبی سے انجام پایا - اور کسی قسم کی بے قاعدگی بدنظمی اور بے ترتیبی کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملا - کام کرنے کا قرینہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں - آخر کہنا ہی پڑتا ہے ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مولوی صاحب قابلِ منتظم ہی نہیں بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز بھی ہیں - ان کا اپنا اسلوب بیان ہے - جو بڑا دل نشین اور سادہ ہے سلاست اور سادگی ان کے انداز کی خاص خوبیاں ہیں -

چھوٹے چھوٹے، خوب صورت فقروں میں بہت بڑی بات کہہ جانا مولوی صاحب پر ہی ختم ہے۔
رام بابو سکسینہ کا قول میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ کہ طرز تحریر میں وہ مولانا حالی کے مقلد ہیں۔ مگر بعض
اوقات وہ حالی سے آگے نکل جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اس لئے بھی ریاض کیا ہے۔ انھوں نے اپنی عمر
میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مجال ہے کہ جھول آجائے۔ تحریر میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے باتیں کر رہے ہوں
زیر لب ہنسی بھی ہے۔ تفنن طبع کے لئے ہلکا ہلکا مزاح بھی ہے۔ کہیں کہیں نصیحتیں بھی کر جاتے ہیں۔ مگر
خطابت کے انداز میں ہرگز نہیں۔ انھیں بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اور خوب آتا ہے۔ اپنی بات کو وہ پھیلاتے
نہیں ہیں۔ جو کہنا ہوتا ہے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ جن کے پیچھے کافی زور کارفرما ہوتا ہے
بات بڑھانے سے وقت اور قوت دونوں ضائع ہوتے ہیں۔ اور یہ ان کی عادت نہیں۔ اس سلسلے میں
ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ کراچی کے کسی اسکول میں ماسٹر صاحب نے لڑکوں کو کام دیا کہ مولوی صاحب
کے فلاں مضمون کا خلاصہ لکھ کر لاؤ۔ لڑکوں نے بہتیرا زور لگایا۔ مگر کچھ نہ سوجھا۔ کوئی بات زائد ہوتی
تو کاٹتے الفاظ خواہ مخواہ ٹھونسے گئے ہوتے تو وہ ان سے نجات پاتے۔ لیکن یہاں تو پہلے ہی "کفایت شعاری"
سے کام لیا گیا تھا۔ لڑکے دوڑے دوڑے مولوی صاحب کے پاس آئے۔ اور کہا کہ اس معاملے میں ہماری
مدد کیجئے۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر جواب دیا کہ اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ سارا مضمون نقل کر کے لے
جائیے۔ یا لکھ دیجئے کہ خلاصے کی گنجائش نہیں!!!

زبانِ اردو اور بابائے اردو لازم و ملزوم ہیں۔ ایک نام لیجئے دوسرا فوراً ذہن میں آجائے گا۔
ساری عمر لیلائے اردو کی خدمت میں گزار دی ہے۔ دراصل انھیں اردو سے عشق ہے۔ وہ مجنوں ہیں
اور اردو محبوبہ۔! اور شاید اردو کے ناز نخروں اور چاؤ چونچلوں کو دیکھتے ساری عمر گزار دیں ایثار اور
وفا کی اس سے بہتر مثال کہاں مل سکتی ہے؟ اس اردو کے لئے بوسیدہ اور کرم خوردہ کتابوں کو کھنگالا۔
ترجمہ کروایا۔ مقدمات لکھے۔ قواعدِ زبان طلبا کے لئے ازسر نو ترتیب دیئے۔ لغات کی تدوین کی۔ شعرا
پر تنقیدی مضامین لکھے۔ شعراء کے کلیات کے انتخاب کئے یا کروائے۔ رسالے جاری کروائے۔ "چند ہم عصر"
جیسی بے نظیر کتاب لکھی۔ جو اسلوب نگارش کے لحاظ سے اردو ادبیات کی بہترین کتاب ہے۔ خطبات دیئے
اور ساری عمر زبانِ اردو کی توسیع و ترویج کے لئے وقف کر دی۔ حریفوں نے لاکھ روڑے اٹکائے لیکن
اس دھن کے پکے انسان نے کچھ پروا نہ کی۔ اور اپنے کام سے کام رکھا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں
جب حالات سازگار نہ رہے۔ اردو کا مستقبل وہاں تاریک پایا تو آپ نے بھارت کو خیرباد کہا۔ بے سر و سامانی
کی حالت میں کراچی میں آ مقیم ہوئے۔ اب حالت یہ ہے کہ اردو یونی ورسٹی کی سکیم عملی جامہ پہن رہی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸۹ پر ملاحظہ فرمائیں

نسیم ریاض

اردو زبان کی نشو و نما میں مولوی عبدالحق کا مرتبہ

بابائے اردو مولوی عبدالحق کو اردو زبان سے صرف اسی لیے دلچسپی نہیں ہے کہ وہ ان کی زبان ہے بلکہ اردو سے شیفتگی کے سبب
حقیقت اس زبان کی تاریخی اور ثقافتی حیثیت ہے ۔ سر سید احمد خاں کی قومی تحریک جس کے بطن سے پاکستان کی ولادت ہوئی
حقیقت ایک ثقافتی تحریک تھی جس نے اردو زبان و ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے ۔ مولوی عبدالحق اردو کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے
یہی وجہ ہے کہ جب کوئی اردو کی اہمیت سے انکار کرتا ہے تو اسے قومی توہین اور ثقافتی کفر قرار دیتے ہیں ۔ سر سید احمد خاں کے بعد
قومی زندگی میں ڈاکٹر عبدالحق کا مرتبہ بہت بلند ہے انھوں نے اردو زبان کو فی الواقع اردو زبان بنا دیا ۔ جس علمی و ادبی
کی بنیاد مولوی صاحب نے ڈالی ہے وہ آج بھارت و پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے میں جہاں اردو
کے نام لیوا موجود ہیں برابر پھل پھول رہی ہے آج ہندوستان میں ان کی قائم کردہ شاخیں بدستور قائم ہیں اور نمایاں علمی و
ادبی خدمات انجام دے رہی ہیں ۔

پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی اشاعت اردو کی تحریک کی داغ بیل پڑ چکی ہے ۔ آپ کی کوشش و کاوش نے
اردو زبان کی راہ سے بہت سے پتھر ہٹا دیئے ہیں ۔ گویا گیسوئے اردو منت پذیر شانہ نہیں رہا ہے اب ۔ !

اس پیرانہ سالی میں بھی انھیں کام عزیز ہے ۔ اب ان کی زندگی کا صرف کام ہے صرف کام اردو زبان و ادب پر ان کے ایسے ہی
احسانات ہیں جیسے تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں پہلی صدی کے مجاہدین کے تھے ۔

ہند و پاکستان کے علاوہ مولوی صاحب نے ایران ، افغانستان ، ترکی ، ملایا ، عرب ، امریکہ ،

اور روس وغیرہ کی یونی ورسٹیوں اور علمی و ادبی اداروں سے رابطہ قائم کرکے انھیں
اردو زبان کی اہمیت کا احساس دلایا ہے یہ آپ ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ ہے کہ شمال سے
جنوب، مشرق سے مغرب تک اردو کا ڈنکا بجنے لگا ہے اور اردو زبان نہ صرف ایشیا کی
ایک متمدن زبان ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کی متمدن زبانوں میں ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کو ہی سب سے پہلے اردو کی عظمت کا خیال پیدا ہوا انھوں نے اس بات کی انتھک کوشش کی کہ ملک و قوم کو اس بات کا یقین دلائیں کہ اردو کوئی گری پڑی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں اتنی وسعت اور اتنی صلاحیت ہے کہ تمام علوم وفنون اور فلسفہ و حکمت کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بذریعہ اردو دی جاسکتی ہے انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس بات کا پُرزور مطالبہ کیا کہ نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم بذریعہ اردو دی جائے اور ان کو ویسی ہی ڈگریاں دی جائیں جیسی مغربی طرز کی یونی ورسٹیوں میں دی جاتی ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے آپ کی سب سے اہم کامیاب اور فاموش کوشش جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جو ان کے اس خیال کی زندہ اور روشن مثال ہے اور یہ بھی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں اگر اردو یونی ورسٹی وجود میں آکر رہے گی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا مطالبہ کہ "فی الفور اردو کو پاکستان میں ذریعہ تعلیم اور یکتا قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے۔ تو یقیناً ان کی تاریخی بصیرت کی بھی دلیل ہوگا کیونکہ یہ اردو زبان ہی ہے جو ہماری ذہنی بیداری کی نقیب، روحانی جد وجہد کی ترجمان اور تخلیقی استعداد کا پیمانہ ہے ان کا خود یہ دعویٰ ہے کہ اردو یونی ورسٹی قائم ہو کر رہے گی جب کہ انھوں نے بزم فروغ اردو اسلامیہ کالج لاہور میں اپنے خطبے میں طلباء سے کہا کہ :۔

"جوانی قائم رکھنے کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہئے مقصد سے زندگی بنتی اور بڑھتی ہے، . . . . جوانی چوڑے چکلے سینے سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور لکڑی ٹیکنے سے نہیں آتا جوانی ہمت وعزم سے ہوتی ہے جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے میں اپنی جوانی پھر واپس لاؤں گا اور اس وقت تک نہ مروں گا جب تک اردو یونی ورسٹی نہ قائم کرلوں۔

مولوی صاحب نے اردو کی پیدائش اور اس کی مقبولیت کے متعلق کیسے دلکش پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔

"اردو ایک مخلوط زبان ہے، یہ زبان کی ایک قسم ہے۔ دنیا میں ایسی متعدد زبانیں ہیں اس قسم کی زبان کے وجود میں آنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب کشورکشائی ہے۔"

مولوی صاحب کا شمار عثمانیہ یونی ورسٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے پہلے پہل یہیں آپ نے اردو زبان کی پرذیبسری کی خدمت

نجام دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عام طور پر اردو کو علمی زبان کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن مولوی صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے منصوبہ کو عملی شکل دے کر اردو کو آخر کار ایک مستند علمی زبان کے درجہ تک پہنچا دیا۔ آپ کی ہی کوشش سے ہندوستان کے وشہ گوشہ میں اردو زبان کی اشاعت کے مراکز قائم ہوئے آپ ہی کی کوشش سے حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ قائم ہوا تھا جس کی نمائی آپ ہی کے سپرد تھی اس وقت جو لوگ آپ کے شریک کار تھے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں مولانا عبدالماجد دریا بادی ولانا عبدالحلیم شرر۔ مولانا سید ہاشمی فریدآبادی وغیرہ ان حضرات سے کون نہیں واقف ان میں سے ہر شخص علم و ادب کی دنیا کا درخشں ستارہ ہے۔

مولوی صاحب کو ۱۹۱۳ء میں انجمن ترقی اردو کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ انجمن کی معتمدی کے لئے آپ کا انتخاب ایک ایسا ن اتفاق تھا کہ جس نے اردو زبان کے حق میں مسیحائی کا کام کیا ہے۔

قیام پاکستان سے پیشتر اردو زبان ایک سخت مقامات گذر چکی ہے ویسے بھی اس کا شباب سوگوار ہی رہا مگر وہ زمانہ سخت بتلا کا زمانہ تھا ہندو مہاسبھا کی کوششوں سے اردو کو مٹانے کی مخالفت اس شدومد سے ہوئی کہ خدا کی پناہ! اس وقت اس یرہ و تار فضا میں اسی بزرگ کی مشیرانہ گرج ایک آتشیں شعلہ کی طرح اندھیروں کا سینہ چیر کر ہر طرف پھیل گئی اس وقت نتائج سے بے نیاز ہو کر اردو کی حفاظت کے لئے جہد آزما ہونا ایک بڑا صبر آزما مرحلہ تھا اور مولوی عبدالحق کا قدم آگے بڑھتا ہی گیا وہ ان کے پایۂ استقلال کو وہ نازک زمانہ بھی متزلزل نہ کر سکا۔ منزلِ عشق ملا کرتی ہے جانبازوں کو اور اس جانباز نے منزلِ عشق پر ہی جا کر دم لیا ہاں تک کہ اردو زبان کی کشتی کو منجدھار سے نکال کر پاکستان کے "ساحلِ مراد" پر لا کھڑا کیا۔

آج سے چند سال پیشتر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ میں روز بروز بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں اور آپ کی انجمن جوان ہوتی جا رہی ہے" میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

انجمن یقینی جوان ہے جوان رہے گی مگر مولوی عبدالحق بھی بوڑھے نہیں ہیں وہ سدا جوان رہیں گے۔ تنومند ہیں اس بلند درخت کی طرح جسے ہم نے عظیم پایا ہے۔ اور جس کی پھیلی ہوئی شاخوں کے سایہ میں ایک پودا بڑھ کر درخت بن چکا ہے مولوی صاحب نے بھی اردو کے گرد اپنے جوان بازو پھیلائے ہیں۔ آندھیاں چلی ہیں اور آئندہ بھی چلتی رہیں گی، لیکن یہ پودا تھوڑی دیر کے لئے جھک کر پھر بلند ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ بلند نظر آئے گا۔ (انشاءاللہ)

آپ نے اردو کی حمایت میں اردو کے تحفظ و بقا کے لئے بچے بچے کے دل میں ایک ولولہ تازہ پیدا کر دیا ہے انجمن ترقی اردو کے علاوہ دوسرے علمی و ادبی ادارے بھی آپ کی ذات گرانمایہ سے فیضیاب ہو رہے ہیں اردو کالج جو اس لحاظ سے اس ملک کا ممتاز ترین تعلیمی

ادارہ ہے کہ اس میں ڈگری کے درجوں تک جملہ علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم اردو ہے، آپ کی مخلصانہ کوششوں سے وجود میں آسکا۔

۱۹۲۱ء سے رسالہ اردو آپ کی ادارت میں نکل رہا ہے اور اردو ادب کو مالا مال کر رہا ہے آپ ہی نے لوگوں کو اس حقیقت سے آشنا کیا کہ قومی کردار کا مادری زبان سے کیا ربط ہے اور اس ربط کے کیا فوائد ہیں وہ ایک خطبے میں فرماتے ہیں کہ:۔

"قومیت کے لئے یک رنگی، یک رنگی کے لئے ہم خیالی اور ہم خیالی کے لئے ہم لسانی کی ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے یہ اردو ہے جس نے بدرجۂ کمال یہ خدمت انجام دی ہے اور یہ اس کی کرامت ہے۔

اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے ایک دوسری جگہ اردو کی فضیلت و برتری کی تاریخی اور تہذیبی روایت کی مدد سے اس طرح ثابت کیا ہے کہ

"جہاں جہاں اور جس درجہ تک اردو مروج ہے وہاں مسلمانوں میں اسی حد اور اسی درجہ تک شائستگی روشن خیالی اور قومی شعور پایا جاتا ہے اور جہاں اردو کا رواج کم ہے یا نہیں ہے وہاں اسی حد تک اور درجہ تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی جذبہ مفقود یہ زبان ہماری قوم کا آلۂ کار و آلۂ ترقی پیما ہے۔ تھرمامیٹر کی طرح اسے لگا کر آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سلا تہذیب و ترقی میں کس درجہ پر ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے زبان و قوم کے ہر پہلو پر غور و فکر کی دعوت دی ہے آپ ہر مسئلہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اہم سے اہم مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرنے کی کتنی بے پایاں قدرت رکھتے ہیں۔

آسان اور مشکل اسلوب بیان کا جھگڑا میر امن اور سرور کے زمانہ سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے لیکن یہ تو سب جانتے ہیں کہ سادہ اسلوب میں جو اثر آفرینی، دلکشی اور حسن ہمہ گیری ہے وہ مشکل اسلوب میں نہیں مولوی صاحب نے سادہ اور مشکل نثر کو بڑی خوبی سے اجاگر کر دیا ہے مضامین اور تقاریر کے ذریعہ سے انھوں نے اپنے دل کی بات کا اظہار کیا ہے ان کو ایک ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کے قلب کی گہرائی کے رنگ میں ڈوب کر نکلا ہو۔ مولوی صاحب کے پاس ہمیشہ بزرگانہ نصیحت ہی نہیں بلکہ ہمدردوں میں وہ ایسے لطیف پیرایہ میں لیسے جملے کہہ جاتے ہیں جو بھرپور طنز کے حامل بھی ہوتے ہیں اور مزاح سے متصل بھی۔

اردو زبان و ادب میں مولوی صاحب ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں جس سادہ اور دلکش نثر نگاری کا آغاز میر امن نے کیا تھا اور جسے غالب نے شوخ و پر لطف بنایا تھا اور جسے سرسید اور حالی نے وسعت عطا کی تھی مولوی عبدالحق نے اپنی تصانیف میں

اس کی تکمیل میں ایک شان پیدا کردی ہے۔

اگران کی شخصیت کو "چند ہمعصر" کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان دوستی کے جذبہ کو انھوں نے زیادہ اہمیت دی ہے اسکے بعد محنت اور خلوص کا مقام ہے کیونکہ حقیقی بڑائی محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرنے میں مضمر ہے اور اسی بڑائی میں پائیداری ہے۔ یہ انسان دوستی کا جذبہ ہی تھا جس کے تحت عبدالحق نے نام دیو مالی، اور نور خاں جیسے خاکے اردو ادب میں پیش کئے کیونکہ دولت مندوں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں۔

"پھول میں اگر آن ہے، کانٹوں میں بھی ایک شان ہے۔"

مولوی عبدالحق صاحب، صاحب طرز انشا پرداز ہیں اور لسانیات کے ماہر بھی، اردو زبان کے محقق بھی، مختلف علمی اداروں کے بانی بھی، اشاعت اردو کی مہم کے رہنما و قائد بھی، لغت نویس بھی اور مقدمہ نگار بھی ہیں گویا آپ کی ذات ایک ادارہ ہے انھیں اگر اردو ادب کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہی مولوی صاحب کے وہ اوصاف حمیدہ ہیں جو ادبی دنیا میں ایک اہم و خاص مقام کے ضامن ہیں۔

اردو زبان ترقی کی اس منزل سے ہمکنار ہوجائے جو مولوی صاحب کا منتہائے نظر اور ہمارا نصب العین ہے۔

جان عبدالحق سلامت عمر عبدالحق زیاد\
باغ اردو میں ہوں خنداں اور گلہائے مراد\
ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین باد،

بقیہ:۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق

اور یہ سب کچھ مولوی صاحب کی ہمت اور کارکردگی کا میٹھا پھل ہے اور اردو سے عشق کی بیّن دلیل! انھوں نے خود بھی ایک موقع پر کہا تھا "ایمان کے بعد جو چیز مجھے سب سے عزیز ہے وہ اردو ہے"۔ اور مولوی صاحب آج بھی اس "ایمانِ ثانی" کی پرورش کر رہے ہیں۔

قلم اس عظیم انسان پر بہت کچھ لکھنا چاہتا ہے۔ مگر "تنگیٔ داماں" مانع ہے۔ اس لئے انہی "چند کلیوں پر قناعت" کرتا ہوں۔ اور ارباب علم و ادب کی خدمت میں بڑے ادب سے پیش کرتا ہوں۔ جتنی بساط تھی اُس قدر حاضرِ خدمت ہے۔ مرزا غالبؔ شاید مولوی صاحب کے متعلق ہی کہہ گئے ہیں۔ ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ظفر نیازی

اُردو جو مٹ نہ سکی

اگر میں آپ سے یہ عرض کروں کہ آج کل انگلستان میں انگریزی زبان کو قومی اور سرکاری زبان قرار دیئے جانے کا مطالبہ زوروں پر ہے تو شاید آپ اسے مجذوب کی بڑ قرار دے دیں، اس لئے میں ایسی بات کہتا ہی نہیں۔ لیکن اگر میں آپ کو یہ اطلاع دوں کہ عرب جمہوریہ کے عوام یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کی درس گاہوں میں ذریعہ تعلیم عربی زبان ہو، تب بھی غالباً آپ حیرت سے میرا منہ تکنے لگیں گے۔ اس لئے کہ عرب ملک میں عربی زبان ذریعۂ تعلیم نہ ہوگی، تو کیا جاپانی اور چینی زبان ہوگی؟

ٹھیک اسی طرح اگر میں آپ تک یہ خبر پہونچاؤں کہ ہندوستان کی درس گاہوں میں ذریعۂ تعلیم عربی کو قرار دیا گیا ہے، یا افغانستان نے اس مقصد کے لئے سنسکرت کو اپنایا ہے، تب بھی آپ میرے متعلق جو رائے قائم کریں گے، وہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی خود دار اور غیرت مند قوم کسی کی نقالی کر کے اپنے مستقبل میں آگ نہیں لگا سکتی۔

اور جب میں آپ سے یہ عرض کروں کہ حضور! ایسا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہو رہا ہے، اور تاریخ کی اس کمی کو خود آپ پورا کر رہے ہیں۔ اگر دنیا کی کسی قوم کو اپنی قومی زبان کے لئے "مطالبہ" کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تو نہ سہی، آپ کو تو یہ دلچسپ فرض ادا کرنا پڑا۔ آپ تو انکار نہیں کر سکتے کہ آپ اپنے ملک کی زبان کو، اپنی قومی زبان کو اس کا "درجہ" دلانے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔ آپ اس حقیقت کو کیسے جھٹلا سکیں گے کہ آپ کے کالجوں میں آپ کی یونی ورسٹیو

ہیں ایک ایسی غیر ملکی زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے، جسے ملک کے ۲ فی صدی آدمی بھی نہیں سمجھ سکتے۔

تاریخ میں غالباً اسی عجوبہ کی کمی تھی کہ کوئی قوم اپنے ہی ملک میں اپنی قومی زبان کو اس کا درجہ دِلانے کی کوشش کرے اور ہزار قربانیوں کے باوجود، اسے منزل کا کوئی ابتدائی نشان بھی نظر نہ آئے۔

مولوی عبدالحق، جن کی رہنمائی میں آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اس جدوجہد نے شدّت اختیار کی، اپنی پوری زندگی صرف اس حقیقت کے منوانے میں بتا بیٹھے کہ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ لیکن خدارا سچ بتائیے کہ کیا ہم نے اس سیدھی سادی حقیقت کو تسلیم کیا؟

میں غیر منقسم ہندوستان کے زمانے کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اس دور کی بابت دریافت کرتا ہوں جسے آپ اپنا دور اور آزادی کا دور کہتے ہیں۔ اب تو آپ کو با اختیار ہوئے بھی بارہ سال سے زیادہ بیت گئے۔ اب تو آپ کے راستے میں کوئی رکاوٹ اور مزاحمت بھی نہیں ہے۔ لیکن آج بھی آپ زبان کے معاملے میں دوسروں کے محتاج بنے بیٹھے ہیں، اور یہ اقرار کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ آپ کی اپنی قومی زبان کون سی ہے۔؟

میں تو کہتا ہوں خدا بھلا کرے بابائے اُردو، کا جن کی مسلسل چیخ پکار نے ہمارے، آپ کے ذہنوں سے اُردو کو مِٹنے نہیں دیا، ورنہ آپ ہی بتائیے ہم میں سے بعض نے اس کو ملیامیٹ کرنے میں کونسی کسر باقی چھوڑی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ جس خطّے نے ایک زمانے میں اُردو کو پالا پوسا، بنایا، سنوارا، اور اسے مقبولِ عام بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اُسی سرزمین کی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر صاحب آج فرما رہے ہیں کہ میں ڈگری کالجوں میں اُردو کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے داخل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔

اِسے نہ بھولئے کہ یہ کسی غیر ملکی کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ یہ اس شخص کا بیان ہے جو اُردو میں پیدا ہوا، اُردو میں پلا بڑھا، اور اُردو ہی نے اس کو آج اِس منصب پر پہونچایا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ بی۔ اے کے نصاب میں اُردو کو شامل کر لو تو اس نے ٹکا سا جواب ہی نہیں دیا، بلکہ ایک طعنہ بھی دے مارا کہ اگر حامیانِ اُردو کو اُردو سے اتنا ہی لگاؤ ہے تو وہ اپنی اُردو یونی ورسٹی علیحدہ قائم کرلیں۔

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے میرا منشا یہ نہیں کہ وائس چانسلر نے نادانستہ طور پر خود اپنے آپ کو گالی دی یا اپنے اوپر خود ہی طنز کیا، بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ اس شرم ناک حادثے کی روشنی میں آپ خود اپنا تجزیہ کریں اور سوچیں کہ وائس چانسلر کے جواب میں کہیں آپ کی بے حسی کو تو کوئی دخل نہیں۔ آخر وہ کیا راز ہے کہ جس مطالبہ کو آج سے نہیں بلکہ بارہ سال سے عوام کی مکمل حمایت حاصل ہے اور جو قیامِ پاکستان سے پہلے ہی کا طے شدہ اور منظور شدہ ہے آج تک میدانِ عمل میں کیوں نہیں پہونچا۔

بہر حال اگر حقیقت کا اعتراف کوئی جرم نہیں تو ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ جو کام ہم نے بابائے اُردو، کو سونپا تھا وہ

صرف اس لئے ادھورا پڑا ہے کہ خود ہم نے ہی ان کے راستے میں کانٹے بچھا دیئے اور جب بھی وہ منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں ہم بڑی ڈھٹائی کے ساتھ راستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔ ورنہ آپ خود ہی سوچئے کہ جس مقصد کے لئے ہر شخص بے چین ہو، ہر طرف سے ظاہری تائید بھی حاصل ہو اور اگر ضرورت پڑے تو ہر شخص قربانیوں کے لئے بھی آمادگی ظاہر کرے اور پھر بھی اس جدوجہد کا روز اوّل ہی نظر آئے! آخر کیوں؟ کیا دنیا میں کہیں بھی ایسا ہوا ہے۔ کیا اس بھری کائنات میں کوئی ایسا ملک ہے جس کے عوام نے متفقہ طور پر کچھ چاہا ہو اور وہاں کی حکومت بھی اس عام خواہش میں برابر کی شریک نظر آئے اور پھر بھی وہ مقصد حاصل نہ ہو؟

مثال کے طور پر مغربی پاکستان میں ساڑھے تین کروڑ افراد بستے ہیں ان میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہیں، جو اُردو کو اپنی زبان، اپنے ملک کی زبان، اپنی قوم اور اپنی حکومت کی زبان نہ سمجھتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود پنجاب یونی ورسٹی کے افسر صاحب نے بَرملا کہہ دیا کہ اُردو میں اتنی جان نہیں کہ اسے لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔

"اعلیٰ حضرت" کا یہ جواب سن کر اگر عام پاکستانیوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئیں تو ان آنسوؤں کو رنج و غم کی علامت نہیں بلکہ اعترافِ بے حسی کی نشانی سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ جواب دینے والے کو تو پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ جن ساڑھے تین کروڑ افراد کی آرزوؤں پر خاک ڈال رہا ہے وہ بڑے متحمل مزاج، بڑے رحم دِل اور درجہ اوّل کے درگزر کرنے والے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں کئی جگہ اُردو پرستوں کی بے حسی کا ذکر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی مجھ جیسے نازک مزاج پر یہ بات گراں گزرے۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ 'بابائے اُردو' کی طرف سے اُردو یونی ورسٹی کے فنڈ کی اپیل پر ایک محفل سے دو سو ستّر روپے جمع ہوئے تو شاید میری طرح وہ بھی شرما جائے۔ ایک مکمل یونی ورسٹی اور دو سو ستّر روپے!! کیا یہ منظر دیکھ کر اپنا سر پیٹ لینے کو جی نہیں چاہتا، جبکہ ہم میں ایسے بھی خدا کے فضل سے بہت سے لوگ موجود ہیں جو صرف اپنی جیب سے پوری یونی ورسٹی کو جنم ہی نہیں دے سکتے، بلکہ اُسے ساری زندگی چلا بھی سکتے ہیں۔

بہر حال آج جس موقع پر "برگِ گل" اپنا بابائے اُردو نمبر شائع کر رہا ہے، ضرورت اس بات کی تھی اور توقع بھی کسی وقت یہ قائم کی گئی تھی کہ ایک جلسۂ عام ہوتا۔ 'بابائے اُردو' وہاں آتے اور قوم سے کہتے کہ :۔

> " آپ نے جو خدمت میرے سپرد کی تھی خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ میں نے اسے بہ حُسن و خوبی انجام دے دیا۔ اب یہ آپ کی تمام درس گاہوں میں تعلیم کا ذریعہ بن چکی ہے۔ آپ کی قومی و سرکاری زبان تسلیم کی جا چکی ہے۔ اب اس کے دامن کو مختلف علوم و فنون

([illegible])

قیصر نظامی

ایک صاحبِ طرز نثّار

جب کسی انشاپرداز کے طرزِ تحریر میں کچھ ایسی خصوصیت ہوں جو اس سے ماقبل، مابعد اور معاصر اہلِ قلم میں نہ پائی جاتی ہوں اور جن کی بنا پر اس کا کوئی مضمون دوسرے اربابِ قلم کے ہم معنے مضامین میں گڈمڈ کر دینے کے بعد بھی مبصّرین کی نظر میں ایک امتیازی نشان رکھتا ہو تو کہا جائے گا کہ وہ صاحبِ طرز ہے۔

اس حیثیت سے علمی اور صحیح ادبی اردو کے نثر نگاروں میں
میرامّن، مرزا غالب، سرسیّد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد
اور مولانا حالی کے بعد اگر ہم کسی شخص کو صاحبِ طرز کہہ سکتے ہیں
تو وہ صرف بابائے اردو عبدالحق ہیں۔

میرامّن نے تشبیہوں استعاروں طرح طرح کے لفظی و معنوی صنعتوں کی بھرمار، لفاظی، تکلف و عبارت آرائی کے بجائے سادہ دلنشین اور بے ساختہ طرزِ بیان اختیار کیا، اس لئے وہ پہلے صاحبِ طرز نثار ہیں۔

مرزا غالب نے اپنی نثر میں بڑی جدّت طرازیوں سے کام لیا۔ ہر بات ایک انوکھے انداز سے بیان کی، گو ان کی نثر مرسلات کی حد تک محدود ہے تاہم ان مراسلات میں بھی مختلف خیالات، جدّت تنوّعات کے ساتھ نمایاں ہیں۔ اور شوخی و ظرافت کے ساتھ ایک سیدھی سادی بات کو ذرا سا پیچ دے کر لکھنا ان کی وہ خصوصیت ہے جس نے ان کی روشن نثر نگاری کو نمام

اہلِ قلم میں ممتاز کر دیا اور ان کا اسلوب ایک اسلوب نیا نشان پایا۔ ایسا اسلوب کہ آج تک کوئی صاحبِ قلم ان کے نمونہ پر ایک خط بھی کا

سر سید نے ان علمی مضامین اور مذہبی مسائل کو جنھیں لوگ الجھی ہوئی ترکیبوں اور بعید الفہم اسلوبوں کے ساتھ اردو میں لکھا کرتے تھے انتہائی سلاست و فصاحت اور کمال روانی اور بے حد سادگی کے ساتھ کچھ اس طرح تحریر کر کے دکھایا کہ ان کا اسلوبِ خاص ہو کر دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بن گیا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ایک اور ہی ڈھنگ نکالا۔ روانی اور سلاستِ زبان کے ساتھ عربی، فارسی، بلکہ انگریزی کے مغلق و اجنبی الفاظ کا اجتماع اور ظرافت کے چٹخارے سے ان الفاظ کی اجنبیت کو نہ صرف رفع کر دینا بلکہ عبارت کو پر لطف بنا کر متانت و بلاغت کے ساتھ مفہوم کو ذہن نشین کر دینا ــــــ اور یہی ان کا طرز مخصوص ہے۔

محمد حسین آزاد دہلوی نے بظاہر نہایت آسان اور عام فہم عبارت لکھی، مگر دلآویز محاوروں، موزوں استعاروں اور دل چسپ تشبیہوں کی مرصع کاری کر کے ایک ایسا دل کش اندازِ بیان ایجاد کیا کہ ان کی نثر نظم کا لطف دے گئی۔ نثرِ غالب کی طرح آزاد کی اس شاعرانہ انشا پردازی کی تقلید بھی آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔

مولانا حالی ادنیٰ سے لے کر اہم معاملات تک کو حشو و زوائد سے پاک موزوں و مناسب الفاظ میں انتہائی سادگی، صفائی اور سلاست کے ساتھ ایک متین و باوقار یک رنگ انداز میں اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ ان کی عبارت کے ایک لفظ کو تبدیل کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور یہی موصوف کا اسلوب ہے۔

مولوی عبد الحق ان چھ صاحبانِ طرز میں سے دو حضرات سر سید و مولانا حالی سے بے حد متاثر ہیں اور ان سے اعتقاد کے علاوہ ان کی صحبت بھی کافی رہی ہے۔

> انھوں نے ان دونوں صاحبان کے اسلوب کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ایک اسلوب وضع کیا ہے جس میں ان کی حیثیت انفرادی ہے۔ ان کے یہاں انتہائی سادگی، بے تکلفی، برجستگی، فصاحت، سلاست، بلاغت، زور اور روانی ہے۔ جس کی بنا پر ان کی عبارت دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ تلمیحات، تشبیہات و استعارات بھی ہیں مگر سبک اور سریع الفہم، جدید الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور محاورات و ضرب الامثال بھی لیکن وہ عبارت میں اس طرح ہوتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگ جڑا ہوا ہو۔ مولانا موقع پر ایسا بے تکلف اور چپا تلا لفظ لکھ جاتے ہیں کہ دوسروں کی نظر بھی وہاں تک نہ پہنچ سکے اور یہ چیزیں بحیثیت مجموعی ان کی تحریر کو جادو بنا دیتی ہیں۔

میں یہاں مولانا کے طرزِ خاص کی جلوہ ریزیوں کا ایک مختصر سا البم پیش کرتا ہوں کہ لوگ اسے دیکھ کر صحیح رائے قائم کر

(۱)

خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ہند

ترقی کا راستہ بہت دشوار گذار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر اور استقلال اور بہت پِتّا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی، سرزمین آزادی ہی میں پھل پھول سکتی ہے ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہئے کہ جو چاہے لکھے۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے، "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی تباحتیں آ جاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ ادب قابلِ مبارک باد ہے۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی"

(خطباتِ عبدالحق)

(۲)

خطبۂ صدارت کُل گجرات اردو کانفرنس احمد آباد

مصیبت بعض وقت رحمت ثابت ہوتی ہے۔ دنیا میں اکثر بڑے کام مصیبت کے وقت انجام پاتے ہیں۔ یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اٹی ہوئی سوتیں کھل جاتی ہیں۔ بجھے ہوے دلوں میں ایک تازہ توانائی اور دماغوں میں ایک نئی جلد پیدا ہو جاتی ہے اور نفاق مٹ جاتے ہیں اور ان کی جگہ یک جہتی اور اتحاد کی برکت آ جاتی ہے۔ جو کام پہلے ان ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔"

(۳)

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا ہے۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا" (نام دیو مالی)

(۲) وہ شخص ہم میں ایسا تھا جیسا بونوں میں دیو" (سید محمود)

(۳) "میں سید محمود کو 'ایک شان دار انسانی کھنڈر' کہا کرتا تھا"
(سید محمود)

(۴)

(۱) "وہ کچھ ایسے مسرت آمیز طریقے سے کہتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے (محسن الملک)

(۲) "خان صاحب بیٹھے گھاس کھود رہے تھے"
(گدڑی کا لال۔ نور خاں)

(۵)

(۱) ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ پڑا اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دیدی" (نام دیو مالی)

(۲) اعلان میں اسے یو، پی کی جنتا یعنی عام لوگوں کی زبان بتایا گیا ہے میں یو، پی کے ہندو مسلمان دونوں کو چنوتی (چیلنج) دیتا ہوں کہ وہ بتائیں کہ یو، پی کے کس علاقے، کس شہر، یا کس قصبے یا گانو میں بولی جاتی ہے"
(خطبۂ صدارت کل گجرات اردو کانفرنس)

(۶)

(۱) بڑے سادہ طبیعت کے آدمی تھے مصلحت، سلیقے اور صفائی کا داغ ان کے دامن پر نہ تھا"
(وحید الدین سلیم پانی پتی)

(۲) نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو

(۷)

" مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا منشا کیا تھا اور ان کا خیال کن مصالح پر مبنی تھا۔ لیکن یہ بلا آئی انھیں دنوں اور انھیں کی بدولت ۔ مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملہ میں سرسید کے سب سے بڑے اور اوّل معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے"

(محسن الملک)

اردو کے موجودہ اور آئندہ علمی، ادبی و فنی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مولوی عبدالحق کے طرز پر بہتر اور کوئی طرز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اہل علم کو ان کی پیروی کرنا چاہیئے۔ گو یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

بقیہ: اُردو جو مِٹ نہ سکی

سے مالا مال کرنا آپ کا کام ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ اپنی ضعیفی کے آخری ایّام میں کچھ تو آرام کرلوں"

لیکن اس کی بجائے نوّے برس کے اس بوڑھے قائد کے ہاتھ میں آج بھی کاسۂ گدائی ہے اور وہ اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے تجھ سے مجھ سے بھیک مانگتا پھر رہا ہے۔

اور ــــ ــــــ ہم اپنے گھروں میں پڑے سو رہے ہیں۔

غزل اور مطالعہ غزل

اس کتاب کو بڑی محنت اور جانفشانی سے ڈاکٹر عبادت یار خاں بریلوی، پروفیسر اُردو، پنجاب یونیورسٹی نے تالیف کیا ہے صفحات ۴۶۶، کتابت و طباعت اعلیٰ رنگین گرد پوش، قیمت مجلد دس روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ اردو روڈ۔ کراچی

نیرنگ نیازی

اک شمع رہ گئی ہے

اُردو زبان و ادب کئی عبوری ادوار سے گزرے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد تمیس سال کی مختصر سی مدت میں ہندوستان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ نے کئی پلٹے کھائے ہیں اور ادبی محفلیں سلطنتِ مغلیہ کی تباہی و بربادی کے بعد اجڑ گئیں اور بہت سے باکمال فن کار اور شعرائے دلی چھوڑ کر اودھ چلے گئے۔ اس پر نادر شاہی حملہ نے دلی کی رہی سہی عظمت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ نااہلوں کو فروغ حاصل ہوا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو چکا بسیاسی انتشار کے اس دور میں انسانی زندگی کچھ ایسی ارزاں ہو گئی جس کی تفصیل ضبطِ تحریر سے باہر ہے۔ شرفاء اور اہلِ علم و فن کی قدر دانی مفقود تھی۔ ان کی جگہ اربابِ نشاط نے لے لی تھی۔ لوگوں کے اخلاق تباہ ہو چکے تھے۔ محبت و خلوص کا کہیں پتہ نہ تھا خود غرضی اور سازش کا دور دورہ تھا عوام کو ذہنی سکون میسر نہ تھا۔

ان حالات کا ردِعمل عوام پر کچھ ایسا گہرا ہوا کہ ان کے احساسات میں شدت اور تلخی پیدا ہوئی اور ان کی زندگی کا رخ بدل کر رہ گیا۔ تہذیب و معاشرت کے تقاضے بھی بدل گئے اور شعر و ادب جو زندگی کی ہر کروٹ سے وابستہ ہے۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس سلسلہ میں شاہ حاتم۔ میر۔ نظیر اکبر آبادی مصحفی اور سودا جیسے فن کار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فنکاروں میں سے اکثر نے ایسے دلگداز شہر آشوب لکھے جن میں سے بعض تاریخی اعتبار سے اس زمانہ کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ اس سرزمین پر انگریزوں کے قدم جم چکے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سکہ چل رہا تھا۔ انگریز اس

حقیقت سے باخبر تھے کہ ملک کی کایا پلٹ میں فنکار یا شاعر کا حصہ کس قدر حیرت انگیز ہوتا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی میدانِ جنگ میں بظاہر شکست و ریخت کا انجام، سامان، سپاہی اور اسلحہ جات سے وابستہ ہوتا ہے لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ زوال کی اولین بنیاد وہ مصنفین اور شعراء رکھتے ہیں جن کی تحریر و تقریر فریقِ محارب کے خلاف یا موافق برسرِ کار رہ چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں قائم ہوا۔ جہاں ملک کے گوشہ گوشہ سے باکمال فن کار اور شعراء جمع ہوئے۔

تاریخ اردو ادب میں "فورٹ ولیم کالج" سے ہی شعوری ادب کی تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اگرچہ اس تحریک کے پس منظر میں سیاسی مقاصد کار فرما تھے۔ مگر اس کالج میں جو باکمال فنکار اور شعراء جمع ہوئے ان کی انفرادی کوششوں نے اردو ادب میں ایسے جواہر پاروں کا اضافہ کیا جو ہمیشہ اپنی تابندگی سے دنیا کو جگمگاتے رہیں گے۔

اس ادبی محفل میں جو ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے سجائی۔ میر امن۔ میر شیر علی افسوس۔ میر بہادر علی حسینی۔ سید حیدر بخش حیدری۔ مرزا کاظم علی جواں۔ نہال چند لاہوری۔ مظہر علی خاں۔ للو لال جی۔ بینی نرائن۔ مرزا علی لطف۔ مولوی امانت اللہ۔ مرزا جان طپش جیسے فنکار اور شعراء جانِ محفل تھے۔ اور جن کی کوششوں نے اردو میں شعوری ادب کا بیش بہا خزانہ تھا

ہمارے باکمال فنکاروں نے ابھی چین کی سانس بھی نہ لی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے غدر کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آنِ واحد میں ملک کے گوشہ گوشہ میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور تمام ملک تباہی و بربادی کی نذر ہو جاتا ہے۔

غدر کی یہ تباہی و بربادی اپنا رنگ لاکے رہی اور ہمارے یہ باکمال فن کار اور شعراء ایسے منتشر ہوئے کہ انہیں صحیح سرپرستی حاصل نہ ہو سکی۔ لکھنؤ۔ رامپور۔ حیدرآباد اور دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی اس قابل نہ رہیں کہ دوبارہ اپنی روایات کو قائم رکھ سکیں اور وہ ادبی محفلیں جو کبھی ریاستوں کی بدولت گرم رہا کرتی تھیں اب یکسر خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ انقلاب صرف واقعات اور حالات ہی کا انقلاب نہ تھا۔ بلکہ اس نے ہمارے فنکاروں اور شاعروں کے افکار و خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔

اس تباہی و بربادی کی وجہ سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بے اطمینانی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے دور میں عوام میں اعتماد کا جذبہ بیدار کرنا اور ان کے دلوں سے کھوئی ہوئی آن بان کے صدموں کو دور کرنا اور ایک نیا لائحۂ عمل تعمیری ان کے سامنے پیش کرنا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

سرسید احمد پہلی شخصیت تھی جنہوں نے حالات کا صحیح جائزہ لیا اور نئے عزائم کے ساتھ مسلمانوں کو اس پستی سے بلندی تک پہنچانے کی انتہائی جد و جہد کی۔ انہوں نے ایک نئی محفل سجائی۔ سرسید احمد کی اس نئی محفل سے ہمارے شعوری ادب کی دوسری تحریک کا آغاز ہوتا ہے جس میں آزاد۔ شبلی۔ حالی۔ نذیر احمد۔ وقار الملک۔ محسن الملک اور وحید الدین سلیم جیسی شمعیں روشن تھیں۔ اس شعوری ادب کی تحریک کا پس منظر قطعی قوم کی تعمیر نہ تھا۔

اس تحریک میں آزاد نے بڑا حصہ لیا اور ۱۸۷۴ء میں ان کی تحریک پر "انجمن پنجاب" نے ایک مشاعرہ منعقد کیا یہ نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ تھا۔ جو مہینہ میں ایک بار انجمن کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ یہ مشاعرے گیارہ مہینے تک جاری رہے بعد کو مصلحتاً یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اس مشاعرہ کے مقاصد مولنا حالی اپنے مجموعۂ نظم کے دیباچہ میں بتلاتے ہیں کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہو گئی۔ اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے۔ مولنا حالی اور آزاد کی چار مثنویاں یعنی "برکھارت" "نشاطِ امید" "حب الوطنی" اور "مناظرہ رحم و انصاف" انہیں مشاعروں کی یادگار نظمیں ہیں۔

زمانہ اور ماحول کا اقتضا ہی یہ تھا۔ کہ اُردو زبان میں بھی انقلاب رونما ہو۔ جہاں انگریزوں کے اثرات نے ہماری ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا کی۔ وہاں یہ بھی لازمی تھا۔ کہ ہماری زبان پر بھی اسکا اثر کارفرما ہوتا جس کا سب سے زود اثر ذریعہ اس وقت اخبارات ہیں ہندوستان میں سب سے پہلے لوہے کا چھاپہ خانہ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اور انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج نے روشناس کرایا۔ اور ۱۸۲۸ء میں لیتھوگرافی (پتھر کا چھاپہ خانہ) کا رواج ہوا جس کا پہلا مطبع دلی میں قائم ہوا۔

سرسید احمد نے ۱۸۶۲ء میں غازی پور میں اسائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر قسم کی غیر ملکی علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے ۱۸۶۴ء میں جب ان کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا تو سوسائٹی کا دفتر بھی یہیں منتقل ہو گیا۔ یہاں آنے کے بعد بہت سی غیر ملکی زبانوں کی علمی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ اور وہ منظر عام پر آئیں ۱۸۶۲ء میں اخبار بھی نکلنا شروع ہو گیا جو سائینٹیفک سوسائٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ اور جواب علیگڈھ مسلم یونیورسٹی گزٹ" کہلاتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد نے قابل یادگار کام کیا جو تاریخ اور ادب میں ان کے نام کو ہمیشہ تابندہ اور پائندہ رکھے گا۔ یہ کام ماہوار رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت تھی۔ یہ وہ رسالہ ہے جس نے ہندوستان کے خوابیدہ علوم وفنون کو اپنی عیسیٰ نفسی سے بیدار کیا اور جس میں اردو کے عناصر خمسہ کی نشو ونما ہوئی۔ اور ۱۸۷۷ء میں شہرۂ آفاق علمی ادارہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ کی بنیاد ڈالی۔

تہذیب الاخلاق کی تحریروں کی قدامت پرست طبقہ نے ابتدا میں بڑی مخالفت کی اور ایک عرصہ ان کی اس مخالفت کا سلسلہ قائم رہا۔ لیکن بایں ہمہ ان تحریروں کا اثر اس قدامت پرست طبقہ کے تحت الشعوری احساس پر اس قدر چھایا ہوا تھا۔ کہ اس طبقہ کی تحریریں بھی زبان اور اسالیب کے اعتبار سے تہذیب الاخلاق ہی کے مزاج کی حامل تھیں۔

سرسید احمد نے اردو زبان کو رہنمائے حیات بنایا۔ اور ادب سے وہ کام لئے کہ اس میں آفاقی انداز پیدا ہو گیا۔ سرسید نے خود مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ صحافت کو ترقی دی اور اس کے ذریعہ ایک ایسا باخبر حلقہ ملک میں پیدا کیا جو نئی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کا احساس رکھتا تھا۔ بقول اکرام "اگر یہ تہذیبی تحریک نہ ہوتی تو شبلی مولوی شبلی رہتے اور مہدی افادی کے الفاظ میں تاریخ کے معلم اول نہ بنتے۔ آزاد کی کوششوں کو فروغ نہ ہوتا۔ حالی کی معرکتہ الآرا "مسدس حالی" نہ لکھی جاتی۔ مقدمہ شعر و شاعری تصنیف نہ ہوتا۔ نذیر احمد کے تمثیلی قصے واقعیت اور مقصدیت کا آغاز نہ کرتے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے انگریزوں کے قدم اسی سرزمین پر ایسے جمائے کہ مسلمان پھر نہ ابھر سکے۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ سرسید احمدؒ اگرچہ انگریزوں سے تعاون اور موالات کے داعی تھے۔ مگر ان کے دل میں قومیت کی حمیت باقی تھی۔ اس قومیت کی زبان اردو تھی۔ جب باشعور اور تعلیم یافتہ برادرانِ وطن نے اپنی نئی قومیت کی تشکیل میں اردو کو چھوڑ کر جدید ہندی اختیار کی تو سرسید نے علانیہ کہہ دیا کہ اب ہندو مسلمان الگ الگ (دو قومیں) ہو جائیں گے۔ آج جس سرزمین کو ہم پاکستان کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ اسی دو قومی نظریہ کا نتیجہ ہے اور بقول بابائے اردو اس میں شک نہیں کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ جس نے رکھی وہ اردو زبان ہے۔

اردو کی بقا کے لئے سرسید احمد نے جو کچھ کیا وہ ان کی کثیر تصانیف اور بے شمار مضامین و مقالات سے واضح ہوتا ہے۔ ان کی کوششوں سے انگریزی زبان سے اردو میں تراجم کے لئے سائنٹفک سوسائٹی کا وجود عمل میں آیا تھا۔ اور ۱۸۶۷ء میں اپنی سیاسی انجمن (برٹش انڈیا ایسوسی ایشن) کی طرف سے سرسید احمد نے کلکتہ یونیورسٹی کے مقابل میں ایک "جامعہ" کی تشکیل کے لئے انگریز حکام سے درخواست کی۔ اس جامعہ کا مقصد یہ تھا کہ جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم اردو کے ذریعہ ہو۔ اور اس کے سند یافتہ بھی انہیں حقوق و منزلت کے مالک ہوں جو انگریزی یونیورسٹی کے طلبہ کو حاصل ہوں لیکن سرسید کا یہ خواب ان کی اپنی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بقول گارساں دتاسی، ہندو اپنے تعصب کی بنا پر ہر ایسی بات کی مخالفت کرتے رہے جو انہیں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلاتی رہے۔ ان کی سازشیں اردو کو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ نئی صورتیں اختیار کرتی گئیں۔ آخر کار ۱۸۷۳ء میں سرسید احمدؒ نے ایک عظیم الشان اجلاس الہ آباد میں بلایا جہاں اردو کی بقا اور اس کی ترویج کے لئے ایک مرکزی مجلس بنائی اور ناگری کی خواہی نخواہی ترویج کو روکنے کی انتھک کوشش کی اس مہم میں بہت سے ہندو بزرگ بھی سرسید احمدؒ کے شریک کار تھے۔ سرسید احمدؒ کی ان کوششوں سے انگریز حکام اپنے ارادوں سے باز رہے اور جب تک وہ زندہ رہے اردو دشمن عناصر اپنے تخریبی مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

حامیانِ ہندی نے اردو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم کیا اور ایک انجمن کی تشکیل دی۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ رہا کہ اس جماعت کی تشکیل بھی حامیانِ ہندی نے سرسید کی راجدھانی یعنی علیگڈھ ہی میں دی۔ جس کا نام "بھاشا سمردھن سبھا" تھا۔ اور اسی کے ساتھ ایک اور جماعت "بھارت ورشیا نیشنل ایسوسی ایشن" کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ لیکن آج ان جماعتوں کا نام بھی کسی کو یاد نہیں اس لئے کہ ان تحریکوں میں خلوص کی کمی تھی۔ لہٰذا زندہ نہ رہ سکیں۔ سرسید احمد کو اپنی قوم اور اردو زبان سے اس قدر محبت تھی کہ ۱۸۹۸ء میں جب کہ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ایک پر اثر مضمون لکھا جس نے فرقہ پرست ہندوؤں کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ جو انہوں نے ہزاروں کے دستخطوں سے ناگری کی ترویج کے لئے عرضداشت کی صورت میں لاٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس مرد مجاہد کا انتقال اس مضمون کے لکھنے کے نو دن بعد ہوا اور جونہی اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر شخصیت کا انتقال ہوا ناگری رسم الخط عدالتوں میں اردو کے ساتھ لازمی ہو گیا۔

سرسید احمدؒ کی وفات کے بعد محسن الملک نے تقاریر اور مولوی بشیر الدین مدیر "البشیر" نے قلم سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور ایک مجلس تحفظ اردو قائم کی۔ اس جماعت نے ۴ اگست ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ میں ایک شاندار جلسہ منعقد کیا۔ جس میں محسن الملک نے بڑی موثر تقریر کی۔ اس تاریخی اجلاس میں تعلیم یافتہ ہنود اور بعض عیسائیوں نے بھی اردو کی حمایت میں معرکۃ تقریریں کیں۔

مسلمانوں کے سیاسی اقتدار ختم ہوتے ہی ان کے بڑے نام امتیازات کو بھی ختم کرنے کی مسلسل کوششیں جاری رہیں کچھ عرصہ بعد لکھنؤ کی مجلس ختم ہوگئی لیکن علیگڈھ کی فضا اسی طرح اردو کے نغمات سے گونج رہی تھی۔ انہوں نے لکھنؤ کی مجلس ختم ہونے کے کوئی دو سال بعد ایک تعلیمی کانفرنس میں "انجمن ترقی اردو" کے نام سے علمیہ شعبہ ۱۹۰۳ء میں قائم کیا جس کے پہلے صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ اور پہلے سیکرٹری مولینا شبلی نعمانی منتخب ہوئے۔

شبلی نے اپنی کوششوں سے "انجمن ترقی اردو" کو کافی فروغ دیا۔ فرقہ پرست اہلِ ہنود اردو کی مخالفت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی طلسم ضرور باندھ دیتے۔ لہٰذا لکھنؤ کے ایک اخبار ہندوستانی میں "انجمن ترقی اردو" کے خلاف یہ شکایت کی گئی کہ اس میں ہندوؤں کو شریک نہیں کیا جاتا جس کا جواب شبلی نے نہایت مدلل اور دندان شکن دیا۔ کہ انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا۔ اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی "پیغمبران ہند" جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں۔

انجمن ترقی اردو کی مجلسِ انتظامیہ میں حالی جیسی باکمال ہستی نائب صدر تھی۔ اور نذیر احمد اور منشی ذکاء اللہ جیسے اربابِ قلم رکن تھے۔ جن کی قلمی معاونت سے انجمن نے مختصر سے عرصہ میں ارتقاء کی جو منزلیں طے کیں اسے تاریخِ ادبِ اردو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک شیروانی اس انجمن کے سیکرٹری رہے۔ ان کے بعد مولوی عزیز الدین مرزا نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ لیکن عزیز مرزا کے انتقال کے بعد کوئی شخصیت ایسی نظر نہیں آرہی تھی جو اس انجمن کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتی۔ آخرکار صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی نظر مولوی عبدالحق پر پڑی۔ اور انہیں انجمن کا سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ مولینا اس زمانہ میں اورنگ آباد (دکن) میں صدر مہتمم تعلیمات تھے۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو کا دفتر علیگڈھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا۔

سرسید احمدؒ اور ان کے رفقاء کے بعد ہمارے بزرگ ایک ٹھہرے ہوئے اور جامد ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں زندگی اور ادب کی تمام قدروں کا سرچشمہ مروجہ روایات ہی تھیں اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں قدیم طور طریقوں کو ہی فوقیت حاصل تھی۔ اس وقت مولینا نے اردو زبان کی تہذیبی اور لسانی اہمیت کو نمایاں کرنے میں جس علو ہمتی اور استقلال سے کام لیا وہ حقیقتاً وفاداری بشرطِ استواری کی ایسی شاندار مثال ہے جو کہیں نہیں ملے گی۔ مولینا کی یہ کوششیں رائگاں نہیں گئیں ان کی مساعی سے اس قوم میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ زبان کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔ سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ بھی بدل گیا اور معاشرہ کے رکھ رکھاؤ میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی کہ زندگی کے ساتھ ادب نے بھی چولا بدلنا شروع کیا۔ اور اس کی پیشانی پر

نئے تفکر کی لکیریں ابھریں اور تنقیدی شعور بھی پیدا ہُوا۔

مولینا نے انجمن ترقی اردو کو فروغ دینے میں کیا کچھ کیا۔ اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہوگا کہ ۱۹۱۵ء کی سالانہ کیفیت میں مولینا نے اجلاس میں کانفرنس کو یہ لطیفہ سنایا۔ کہ کانفرنس نے اپنی مقررہ رقم دو سال سے ادا نہیں کی۔۔۔۔ خیر اس کا چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر یہ ستم ظریفی قابل ذکر ہے کہ اس سال کے بجٹ میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ گزشتہ سال "انجمن ترقی اردو" کو رقم ادا نہیں کی گئی۔ اور اگر اس سال گنجائش ہوئی تو ادا کی جائے گی۔ غالباً یہ کانفرنس ہی کا بجٹ ہے جس میں اس قسم کی تحریروں کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

مولینا نے اپنی کوششوں سے دو سال کے اندر تقریباً آٹھ ہزار روپے انجمن کے لئے فراہم کرلئے۔ یہ رقم زیادہ تر اورنگ آباد اور اس کے اضلاع سے فراہم کی گئی تھی۔ جب کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کی مالی امداد بند کی تو انجمن بھی اس کی مداخلت سے آزاد ہوگئی۔ ۱۹۱۷ء میں مولینا نے سراکبر حیدری سے تین ہزار روپے سالانہ کی امداد حاصل کی۔

مولینا نے اس دور میں انجمن سے ترقی اردو کے لئے بڑے کام کئے۔ اور ۱۹۲۱ء میں رسالۂ اردو (سہ ماہی) کا اجرا کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان وادب کی مفید اور محققانہ بحثوں سے رسالہ کو مالا مال کیا جائے۔ اور اردو ادب کے شائقین اسے غور اور شوق سے پڑھیں، فائدہ اٹھائیں۔ اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو۔ لہٰذا انہوں نے بھی اپنے گرد سر سید احمد کی طرح مصنفین کا حلقہ پیدا کیا اور اس کے ذریعے ایسے ادبی جواہر پاروں کو دریافت کیا۔ جو اب تک زمانہ کی کوتاہیوں سے پردۂ خفا میں پڑے ہوئے تھے۔

قدیم دکنی مخطوطات کا سراغ لگایا۔ اور ان کو زبان کی صحت کے ساتھ ارباب ذوق نے پیش کیا۔ نصرتی۔ ملا وجہی اور قلی محمد شاہ جیسے کو اب نہ جانے کب تک گمنامی پڑے رہتے۔ اگر مولینا اس طرف التفات نہ فرماتے۔ اسی طرح شعرائے اردو کے تذکروں کی چھان بین کی۔ اور ان کی اشاعت میں پیش پیش رہے۔ نایاب ذخیروں کو دریافت کیا۔ مثلاً میر تقی میر کی خود نوشت سوانح "ذکرِ میر" گردیزی۔ ابراہیم شفیق، مصحفی میر حسن۔ مرزا علی لطف وغیرہم کے تذکروں کو بھی طاقِ نسیاں سے اتار کر ناقدانہ تصحیح کے ساتھ ارباب نظر تک ان کے ذوق کی تسکین کے لئے پہونچایا۔

جس طرح سرسید احمد نے اردو دشمن عناصر کو کچلنے کے لئے ان کی ہر نئی سازش کو ناکام بنایا۔ اسی طرح مولینا عبدالحق نے بھی حامیان ہندی کی ہر نئی سازش کو قدم قدم پر بے نقاب کیا اور اردو کی ترویج واشاعت کو فروغ دینے میں خود کو فنا فی الاردو کردیا۔

مولینا کے غیر معمولی عزائم اور بے پناہ استقلال کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اردو کی بقا کے لئے بڑے سے بڑے مصائب اور نازک سے نازک ترین حالات کا مقابلہ کرنے سے کبھی فرار اختیار نہیں کیا۔ جب دلی میں فساد زوروں پر تھا۔ اور کوچہ وبازار میں مسلمانوں کے لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اس وقت مولینا حیدرآباد (دکن) میں تھے۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب سر مرزا اسماعیل نے اردو ہندی قضیئے کی بنا پر انجمن ترقی اردو کی امداد بند کردی تھی اور مولینا اس کے اجراء کے لیئے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر بھوپال کے اسٹیشن پر شعیب قریشی ان سے آ کر ملے۔ انہوں نے مولینا کو دلی جانے سے روکا کہ دہاں قیامت کا ہنگامہ برپا ہے۔ اور حالات اس قدر مخدوش ہوچکے ہیں کہ کوئی مسلمان زندہ بچ نہیں سکتا۔ جب مولینا زیادہ مصر ہوئے تو شعیب صاحب نے ان سے فرمایا کہ اگر وہ اپنے اس ارادہ سے باز نہ آئے تو وہ نواب صاحب سے کہہ کر وارنٹ جاری کرائیں گے۔ اور انہیں گرفتار کرالیں گے۔ مولینا فرماتے ہیں کہ میں شعیب قریشی کو کبھی معاف نہیں کروں گا کہ انہوں نے مجھے روک دیا۔ اگر میں مرگیا ہوتا تو مجھ جیسا گنہگار شہادت کا درجہ تو نہ پاسکتا تھا لیکن وہ ذلت اور رسوائی نہ ہوتی۔ جو یہاں آکر ہوئی۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری نے صحیح فرمایا کہ اردو بولنے والی قوم اپنے محسنوں کے عیب دیکھتی ہے ہنر اس کو نظر نہیں آتے ہیں۔ اور نظر آتے ہیں تو صاحب ہنر کے گزر جانے کے بعد۔

مولینا اردو کے محسن اعظم ہیں۔ سر سید احمدؒ کے زمانہ سے آج تک وہ مسلسل اسی انہاک کے ساتھ اُردو کو فروغ دینے اور اسے معراج تک پہنچانے کی دھن میں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی ہر تحریک انہیں کی کاوشوں کی وجہ سے برعظیم میں ایسے زمانہ میں کامیاب ہوئی جبکہ اغیار اس زبان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے میں کوشاں تھے۔

"جامعہ عثمانیہ" کی تاسیس اور اس کے ذریعہ اردو کے دامن کو جدید علوم و فنون سے مالا مال کرنے اور اس زبان کو دنیا کی بڑی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کا سہرا دراصل مولینا ہی کے سر یہ ہے۔

مہاتما گاندھی جی جو صُلح کل کے علمبردار اور عدم تشدد کے سب سے بڑے مبلغ سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اردو کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی۔ ان کی اردو دشمنی کا اس خط سے صاف پتہ چلتا ہے۔ جو انہوں نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں دلی کی اردو کانفرنس کو بھیجا تھا۔ اس خط میں مہاتما جی نے اردو کو مسلمانوں اور ہندی کو ہندووں کی زبان گردانا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری زبان (۱۶ جنوری ۴۰ء) میں مہاتما جی کی اس تنگ نظری پر تاسف کا اظہار کیا گیا۔ گاندھی جی کے ان خیالات کے مقابلے میں سر تیج بہادر سپرو، مہاراجہ کشن پرشاد اور راجہ نریندر ناتھ گر جیسی معتبر ہندو شخصیتوں کے اقوال پیش کئے گئے جس کی تائید دیگر چند اخبارات نے بھی کی۔ اور مہاتما جی کے اس اقدام پر ادران کے اس غلط پرچار پر تنقیدیں بھی کیں۔

حامیانِ ہندی نے ریاستوں میں بھی اردو کے وقار کو مجروح کرنے میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مولینا عبدالحق نے "جائزہ زبان اردو" (حصہ اول) میں لکھا ہے۔ کہ ۱۹۱۳ء میں مہاراجہ بیکانیر کی سالگرہ کے موقعہ پر پنڈت مدن موہن مالویہ نے کھلے دربار میں درخواست کی تھی کہ "میں بہ حیثیت برہمن بھیک مانگتا ہوں۔ میری دکشنا یہ ہے کہ اُردو کو ہندی میں تبدیل کردیا جائے"

پنڈت مدن موہن مالویہ ریاست الور کے راجہ جے سنگھ سے بھی ۱۹۱۰ء میں ریاست میں ہندی جاری کرانے میں نہ جانے

کس منتر کے ذریعہ کامیاب ہوئے حالانکہ ریاست الور چند مسلمان رفیقوں کی دوستی اور مدد سے وجود میں آئی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد تک انہیں کی تہذیب و تمدن کے زیر اثر رہی۔

ریاست جے پور میں جہاں کہ ابتدا میں فارسی زبان رائج تھی۔ مگر ۱۸۶۵ء میں مہاراجہ رام سنگھ نے تنظیم جدیدہ کی اور اندازہ لگایا کہ تمام ریاست بلکہ تمام ملک میں اردو زبان آسانی کے ساتھ سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ لہٰذا اردو کو دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا۔ یہاں اردو کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ جے پور دوسری دلّی بن گیا اور عرصہ تک راجپوتانے میں چھوٹی دلّی کہلاتا رہا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں مہاراجہ کے انتقال کے بعد ریاست کا انتظام اور انصرام کونسل کے سپرد ہوا۔ تو اردو کے خلاف حامیانِ ہندی نے بڑی بڑی سازشیں کیں اور سر مرزا اسماعیل کی وزارت عظمیٰ کے دوران اس ریاست سے بھی اردو کو جلاوطن ہونا پڑا۔ اور اس کے سنگھاسن پر ہندی براجمان ہوئی۔ سر مرزا اسماعیل کو مولینا عبدالحق نے اس سلسلہ میں ایک خط بھیجا۔ جس میں لکھا تھا:-

"آپ کی حکومت کے مُبیّنہ فیصلے سے تمام ریاست میں اُردو کی بجائے ہندی اور دیوناگری حروف جاری کر دیئے جائیں۔ ایک ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ ایک مدت سے اردو کو جے پور میں سرکاری زبان کا مرتبہ حاصل رہا ہے راجپوتانے میں ہندی اسلامی تہذیب اور اردو شاعری کا مرکز جے پور ہی کو کہا جاتا ہے۔ کیا سبب ہے کہ جے پور ایک ایسی عام کل ہند زبان کے خلاف عمل پیرا ہو۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں سے بنی۔ اور مستقبل میں ادبی ترقیوں کی گوناگوں صلاحتیں رکھتی ہے۔ یہ ایسا معمہ ہے۔ جسے میں حل نہیں کر سکتا۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے۔ کہ یہ ایک فرقہ وارانہ مسئلہ ہے (حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے) پھر بھی میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان کی کوئی حکومت جس کی رعایا میں مختلف فرقے موجود ہوں بغیر دوسرے فرقے کو نقصان پہنچائے۔ کس طرح ایک فرقے کی جانبداری کر سکتی ہے"

سر مرزا اسمٰعیل اگرچہ مسلمان تھے مگر انہیں اُردو سے نہ جانے کیوں للّٰہی بغض تھا۔ ۱۹۴۴ء میں راجپوتانے میں انہوں نے سنسکرت یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا۔ یونیورسٹی تو البتہ نہ بن سکی مگر کسی ساہتیہ سمیلن کا افتتاح کرنے کا شرف ضرور حاصل ہوا۔ آپ نے اپنے افتتاحی خطبہ صدارت میں فرمایا۔ کہ سنسکرت کا مطالعہ ہماری روحانی تشنگی کو دور کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ خود اس زبان سے ناواقف تھے۔ مرزا اسمٰعیل کے اس خطبۂ صدارت کے بعد جب وہ ریاست جے پور سے ہٹا دیئے گئے تو وہ حیدرآباد (دکن) پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے

(باقی صفحہ ۲۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

مسعود جعفری

مولوی عبدالحق اور ترقی پسند ادب

کرشن چندر نے لکھا ہے :-

"جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لئے مسٹر جناح نے پاکستان کے لئے کیا وہ کام اُردو کے لئے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا۔ بلاشبہ عبدالحق صاحب نے اپنے خون سے اِس زبان کو سینچا ہے۔"

اُردو سے اسی لگن کا نتیجہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی نئی تحریک شروع ہوئی جس سے اُردو زبان کو فائدہ پہونچنے کی اُمید ہو۔ مولوی صاحب نے اس تحریک کا ساتھ دیا ہے۔ وہ خود بھی تقریباً پچاسی سال سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کررہے ہیں۔ بقول پروفیسر احتشام حسین :-

"اُردو زبان و ادب کی انتھک خدمت نے ان کے نام کو اُردو کے ساتھ اس طرح وابستہ کردیا ہے۔ کہ دونوں کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے۔"

چونکہ مولوی صاحب میں خود کام کرنے کا مادہ ہے اور زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ ہے۔ لہٰذا جب بھی وہ کسی ایسے نوجوان گروہ کو دیکھتے ہیں جو زبان و ادب کی خدمت کا جذبہ لے کر آگے بڑھ رہا ہے تو مولوی صاحب نہ صرف اس پر خوش ہوتے ہیں بلکہ اس تحریک کا ساتھ دینا اور اس کی ہمت افزائی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جب ۱۹۳۵ء میں

ترقی پسند ادبی تحریک شروع ہوئی تو مولوی صاحب نے اس کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس کے لئے اپنا خطبہ تحریر کیا اور بزرگ ہونے کی حیثیت سے انھیں نصیحتیں کیں۔ اور ان الفاظ کے ذریعہ سے ان کی ہمت افزائی کی۔

"میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے۔ وہ میرے طالب علمی کے زمانے کے نوجوانوں میں نہیں تھی۔ اس لئے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب بھی کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہوجاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اُس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی۔ تو پھر میں نے گذشتہ کی تلافی نہیں کی۔ بلکہ کفارے کی یہ ترکیب سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہ کر سکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کر سکتے ہیں صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اسی طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جانباز کوہ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے وجوہ تھے جن کی بنا پر مولوی صاحب کو اس تحریک سے اس قدر دلچسپی تھی اور انھوں نے ترقی پسند نوجوانوں سے اتنی اُمیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں مولوی صاحب کی ادبی شخصیت اور ترقی پسند تحریک پر ایک سرسری نظر ڈالنی پڑے گی۔ مولوی صاحب کی ادبی شخصیت پر نظر ڈالتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا ہے:۔

"وہ علی گڈھ یونی ورسٹی اور علی گڈھ تحریک کی سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کے زمانے کی ان روشن خیال روایات سے وابستہ ہیں۔ جن کے سرے انیسویں صدی کی انگریزی فلسفیانہ آزاد خیال (ہربرٹ اسپنسر اور مل وغیرہ) سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ مذہبی احیائیت کی اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں۔ جو مولانا شبلی کے زیر اثر علی گڈھ اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں جاری ہوئی سید احمد اور مولانا شبلی کے تنازعوں میں وہ سرسید کے حامی اور شبلی کے سخت مخالفوں میں تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ جدید آزاد فکر اور جدید سائنس کے خیالات اُردو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ملک میں پھیلیں۔ وہ جدید اشتراکیت کے علمی فلسفہ کو بھی پسندیدہ نظر سے دیکھتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"ان کے طرز کی سادگی اور ان کی عقل پسندی دلکشی رکھتی ہے۔ ان کی علم دوستی مسلم ہے۔ ان

کی راہ نمائی میں انجمن ترقی اردو نے اردو ادب کے قدیم تذکروں اور اساتذہ کے کلام کو شائع کر کے انھیں نئی زندگی بخشی ہے۔ ان کی اردو قواعد اور انگریزی اُردو ڈکشنری ہمارے ادب کے لئے نہایت مفید چیزیں ہیں۔ انکی ابڈیٹری میں انجمن کے رسالے "اُردو" کا معیار ہمیشہ بلند رہا۔ اس میں ادبی ریسرچ اور تحقیق محدود تک پھر بھی مفید ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولوی صاحب کی اردو زبان کی ترقی کے لئے لگن اپنی ساری زندگی اور سارے نجی سرمائے کو اس ایک کام کے لئے وقف کر دینا قابلِ احترام اور مثالی حیثیت رکھتا ہے۔"

دوسرے مولوی صاحب کو اردو سے بے پناہ محبت ہے وہ اپنی زندگی کے تقریبًا پچاس سال اُردو زبان کی خدمت میں بسر کر چکے ہیں۔ لہذا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے وہ ہر اس تحریک یا شخص کا ساتھ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جن کے ذریعہ سے انھیں اردو کے فائدے کی ذراسی بھی اُمید ہو۔ اردو سے ان کی محبت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کچھ لوگوں کی طرح اردو کو کسی خاص فرقے یا طبقے کی زبان سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ خود کہتے ہیں:۔

"زبان ذات پات، قومیت، وطنیت سے بری ہے۔ جو اُسے بولتا ہے اس کی زبان ہے۔ جو زیادہ صحت اور وضاحت کے ساتھ لکھتا بولتا ہے وہی زیادہ تر زباں داں اور اہلِ زبان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں کسی صوبے کی تخصیص ہے اور نہ کسی قوم اور نسل کی۔"

اُردو سے ان کی شیفتگی کا سبب درحقیقت اس زبان کی ثقافتی اور تاریخی حیثیت ہے۔ مولوی صاحب سے زیادہ کسے اندازہ ہوگا کہ پچھلی دو صدیوں میں برکوچک کی ہندی آریائی تہذیب کے دفاع و تحفظ میں اس زبان نے کتنا بڑا حصہ لیا۔ لہذا ان وجوہ کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کی روشن خیالی جدید آزاد فکر اور جدید سائنسی خیالات کو اردو کے ذریعہ سے عام کرنے کا جذبہ انکی ترقی پسند تحریک سے ہمدردی کا سبب بنا۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو جدید سائنسی اور فلسفیانہ خیالات کو اردو میں منتقل کرنے کی کس قدر آرزو ہے۔ کسی جگہ محمد تقی صاحب لکھا ہے:۔

"میں علمی مسرت اور خوشی کے ان آنسوؤں کو کبھی نہیں بھلا سکتا جو انجمن ترقی اردو کے صدر کی آنکھوں میں اس وقت چمکے جب انہوں نے مارکس کی "داس کیپٹال" کا ترجمہ سنا تھا۔ وہ پچھلے چالیس پچاس برس میں بار بار اس کتاب کا ترجمہ کرانے کی سعی کرا چکے ہیں اس مقصد کے لئے چند آدمیوں کا بورڈ بھی کام کر چکا ہے۔ لیکن یہ مساعی کامیاب نہ ہوسکیں۔ اور مولوی صاحب کی وہ دلی مراد پوری نہ ہو سکی تھی جو اس کلاسیکی شاہکار کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے وہ رکھتے تھے

انھوں نے "کیپٹال" کا ترجمہ سنا۔ کچھ بحث کی۔ چند مفاہیم کی وضاحت چاہی اور یہ اندازہ لگا کر کہ کیپٹال کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کامیاب ہو گیا اُن کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمکنے لگے۔"

مولوی صاحب چونکہ ایک بالغ نظر اور جدید سائنسی خیالات کے ادیب ہیں۔ لہٰذا وہ اس وقت (جب کہ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔) کے ہندوستان کا اور بین الاقوامی حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ جن خیالات کو وہ مانتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے جس جذبے اور نظریے کی ضرورت ہے اُسی کو اپنا کر ترقی پسند تحریک آگے بڑھ رہی ہے لہٰذا مولوی صاحب نے نہ صرف اس کے اعلان نامے پہ دستخط کئے بلکہ دوسرے ذرائع سے بھی اس تحریک سا تھ دیا۔

اب یہاں پہ سرسری طور سے ترقی پسند تحریک کا ذکر بھی کر دینا بہتر ہو گا۔ کیوں کہ اس طرح مولوی صاحب کی اس تحریک سے شیفتگی کو آسانی سے سمجھا جا سکے گا۔ ترقی پسند ادیبوں نے اپنے اعلان نامے میں کہا ہے (واضح رہے کہ اس اعلان نامے پہ مولوی صاحب کے بھی دستخط ہیں)

"ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔ ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو رجعت پرست طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں۔"

پھر آگے چل کر اعلان نامے میں تحریر ہے :۔

"ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔"

جس زمانے میں یہ تحریک شروع ہوئی اس وقت انگریز سامراج کا شکنجہ کسی قدر ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ مگر وہ خود کو موت سے بچانے کے لئے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ہندوستان کی دولت لوٹی جا چکی تھی۔ مزدور اور کسانوں

کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی میسر نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستانی عوام اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ ہندوستانی رہنما بالترتیب جیلوں میں بند کئے جا رہے تھے یا ان کو گولیوں سے اڑایا جا رہا تھا۔ غلامی، معاشی استحصال اپنی بھیانک شکل میں ہندوستان کے شہروں، میدانوں، ریگستانوں، پہاڑوں اور دریاؤں میں رقص کر رہا تھا۔ انسان کو انسان سے لڑانے کی ترکیبیں اختیار کی جا رہی تھیں۔ سامراجیت اور رجعت پرستی اپنی ہستی کو موت سے بچانے کیلئے انسان کو کھا جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پرانی تہذیب اپنی شکست کی وجہ سے فراریت کا شکار ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اردو ادب فراریت کے راستے پہ جا پڑا تھا۔ اور شدید ہئیت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں اسکی رگوں میں نیا خون آنا بند ہو گیا تھا۔ (یہ وہی زمانہ تھا جب نیاز فتح پوری یونانی علم الاصنام اور انسائیکلو پیڈیا پیڈبے لیکا کو دریافت کر رہے تھے۔ خدا کے وجود اور زندگی کی تمام اخلاقی قدروں سے انکار کر چکے تھے۔ اور عبدالماجد دریا بادی سے دست وگریباں تھے۔ انہوں نے ادب کو "ادب برائے ادب" یا "ادب برائے وطن" کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔ اگر ایسے میں ترقی پسند ادب آگے بڑھ کر نیاز صاحب کی ٹیگوریت، یونانیت اور نیم ملّیت پہ بھرپور وار نہ کرتا۔ تو آج ہمارا ادب کبھی کا دم توڑ چکا ہوتا) یہ حالات تھے جس کی وجہ سے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند ادب مرصع شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ لیکن اگر یہ کہوں کہ اس کی ابتدا کسی حد تک سرسید اور حالی کے زمانے میں ہو چکی تھی تو بیجا نہ ہوگا۔

ترقی پسند ادب دو عناصر ترکیبی سے مل کر بنا ہے۔ ایک حقیقت نگاری اور دوسری انقلابی تحریک۔ اب ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس تحریک سے پہلے کا ادب بھی کسی نہ کسی شکل میں حقیقت سے منسلک تھا کیونکہ اگر کسی تحریر میں حقیقت نہ ہو تو وہ بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلے شک اس سے پہلے ادب میں بھی حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے اظہار میں اور خاص طور سے طبعی زندگی کے اظہار میں تشنہ اور نامکمل تھی۔ اس کا ثبوت پورا قدیم ادب ہے اس میں کچھ حقیقت تو ضرور ہے۔ مگر حقیقت کا بہت سا حصہ موجود نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ روایاتِ ماضی کی زیادہ پابند ہے، مگر زندگی اور ادب دونوں کی بنیاد ماضی کے علاوہ حال اور مستقبل کے حقائق پر بھی ہے۔ اور اس بے توجہی کی وجہ سے ہمارے پرانے ادب میں سکوت اور جمود ہے۔ اس میں کسی قسم کی حرکتِ حیات نہیں ملتی۔ پھر اس سے پہلے کا ادب طبعی زندگی کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتا تھا۔ بلکہ وہ رومانی زندگی سے زیادہ قریب تھا۔ اس وجہ سے اس میں رمزیت تو ہے مگر اشیاء، ماحول اور اجسام کا ذکر کم ہے۔ لہذا ترقی پسند تحریک قدیم ادب کی مخالف نہیں، بلکہ اس کے تشنہ اور نامکمل پہلوؤں کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ اور جہاں تک ادبی روایات کا تعلق ہے وہ دراصل اس سے بغاوت کرنا چاہتی ہے مگر اس کی مخالفت کر کے نہیں۔ بلکہ سیا؟

معاشی اور سماجی حالات سے مجبور ہوکر ترقی پسند حقیقت نگاری اسلوب اظہار میں رومانیت کے برعکس ہے۔ یہ ہمیشہ تصوریت سے گھبراتی ہے کیونکہ وہ زندگی چاہتی ہے اور اس کو زندگی کے سچے اصول بیان کرنے ہیں۔ دراصل موجودہ سائنسی دور میں ایسی ہی حقیقت نگاری کی ضرورت ہے۔

دوسری چیز انقلابی قدریں ہیں۔ انقلاب انسانی زندگی کے ارتقاء کی اہم حقیقت ہے۔ اور بقول عزیز احمد:-

"جب زندگی آنکھوں پر پٹیاں باندھے کسی پرانی روش پر
چلتے چلتے اُکتا جاتی ہے۔ تو انقلاب آنکھوں کی پٹیاں کھول کر
نیا راستہ دکھلاتا ہے اور یہ راستہ دراصل صالح ہوتا ہے۔"

لہٰذا ادب جو زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے۔ انقلاب سے گریز کر ہی نہیں سکتا۔ شروع میں جب کوئی ادب پیدا ہوتا ہے تو اس میں بڑی ملائمیت اور روانی ہوتی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس پر جمود طاری ہوجاتا ہے۔ اور اس جمود کو توڑنے کو ادبی انقلاب آیا کرتے ہیں۔ مگر ایک چیز ضرور ایسی ہے جو کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ جو ہر ادب میں موجود ہوتی ہے۔ وہ ہے "انسانیت" مگر بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانیت کے نام پر ادب میں رجعت پرستی کو ہوا دی جاتی ہے۔ اور یہی وقت ہوتا ہے جب ادب زنگ آلود ہوجاتا ہے۔ اور ایسا ہی زنگ ہمارے ادب پر سرسید اور حالی کے زمانے میں آگیا تھا۔ جس کو کسی حد تک ہمارے ان دو بزرگوں نے توڑنے کی کوشش کی۔ اور پھر انھیں روایات کو موجودہ سیاسی اور معاشی ماحول کی روشنی میں ترقی پسند تحریک نے آگے بڑھایا۔ اور اُس انگریز سامراجیت کے بُت کو توڑنے کی کوشش کی۔ جو رجعت پرستی کو ہوا دے کر اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ترقی پسند ادیبوں نے اپنے اعلان نامے میں کہا (اس اعلان نامے کا کچھ حصہ پہلے نقل کیا جاچکا ہے۔ یہاں پر صرف اس حصہ کو تحریر کیا جارہا ہے جس میں ادبی فراریت اور ادبی روایات کا ذکر ہے)۔

"اس وقت ہندوستانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اور جاں بلب رجعت پرستی جس کی موت یقینی ہے۔ اپنی زندگی کی مدت بڑھانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتی ہے پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی رگوں میں نیا خون آنا بند ہوگیا ہے۔ اور اب شدید ہیئت پرستی اور گمراہ کن منفی رجحانات کا شکار ہوگیا ہے۔"

آگے چل کر اعلان نامے میں اپنی ملکی روایت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر ہے۔

"ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں۔ اور ان روایات

کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں مروّج کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔"

یہی وہ انسان دوستی، وطن پرستی، اپنی صالح روایات سے محبت اور رجعت پرستوں سے نفرت اور سامراج دشمنی ہے جس پر اس ادبی تحریک کی بنیاد ہے جس پر وہ نئے ادب کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس زمانے کے تمام علم دوست افراد نے جن میں مولوی عبدالحق، ٹیگور، اقبال، پریم چند اور قاضی عبدالغفار شامل ہیں اس تحریک کا ساتھ دیا۔ اور مولوی صاحب نے تو ان الفاظ کے ذریعہ سے ترقی پسند ادیبوں کو نصیحت کی۔

"ادب و زبان کے علاوہ جو بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لئے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دل عزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا۔ تو یاد رکھیئے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ۔"

پھر آپ نے رجعت پرستی کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر آپ رجعت پسندی کے سہارے ترقی کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ تو شروع میں ہی سیدھے راستے سے بھٹک جائیں گے اور کبھی منزلِ مقصود پر پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔ شاید تیل اور پانی کا ایک ہو جانا ممکن ہے۔ لیکن رجعت اور ترقی کا ایک جا ہو جانا ممکن نہیں۔ یہ کھلی مداہنت اور ریاکاری ہوگی اور یہی ایک چیز آپ کی ترقی پسندی کو بے وقعت کردے گی۔ اگر آپ کو اپنے عقائد کی پاکی اور استقامت پر اطمینان نہیں تو بہتر ہے۔ آپ یہ خیال ترک کر دیں۔ رجعت پسندی کے کے بل کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ کھڑے نہ ہوں۔"

پندرہ سال کی ترقی پسند ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے مولوی صاحب کی اس نصیحت پر عمل کیا ہے۔ اور کسی وقت بھی انھوں نے رجعت پرستی کو قبول نہیں کیا۔

ترقی پسند ادب سے مولوی صاحب کے لگاؤ کی ایک وجہ تو یہ تھی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ دوسرے اس تحریک سے اردو زبان کو بھی فائدہ پہونچ رہا تھا یہ تحریک ویسے تو ہندوستان کی تمام زبانوں میں شروع ہو گئی تھی۔ مگر اب جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ اس تحریک سے اردو کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ اور زبان پر اس نے جلدی اور گہرا اثر ڈالا۔ کیونکہ اس تحریک کے سب سے اہم مرکز لاہور، لکھنؤ اور حیدرآباد (دکن) تھے اور یہی وہ مقام

ہیں جو اُردو کی آماجگاہ رہے ہیں۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر لاہور سے دو اچھے رسالے نکالے گئے۔ ایک "ہمایوں" اور دوسرا "ادبی دنیا"۔ اس کے کچھ عرصے بعد "ادبِ لطیف" جاری کیا گیا۔ اس کے علاوہ نئے اور ترقی پسند ادب کی اشاعت کے لئے لاہور میں مکتبہ اُردو قائم ہوا۔ "یہ مادی محور تھا جس کے ارد گرد نئی ادبی تخلیقوں کی پنجاب میں تشکیل ہوئی۔"
لہٰذا اس سے نئے ادیبوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ان کی تخلیقات شائع ہو کر اُردو داں طبقے تک پہنچیں۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور حیدرآباد سے بھی نئے رسالے نکلنے شروع ہوئے اور اشاعت گھر قائم کئے گئے۔ لہٰذا اردو میں نئے لکھنے والوں کے گروہ نکلنے لگے۔ جو اپنے ساتھ انقلابی روح اور واضح حقیقت نگاری لے کر آئے تھے۔ انھوں نے ادبی تخلیقات میں بھی انھیں خیالات کو پیش کیا۔ اگر ایک طرف نئی افسانہ نگاری اور نظم نے اردو ادب میں جگہ پائی۔ تو دوسری طرف پہلی بار اردو میں سائنسی تنقید کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں اور غیر ملکی ادب کا ترجمہ بھی ہوا۔ اس تحریک کی وجہ سے جہاں ایک طرف نئی تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔ وہاں دوسری طرف مختلف ادبی خیالات رکھنے والوں کے درمیان بحث و مباحثے بھی ہوتے رہے جس سے کچھ باتیں صاف ہو کر سامنے آتی رہیں۔ غرض کہ اُردو کی ترقی اور ارتقا میں ترقی پسند تحریک نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس بیس سال کے عرصے میں اُردو ادب میں جس تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی ہے اتنی پچھلے تمام زمانے میں مجموعی طور پر نہیں ہوئی۔ اور اس تحریک نے اردو زبان و ادب میں اپنی جگہ پیدا کر لی ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادب اردو میں اب اپنے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر چکا ہے۔ جو اس سے چھینی نہیں جا سکتی اور کسی قدامت پرست ہتھیار سے اُسے فنا نہیں کیا جا سکتا۔"

لہٰذا اس حقیقت کی موجودگی میں مولوی صاحب کی اس تحریک سے دلچسپی اور شیفتگی ایک قدرتی بات ہے۔ اور انھوں نے ترقی پسند ادیبوں سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ اپنی جگہ صحیح اور لازمی تھیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے مولوی صاحب کی خواہش اور ان کی امیدوں کو کس حد تک پورا کر دیا ہے اور آج یہ تحریک اردو ادب کی سب سے جاندار تحریک ہے۔ مولوی صاحب نے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا:

"میں تسلیم کرتا ہوں اور میں کیا ان کے مخالف بھی تسلیم کریں گے کہ انھوں نے (ترقی پسند ادیبوں نے) ہمارے ادب کو بلند کیا اس کا وقار بڑھایا۔ افسانہ نویسی اور نظم میں جدت و وسعت پیدا کی اور خاص کر تنقید کے فن پر قابلِ غور کام کیا ہے۔"

پھر اپنی اس تقریر میں مولوی صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کی لگن اور کام کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے ایک دلچسپ

مثال پیش کی :-

" والٹیر دنیا کا بہت بڑا اور عجیب وغریب ادیب گذرا ہے۔ وہ اپنے ڈرامے کی مشق کر رہا تھا۔ اس میں ایک خاتون بھی تھی۔ جسے وہ بتا رہا تھا کہ اسے یہ کیوں کر ایکٹ کرنا چاہیئے۔ اور کیسے ادا کرنا چاہیئے۔ اس خاتون نے کہا کہ حضرت آپ جو جذبہ مجھ میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ میرے اندر شیطان ہو۔ اس نے جواب دیا کہ بے شک جو شخص بھی کسی آرٹ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اندر شیطان کا ہونا ضروری ہے، تو حضرت ترقی پسند جو یہاں بیٹھے ہیں، ان کے اندر بلاشبہ شیطان ہے۔ یہ جب کام کرنے پر آتے ہیں تو آندھی ہیں، طوفان ہیں، بھوت ہیں، شیطان ہیں ۔"

بقیہ:- ایک صاحبِ طرز نثار

"انجمن ترقی اردو" کے خلاف جو انتقامی حرکتیں کیں۔ اس کی داستان بہت طویل ہے۔ بہرحال بابائے اردو مولینا عبدالحق ہر محاذ پر اردو کے لئے سینہ سپر رہے اور اردو کی ترویج و اشاعت میں پیش پیش رہے۔ آپ کی صحیح تعریف علامہ نیاز فتحپوری نے کی ہے کہ

"آفتاب آمد ، دلیلِ آفتاب "

(نوٹ) اس مضمون میں میں نے مندرجہ ذیل کتب و رسائل سے استفادہ کیا ہے۔

بابائے اردو نمبر الشجاع - پچاس سالہ رپورٹ " اردو"

تاریخ ادبیات اردو سکسینہ ہیل کی سرگذشت - رشید احمد صدیقی

تاریخ و تنقید ادبیاتِ اردو - حامد حسن قادری۔ (محشر خیال۔ سجاد انصاری)

مقالات حالیؒ حصہ اوّل

مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کے مضامین جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں صفحات ۳۲۴ قیمت ۳ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان اردو روڈ کراچی نمبر ۱

محمد طٰہٰ خاں

دیوانہ محسن

یہ کہانی اس اجڑے ہوئے دیار سے شروع ہوتی ہے جسے اگلے وقتوں میں شاہ جہاں آباد کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بزرگوں کی زبانی سنا ہے اور کہنے والے نے یوں کہا ہے کہ سردیوں کی ایک طوفانی رات تھی۔ دلّی کے در و دیوار پر ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ بارش کے طمانچے مار رہے تھے۔ کوچہ و بازار تاریکی میں لپٹے ہوئے سائیں سائیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک سایہ قلعۂ معلیٰ کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کا گھیرا بنا کر چہرے پر رکھ لیا تھا اور کہنیوں کو پسلیوں میں چپکائے ہوئے جھکا جھکا چلا جا رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ خود بخود بڑبڑانے لگتا تھا۔ ہونہہ۔ وہ پولیس کا سپاہی بھی کیا بیوقوف تھا کتنے وثوق سے کہہ رہا تھا۔ نہ جاؤ محسن راستے میں تمہاری جان کا خطرہ ہے۔ جان کا خطرہ! کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔ بھلا اتنی سی بات مجھے قلعہ معلیٰ میں چراغ جلانے سے کیوں کر روک سکتی تھی۔ دلّی والوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے دیوانہ کہتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ جب تک میں دلی میں رہتا ہوں قلعے میں چراغ جلانے ضرور جاتا ہوں۔ شاید ان کو نہیں معلوم کہ ہوشیار جیتا ہے اپنے لئے اور دیوانہ جیتا ہے دوسروں کے لئے یا گل کہیں کے۔

بارش موسلا دھار ہو رہی تھی، ہر موج ہوا اہرمن کی پھنکار ہو رہی تھی۔ رعدِ خشمگیں لیے

پھندے بادلوں پر بجلی کے تازیانے برسا برسا کر گرج رہا تھا اور وہ ٹوٹ کے برس رہے تھے۔ اس قیامتِ صغریٰ میں زمین کی چھاتی دہل رہی تھی اور پتھر کا کلیجہ رکھنے والے پہاڑوں سے صدائے الاماں نکل رہی تھی۔ مگر وہ رخشِ ترنگ کا سوار منزلِ مقصود کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہر لڑکھڑاہٹ پہ ہمت اپنے بازوں کا سہارا لگاتی تھی اور ہر ڈگمگاہٹ پر جوانمردی اس کے آڑے آتی تھی۔ وہ تھاکر چلا جا رہا تھا اور چلا جا رہا تھا۔ غرض کہ اسی کشمکش کے عالم میں وہ رفتاں و خیزاں قلعے کے دروازے پر پہونچ گیا۔ چاہتا تھا کہ دروازہ کھولے کہ ایک ہیبت ناک گڑگھڑاہٹ سے قلعے کی دیواریں تھرتھرانے لگیں۔ دروازہ خود بخود کھل چکا تھا۔ مگر دیوانہ یہ سماں دیکھ کر تصویرِ حیرت بن گیا۔ بڑی دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُدھر دیکھتا رہا۔ اچانک پولیس والے کی تاکید اس کے ذہن میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ جان کا خطرہ۔ جان کا خطرہ۔ مگر۔۔۔ مگر اتنی سی بات تو مجھے نہیں روک سکتی۔ یہ کہتا ہوا وہ دیوانہ وار اندر کی طرف چھلانگ لگا گیا۔

دروازہ پھر اسی ہیبت ناک گڑگھڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ مگر اس نے پیچھے گھوم کر بھی نہ دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیوانِ خاص کی طرف ہو لیا۔ ابھی دروازے میں قدم ہی رکھا تھا کہ ایک بار پھر اوسان خطا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ کیا دیکھتا ہے چراغ پہلے ہی جل رہا ہے۔ عود و لوبان کے دھوئیں کے خوشبودار مرغولے آنکھ مچولی کھیلتے پھر رہے تھے۔ کافوری شمعیں اپنے اپنے فانوس سے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ کل تک جس دیوان میں خاک اڑتی تھی۔ آج اس کا گوشہ گوشہ درمانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے۔ اس نے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھا مگر جب کسی متنفس کا سراغ نہ پایا تو چار و ناچار اپنی بھیگی ہوئی قمیص نچوڑتا ہوا آتش دان کے پاس آ کھڑا ہوا کہ تکان اور کپکپی دور ہو جائے

آتش دان کے پاس آئے ہوئے تھوڑی سی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نسوانی قہقہے کی آواز آئی۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے مڑا تو چراغ کی لو میں ایک قبول صورت نسوانی چہرے کو مسکراتا ہوا پایا —— غیر شعوری طور سے اس کے منہ سے نکل گیا کہ کون ہو تم؟

چہرے نے اسی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ پری۔

پری۔! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مجھے بہکا رہی ہو۔

میں نے کہانیوں میں سنا ہے کہ جب پری کے لعلِ بدخشاں جیسے ہونٹوں پر انگڑائی کی مسکراہٹ کھیلتی ہے تو دنیا میں بہار آجاتی ہے۔ وہ جب مخمور آنکھوں سے پلکوں کی چلمن اٹھاتی ہے تو آہوئے ختن اپنی چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ وہ جب چاندنی رات میں سیر کو نکلتی ہے تو ستاروں کی دھڑکن

تیز ہو جاتی ہے، چاند پیلا پڑ جاتا ہے۔ مگر تم ....

ہاں مگر میں۔ پری نے اس کے منہ کی بات چھین لی۔

میں انقلابات زمانہ کی ماری ہوئی آج مردہ بدست زندہ ہوں۔

اپنوں اور بیگانوں کی بے اعتنائی مجھ پر بجلی بن کر گر چکی ہے۔ ارباب سیاست کی روباہی مجھ پر قہر بن کر برس چکی ہے۔ میں نے اپنے قدردان کی آنکھیں نکلتے دیکھی ہیں۔ میں نے اوراق مصور، جیسے کوچوں میں خون ہی خون دیکھا ہے۔ میں نے ماتا بھری ماؤں کو اپنے جگر گوشوں کی لاشیں اٹھاتے دیکھا ہے۔ اور کیسے کہوں محسن۔ اپنے چاہنے والے کا پرچم آخری بار لہراتے دیکھا ہے۔ یہ کہتے کہتے پری کا گلا رندھ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

محسن بھی اپنے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پری نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

میرے متوالے صبح کے ستاروں کی طرح ایک ایک کرکے ٹوٹ گئے۔

جگمگاتی ہوئی دتی شہر خموشاں کی مثال ہو گئی۔ چہل پہل خواب و خیال ہو گئی۔ پھر بھی تم مجھ حرماں نصیب میں خوب صورتی کی تلاش کر رہے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں زندہ کیسے ہوں۔ کاش تم نے پنجاب کی لہلہاتی فصلوں میں کسی نوخیز دوشیزہ کو تتلیوں کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہوتا۔ کاش تم نے جانِ عالم کے شہر میں کسی من موہنی کو گومتی میں پاؤں لٹکائے چھپا چھپ کرتے دیکھا ہوتا۔ یا پھر دکن کے بارونق بازاروں میں کسی بانکی تلنگن کو لہرا لہرا کر چلتے دیکھا ہوتا تو آج مجھ سے یہ سوال نہ کرتے۔ یہ میرے حسن و جمال کے مختلف روپ تھے۔ جو چاہنے والوں کی طرح مجھ سے چھن گئے وہ باتیں آئی گئیں اب نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ زمانہ۔

یہاں پہونچ کر محسن نے بڑے تعجب سے پوچھا۔ کون لوگ؟

محسن کے سوال پر پری آبدیدہ ہو گئی اور دبی دبی آواز سے کہنے لگی کہ یہ وہ ہستیاں تھیں جو ؎

کریں غریب کا بھی تا بہ فرش استقبال	بہت لحاظ کہ آئے نہ اس کے دل پہ غبار
بہادرانہ امنگیں سپاہیانہ جلال	جریب دست مبارک میں اور کمر میں کٹار
نہ نکلیں گھر سے، جو نکلیں تو شان سے نکلیں	کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار
محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ صلِ علٰے	وہ جب کریں تو آہستگی کریں گفتار

یہ تھے میرے وہ متوالے جن کی حسین یادوں کو میں اپنے سینے سے لگائے اس بھائیں بھائیں کرتے ہوئے قلعے میں یکہ و تنہا پڑی ہوں۔ اس کی خوفناک دیواریں مجھے پھاڑ کھانے کو دوڑتی ہیں

محسن۔ تم مجھے کہیں دور لے چلو یہاں سے بہت دور۔
محسن نے بڑی شان بے نیازی سے جواب دیا۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ذرا میری قمیص کو سوکھ جانے دو۔
محسن کی اس ادا پر پری کھل کھلا کر ہنس دی اور چراغ کی لو سے باہر آکر اس کی پیشانی سے بھیگے ہوئے بال ہٹاتے ہوئے اپنے آپ سے بولی ؎
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
میرے درد بھرے دل میں مدت مدید سے ایک تمنا پھڑ پھڑا رہی ہے کہ ایک بار میں اپنے چاہنے والوں کا مسکن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں ایک بار میں ان دریا دل لوگوں کے مبارک ہاتھوں کو بوسہ دے کر آنکھوں سے لگالوں جنہوں نے میرے بے یار و مددگار متوالوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، سر آنکھوں پہ بٹھایا، گھربار لٹایا، ریاستیں اجاڑیں مگران کی پیشانی پر بل نہ آیا!
مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں پنجاب میں تتلا تتلا کر بات کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد دلّی کے ٹکسال میں آئی تو اہل کمال نے مجھ پر نطق جبریل کی مہر لگائی۔ ہر کہ و مہ نے مجھ سے والہانہ پیار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کے سوز و ساز سے ہمکنار کیا۔ مگر لکھنؤ کے ہی دامنوں نے میرا دامن شوخی و طراری کے پھولوں سے بھر کے مجھے بانکپن کی مسند پر بٹھایا۔ اب تو میری زبان تڑاق پڑاق چلنے لگی۔ ادیب سامنے آیا تو چار فقروں میں مار گرایا۔ شاعر نے زبان ہلائی اور منہ کی کھائی۔ منہ لگنے گا تو بیر کی کھائی۔ چشم زدن میں حواس بیرنگ، قافیہ تنگ دم دبا کر بھاگا۔
یہ سن کر محسن کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ اس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا کہ پھر کیا ہوا۔
پری بولی کہ پھر وہ ہوا جس نے میرے حسن و جمال میں بیش بہا اضافہ کیا۔ وہاں کے کچھ ارباب فن نے مرثیہ گوئی کے بہانے میرے تاج میں کوہ نور جڑ دیا۔ اس کی قدر و قیمت میں ہی جانتی ہوں محسن۔
محسن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ پھر تم کو ضرور جانا چاہئے۔
پری نے تائید میں ہاں کرتے ہوئے کہا کہ اچھا تو پھر میں صبح ہی روانہ ہو جاؤں گی۔ اور زیادہ سے زیادہ پرسوں تک واپس ہو گی۔ تم تیار رہنا۔ اسی رات ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔
محسن جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا تو پری اس کو دروازے تک چھوڑنے آئی۔ طوفان

ختم ہو چکا تھا اس لئے محسن آرام سے گھر پہونچ گیا۔

تیسرے دن محسن دن لڑکھڑاتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جھٹ پٹے تک کوچہ و بازار کی سیر کی۔ اندھیرا ہوتے قلعہ پہونچ گیا۔ پری ہمہ تن انتظار تھی۔ محسن کو دیکھتے ہی خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں دونوں پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب رات بھیگ چلی اور ہوائیں سنکنے لگیں تو پری حرف مطلب زبان پر لائی کہ وہ ملک دکن جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ دکن کا نام سن کر محسن چونک پڑا اور کہنے لگا کہ وہاں کے کوچہ و بازار سے میں ناآشنا ہوں۔ نہ وہاں میرا کوئی دوست ہے نہ شناسا اور اگر ہو بھی تو مجھے معلوم نہیں۔

پری نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ کچھ مضائقہ نہیں۔ میں علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق کے لشکروں کی ہمراہی میں وہاں پڑاؤ ڈال چکی ہوں۔ وہاں کا قریہ قریہ جانا پہچانا ہوا ہے مگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔

وعدہ! وعدہ کیا۔ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا؟

پری نے اس کو جواب دیا کہ محسن مجھے تمہاری بے لوث محبت میں خدا نخواستہ شبہ ہرگز نہیں مگر اس سے قبل میرے چند چاہنے والے وہاں گئے۔ کچھ روز تو انھوں نے میری محبت کا دم بھرا بعد ازاں اسی محبت کو سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور میں کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ بولو تم تو ایسا نہ کرو گے؟

محسن نے پری سے وعدہ کرلیا تو اس نے کہا کہ اچھا پو پھٹنے سے پہلے ہم دلّی چھوڑ دیں گے۔ کہتے ہیں اس کے بعد بہت دنوں تک کسی نے دیوانے محسن کو دلّی میں نہیں دیکھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے وطن میرٹھ کی طرف چلا گیا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ سرکاری پاگل خانے والے اسے پکڑ لے گئے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

سرزمین دکن میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے ان کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ محسن مدّت دراز تک پری کو نوک پلک سے سنوارتا رہا اور اسے اپنی عرق ریزیوں کے شیشے میں اتارتا رہا۔ دن بدن پری پر جوانی کا نکھار آتا رہا۔ اب وہ آئینہ دیکھتی تھی تو پھولی نہ سماتی تھی۔ اپنا رنگ و روپ دیکھ خود شرم سے کٹ کٹ جاتی تھی۔ غرض کہ انہی شب و روز میں ایک طویل مدت گزر گئی تو ایک دن پری نے کہا کہ محسن۔ میں تمہاری بے پناہ چاہت اور بے لوث محبت کا رسمی شکریہ ادا کرکے تمہارے کارہائے نمایاں کے آفتاب عالمتاب کو چراغ

دکھانا نہیں چاہتی۔ سرزمین دکن کے بچے بچے کی زبان پر ہماری محبت کا افسانہ ہے۔ ہر اہل نظر تمہاری وفا کا معترف تو میرے حسن کا دیوانہ ہے کہ تم نے میرے قدیم ترین چاہنے والوں کی جگر کا ویوں کو گوشہ گمنامی سے نکال کر گھر گھر پہونچا دیا۔ اس طرح میری عمر کے ماضی میں دو سال کا اضافہ ہوگیا اور مستقبل بھی خوش آئند نظر آنے لگا۔ مگر میرا مقصد کچھ اور تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج وہ دن آگیا ہے کہ میں تمہارے سامنے اپنی بے چین آرزو کا اظہار کردوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میرے ہونہار متوالوں کے سربراہ ہوگئے ہو اگر مناسب خیال کرو اور پرانی رفاقت کا دم بھرو تو میری یہ آخری خواہش بھی پوری کردو۔

محسن تھوڑی دیر تک پری کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا کہ وہ کون سا کام ہے جو میں تمہارے لئے نہیں کرسکتا۔

پری کے چہرے پر امید کی سرخیاں ناچنے لگیں۔ اس نے مجسم التماس بن کر کہا کہ جہاں تم نے مجھے عمردراز دی ہے وہاں اپنے ہی ہاتھوں سے زندہ جاوید بنا دو۔

محسن نے پری کو جھڑکتے ہوئے جواب دیا کہ بھلا میرے ہوتے ہوئے تمہاری طرف کون آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔ تم آج کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہو۔

پری نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے محسن کی طرف دیکھا اور بڑے اندوہناک لہجے میں کہنا شروع کیا کہ میرے محسن، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میرے دیرینہ ہمدرد دامے، درمے، سخنے، قدمے ہر آڑے وقت پر میرے کام آتے رہے۔ گھر بار چھوڑا۔ دردر کی خاک چھانی مگر ہمیشہ میرے گیسو سنوارتے رہے۔ ان کے کارہائے عظیمہ کی بدولت میری دنیا باغ و بہار ہوگئی اور میں اپنی ہم وطن بہنوں سے بازی لے گئی۔ محفل محفل میرے حسن کا چرچہ اور بستی بستی میرے بانکپن کا شہرہ ہوگیا تو میں نے یہ سمجھا کہ میں اس برصغیر کی حسین ترین پری ہوں۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ سمندر پار سے کچھ بدیسی سوداگر آئے اور تجارت کے پردے میں حکومت کے لئے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ انھوں نے میرے متوالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرا دیا اور اپنی پٹاری سے فتنوں کی ایک ایسی پوٹ نکالی جس نے چند ہی روز میں بہتوں کو اپنا گرویدہ کرلیا میری اس بہن کے چونچلوں کو اقتدار کی حمایت حاصل ہوئی تو اس نے ایسے بال و پر نکالے کہ ہر سر میں اس کا سودا ہوا اور خاص و عام اسی کا والا وشیدا ہوا۔ میں اپنی کسمپرسی اور لاچارگی پرخون

کے آنسو روتی رہی کہ سب نے مجھے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں بدیسوں کے لائے ہوئے علوم و فنون سے بے بہرہ ہوں۔ اس دن میں قلعہ معلیٰ کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر روئی کہ ہائے کہاں چلے گئے وہ جنھوں نے اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کر دیا تھا۔ آج کوئی بندہ خدا مجھے بدیسی علوم سے بہرہ ور نہیں کرتا۔ البتہ میری ذات میں کیڑے ڈال خوش ہوتا ہے۔ اسی دن سے میں قلعہ معلیٰ میں گوشہ نشین ہوگئی اور نہ جانے کب تک وہیں رہتی کہ خدا نے تم کو فرشتہ رحمت بنا کر بھیج دیا۔ محسن اب مجھ میں وہ روز بد دیکھنے کی سکت نہیں۔ تم مجھے بدیسی علوم سے مالا مال کر دو۔

محسن پری کی باتیں سن کر سناٹے میں آگیا۔ بڑی دیر تک تصویر بنا بیٹھا رہا۔ تو پری اس کے روبرو آئی اور جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ تم بولتے کیوں نہیں تم جواب کیوں نہیں دیتے محسن۔

محسن نے نگاہ اوپر اٹھائی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا شاید اتنے بڑے کام کے لئے میری عمر وفا نہ کرے۔

پری نے اس بات پر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہنے لگی کہ تم بھی کتنے بھولے ہو محسن۔ ہم دونوں اب موت کی دسترس سے بہت دور ہیں ہم دونوں کی زندگی ایک ہو چکی ہے۔ تم خدا کا نام لے کر میدان میں آجاؤ۔ اس کی رحمت سے کیا بعید ہے۔

پری کی زبان سے حیات جاوید کا مژدہ سُن کر محسن کے تھکے ہوئے چہرے پر جوانی کی تمتماہٹ آگئی وہ دیوانہ وار پری کی طرف بڑھا اور چاہتا تھا کہ اسے اپنی آغوش میں بھینچ لے کہ پری نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بڑے پیار سے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی کہ محسن تم جذبات کی رو میں بہہ کر یہ بھول گئے کہ میں بزرگان دین کی گودو میں کھیلی ہوں، سجادوں پر سوئی ہوں اور خانقاہوں میں رہی ہوں۔

محسن نے اپنا سر جھکا لیا اور دونوں ہاتھ چھڑا کر بھاری بھاری قدموں سے اندر چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد محسن پھر دیوانہ ہوگیا۔ پری کی آخری تمنا نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ وہ ساری ساری رات پری کے آنچل میں ستارے ٹانکتا رہا اور سارا سارا دن انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ رات و دن آتے جاتے رہے مگر وہ دھن کا پکا، ہمت کا دھنی سب سے ہی بے نیاز ہو کر اپنا جگر خون کرتا رہا۔ اسی طرح ایک طویل مدت اور گزری تو ایک دن پری نے پوچھا آج کونسی تاریخ ہے؟ محسن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تاریخ۔ تاریخ وہ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اپنے ہی اوپر برس پڑا۔ مجھے تو دن بھی نہیں معلوم، مگر تم پوچھ کر کیا کرو گی۔

پری نے محسن کی بات کا جواب نہ دیا اور حیرت سے اس کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی۔
پھر پری نے کہنا شروع کیا کہ محسن۔ تم نے مجھے بارہ اور سولہ سنگھار سے سجا دیا۔ بال بال موتی پروئے۔ تار تار رنگین کر دیا۔ میرے حسن کا ڈنکا پہلے ہی بجتا تھا۔ تم نے میرا خطبہ بھی پڑھوایا مگر اب اپنی جان پر رحم کرو۔ میری تمنا کب کی پوری ہو چکی ہے۔

آخری جملے پر دونوں بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک ہنستے کھیلتے بسر ہوئی۔

ایک دن محسن نے پری سے کہا کہ شاید تم کو معلوم ہے کہ سرسید، حالی، اقبال اور قائداعظم کا نخل امید بار آور ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی کشمکش آج مسرت وانبساط کے پھول لے آئی ہے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے مسلمان ان پھولوں کی چاہت میں جوق درجوق جا رہے ہیں۔ میری بھی تمنا ہے کہ کسی آزاد ملک میں آزاد بھائیوں کے ہاتھوں آخری آرام گاہ میں اتارا جاؤں۔ پری یہ سن کر بیتاب ہو گئی اور کہنے لگی۔ محسن کیا تم مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟
نہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ اور کیوں نہ جاؤں۔ اس خود آفریدہ بہار کے پھولوں میں میرا خون دل جھلک رہا۔ میں نے ان پھولوں کو گھر گھر پہونچایا ہے اور اس بہار کے نغمے میں نے ہی بکھیرے ہیں۔ مگر میں اپنی خدمات کا صلہ نہیں چاہتی البتہ مسلمانوں کی چند بیش قیمت امانتیں میرے سینے میں چھپی ہوئی ہیں۔ انھیں منظر عام پر لانا چاہتی ہوں۔ بولو تم کب چلو گے۔
محسن نے کہہ دیا آج ہی۔

دونوں اسی دن منزل مقصود پر پہونچ گئے۔

محسن یہاں بھی پری کی آرائش و زیبائش سے غافل نہ رہا اور اس کے حسن و جمال میں چار چاند لگاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ پری سے کہنے لگا کہ جو فکر تمہیں دکن میں بیتاب رکھتی تھی وہی فکر مجھے یہاں بے چین کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہیں یہاں بھی پھلتا پھولتا دیکھ لوں اور بس۔

پری نے قدرے ناراض ہو کر کہا۔ سب سے پہلے تمہیں اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ تمہیں سر کو چھپانے کے لئے کوئی مستقل جگہ درکار ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس کا انتظام کرو۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم ساری عمر کے گاڑھے پسینے کی کمائی کہیں بیجا صرف کر ڈالو گے۔
محسن ہنس پڑا۔ بھلا میں ایسی کمائی کو کہیں بیجا صرف کر سکتا ہوں۔ وہ میں نے تمہارے

مستقبل پر صرف کردی ہے۔ اس نے نہایت اطمینان سے پری کو سمجھایا۔

پری یہ سن کر برس پڑی کہ دتی والے سچ کہتے تھے۔ تم دیوانے ہو۔ تم پاگل ہو۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ محسن سنتا رہا۔ ہنستا رہا۔

بہت دنوں بعد پری گھبرائی ہوئی آئی اور زار و قطار رونے لگی۔ محسن نے اسے دلاسہ دیا تو اس نے اور بھی رونا شروع کر دیا۔ کافی دیر بعد پری نے سسکیاں لے لے کر بتایا کہ محسن تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ تم کو نہیں معلوم کہ یہاں وہی سمندر پار کی سوکن پہلے سے براجمان ہے۔ اس نے یہاں پہلے ہی سے ساز باز کر رکھی ہے۔ اس کی عشوہ طرزیوں کے دیوانے مجھے منہ لگانا اپنی تحقیر خیال کرتے ہیں اور میں نے لاکھوں کو دیکھا ہے جو میرے ساتھ اس کو خلط ملط کر کے چاند پر دھول ڈال رہے ہیں۔ ایسی باتوں کو وہ قابل فخر جانتے ہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔

پری کے الفاظ محسن کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔ اس کے بدن میں بجلی دوڑ گئی اور وہ گرجنے لگا۔ ابھی میں جوان ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ میں جوان ہوں میں قومی غیرت کے ان سوداگروں کا بازار آن واحد میں ٹھنڈا کر دوں گا۔ میں ان عاقبت نا اندیشوں کو بتا دوں گا کہ وہ احساس کمتری کے مرض کو کمال سمجھ کر اس پر فخر کر رہے ہیں۔ میں گلی گلی پکارتا پھروں گا کہ اسے غلامانہ ذہنیت کے متوالو۔ فخر اس چیز پر بجا ہے جو تمہاری ہے۔ تمہارے اجداد کا ترکہ ہے۔ تمہاری قومی میراث ہے۔

پری نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ ان باتوں سے کیا فائدہ محسن۔ تم بدیسی پری سے میری مصالحت کرا دو۔

مصالحت! وہ چونک پڑا۔ کیسی مصالحت !!

پری نے جواب دیا کہ بہت سے سربراہوں کا خیال کہ مجھے اس بدیسی سوکن کا لباس پہنا دیا جائے تو یہ مخاصمہ ختم ہو سکتا ہے۔ کیا مضائقہ ہے محسن اگر میری شکل و شباہت تھوڑی سی بدل جائے۔ میں تو وہی رہوں گی۔

محسن یہ سن کر چراغ پا ہو گیا۔ لباس، شکل و شباہت، مخاصمہ یہ سب کیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیا ڈھونگ ہے۔ کہہ دو ان سربراہوں سے کہ جسے وہ لباس یا کھال سمجھ رہے ہیں وہ تمہاری روح ہے۔ بتا دو ان ماہرین کو کہ جس شکل کو وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں وہ عرب کے صحرا نشینوں کی امانت ہے۔ اس میں امت کی آبرو جھلک رہی ہے یہ

(باقی صفحہ ۲۰۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

متین الرحمٰن مرتضیٰ

اُردو تنقید اور عبدالحق

تنقید

تنقید کیا ہے ؟ اس کا عمل کیا ہے ؟؟ ان بنیادی سوالات کے جواب میں صراحت و وضاحت کے لئے مختلف اقوال، متعدد نظریات اور بہت سی اختلافی آرا پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن چوں کہ موضوعِ بحث "تنقید" نہیں ہے اس لئے اجمالاً عرض ہے کہ تنقید شب کو تاریک اور دن کو روشن بتاتی ہے۔ تنقید کی ایک بنیادی قدر دیانت و انصاف ہے۔ "تنقید خوب و زشت، کذب وصدق، پست و بلند اور ادنا و اعلا میں امتیاز کرتی ہے۔ تنقید وضاحت و صراحت ہے، تحلیل و تجزیہ ہے اور کچھ قدروں کا تعیّن ہے"[1] تنقید محض محاسن بینی ہے اور نہ معائب جوئی بلکہ تنقید فنی محاسن اور معائب کی دیانت دارانہ نشان دہی کا نام ہے اور نہ ہی تنقید خوب و زشت کا کوئی ایسا صریح حکم ہے جو ناظر کی قوّتِ فیصلہ کو معطل کردے۔ تنقید فن کار کو بے راہ روی اور عامیانہ پن سے محفوظ کرکے فن میں تنوّع اور تفرّد کی تحریک کرتی ہے۔ گویا

---

[1] "تنقید کیا ہے ؟" آل احمد سرور صفحہ ۲۰۲

تنقید ادب کی اتالیق ہے۔ کمالِ تنقید کے لئے ولولۂ تحقیق، عمیق مشاہدہ اور وسعتِ مطالعہ ازحد ضروری ہے تاکہ ذہن پختہ، فکر و نظر بالیدہ اور مذاق سنجیدہ ہو سکے یا ایلیٹ کے الفاظ میں "نقاد کا ذہن آفاقی" ہو سکے۔ یہ خیال درست نہیں کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کے مصداق بگڑا ادیب ناقد ہوتا ہے ڈسرائیلی DISRAELI کا خیال درست ہے کہ "نقاد وہ نہیں جو فنِ ادب میں ناکام ہو بلکہ وہ ناظر اور طالب علم کا رہنما، فلسفی اور دوست ہوتا ہے۔" تنقید کو تخلیقی سرگرمی خیال نہ کرنا بھی قرینِ حقیقت نہیں۔ ہڈسن ٹھیک کہتا ہے کہ "راست تنقید بھی چوں کہ اپنا مواد اور جذبۂ حیات سے حاصل کرتی ہے چناں چہ وہ بھی اپنے رنگ میں تخلیقی ہے" تنقیدی شعور بھی تخلیقی شعور کے ساتھ ہی ساتھ جاگتا ہے اس لئے کہ فن کار اپنی تخلیق کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لئے اس میں گرمئ حسن پھونکنا چاہتا ہے۔ "گرمئ حسن" پھونکنے سے بیشتر حسن کا کوئی معیارِ قدر متعین کرنا پڑتا ہے اور حسن کے کسی قدری معیار کے تعین کے لئے تنقیدی شعور کی بیداری ناگزیر ہے۔ اس طرح متخیلہ تخلیق کے خارجی صورت اختیار کرنے سے پیشتر ہی تنقیدی شعور کی بیداری عمل میں آجاتی ہے۔ تنقیدی شعور کی اعانت ہی سے تخلیقی شعور کا مہیا کیا ہوا مواد فن کار کے فن کی صورت میں منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یعنی قوتِ متخیلہ کی پیش کش قوتِ منفکرہ کی مناسب تراش خراش کے بعد خارجی صورت اختیار کرتی ہے۔ فن کار کی قوتِ متخیلہ اس کا تخلیقی شعور ہے اور قوتِ متفکرہ اس کا تنقیدی شعور۔ بعض اوقات قوتِ منفکرہ کی دست برد قوتِ متخیلہ کی پیش کش کے خارجاً ظہور پذیر ہو جانے کے باوصف بعد تک جاری رہتی ہے فی الاصل تنقید کا مادہ جبلی ہے جو قدرت کی جانب سے دیگر مقتضیاتِ بشری کے ساتھ فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی کارفرمائی تمام افعالِ انسانی میں کم و بیش ہوتی ہے[1] یہی فطری تقاضہ ادب پر اثر انداز ہو کر ادب میں ایک علاحدہ شعبہ اور ایک مستقل فن کو ظہور میں لایا۔

اُردو ادب اور تنقید

ہر زبان کے شعر و ادب میں تنقید کا وجود بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ بجائے خود شعر و ادب کا جیسا کہ ماقبل کی تمحیص سے واضح ہے لیکن یہ بات خاصی دل چسپ ہے کہ اُردو ادب کے تدریجی ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے حالی سے باقاعدہ شعبۂ تنقید کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور معاً یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا حالی سے پیشتر تنقید نے اُردو ادب میں جنم ہی نہ لیا تھا۔ اس سوال کا مستقل رائے کی

---

[1] "تنقیدی سرمایہ" عبدالشکور صفحہ ۵

صورت اختیار کرلینا بجائے خود ایک غلط فہمی ہوگا۔ جیسا کہ اوپر کہیں تحریر کیا جا چکا ہے ہر ادیب و شاعر کے ذہن میں ادبی تخلیق کو زیور فن سے مزین کرنے کے لئے خوب و ناخوب کا کوئی نہ کوئی معیار امتیاز ضرور قائم رہتا ہے کیوں کہ ادیب کے ذہن کی تنقید کے شعور سے بیگانگی کی صورت میں ادب العالیہ کی تخلیق ہی ممکن نہیں چناں چہ ایلیٹ لکھتا ہے کہ "جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے" پس یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ اردو ادب تنقید کی عدم موجودگی کے باوجود حالی تک ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہو۔ اردو ادب میں حالی سے پیشتر باقاعدہ شعبۂ تنقید کی ناپیدگی کی چند وجوہات ہیں :

(۱) حالی سے قبل کے دور میں شعرا اور نثرنگاروں کے لئے اپنی تخلیقات پیش کرنے کا بڑا ذریعہ مشاعرے اور جلسے (درباری مجالس) تھے۔ اوّل تو درباری مشاعروں اور مجلسوں میں تنقید کا موقعہ بہت کم میسّر آتا تھا۔ اگر تنقیدی نظریات کے اظہار کا موقعہ ملتا بھی تھا تو ان تمام تنقیدی خیالات کا اظہار جستہ جستہ زبانی ہی ہوتا تھا ان کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام یوں نہ ہوتا تھا کہ تنقید ان مشاعروں اور مجلسوں کا مقصود بالذات نہ ہوتی تھی پھر طباعت و اشاعت کے لئے آج کی سی سہولتیں نہ تھیں کہ ان تنقیدی نظریات کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا جاسکتا نہ ایسے وسائل مہیّا تھے کہ تنقیدی رجحانات کی اشاعت اور وسعت ہوسکتی۔

(۲) ایک وجہ شعبۂ تنقید کی ناپیدگی کی یہ بھی ہے کہ ہندوستان کا دورِ قدیم عقیدت کیشی کا دور تھا اور اسی عقیدت کیشی کے باعث کسی کے سامنے یارائے دم زدن نہ تھا۔ ایسی صورت میں تنقیدی ادب کی پیداوار ضرور کم ہونی چاہئے [1]

(۳) ہمارے ہاں تنقید کی حیثیت ہمیشہ ثانوی تسلیم کی گئی تنقید کو کبھی تخلیق کا درجہ نہ دیا گیا [2]

دراصل اردو شاعری میں مختلف نوعیت کے مضامین اور موضوعات کے ادا کرنے کے لیے مختلف اصناف سخن کی تدوین اور ان کے لئے مناسب اسالیب کی تخصیص ابتدا ہی سے ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ اردو شاعری

---

[1] "تنقیدی سرمایہ" عبدالشکور صفحہ ۸

[2] "تنقید کیا ہے"؟ آل احمد سرور صفحہ ۱۹۳ — ۱۹۴

عربی و فارسی کی شاعری کے نقشِ قدم پر رواں تھی چناں چہ ان زبانوں کی تنظیم و تقسیم کو اُردو شاعری نے اپنے اوائل ہی میں پوری طرح اپنا لیا تھا۔ اُردو نثر کی بنا بہت بعد کو پڑی۔ نثر میں موضوعات کا تنوّع اُس وقت ظہور میں آتا ہے جب وہ اپنی علمی افادیت منوا لیتی ہے۔ نثری اصناف اور ان کے لئے حسبِ اقتضا اسالیب کی تخصیص کی ضرورت بھی اُسی وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ علمی صورت اختیار کرتی ہے۔ چناں چہ جس طرح فارسی اور عربی کی شاعری نے اُردو شاعری کو متاثر کیا بعینہٖ مغرب کے نثری ادب نے اُردو نثر کو علمی وسعت اور گہرائی سے متمتع کرکے اس میں اپنے مزاج اور ہیئتِ ترکیبی کی مطابقت سے اصنافِ نثری اور مخصوص اسالیب کی بساط بچھا دی۔ یہ عمل انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوکر بیسویں صدی میں مکمل ہوا۔ چناں چہ حامد حسن قادری "داستانِ تاریخِ اُردو" میں لکھتے ہیں:۔

> "عصرِ حاضر میں مغربی تعلیم سے اُردو کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا اور زبان و ادب کی اصل خدمت ہوئی وہ یہ کہ فلسفہ و سائنس، تاریخ و سیرت، ادب و انشا تبصرہ و تنقید، ناول و افسانہ وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے الگ الگ مناسب و موزوں اسالیب مخصوص ہوگئے۔ اب سے پہلے یہ بات نہ تھی یہ خال خال تھی"

چناں چہ جس طرح اُردو نے معرضِ وجود میں آجانے کے برسوں بعد ضبطِ تحریر میں آنے کا شرف حاصل کیا۔ بالکل اسی طرح اُردو تنقید کو یہ شرف حالی نے بخشا حالی سے پیشتر اُردو کا تنقیدی سرمایہ سب کا سب ہمارے سامنے نہیں اس لئے بھی ہمیں اس کی قلّت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے محققین نے تنقید کی موجودہ وضع کو پیشِ نظر رکھ کر حالی سے پہلے اُردو ادب میں تنقیدی سرمائے کی جستجو کی حالاں کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اُردو ادب میں تنقید نے ایک علاحدہ شعبہ اور مخصوص اسلوب حالی کے عہد سے حاصل کیا اور پھر اُس زمانے کا معیارِ تنقید بھی جُدا تھا۔ اُس زمانے میں ادبی تنقید کا بڑا مقصد ادب کا متروکات اور غیر فصیح الفاظ کے نقطۂ نظر سے تجزیہ اور فارسی کے رتبۂ کمال تک پہنچنے کی سعی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب قدیم ادب میں مفصّل اور مبسوط تنقید کی جستجو کی جاتی ہے تو مایوسی ہوتی ہے [1] اور پھر ہمارے محققین نے شاید اس امکان پر غور نہیں کیا کہ تنقیدی خیالات کا اظہار شعر و سخن میں بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک اُردو ادب کا بہت سا تنقیدی سرمایہ معرضِ علم میں نہیں آسکا۔ مثلاً غالب لکھتے ہیں ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

---

[1] "شعرائے اُردو کے تذکرے" ڈاکٹر سیّد عبداللہ صفحہ ۱۰۵

کیا یہ تنقید نہیں؟ غالب ہی کے دور میں اس تنقید کے وزن کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ بعد کو اس تنقید نے غزل کی کائنات ہی بدل ڈالی۔ غالب نے بذاتِ خود نئے تجربات کئے اور عملاً "تنگنائے غزل" کو وسعت دی۔ اسی طرح انیس، دبیر اور میر حسن کے یہ اشعار قابلِ توجّہ ہیں:۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

(انیس)

شکرِ خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیہ میں موجدِ طرزِ جدید ہوں

(دبیر)

نوا سنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

(انیس)

سبک ہو رہی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

(انیس)

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں

(میر حسن)

آج کے تنقیدی ادب میں 'نیا مضمون' 'طرزِ جدید' 'شگفتگیٔ بیان و تحریر' 'توازن و عدمِ توازن' 'نئی زبان اور نیا اسلوب' قسم کے متعدد الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ کیا جدید تنقید کی یہ سب اصطلاحات ان ہی اشعار سے ماخوذ نہیں ــــ؟ بہت سے حضرات کو ان اشعار کی تنقیدی حیثیت تسلیم کرنے میں تامّل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شعار میں تنقید اُن جدید اصول اور اقدار کی متحمل نہیں جو آج ہمارے پیشِ نظر ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ ان میں ہمیں تنقید کی مفصّل جزئیات نہیں ملتیں لیکن تنقیدی اشارے اور کنائے ضرور موجود ہیں جو کسی شاعر کی خود نمائی کے جذبے سے مغلوب ہوکر اپنی اصل صورت کھو بیٹھے، کہیں خود ستائی کے شوق نے انھیں مبالغے اور تعلّی میں گم کر دیا، کہیں رشک و حسد کی تحریک نے انھیں طعن و تشنیع کے لبادے میں

ملبوس کر دیا اور کہیں جوشِ کلام نے انھیں مسخ کر ڈالا۔ حاصلِ تمحیص یہ کہ حالی سے پیشتر اُردو ادب میں گو تنقید نے کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کیا تھا تاہم ضمنی طور پر تنقیدی اجزا ہمارے ادب میں ہمیشہ موجود رہے ہیں لیکن چوں کہ یہ تنقیدی اجزا منتشر اور پریشاں تھے۔ بدیں وجہ ہمارے نقّاد کی نگاہ انھیں محیط نہ کر سکی اور یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ حالی سے پہلے ہمارے ہاں تنقید تھی ہی نہیں۔ حالی سے پہلے اُردو ادب میں تنقید ضرور تھی لیکن فنّی نہیں!

ہمارے ہاں تنقید نے اوّل اوّل تذکروں میں ضبطِ تحریر کا شرف پایا پھر جب تذکرہ نویسی تاریخ ادب کی منزل کو پہنچی تو تنقید مفصّل ہو کر بجائے خود ایک علاحدہ شعبہ قرار پا گئی۔ قدیم تذکروں میں تنقیدی مواد کے نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر یہ ہیں:—

(۱) "نکات الشعرا":۔ (مؤلفہ میر تقی میرؔ) اس تذکرے میں خلافِ اُمید تنقیدی مواد اچھا خاصا ہے۔ یہ پہلا موجودہ تذکرہ ہے۔ اس میں تنقید کے علاوہ شخصیتوں کا تجزیہ بھی اخلاقی نقطۂ نظر سے کافی سختی سے کیا گیا ہے بعض جگہ لہجہ تلخ اور طنزیہ ہے جس سے تنقید بھی غیر متوازن ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:—

"میرؔ صاحب کی تنقید پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی تنقید کسی ہم درد ڈاکٹر کے عملِ جراحی سے مشابہ نہیں بلکہ بعض اوقات ان کی حیثیت قاتلانہ حملے کی ہو جاتی ہے۔"

(۲) "تذکرۂ ہندی" (مؤلفہ غلام ہمدانی مصحفیؔ):۔ مصحفیؔ کے تذکروں کی زبان غنیمت ہے۔ ان کے ہاں تنقیدی مواد اگرچہ کم ہے لیکن ان کی آرا وزن دار معلومات پائدار اور ان کے تبصرے قابلِ لحاظ ہیں بالخصوص انشاؔ کے متعلق انھوں نے کافی صحت کے ساتھ لکھا ہے۔ سوداؔ کے بارے میں ان کی رائے بہت وقیع اور درست ہے۔

(۳) "گلشنِ ہند" (مؤلفہ لطفؔ):۔ یہ اردو زبان میں تحریر کیا گیا۔ انیسویں صدی کے تاریخی واقعات کافی صحت سے تحریر کیے گئے ہیں۔ لیکن بعض اکابرین پر ناروا اور مہمل اعتراضات ہیں جس کی وجہ محض مذہبی خیالات کا جوش

اور جذبات کا اُبال تھا

(۴) "گلشنِ بیخار" (مؤلفہ شیفتہ):۔ حالی سے پیشتر کا سب سے اہم تذکرہ گلشنِ بیخار ہے۔ شیفتہ کو بعض ناقدین اُردو کا پہلا نقّاد قرار دیتے ہیں وہ متوازن ذہن اور مستقل مزاج رکھتے۔ مبالغہ اور تعلّی ناپسند کرتے تھے۔ آخری زمانے کے بہترین ناقدینِ ادب میں شمار ہوتے ہیں شیفتہ ناقد بھی اچھے ہیں اور صائب الرّائے بھی ہیں۔ البتہ بعض مقامات پر ان کی اشرافی ذہنیت اور اسلوب پرستی بھی ان کی کمزوری بھی نظر آتی ہے۔ شیفتہ نے بڑی تحقیق اور جانفشانی کے بعد یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بہت زیادہ اہم اور مستند ہے۔ شیفتہ کے ہاں تنقید کافی جان دار اور وقیع ہے۔

لیکن ایک بات جو خاصی دلچسپ ہے قابلِ غور ہے کہ ان محولہ تذکرے سے جو ابتدائی اُردو تنقیدی سرمایہ ہیں صرف "گلشنِ ہند" اُردو زبان میں ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ ہمارا بہت سا تنقیدی سرمایہ بیاضوں، دیباچوں اور تقریظوں میں بھی محفوظ ہے جس سے جائزہ لینے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ شیفتہ کے بعد حالی کا ذکر کرنے سے پیشتر آزاد اور "آبِ حیات" کا ذکر ناگزیر ہے۔ آزاد کی اس مشہور تصنیف پر جتنی تنقید ہوئی اتنی شاید اُردو کی کسی دوسری تصنیف پر نہیں ہوئی۔ قریب قریب ہر نقّاد نے "آبِ حیات" کے متعلق ایک آدھ سخت جملہ لکھنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ آزاد پر اس کڑی تنقید کی وجہ بھی اپنی جگہ معقول ہے۔ "آبِ حیات" میں جو کوتاہیاں ہیں ان سے زیادہ کوتاہیوں کی نظیر "آبِ حیات" سے پیشتر کی تصنیفات میں مل سکتی ہے لیکن وہ اِس لئے قابلِ درگزر ہیں کہ ان کا زمانۂ تصنیف "آبِ حیات" کا زمانۂ تصنیف نہ تھا۔ "آبِ حیات" کی تصنیف کے زمانے میں تنقیدی اصولوں اور روایتوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اگرچہ اصولوں میں ابھی کمال قطعیت اور جامعیت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ آزاد نے ان ضابطوں سے بے نیازی اختیار کی۔ انشا پردازی کی عظمت کا طلسم باندھ کر تحقیق کے سلسلے میں اپنی تہی دامانی، غربت اور سہل پسندی پر پردہ ڈال لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود "آبِ حیات کی اہمیّت و افادیّت مسلّم ہے۔

نقد و نظر کے جو اندازے تدریجاً ذہنوں میں مرتب ہو گئے تھے لیکن اب تک تنظیم نہیں پا سکے تھے انھیں سب سے پہلے حالی نے شعر و ادب کے متعلق اپنا ایک جامع نظریہ قائم کرتے ہوئے،

نقد و نظر کے بنیادی اصول متعیّن کر کے منضبط کیا۔ حالؔی کی بصیرت و مہارت آج تک اُردو تنقید کو اپنی اہمیّت اور افادیّت سے بے نیاز نہ کر سکی۔ وہ بلا شبہ لازمِ اُردو تنقید کے میرِ مجلس ہیں۔ حالؔی نے محض تنقید کے چند ضابطے ہی وضع نہیں کیے بلکہ ان کی تنقیدات بجائے خود اُردو تنقید میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کی تنقید غیر جذباتی، وقیع اور منصفانہ ہوتی ہے۔

تنقید میں وسیع تحقیق کا عنصر شامل کرنے کا سہرا شبلؔی کے سر ہے۔ لیکن شبلؔی کی تنقیدات کی عظمت کو خود ان کی شخصیّت پرستی کی کمزوری نے ضرر پہنچایا۔ مگر تحقیق کو تنقید کے لیے مستلزم کر دینا ہی شبلؔی کا کچھ کم اہم کارنامہ نہیں۔ تحقیق و تلاش کے میدان میں حالؔی بھی شبلؔی کے درجے کو نہیں پہنچتے۔ جس کی طرف خود شبلؔی نے بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے [1]

اُردو تنقید اور عبد الحق

شیفتہ نے تنقید کا جو تخم فراہم کیا تھا حالؔی نے اُسے سرزمینِ ادب میں گہری کرید اور سخت کاوش سے دیا۔ شبلؔی نے اس کی ابتدائی نشو و نما اور بالیدگی کے زمانے میں تحقیق و تلاش کی مقوی غذا مہیا کی۔ شبلؔی کے بعد عبد الحق نے اس نوخیز پودے کو قریب قریب نصف صدی میں خونِ جگر سے سینچ کر بہارِ شباب بخشی۔

---

[1] "حیاتِ شبلؔی" صفحہ ۸۰۲

آج عبدالحق اپنے دور کے ناقدین کے امام ہیں وہ بلاشبہ اس اعزاز جلیلہ کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنا سارا شباب اور عرصۂ پیری شانۂ تنقید و تحقیق سے اُردو ادب کے گیسو سنوارنے میں گزارا ہے۔

مولانا عبدالحق بہت بڑے زباں داں اور ماہرِ لسانیات تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن بہت سے دوسرے اچھے انشا پردازوں کی طرح ان کے نزدیک اُردو میں فصاحت و بلاغت کا معیار فارسی اور عربی کی نادر تراکیب کا کثرت سے استعمال نہیں بلکہ اُن کے نزدیک زبان کا ستھراپن، سلجھاؤ اور سلاست زیادہ اہم اور ضروری ہے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے حسبِ مناسبت خواہ عربی و فارسی سے استفادہ کیا جائے خواہ سنسکرت و برج بھاشا یا دیگر زبانوں سے۔ ان کی تحریروں سے اس امر کی بھی صداقت ثابت ہوتی ہے کہ وہ روزانہ استعمال میں آنے والی زبان اور تحریر میں آنے والی علمی زبان کی ہر ممکن قربت کے متمنی ہیں تاکہ ہر طبقے میں علمی ذوق ترویج پا سکے اور علمی زبان کسی خاص طبقے کے لیے مخصوص ہو کر نہ رہ جائے۔ چناں چہ بجائے خود ان کی تحریر سادہ تکلف سے بے نیاز، صاف ستھری اور مؤثر ہوتی ہے۔ انشا پردازی کے جوہر اور قوت کی نمود و نمائش گنجلک تراکیب اور تکلفِ بیاں کا الجھاؤ ان کی تحریروں میں نظر نہیں آتا۔ ان کی تحریر میں واقعیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں موزوں، مناسب اور عام فہم لفظوں پر مشتمل ایک مختصر سے جملے کی نشست میں سجا کر قاری کے حضور میں پیش کر دیتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت پیدا کرنے کی دُھن میں نادر تراکیب غیر مانوس الفاظ، تکلفِ بیاں، اشاریت اور علامت کے ایسے غلافوں میں چھپا کر اصل حقیقت کو گم نہیں کرتے۔ چناں چہ شاعرانہ سحر طرازیوں کے دلدادہ اکثر ان کی تحریروں کو دیکھ کر مایوس ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مطلب یہ نہیں کہ وہ زبان کی فصاحت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ تنقید کرتے وقت وہ لسانی خوبیوں اور لغزشوں کی پوری طرح گرفت کرتے ہیں۔ میر اثر کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہیں:۔

> "میر اثر کا کلام بہت ہی پاک و صاف اور فصیح ہے اور درد و اثر کی چاشنی رکھتا ہے اور مثنوی تو سلاست و فصاحت کی کان ہے .... مثنوی کی زبان سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے کے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی 'خواب و خیال' کا مقابلہ کر سکتی ہے ...."

وہ اپنی تحریر میں بے جا لفاظی کی گنجائش قطعی نہیں رکھتے اس لئے کہ وہ صرف ٹھوس اور کام کی باتیں کرنا جانتے ہیں۔ بے جا اور غیر ضروری باتیں کرنا جانتے ہی نہیں چناں چہ اسی لئے ان کی تنقید میں جہاں زبان و بیاں اور طرزِ نگارش کی خوبیوں اور خامیوں پر گرفت ہوتی ہے وہاں نفسِ مضمون اور

تخلیق کے خالق (ادیب یا شاعر) کے گردوپیش کی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے مشاہدات و تجربات کی گہرائی میں پہنچ کر ایک مضبوط اور مدلّل رائے قائم کرتے ہیں۔ میرؔ کے متعلق اُن کی رائے قابلِ ملاحظہ ہے:۔

"میرؔ صاحب کے کلام میں سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا کلام ایسا درد بھرا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے ......"

مذکورہ سطور کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یہ جملہ سپردِ قلم کرنے سے پیشتر داخلی اور خارجی کیفیات کا مکمل مطالعہ کیا اور پھر ان خارجی و داخلی محرکات کا تجزیہ نہایت مستحکم تنقید کی صورت میں پیش کر دیا۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدات دیکھ کر اس امر پر یقین اور زیادہ کامل ہو جاتا ہے کہ تنقید بھی تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ زیرِ تنقید مصنّف کی ذہنی کیفیات و واردات کا بھرپور شعور حاصل کرکے اس کے فکر و نظر کی نبض کی ہر حرکت کا مفہوم جان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ بعض اوقات اس کوشش میں مضمون زیرِ تنقید پر قدرت اور تبحّر کے اعتبار سے وہ مصنّف زیرِ تنقید سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں جیسا کہ نواب صدر یار جنگ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"مولوی صاحب موضوع پر اُس وقت قلم اٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کرتے ہیں نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنف پر، اور موضوعِ کتاب پر ...... جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اُس پر، اس کے مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلۂ موضوع کر گیا ہے۔"

مولانا عبدالحق کی تنقید کی ایک امتیازی شان ان کی صلابتِ رائے، خلوص و صداقت

کمال توازن اور معقولیّت ہے ۔ وہ تنقید کو تنقیص نہیں سمجھتے اور نہ ہی تحسین کو تنقید خیال کرتے ہیں وہ پورے صبر و تحمّل اور غور و فکر سے ایک متوازن رائے قائم کرتے ہیں ۔ ان کی رائے کا توازن نہایت مستحکم، پائدار اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ اور ان کی رائے کا یہی توازن فی الاصل ان کی ناقدانہ عظمت کی بنیاد ہے ۔ قدیم تذکروں کے متعلق اُن کا یہ تنقیدی نقطۂ نظر کتنا صحت مند، متوازن اور مناسب ہے :۔

" ہمارے شعرا کے تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر اُن میں بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک محقق اور ادیب کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں ان سے شاعروں کے ضروری حالات اور ان کا ماحول ہمارے سامنے آجاتا ہے"

حالی کی ناقدانہ شخصیت کی نشو و نما میں سرسیّد اور شیفتہ کا اثر مساوی ہے ۔ شیفتہ سے حالی نے "مشرقیت" حاصل کی اور سرسیّد کی معرفت انھوں نے مغربی افکار سے استفادہ کیا ۔ شبلی کی کٹّر "مشرقیت" میں بھی سرسیّد کی "مغربیت" نے خوش گوار اعتدال پیدا کیا ۔ چناں چہ شبلی اور حالی نے تنقید کی جو قدریں اور روائتیں قائم کی تھیں وہ مشرق و مغرب کا خوش گوار، مفید اور متوازن امتزاج تھا ان ہی ممتزج روائتوں اور قدروں کو مولانا عبدالحق نے پوری طرح اپنایا ــــــ ظاہر ہے کہ ان کے نقد و نظر کے بنیادی اصول وہی ہیں جو حالی اور شبلی نے وضع کیے تھے ۔ ان کی تمام تنقیدات اسی امر کا مظہر ہیں ۔ لیکن کلیم الدین احمد نہ جانے کیوں اس امر کا احساس نہیں رکھتے اور اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ مولانا اصولِ تنقید سے بحث نہیں کرتے (یعنی اپنے اصولِ نقد کی وضاحت نہیں کرتے) عبدالشکور نے "تنقیدی سرمایہ" میں اس کا معقول جواب دیا ہے :۔

" یہ اعتراض جس قدر دل چسپ ہے اُسی قدر تبسّم آفریں معلوم ہوتا ہے ۔ ناقد کا فرض تنقید کرنا ہے ۔ "تنقید کے اصول مرتب کرنا اور ان کو شائع

کرانا ایک ضمنی فرض ہے۔ مغرب میں ناقدین پر بہت لے دے ہوئی ہے
لیکن کسی ناقد کی اس فروگزاشت پر شاید ہی کبھی اعتراض کیا گیا ہو"

خود عبدالشکور صاحب نے آگے چل کر جو اعتراض کیا ہے وہ بھی غور طلب ہے:-

"مولوی صاحب کی تنقیدات کو پڑھ کر البتہ ایک آدھ نقص ضرور محسوس ہونے لگتا ہے وہ یہ کہ ان کا انگریزی تنقید کا مطالعہ پہلی جنگ عظیم کے بعد بہت کم جاری رہا ۱۹۱۸ء کے بعد یورپ کے ادب میں خصوصاً روسی ادب میں مختلف النوع تحریکات کار فرما ہوئیں اور جن کے اثرات بہت تیزی کے ساتھ اُردو ادب اور تنقید تک پہنچتے رہے ان تحریکات کے اثر سے مولوی صاحب قدرے کم واقف ہیں چناں چہ ان کی حالیہ تنقیدات کو دیکھ کر بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۸ء سے پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مولانا عبدالحق کے نقد و نظر کی بنیادی قدریں وہی ہیں جن کے نقوش حالی شبلی نے مرتب کیے تھے۔ چناں چہ ان کی تنقید کا خمیر ان ہی روایات سے اٹھتا ہے جن میں "مشرقیت" جزوِ ممتاز ہے۔ کلیم الدین نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بہت مناسب اور درست ہے کہ مولوی صاحب کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے۔ وہ روائت پسند ہیں اور اپنی روایات سے بیگانگی اختیار کرنا اپنی زبان اور ادب کے لیے باعثِ ضرر سمجھتے ہیں۔ انگریزی ادب سے استفادہ عبدالحق ضروری خیال کرتے ہیں لیکن بقدرِ ضرورت اور شدّت سے نہیں کہ اپنے اندازِ فکر کا گلا گھونٹ کر اپنی انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔ انگریزی یا دوسری کسی زبان کا مزاج قطعی طور پر ہماری زبان کا سا نہیں ہو سکتا۔

ہر زبان کے ادب کی کچھ مخصوص روایات ہوتی ہیں چناں چہ مغربی ادب میں وقوع پذیر ہونے والے تغیّرات بجنسہٖ ہمارے ہاں جگہ نہیں پا سکتے۔ ہمارے ہاں کے تقاضے مختلف ہیں۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سے روسی ادب اور مارکسی منظریات نے بہت کچھ اشتعال جانب داری اور بغاوت کے جذبات کو ابھارا ہے۔ روسی ادب کے

مقلدّین نے شدّت پسندی اختیار کر لی ہے، توازن کھو بیٹھے ہیں اور اپنی روایات سے جامد بے جا تفاخر محمود خیال کرتے ہیں ان کی اپنی فکری صلاحیتیں بتدریج غیر محسوس طور پر مفلوج ہو رہی ہیں اور فکری و نظری انحصار بڑھ رہا ہے۔ فکری و نظری انحصار ادب کی توانائی کے انحطاط کا باعث ہوا کرتا ہے۔

مولانا عبدالحق روائت پسند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو ادب میں کسی دوسرے ادب کی اشتہاریت کے رجحان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ شاید اسی وجہ سے بہت سے ناقدین کو ان میں رجعت پسندی اور قدامت کے آثار ملتے ہیں۔ عبدالشکور بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر عبادت کی یہ رائے بہت وقیع اور صائب ہے:-

"ڈاکٹر عبدالحق اُردو زبان اور ادب کے سب سے بڑے محقق ہیں اور محققین نے اُردو تنقید میں جس تنقیدی روایت کے سلسلے کو قائم اور باقی رکھا ہے اس میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ حالی نے جس تنقیدی روایت کی بنیاد رکھی تھی اس کو پوری طرح ڈاکٹر عبدالحق نے اپنایا ہے۔ حالی کی طرح انھوں نے قدیم روایات کی اہمیت شدت سے محسوس کی ہے اور ان کو سامنے رکھ کر ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ایسی تنقیدی روایات کو برتنے کی طرف اپنا رجحان بھی ظاہر کیا ہے جو تہذیب، ادب اور تنقید کے گہرے شعور ہی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح گویا تنقید کے نئے تجربات کا خیال بھی رکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ادب اور اس کے مختلف مسائل کو سمجھنے میں وہ تمام باتیں پیش نظر رکھی ہیں جن کو نئی تنقید ضروری قرار دیتی ہے۔ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔"

مولانا عبدالحق رجعت پسند نہیں ہیں بلکہ روایت پسند ہیں انھوں نے قدیم ادبی روایات اور جدید تنقیدی رجحانات میں کامیاب توازن قائم کیا ہے اور اس طرح اُردو تنقید کو جو معیت کے وصف سے بہر

داد کا تجزیہ بھی ملتا ہے اور مولانا نہایت معقولیت سے دونوں پہلوؤں کو زیرِ تنقید لاتے ہیں اور ہر ممکن توازن لحاظ رکھتے ہیں مثلاً میرؔ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہیں:۔

"اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے، الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکہ دیتی ہے، وہ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں.........."

مولانا عبدالحق کی تنقید منصفانہ، وقیع اور جامع ہوتی ہے ان کے مزاج میں تحمّل، اعتدال، متانت اور شفقت ہے اور یہی اُن کی تنقید کی شان ہے یہ متانت، تحمّل، شفقت اور حقیقت پسندی انھوں نے حالؔی کی معرفت شیفتہؔ سے پائی۔ چناں چہ ان کے متعلق عام طور پر ناقدین کی رائے یہی ہے کہ وہ شیفتہؔ اور حالؔی سے متاثر ہیں۔

اسکاٹ جیمس کے خیال کے مطابق چوں کہ نقّاد کو رہبر خیال کیا جاتا ہے اس لئے ایک بڑے نقّاد کے لیے انصاف پسندی، متانت اور اصابتِ رائے کی صلاحیتوں کے علاوہ مطالعے کی وسعت بھی ضروری ہے مولانا عبدالحق جیّد عالم ہیں اور وسیع مطالعہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں بصیرت کی گہرائی و گرفت کی صلابت ملتی ہے۔ مولانا عبدالحق تنقید نگاری کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں چناں چہ وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں تو خوب غور و فکر اور گہرے مطالعے کے بعد پورے اعتماد اور جماؤ سے تنقید نگاری کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ عدم وثوق اور شک و اشتباہ کی کیفیت میں وہ تنقید سے گریز کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید جان دار، ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہوتی ہے۔ اور جامعیت کے وصف سے یکساں متصف ہوتی ہے۔

مولانا عبدالحق کی تنقید میں تحقیق و تلاش کی تگ و تاز کا اظہار بالعموم ہوتا ہے۔ تحقیق کو تنقید سے پورے التزام کے ساتھ شبلؔی نے وابستہ کیا اور شبلؔی کے بعد اس اقدام کی صحیح قدر و قیمت کا

بھرپور اندازہ شاید ڈاکٹر عبدالحق ہی نے کیا ہے چناں چہ تنقید نگاری کے میدان میں انھوں نے صرف حالیؔ ہی سے اکتساب نہیں کیا بلکہ شبلیؔ سے بھی بہت کچھ پایا۔ تنقید نگاری کے سلسلے میں انھیں کلیتاً مکتبِ حالیؔ سے منسلک کر دینا قرینِ حقیقت نہیں حالیؔ کی تنقید کی قدر و قیمت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حالیؔ کے ہاں فکر و نظر کی گہرائی تو ہے مگر تحقیق و تلاش کی گہرائی نہیں شبلیؔ کا یہ خیال درست ہے کہ حالیؔ کنوئیں کی مانند ہیں جو محدود ہوتا ہے لیکن گہرائی رکھتا ہے اور خود شبلیؔ نہر یا دریا کی مانند ہیں جس کی گہرائی اس کی وسعت کی بہ نسبت بہت معمولی اور حقیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے کنوئیں کی گہرائی اور دریا کی وسعت کو ہر دو بزرگوں سے کچھ اس طرح اصل سے بڑھ کر اپنایا کہ وہ بحرِ ذخّار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو کنوئیں سے کہیں زیادہ گہرائی اور دریا سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔

رچرڈس کا کہنا ہے "جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لئے کرتا ہے نقّاد وہی کام ادب کے لئے کرتا ہے" رچرڈس کا یہ قول بالکل مولانا عبدالحق کے حسبِ حال ہے۔ ان کی تنقید میں قصّاب کی سی بے رحمی نہیں بلکہ ایک ہمدرد جرّاح اور ڈاکٹر کے لہجے کی سی ملائمت اور شفقت ملتی ہے۔ وہ تنقید کو خوردہ گیری، عیب جوئی یا جزرسے کل پر خوب و ناخوب کا کوئی مطلق حکم لگانا ہی خیال نہیں کرتے اور نہ ہی تحسین کو تنقید قرار دیتے ہیں بلکہ وہ تنقید کو ایک فن جان کر حیات کی مستحکم قدروں کا پورا پورا احساس رکھتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ زیرِ تنقید

ہونے سے محفوظ کیا اور یہی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ ترکی کی محبِ وطن، ادیب اور راہنما خاتون خالدہ ادیب اُن کے متعلق لکھتی ہیں :۔

"سن رسیدہ علما میں جو ادبی تحقیقات اور اُردو زبان پر جدید معروفی اصول کے مطابق ناقدانہ تصنیف کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں مولانا عبدالحق ہیں۔"

الغرض مولانا عبدالحق کی اُردو تنقید کے لئے خدمات ناقابلِ فراموش اور نہایت گراں قدر ہیں۔ اُردو تنقید کی طفولیت کے عہد میں حالی نے اُسے آدابِ نشست دیئے، شبلی نے قوتِ ایستادگی عنایت کی اور عبدالحق نے اندازِ خرام بخشا۔

عبدالحق کی تنقیدات نے فنِ تنقید کو ایک اہم اور ممتاز مقام بخشا۔ یہ مولانا عبدالحق ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم تنقید کے ذوق کو پھلتا پھولتا دیکھ رہے ہیں اور یہی کہ جو حالی کے زمانے تک بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھتی تھی آج پورے کمال کے ساتھ بھاگ رہی ہے، دوڑ رہی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے آج ہر نقاد بے واسطہ یا بالواسطہ ان کا اثر ہے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے پورے خلوص سے اُردو تنقید کی پرورش کی ہے اور اس پرورش میں ہر ممکن احتیاط کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مولانا عبدالحق "بدنام" رجعت پسندوں اور "نام نہاد" ترقی پسندوں کا مشترک قیمتی سرمایہ ہیں۔

بقیہ : دیوانہ محسن

وہ شکل ہے جو ملتان سے اسپین تک ہر کہ ومہ کی آنکھوں میں رس بس گئی ہے۔ سمجھا دو ان کو کہ پردیسی کا پیار سرما کی چاندنی ہے۔ مفلس کی جوانی ہے اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا ——
تم نے اچھا کیا کہ وقت پر مجھے آگاہ کر دیا۔ اب میرے سینے میں نئی امنگیں بیدار ہو رہی ہیں۔ نئے ارادے جنم لے رہے ہیں۔ نئی ہمت اور نئے حوصلے مجھے مسکرا مسکرا کر تھپکیاں دے رہے ہیں۔ میں یہاں بھی دکن کی مثال قائم کرکے دم لوں گا۔ جاؤ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ——

معین الرحمن

مولوی عبدالحق کا مرتبہ

اردو زبان و ادب میں ڈاکٹر عبدالحق کے مقام کی تعیین کے لئے ہمیں سب سے پہلے اردو نثر کی تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا اردو ادب نے تدریجی ارتقا کے پس منظر کو خارجی محرکات اور متعلقہ ادوار کے عمرانی و طبعی میلانات کی روشنی میں جانچنا ہوگا پھران رجحانات سے پیش نظر یہ پتہ لگانا ہوگا کہ یہ" پری وش" عبدالحق صاحب کی مساعیٔ مشکورہ سے قبل کس رنگ و روپ میں تھی اس میں کس قدر دم خم تھا اور مولوی عبدالحق صاحب نے اسے کیا کچھ حسن بخشا اس کی کس حد تک ٹھوس اور تجریدی قدروں پہ آبیاری کی ہے اس میں کتنا پھیلاؤ کتنی وسعت اور کس قدر تنوع پیدا کیا۔ داستانِ ادب بجائے خود ایک طویل مبحث ہے یہ سطور یقیناً غائر تجزیئے کی متحمل نہیں ہو سکتیں اس لیے ہمیں اردو نثر کے ماضی پر اجمالی اچٹتی اور سرسری نظر ڈالنے پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا۔

اردو نے گنگا جمنا کے دوآبے میں جنم لیا تو فارسی درباری زبان تھی گھروں میں بے شک اردو ہی بولی جاتی لیکن ہر طرف فارسی کا ہی چرچا اور اثر تھا گو اردو کی ابتدا دسویں صدی کے وسط سے ہو گئی تھی لیکن اس نے تحریری انداز کافی بعد کئے پایا [1]۔ شمالی ہند سے ہندوستانی زبان سب سے پہلے علاؤالدین خلجی کے ذریعے ۶۹۲ ہجری میں گجرات پہنچی خلجیوں کے دورِ تسلط اور تغلق عہد میں لشکر کے علاوہ ہر قسم کے لوگ دلی سے گجرات پہنچے اور ان ک

---

[1] ماخوذ از مضمون "اردو زبان کے قدیم کتبے" رسالہ "اردو" شمارہ اپریل ۱۹۳۸ء نوشتہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق

زبان دکن کی طرح گجرات میں بھی پھیل گئی یہاں پہنچ کر ہی اس نے صحیح معنوں میں ادبی حیثیت حاصل کی اُردو کا ابتدائی رجحان مذہبی تھا کیوں کہ صوفیا کرام کا مسلک دراصل فیضانِ عام ہوتا تھا اس لیے وُہ طالبانِ فیض تک جن میں زیادہ تر طبقہ عوام کے لوگ ہوا کرتے اپنی تعلیم اور پیغام پہنچانے کے لئے اُنھیں کی زبان میں گفت وشنید کرتے گو زبان وادب کی ترویج واشاعت ان کا مقصود نہ تھا پھر بھی گجرات و دکن میں ان کے طفیل اس زبان کو جو آج اُردو کے نام سے مضمون ہے بہت کچھ فروغ حاصل ہوا چناں چہ گجرات کے ان بزرگوں میں سے بعض کے ہندی اقوال اب تک محفوظ ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو نے ذرا قدم جمایا تو کچھ مذہبی رسالے اور قصّہ کہانی کی کتابیں لکھی گئیں ان ہی کتابوں میں فضل علی فضلی کی "دہ مجلس" ہے جو فارسی کی معروف کتاب "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے یہ وہ زمانہ ہے جب فارسی انشا پردازی کا ڈھنگ یہ تھا کہ بڑے لمبے اور گنجلک قسم کے جملے قافیے کے التزام کے ساتھ لکھے جاتے نفسِ مضمون کو اس قدر پُرپیچ انداز میں بیان کیا جاتا، مقصد کی طرف رجوع کے لئے اس آن بان سے گریز باندھی جاتی، استعاروں اور تشبیہوں میں وہ جودتِ طبع دکھائی جاتی کہ بس مطلب اسی زور اور طمطراق کی نذر ہوجاتا۔

اُردو نثر نگاروں نے اسی کا اتباع کیا اور نثر میں خوب خوب لفّاظی سے کام لیا تحریر جس قدر بھی فہم سے بالا ہوتی اسی قدر قابلِ تحسین اور معیاری گردانی جاتی (۱) مرزا رفیع سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ پیچ دار مقفّی اُردو میں لکھا مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کا اُردو ترجمہ کیا چند سال بعد شاہ عبدالقادرؒ نے ترجمہ کیا گویہ ترجمہ بھی سلیس نہیں پھر بھی پہلے ترجمے کی نسبت ادائے مفہوم کے اعتبار سے زیادہ صاف مختصر اور دل کش ہے۔ فضلی کی "دہ مجلس" سے قریب ساٹھ ستر برس بعد "نوطرزِ مرصّع" منصّۂ شہود پر آئی میر عطا حسین تحسین کی یہ نثری یادگار جو قصّہ چہار درویش کا چربہ ہے اپنے تصنّع وتکلّف کے ساتھ اب بھی موجود ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی عبارت میں بھی بہت رنگینی ہے لیکن پھر بھی "دہ مجلس" کے مقابلے میں گوارا ہے

سلطنتِ[2] مغلیہ کے زوال پر جب انگریزوں نے ملک کے بڑے حصّے پر اپنے قدم جمائے تو محکومین کی تہذیب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے انھیں اُردو سیکھنے کا احساس ہوا اس غرض سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ کلکتہ میں بہت سے باکمال اہلِ قلم حضرات کا جمگھٹا ہوگیا کالج کے سربراہ جان گلکرائیسٹ نے

---

[1] "داستانِ تاریخِ اردو" از پروفیسر حامد حسن قادری

[2] "ناول کی تاریخ وتنقید" از علی عباس حسینی

جو خود اچھے انشا پرداز تھے ان سے فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرایا اور قصے کہانی کی کتابیں لکھوائیں اس طرح نثر کی ترویج کا سلسلہ شروع ہوا چناں چہ میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین، خلیل خاں رشک، نہال چند لاہوری، للو لال بینی نرائن اور اکرام علی وغیرہ نے قصے کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا، خود کہانیاں لکھیں اور زبان کی صفائی میں نمایاں حصہ لیا۔

اس زمانے میں معیاری نثر قلعۂ معلّٰی کی زبان تھی جس میں آورد کا آمد پر غالب ہونا فطری تھا سادہ سی بات کو تصنع و تکلف سے پیش کرنا ضروری خیال کیا جاتا لیکن پھر بھی زبان میں پہلے کی سی تعقید لفظی نہیں زبان کافی صاف اور سمجھ میں آنے والی ہے میر امن نے "باغ و بہار" کے نام سے چہار درویش کی کہانی لکھی جسے میر عطا حسین تحسین "نوطرز مرصع" کے نام سے لکھ چکے تھے[1] ــ "باغ و بہار" لکھتے وقت "نوطرز مرصع" ضرور میر امن کے پیش نظر رہی لیکن ان کی زبان میں بہت صفائی سلاست اور بے ساختگی ملتی ہے شیرینی اور فصاحت کے اعتبار سے اس زمانے کی کوئی اور کتاب اس کے ہم پلہ نہیں۔ گلکرائیسٹ نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھوائیں گو ان کتابوں کی زبان اور آج کل کی زبان میں بہت فرق ہے پھر بھی ان کی عبارت بڑی سادہ ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے فارسی نثر کے پُر تکلف طرز سے الگ راہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے متعلقہ انشا پردازوں کے علاوہ اس زمانے میں اور بھی بہت سے نثر نگاروں نے نام پیدا کیا میر انشا اللہ خاں انشاؔ کی "رانی کیتکی" اور "دریائے لطافت" جو خاص طور پر زبان دانی کے اظہار کے لیے لکھی گئیں اپنی مثال آپ ہیں۔ میر امن دہلوی اور انشاؔ کے برعکس رجب علی بیگ سرور نے اپنی نثر کو صنائع بدائع اور قافیہ پیمائی کے سبب چمکانے کی کوشش کی۔ میر امن کی "باغ و بہار" کے مقابلے میں سرور کے "فسانۂ عجائب" میں الفاظ کا نظر فریب طلسم ضرور ہے لیکن اس لفاظی کے سبب عام فہم نہیں۔ بہر حال فورٹ ولیم کالج سے منسلک اصحاب نے سلیس نگاری کی شاہ راہ قائم کرکے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔

اردو[2] کے اس ابتدائی دور ہی میں سیاسیات نے ادب کی نشو و نما پر اثر انداز ہونا شروع کردیا۔ فورٹ ولیم کالج کا دارالترجمہ بند ہوا میکالے کی مشرق ناشناسی کے سبب ملکی زبان ذریعۂ تعلیم بننے سے محروم ہو گئی اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی کا فروغ اور ملکی زبانوں کی بے قدری کا آغاز ہوا[3] ــ ۱۸۲۰ء سے غدر تک کے پر آشوب زمانہ میں سادہ اور پر تکلف نثر میں مستقبل کے لئے بڑی کھینچا تانی رہی لطف کی بات یہ ہے کہ

---

[1] "ناول کی تاریخ و تنقید" از علی عباس حسینی

[2] "ناول کی تاریخ و تنقید" از علی عباس حسینی

[3] "مختصر تاریخ زبان اردو" از پروفیسر غلام حسین

رٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے مختلف علوم وفنون کی تابیں ترجمہ و تالیف ہو گئی تھیں اور ان میں سے اکثر طبع بھی ہوئیں۔ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی جگہ اردو وسرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوئی ۱۸۳۵ء میں اخبارات کو آزادی ملی اور اردو نثر کا رجحان عام ہوگیا ۱۸۵۰ء میں غالبؔ نے اردو نثر کی طرف توجہ کی انھوں نے اردو میں باقاعدہ کتاب کی صورت میں بے شک کچھ نثری سرمایہ نہیں چھوڑا پھر بھی ان کے خطوط اس عہد کی نثر کے شاہ کار ہیں انھوں نے اپنے نام ہم عصروں کے برعکس "مکاتبہ" کو "مکالمہ" کر دیا اور اردو نثر کو وہ بے تکلّفانہ انداز بخشا کہ جس پر اردو نثر ن کی بے حد زیر بار منت ہے۔

غدر کے بعد انشا پردازوں کا ایک اور گروہ پیدا ہوا اس وقت تک اردو کا سرمایہ بہت محدود تھا اس نئے گروہ کی کاوشوں نے جس کے سربراہ سرسیّد احمد تھے اردو نثر کو بہت سنبھالا دیا۔ اس گروہ نے مغربی طرزِ انشا سے آشنا ہو کر اردو نثر میں انقلاب پیدا کر دیا ۱۸۶۳ء[1] میں انگریزی سے اردو تراجم کے لئے غازی پور میں "سائنٹی فک سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی انگلستان کا دورہ کرنے کے بعد سرسیّد نے "تہذیب الاخلاق" نامی ایک رسالہ نکالا اس رسالے نے اردو نثر اور اس کے اسالیب بیان کو بہت رواں، سادہ اور صاف کیا عبارت میں آزادی کا عنصر پیدا کیا اخلاقی، معاشرتی اور اصلاحی رجحانات بھی اردو نثر کے فروغ کا باعث ہوئے سرسیّد اور ان کے ہم عصروں میں ایک مخصوص گروہ نے اردو کے مانجھنے میں بڑا حصّہ لیا مغربی علوم وفنون کے جواہر پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں زبان میں نئی اصطلاحیں اور نئے لفظ داخل کیے گئے اور زبان کو علمی مضامین کے اظہار کے قابل بنانے کی طرف توجہ کی گئی۔

اس علمی دور میں مولوی عبدالحق کی نشو و نما ہوئی انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو سرسیّد۔ آزادؔ۔ نذیر احمد۔ حالیؔ اور شبلیؔ کا شہرہ تھا جنھیں اردو نثر کے عناصرِ خمسہ کہا جاتا ہے مولوی عبدالحق کو سرسیّد اور حالیؔ ایسے علمی مذاق کے مالک مشاہیر کی صحبت نصیب ہوئی ان ہی کی تربیت اور فیضِ صحبت نے مولوی صاحب کے مذاق

---

[1] ماخوذ از مضمون "سرسیّد مرحوم اور اردو لٹریچر" نوشتہ شبلی نعمانی

[2] "مختصر تاریخ ادب اردو" از ڈاکٹر اعجاز حسین

کو نکھارا، طبیعت میں ٹھہراؤ، تحمّل اور ضبط پیدا کیا، نتیجتاً متانت، اعتدال، قوت، صفائی اور سادگی ان کی تحریر کے امتیازی نشان ہیں طبعاً سادہ مزاجی کے باعث بھی وہ خصوصاً حالی سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ گرد و پیش پھیلے ہوئے ماحول کے زیر اثر انھوں نے ابتدا ہی سے جو شغل اختیار کیا وہ مضمون نگاری تھا۔ شمس العلما مولوی عبدالرحمان صاحب کے لکھنے کے مطابق مولوی عبدالحق نے زمانۂ طالب علمی (۱۸۷۹ء) میں سرسیّد کے مشہور آفاق رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں اُردو کے مستقبل پر ایک مضمون لکھا جسے بہت پسند کیا گیا اس وقت کسے خبر تھی کہ آپ کا سارا استقبال گیسوئے اُردو سنوارنے میں بسر ہوگا۔

مولوی عبدالحق[1] صاحب علی گڑھ کالج کے ابتدائی زمانہ (۱۸۹۴ء) کے بی۔ اے ہیں یہاں یہ ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا کہ مولوی صاحب موصوف نے علی گڑھ کالج سے الہ آباد یونی ورسٹی کا امتحان دیا لیکن کامیابی کی اطلاع پر بی۔ اے کی سند لینے بھی وہاں نہیں گئے ۱۹۳۷ء میں آپ کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسی جامعہ نے آپ کو ڈاکٹریٹ کا خلعتِ فضیلت پہنایا۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی طرف سے بھی انھیں "ڈی لٹ" کا یہی اعزاز حاصل ہوا۔ بی۔ اے کر چکنے کے بعد مولوی صاحب کچھ دن پنجاب رہے پھر حیدر آباد چلے آئے یہاں چند سال مدرسہ آصفیہ حیدر آباد کے صدر مدرس رہے۔ ریاست کی معتمدی امورِ عامہ میں مدتوں مترجم کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۱۱ء میں ناظم تعلیمات کے مددگار اور چند ہی ماہ بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کیئے گئے علمی تجربے سے قطع نظر تعلیم یافتہ طبقے میں آپ کی علمی وسعتِ نظر اور پاکیزہ طرزِ نگارش جانی پہچانی تھی ۱۹۱۲ء[2] میں علی گڑھ تعلیمی کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی کے موقع پر شعبۂ ترقیٔ اردو کے سیکریٹری کی حیثیت سے آپ کو منتخب کیا گیا اس انتخاب نے ان کے لیے ایک نئی راہ

---

[1] "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقیٔ اُردو" مرتبہ سیّد ہاشمی فرید آبادی

[2] "انجمن ترقیٔ اُردو کی کہانی مطبوعہ (۱۹۳۸ء)" از غلام ربّانی

کھول دی وہ اس اقلیم جدید میں اس جوش جذبے اور شوق سے داخل ہوئے، ترقیٔ اُردو کی دُہ دُھن سوار ہوئی، کہ بس یہی عنوانِ زیست بن کر رہ گئی ۔

مولوی صاحب شعبۂ ترقیٔ اُردو کے سیکرٹیری منتخب ہوئے تو سرسیّد کی تحریک نے عوام کے خیالات و احساسات میں انقلاب بپا کیا ہوا تھا مغربی تعلیم کی طرف لوگوں کا عام رجحان تھا اس تحریک کا ادراک و شعور سرسیّد کے تربیت یافتہ مولوی عبدالحق سے زیادہ اور کسے ہو سکتا تھا جن کی زندگی کا آغاز ہی ایم اے او کالج کی چہار دیواری میں ہوا ۔ انھوں نے تالیف و تراجم کے کام کے آغاز کے ساتھ ہی زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان اور عام فہم بنانے کی طرف توجہ کی، زبان کو علمی مضامین کے اظہار کے قابل بنانے کے لیے علمی موضوعات پر تصانیف و تراجم کے سلسلے کو تیز تر کر دیا۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی دقت ان کی مخصوص اصطلاحات تھیں جن کے مترادف مشرقی زبانوں میں نہ ملتے تھے ۔مولوی عبدالحق صاحب نے اصطلاحاتِ علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایسی مسلسل سعیٔ و محنت سے جوان کا طرۂ امتیاز ہے مختلف علوم کی اصطلاحات کو مرتب کر کے چھپوایا، ان کی کئی کئی بار بار ترمیم و تصحیح کی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے ۔

مولوی عبدالحق صاحب اُردو کے جیّد عالم اور ماہرِ لسانیات ہیں "قواعدِ اُردو" کے نام سے اُردو زبان کے اجزائے صرفی و نحوی اصول پر ان کی مجتہدانہ تالیف بڑی گراں قدر، مبسوط، جامع اور مستند ہے اس میں الفاظ کی ساخت کے ارتقائی تغیّرات، مرکبات و محاورات، عبارت کی نحوی ترکیب اور عروض کے ضروری اُصول و قواعد پر ایسی مرتّب اور مشرّح تفاصیل بہم پہنچائیں کہ زبان کے معارف سے تمام و کمال آگاہی ہو جاتی ہے علمی حلقوں میں اس کتاب کو اس موضوع پر سند اور حجّت تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۳۰ء میں حکومتِ حیدر آباد نے مولوی صاحب کو جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کا صدر مقرر کر دیا اور اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تالیف کی خدمت سپرد کی مولوی عبدالحق صاحب ہی کے لفظوں میں ایک کامل و جدید مستند لغت میں

> "ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیّر ہوئے اس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معانی پیدا ہو گئے ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہوگی یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے اصل زبان میں اس کے کیا معنی تھے اور

اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لئے اصل یا اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے اس کے علاوہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مماثل اور ہم علاقہ الفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل مگر مختلف الاصل الفاظ کی تحقیق اور ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔"

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار کٹھن اور محنت و وقت طلب ہے معقول عملے اور خاطر خواہ مددگاروں کے علاوہ اس کے لیے فراہمیٔ سرمایہ بھی بڑا اہم مسئلہ ہے بہر حال بڑی مستعدی سے لغت کی تالیف کا کام شروع ہوا مولوی صاحب[1] کی نگرانی میں سنسکرت اور ہندی کے بعض ماہرین الفاظ کی اصل اور سرگزشت کا پتہ چلانے کے لیے مقرر کیے گئے نظم ونثر کی مستند کتابوں سے الفاظ و اسناد ڈھونڈنے میں کئی کئی صاحب مصروف رہے مگر قدم قدم پر مولوی صاحب کی رہنمائی شامل حال رہی وہ جزوی تلاش و تحقیق تک میں شریک ہوتے یہاں تک کہ دس بارہ برس میں اس کام کے لیے قابلِ قدر مواد فراہم ہو گیا چند اجزا حیدر آباد کے سرکاری مطبع میں چھپے تھے کہ یہ سرمایہ تقسیمِ ہند کی نذر ہو گیا اس لغت کی تکمیل بڑی تندہی سے جاری ہے۔ تمام اہلِ علم کی نظریں اس لغت کی طرف لگی ہوئی ہیں اُردو کی یہ لغتِ کبیر جو بڑی تقطیع کے تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر آٹھ جلدوں میں چھاپی جائے گی اپنی افادیت اور اُردو کی صلاحیت کے ثبوت میں مولوی صاحب کے "احسانِ عظیم" اور "حسنِ تنظیم" کی فقیدالمثال یادگار ہوگی۔ ویسے ۱۹۳۷ء میں بڑی تقطیع کے دو کالمی ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات پر انگریزی کی جدید ترین "آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری" چھاپی گئی جس میں تقریباً ۲ لاکھ انگریزی الفاظ و محاورات کے ہم معنی اُردو الفاظ دیئے گئے ہیں یہ لغت بھی مولوی صاحب کی رہبری میں متعدد اہلِ علم کی دس گیارہ سال کی محنت سے تیار ہوئی طلبہ کی سہولت کے لیے اس کی تلخیص بھی کر دی گئی ہے ہندوستان کی کسی اور زبان میں انگریزی کی اتنی بڑی لغت کا وجود نہیں ملتا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اُردو ادبیات کے عظیم محقق شمار کیئے جاتے ہیں انھیں تاریخ سے عموماً اور تاریخِ زبانِ اُردو سے خصوصاً بڑی دل چسپی ہے ان کی تحریر[2] میں جگہ جگہ تاریخی موشگافیاں ملتی ہیں اُردو کی ابتدا اور اس کے تدریجی ارتقا پر ان کی بہت گہری نظر ہے اور یہ ایسا شعبہ ہے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی جستجو و تحقیق نتائج کے اعتبار سے زبان کی تاریخ پر ایسا گراں قدر احسان ہے جسے اہلِ اُردو کبھی فراموش نہیں

---

[1] "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقیٔ اردو" مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی

[2] "تنقیدی سرمایہ" از پرنسپل عبدالشکور

کر سکتے انھوں نے متعدد قدیم و نایاب تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور طبع کراتے ان میں میر کی نکات الشعرا[1] اور ان کی خود نوشتہ سوانح حیات" ذکرِ میر" ایسی بیش بہا تاریخی دریافت کے درجے کی چیزیں بھی شامل ہیں اس کے علاوہ انھوں نے بیسیوں دکنی مخطوطات گمنامی کے عمیق گڑھوں سے نکال مارے قدیم اردو کے یہ گراں مایہ جواہر ریزے جو صدیوں سے دور دست مقامات خصوصاً غیر معروف خانقاہوں کے بوسیدہ بستوں میں موجود تھے مولوی صاحب کی تلاش صادق سے جمع ہوگئے ان نوادرات ہی میں نویں صدی ہجری کے ثلث اوّل کے ایک نسخے کو اردو کا سب سے قدیم نسخہ سمجھا گیا ہے ان پارینہ سال کرم خوردہ کتابوں کی فراہمی سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ان کا پڑھنا تھا اکثر خط نسخ میں لکھی گئی تھیں مزید ہندی اصوات حروف و اعراب مختلف تھے کتنے ہی لفظ متروک ہوچکے ان کو پڑھ کر مطلب اخذ کرنا بڑا کٹھن ودشوار تھا جناب مولوی صاحب نے یہ "ہفت خواں" طے کیں اور قدیم دکن کی اعلا درجے کی منظوم کتابیں تصحیح تحشیہ فرہنگ الفاظ کے ساتھ اہلِ اردو کے سامنے پیش کیں۔

مولوی صاحب کے تحقیقی مقالات اور قدیم نظم و نثر کی اشاعت نے اس عام نظریئے کو کہ اردو لشکری زبان ہے جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہ جہاں کے عہد میں جنم لیا باطل کر دیا، مولوی عبدالحق صاحب نے بابر کی آمد سے بھی سو برس زیادہ بیشتر کی کتابیں معلوم کر ڈالیں۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دیوان پر اُن کے بسیط تبصرے نے اردو داں طبقے میں ہلچل مچا دی۔ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے بڑی تقطیع اور اعلا درجے کے کاغذ پر تقریباً اٹھارہ سو صفحات میں پچاس ہزار کے قریب شعر اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زبان میں گنگا جمنی ترکیبوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ قدامتِ زبان کے سبب یہ کلیات عسیر الفہم ضرور ہیں لیکن یہ بلاشبہ اردو ہی کی ابتدائی صورت ہے۔[2]

مولوی صاحب کی سعی و تلاش نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ کر دیا اور گیارھویں کی بجائے ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں اسے بولتے ہوئے سنا دیا بلکہ اس کے سبب ہندوستان کی ملّی تاریخ اور تہذیبی وحدت کے مطالعے کا ایک نیا باب کھل گیا۔اس ضمن میں کمال تحقیق و محنت کے حامل ان کے متعدد وقیع و جامع مضامین شائع ہوئے خصوصاً ان کا پرمغز مقالہ' اردو کی نشو و نما میں صوفیا کرام کا حصّہ" جو علاحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہوچکا بڑی جاں فشانی و عرق ریزی کا مظہر ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب جلیل القدر محقق ہونے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سب سے بڑے ناقدِ ادب ہیں

---

[1] ماخوذ از مضمون ڈاکٹر مولوی عبدالحق کتاب "تلخیص لاردو" مرتبہ سید ہاشمی فریدآبادی [2] "کلام سلطان محمد قلی قطب شاہ" از ڈاکٹر مولوی عبدالحق رسالہ اردو شمارہ جنوری ۱۹۲۲ء

ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ انجمن کی طرف سے "چند تنقیدات عبدالحق" کے نام سے شائع ہو چکا اور ایک مجموعہ تراب علی خاں باز نے مرتب کرکے شائع کیا۔ مذاقِ جدید کے مطابق علمی تنقید میں رسالہ" اردو" کو جو مولوی صاحب موصوف کی زیرِ ادارت پچھلے چالیس برس سے نکل رہا ہے اوّلیت کا امتیاز حاصل ہے۔

اس رسالے کے مطابق سیّد ہاشمی فرید آبادی صاحب کی یہ رائے بڑی معقول و مناسب ہے کہ ہندوستان کا تو کیا ذکر ہے یورپ اور امریکہ میں بھی کم رسالے ہیں جن کا معیار اتنا بلند اور مذاق اتنا پاکیزہ ہو اس رسالے میں ابتداہی سے مولوی صاحب کی پُر لطف و پرمغز تنقیدیں اور مستند و وقیع مضامین شائع ہوتے رہے اس رسالے نے تاریخ و تحقیق میں بے نظیر خدمات کے علاوہ علمی تنقید کے نئے باب کھول دیئے عوامی مذاق کے نکھارنے اور ادبِ اُردو کی خدمت میں مولوی صاحب نے اس رسالے سے بہت کام لیا۔"اُردو" میں تنقیدی و تحقیقی مقالات و مضامین دینے کے علاوہ انھوں نے انجمن کی طرف سے شائع ہونے والی متعدّد کتابوں پر بلند پایہ اور فاضلانہ مقدمات لکھے جو ان کے وسیع مطالعے، نکتہ رسی اور دیدہ ریزی کے آئین ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا مولوی صاحب پر حالیؔ کی شخصیت نے بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ تنقید نگاری کا فن انھوں نے حالیؔ سے ہی حاصل کیا اور[1] ان کے توسل شیفتہ سے متاثر ہوئے۔ بصیرت و شعور، ذاتی رائے زنی کی صلاحیت اور وسعتِ مطالعہ نقد و بصر کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ عقلیت واقعیت اور چھان بین مولوی عبدالحق کی تنقید کے اساسی عنصر ہیں حالیؔ کی طرح اُن کی تنقید میں گہرے تفکّر اور آزادانہ رائے کی کمی نہیں وہ تنقید کرتے وقت اعتدال توازن اور معقولیّت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جذباتیّت یا ذاتی پسند و ناپسند سے کام بے بغیر انتہائی توازن اور عقلیت کے ساتھ اپنی جچی تلی رائے دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی تحریر نہایت پختہ رچے ہوئے تنقیدی شعور کا اظہار ہوتی ہے۔

حالیؔ کے کردار کی تعمیر سادگی اور خلوص سے ہوئی مولوی صاحب بھی سادگی کے دل دادہ ہیں وہ تنقید کرتے وقت مواد اور اسلوب بیان دونوں پر یکساں نظر رکھتے ہیں انھیں فارسی و عربی کی تراکیب سے کوئی دل چسپی نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ زبان کی سادگی اور صفائی پر زور دیتے ہیں وہ عبارت میں غیر ضروری آرائش و زیبائش اور

---

[1] "تنقیدی سرمایہ" از پرنسپل عبدالشکور

نمائی خولی رنگ آمیزی اور انشا پردازی سے کام نہیں لیتے وہ سادہ سے لفظوں میں کام کی باتیں چاہتے ہیں لیکن زبان و اندازِ بیان کے لطف اور ادبی چاشنی اور شان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

مولوی عبدالحق تنقید کرتے وقت نہ صرف زیرِ نقد کلام کے ماحول اور اس دور کے ان معاشرتی و سماجی اثرات پر جس میں اس نے جنم لیا ہے نظر ڈالتے ہیں بلکہ کلیم کے ذہن و دل کے در و بست کو بھی ٹٹولتے ہیں یعنی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حسن پر نظر رکھتے ہیں تنقید ان کے نزدیک محض عقیدت یا منافرت کا اظہار نہیں بلکہ انتہائی ذمہ دارانہ فرض ہے وہ اس وقت تک کسی موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے جب تک کہ وہ خود اسے بخوبی سمجھ اور پرکھ نہیں لیتے موضوع زیرِ نقد کو اچھی طرح ذہن میں رچانے کے بعد وہ تخلیقی عمل کے ماتحت اس کے معائب و محاسن کا تجزیہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید میں حیرت انگیز حد تک عقلیت، اعتدال، متانت و توازن ملتا ہے اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے تجزیئے کے عین مطابق بعض اوقات اُن کا مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلۂ موضوع کر جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کو انسانی سیرتوں کی عکاسی میں بھی کمال حاصل ہے ان کی کتاب "چند ہم عصر" جس کا شمار ادبیاتِ عالیہ میں ہوتا ہے اس کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ مولوی صاحب کی زبان نہایت ستھری رچی ہوئی اور ڈھلی ہوئی ہوتی ہے ان کا اپنا طرزِ تحریر ہے میٹھے میٹھے جملے رواں اور شستہ زبان صدیوں کے مٹھاس اور رس سے مملو ان کا بزرگانہ لب و لہجہ اور دھیما دھیما انداز ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔

مولوی عبدالحق نے اردو زبان کو "برعظیم" میں مقبول و عام بنانے کے لیے تبلیغ سے بھی

کام لیا تقسیم ہند سے پہلے کے نو دس[1] سالہ طوفانی دوروں کی مسافت لگائی جائے تو بات پچاس ساٹھ ہزار میل تک پہنچتی ہے اس سے ان کی ہمّت، استقلال سچی لگن، غیر معمولی تڑپ اور دھن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اس غیر معمولی اخلاص و انہماک، ذاتی قابلیّت اور غیر منقطع جدوجہد سے بیداریٔ احساس اور حمایتِ اردو کی جو عام لہر پیدا ہو گئی اس کا احاطہ بہت دشوار ہے مولوی صاحب کے متعلق غلام ربانی صاحب کے یہ کلمات کہ ان کی پاک اور بلند مرتبہ سیرت ملک کے لیئے ایک سبق ہے ان کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا ہے، ان کی سرگرمیوں اور مستعدیوں کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے ان کی زندگی کا ہر لحظہ اردو کی ترقی کے خیال میں گزرتا ہے۔ سچی تحسین پر مبنی ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ بھارتی حکومت نے غصب کر لیا اس بیش بہا کتب خانے کے علاوہ ان کا تمام اثاث البیت لوٹ لیا گیا اس طرح چاروناچار عمر بھر کے علمی شوق کا سرمایہ آزادی کی نذر کر کے انجمن کا یہ علوہمت معمار اردو کی روحِ رواں بھارت سے نکل کر پاکستان میں آ گیا اور اپنی پیرانہ سالی میں شدید صدمے جھیلنے کے باوجود نئے عزم و ارادے کے ساتھ اُردو کی بلند تر عمارت کی تعمیر میں لگ گیا۔

غرض مولوی عبدالحق کی شخصیّت اُردو ادب میں بڑی منفرد ہے وہ اس صدی ہی کا نہیں بلکہ مستقبل کا بھی لازوال سرمایہ ہیں بقول سیّد ہاشمی فرید آبادی صاحب (مرتب "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقیٔ اُردو) "ان کی شخصیّت اسلامی ہند میں بے غرض خدمت اور ایک ملّی مقصد کے لیئے اپنی ذات کو وقف کر دینے کی حیرت انگیز مثال بن گئی ہے۔"

زبانِ اُردو پر اُن کی شخصیت کے بھرپور اثرات کا نتیجہ ہی تو ہے کہ آج اُردو ادب اور مولوی عبدالحق ایک دوسرے میں جذب و پیوستہ نظر آتے ہیں۔ زبان کو مانجھنے اس کے اسالیبِ بیان کو رواں، صاف ستھرا کرنے اور اس میں لوچ و لچک پیدا کرنے میں ان کا بڑا اہم حصّہ ہے۔ ان کی تحقیق و جستجو نے اُردو زبان کے ماضی میں کئی صدیوں کا اضافہ کیا ان کی

(زبان صفحہ ۲۷۲ [illegible])

---

[1] "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو" مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی

ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی

ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت شخصیت نگار

چند ہمعصر کی روشنی میں

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے حیات وکائنات کے دوسرے مسائل سے منھ موڑ کر صرف اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے ان میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے۔

اردو ان کی حیات ہے اور اردو ہی ان کا سرمایۂ حیات ہے۔

ہر کٹھن وقت پر اردو کی آبرو انھوں نے بچائی ہے اور ہر سخت منزل پر اردو دوستوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ انھوں نے ادبی ہنگاموں میں اپنی ذات کو نہیں الجھایا۔ ان کے سامنے مختلف تحریکوں نے سر اٹھایا۔ اور انھوں نے سرپرستی بھی سب کی کی لیکن صرف اس حد تک جو زبان وادب کی تعمیر و تزئین کے لئے مفید ثابت ہو۔ انھوں نے ہمیشہ ٹھوس خدمت کی اور ہر تحریک سے ٹھوس خدمت کا مطالبہ کیا۔!

ڈاکٹر صاحب کی شہرت عام طور پر ان کے مقدموں کی وجہ سے ہے۔ اور نقادوں کے ایک گروہ نے تو انھیں ایک بہتر مقدمہ نگار کے علاوہ اور کچھ ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس رائے زنی کے پیچھے تنقید نگاروں کی وہ انتہا پسندی کام کر رہی ہے جو مشرق و مغرب کے ادب کو ایک ہی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے، جیسے مشرق کی ہر تعمیر میں اک صورت خرابی کی نظر آتی ہے اور جیسے اسلاف کی ہر روایت ایک گناہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ درجے کی تنقیدی صلاحیت رکھنے کے باوجود اردو ادب کو اس کے پس منظر، محرکات اور عوامل سے الگ کر کے پرکھتے ہیں۔

مقدمات عبدالحق تقریظ نگاری کے سحر نے نکالیں۔ ان سے کسی ادیب یا شاعر کی غیر ضروری تشہیر مقصود نہیں۔

> یہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں تنقید و تحقیق کے عناصر کا خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ تنقید، تحقیق کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

تحقیق سے ایک مصنف یا شاعر کا ہر گوشہ سامنے آجاتا ہے، وہ راستے بھی معلوم ہو جاتے ہیں جن پر وہ تھوڑی دور بھی چلا ہے۔ اس کی تخلیقات ایک بڑی حد تک الحاق و اضافہ اور التباس و اشتباہ کے الزام سے بری ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں قوتِ تنقید اس مصنف یا شاعر کا درجہ متعین کرنے میں غلطی نہیں کرتی۔ نقاد اس مواد پر فتویٰ دیتا ہے جو اس کے سامنے رہتا ہے۔ محقق صحیح مواد نقاد کے سامنے رکھتا ہے!

ڈاکٹر صاحب کے مقدموں سے ان کی بے پناہ علمیت اور وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے وہ ہر مصنف کی تہ تک پہونچکر دم لیتے ہیں، اور پھر تصنیف کے اہم نکات و رموز پر بحث کرتے ہیں۔ بحث میں وہ سرسری یا سطحی بات نہیں کہتے۔ ان کے بحث کا انداز جذباتی بھی نہیں ہوتا۔ ان کا طریقۂ استدلال اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ جس مصنف پر وہ اظہارِ خیال کر رہے ہیں اس کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھا جائے۔ وہ اپنی رائے کے اظہار کے بعد دوسروں کی رائے کا انتظار کرتے ہیں۔ اور شاید اسی سبب سے کبھی کبھی ان پر فیصلے کی عدم قطعیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن الزام لگانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی عدم قطعیت قاری کے ذہن کو بالیدگی و توانائی بخشتی ہے۔

> وہ اپنی نادرانہ نگاہ سے دوسروں کے تنقیدی شعور کو جھنجھوڑ دیا جاتے ہیں۔ وہ ان نقادوں کی صف میں نہیں جو مصنف کی شخصیت نمایاں کرنے کے بجائے اپنی شخصیت نمایاں کریں۔ وہ تنقید سے تسلط و تغلب نہیں، افہام و تفہیم کا کام لیتے ہیں اور تنقید کو اس کے علاوہ کچھ اور ہونا بھی نہیں چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب کے مقدمات وقتی ابال یا جذباتی ہیجان کا نتیجہ نہیں کہ اس کی افادیت پر زوال آجائے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔

> اگر یہ مقدمے نہ ہوتے تو کلاسیکل لٹریچر کے تحفظ و احترام کا اور پھر اسے ایک نئے

ڈھنگ سے پیش کرنے کا جذبہ اتنا عام نہ ہوتا جتنا اب ہے۔

ان مقدموں نے اگر ایک طرف اردو زبان و ادب کی اہم کڑیوں میں روح دوڑا دی ہے تو دوسری طرف خود ڈاکٹر صاحب زندۂ جاوید بنا دیا ہے لیکن ان کی وہ خدمات بھی کم اہم نہیں جو مقدمات کے دائرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان میں سے ایک ان کا فن شخصیت نگاری ہے۔ جس کی طرف ابھی بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

> ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک معاصر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقولہ خود ان کی ذات پر زیادہ صادق ہوتا ہے۔ اپنی اس طویل ادبی زندگی میں انہوں نے نہ صرف اپنے بڑے بڑے معاصرین کو چار چاند لگائے۔ بلکہ ان چھوٹے چھوٹے ہمعصروں کو بھی ادب دوستوں سے روشناس کرایا۔ جن کے اندر ابھی عہد آفرینی کی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوئی تھیں

وہ چاہتے یہ ہیں کہ ہر اس فرد کا نام جان جائے جس نے علم و ادب کو فروغ دینے میں تھوڑی بہت بھی کاوش کی ہے۔ ہم عصر شخصیتوں پر ڈاکٹر صاحب نے اب تک جو لکھا ہے اگر اسے یکجا کیا جائے تو چند ہم عصر جیسی جیسی کئی کتابیں تیار ہو جائیں۔ کبھی کسی کتاب کے سلسلہ میں کسی نئی شخصیت پر وہ بحث کرنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ ادبی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے کئی گمنام شخصیتوں کی طرف بھی اشارہ کر جاتے ہیں اور کبھی ایک ہی شخصیت کو موضوع گفتگو بنا لیتے ہیں۔

شخصیت نگاری کا فن جتنا آسان ہے۔ اتنا ہی مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ اگر کسی کی قوت مشاہدہ تیز ہو تو وہ شخصیت کے ہر نقش اور ہر لکیر کو پہچان سکتا ہے لیکن مشکل اس لئے کہ نقش باطل اور نقش حق میں امتیاز کرنا سب کا کام نہیں۔ یہی وہ منزل ہے۔ جہاں باریک بین شخصیت نگار بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔ اور وہ زمانے کے سامنے کسی شخصیت کا رطب و یابس سب کچھ رکھ دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت مجہول ہو کے رہ جاتی ہے۔ اور زمانہ اس سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب

اس کوچے سے ایک کامیاب شخصیت نگار کی حیثیت سے گزرے ہیں "چند ہم عصر" میں شخصیتوں کے خاکے ہیں اور ظاہر ہے کہ عظیم شخصیتوں کی تصویر دس پانچ صفحوں میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ لیکن انھوں نے ہر شخصیت کا عطر نچوڑ کر ان میں جمع کر دیا ہے اور ان تمام اجزا کو چند صفحوں میں فراہم کر دیا ہے۔ جنھوں نے شخصیت کی تعمیر کی اور جنھوں نے دنیا کی تقدیر بدلنے میں مدد کی وہ ہر شخصیت کی رگ پے پر دوڑ کر اس کا وہ صالح خون نکال لیتے ہیں، جس نے دنیا کی ان گنت شخصیتوں نے اسے ممتاز کر دیا ہے۔ ان کے ہاتھ میں بہنے شخصیتوں کی دکھتی رگیں یا شہ رگ ہوتی ہے وہ جانتے ہیں کہ اور رگوں پر عملِ جراحی کا فعل عبث ہے۔ اس لئے اس رگ پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو فعال اور متحرک ہوتی ہے اور جس کی روشنی میں ایک دنیا فعال اور متحرک بن سکتی ہے۔

بظاہر چند ہمعصر سوانحی خاکے ہیں لیکن ان

خاکوں سے رنگارنگ تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

بظاہر یہ مجمل اشارات ہیں۔ لیکن ان اشارات سے مفصل اور مبسوط کتاب تیار کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے سوانحی خاکوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان سے نہ صرف زیرِ بحث شخصیت کے خط و خال واضح ہو جاتے ہیں بلکہ اس عہد کی رفتارِ ترقی کا بھی حال معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت اور زمانہ کے باہمی رشتوں کو قدم قدم پر جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آ جائے کہ اس شخصیت نے زمانہ کے ساتھ کیا کیا۔ اور زمانے نے اس سے کیا اثرات قبول کئے تدبر و حکمتِ عملی کے زیور سے آراستہ ہونا بڑی اچھی بات ہے۔ محسن الملک کے اندر بھی یہ خصوصیت تھی۔ مگر اس خصوصیت میں تابندگی و درخشندگی اس وقت آتی ہے جب محسن الملک کے تدبّر و حکمتِ عملی کے بیان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ریاست حیدر آباد کے انتظامی کوائف کو بھی بیان کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ محسن الملک کی یہ خصوصیت حیدر آباد کو سنوارنے کے کام آئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہر سوانحی خاکے میں یہ بات ملتی ہے اور وہ زیرِ بحث شخصیت کو کبھی زمانے سے الگ لے جا کر نہیں پرکھتے بلکہ وہ زمانے کے دل کی دھڑکن اور "شخصیت" کی نبض کی رفتار پر بیک وقت توجہ کرتے ہیں۔ اور دونوں کی گرہیں ایک دوسرے کی مدد سے کھولتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شخصیتوں کے نمائندہ نقوش سے ایک عالمگیر صداقت کی بنیاد رکھتے ہیں اور ایک آفاقی اصول مرتب کرتے ہیں مثلاً حالی کی دردمندی، انسان دوستی اور حسمِ دلی سے متعلق وہ چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کرتے ہیں۔

واقعات جمع کرنا کوئی اہم کام نہیں لیکن ان سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حالی کے یہی رجحانات انھیں اپنے وقت کا عظیم انسان بنا دیتے ہیں اور ان کی ادبی زندگی کی تقلید کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ مولانا محمد علی کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ہر بڑی تحریک میں استقلال اور ثابت قدمی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی چیز مولانا کے اندر نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ شخصیتوں کے سیرت و کردار اور ذہن و مزاج کو دنیا کے سامنے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اور نئے چلنے والوں کے لئے ایک آزمودہ راہِ عمل متعین کر دیتے ہیں۔ شخصیت نگاری کا یہ بہت بڑا آرٹ ہے کہ شخصیتیں دنیا کے سامنے مشعلِ راہ بن کر پیش کی جائیں اور ان کو دیکھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ اور امنگ پیدا ہو۔ نہ یہ کہ شخصیتوں کو ایک بت بنا دیا جائے اور دنیا صرف اس کی پرستش

نی ہے - اور اپنے فرائض بھول جائے - ڈاکٹر صاحب کی شخصیت نگاری کا یہ آرٹ اردو میں اپنی مثال آپ ہے - اور اصل میں یہی شخصیت نگاری ہے -

ڈاکٹر صاحب نے "چند ہم عصر" میں زیادہ تر علم و ادب کے رہنماؤں کو اپنا موضوع قلم بنایا ہے اس لئے ان رہنماؤں کی سیرت کے ساتھ ساتھ ان کی خدمات کا بیان کیا جانا ایک فطری بات ہے - اور صحیح تو یہ ہے کہ شخصیت متشکل ہوتی ہے کردار و خدمات کے امتزاج سے - ڈاکٹر صاحب شخصیتوں کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلتے ہیں -

یہ اشارے سادہ اور سپاٹ نہیں ہوتے بلکہ ان

میں بھرپور ناقدانہ نگاہ مستور رہتی ہے -

امیر مینائی، چراغ علی، مولانا بلگرامی، پروفیسر مرزا حیرت - اور دوسری شخصیتوں کے کارناموں پر وہ ایک بے باک ناقد کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں - اور ان کے کھرے کھوٹے کو الگ کرکے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں - وہ کبھی کسی شخصیت کو اس کے اپنے دائرے سے الگ نہیں کرتے - امیر مینائی لکھنؤ کے دبستان شاعری کے آخری چراغ تھے - وہ اس بات کا ذکر اشاروں اشاروں میں کر دیتے ہیں اور امیر مینائی کی شاعرانہ حیثیت متعین کر دیتے ہیں - اسی طرح جب غلام قادر گرامی کی شاعری کی داد دیتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ قدیم اساتذہ کی روش پر چلتا تھا - اور اپنے شعر کو خوب بناتا اور سنوارتا تھا -

وہ سوانحی خاکوں میں اصول تنقید، معیار تنقید، یا ضرورت تنقید پر بھی بحث کرتے ہیں - امیر مینائی نے سرورِ کائنات کی شان میں نعتیہ شاعری کی ہے اور اس باب میں وہ کچھ روشِ عام سے بچ کر چلے ہیں - ڈاکٹر صاحب نے امیر مینائی کی اس روش کی صرف داد دی ہے بلکہ اصول نعت گوئی پر مکمل کر تبصرہ کیا ہے - اور مختصر لفظوں میں اس صنف کا جائزہ لیا ہے - اسی طرح امیر اللغات کے ضمن میں اردو میں لغات کی کمی اور ان کے تدوین کے اصول و ضرورت پر اپنی رائے دی ہے - وہ مرزا حیرت کے فن ترجمہ کو سراہتے ہوئے اس فن کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کرتے ہیں - اور ترجمے کی اچھائی یا برائی کا معیار بیان کرنے لگتے ہیں - اسی طرح مولانا وحید الدین سلیم کے انداز درس و تدریس پر بات کرتے کرتے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے - اور پھر وہ اپنا راستہ خود نکال لیتا ہے یا ان کی شیفتگی علم پر رائے دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کوچے میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم بننا دشوار -

ریسرچ اور تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر صاحب

کی خدمات ناقابل فراموش ہیں -

وہ خود اپنی زندگی کو اس کام میں وقف کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کے لئے آمادہ کرتے رہے " چند ہم عصر" میں بھی وہ اپنے اس رجحان طبع کو ترک نہیں کرتے - جب بھی وہ کسی شخصیت کے بارے میں آخری رائے قائم کرتے ہیں تو وہ نظر تحقیقی اعتبار سے قابل اعتماد ہوتی ہے - شخصیت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ انداز اس بات کا ثبوت ہے کہ

کسی شخصیت کے بارے میں ذاتی تاثرات کو بھی اسی وقت اہمیت حاصل ہوتی ہے جب وہ تحقیقی بنیاد پر حرف باطل نہ ثابت ہوں۔ یہ بڑی سچی بات ہے کہ موضوع خود تحریر کا انداز بدل لیتا ہے۔ تذکرہ یا سوانح میں وہ انداز نہیں چل سکتا جو ناول یا افسانے میں کام آتا ہے، لیکن

> ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ تحریر اتنا پختہ اور بے لچک ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں بڑی دور سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ وہی خفیف احتیاط، وہی سوچی سمجھی بے باکی سے گریز کی کوشش، وہی سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی عادت، وہی دل پر شہد نہ لگنے کا خوف، وہی اصلاحی اور واعظانہ رنگ ہر موضوع میں نمایاں رہتا ہے۔

مگر وہ گمان یہ کرتے ہیں کہ ان کا یہ اسلوب اس موضوع کی ترغیب نہیں معلوم ہوتا۔ ان کی تحریر کبھی کبھی پھیکی اور بے ... معلوم ہوتی ہے۔ مگر کسی حال میں کسی بزرگ کی شخصیت نگاری کے سلسلے میں لب و لہجہ کا ضبط اعتدال ایک لازمی جزو ہے۔ بہر صورت یہ خیال رہنا چاہیے کہ شخصیت نگار نہ تو واقعہ نگار ہے اور نہ مدّاح۔ مداحی اور واقعہ نگاری کا درمیانی راستہ اختیار کرنا حالی سے بھی بعض وقت نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب اس نکتے پر کافی محتاط رہتے ہیں اور ان شخصیتوں کی تصویر کشی میں جن کے ... مدارج تمام ان سے بڑے تھے بڑا سنجیدہ اسلوب اختیار کیا ہے۔

حالی اور شبلی کو دورِ جدید کے رہنماؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کے چراغ سے چراغ جلایا گیا ہے۔ لیکن سوانح نگاری اور شخصیت نگاری کے میدان میں ان کے فن کو ترقی دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا کارواں اتنا آگے بڑھنے کے باوجود بعض راہوں میں اب بھی جامد و ساکت ہے۔

> ڈاکٹر عبدالحق نے جہاں ایک زندہ و توانا ادب کی تمام اصناف پر توجہ دی وہاں سیرت و شخصیت نگاری کے فن کی طرف بھی مائل ہوئے۔ چند معاصر ان کے اسی میلانِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے ان سوانحی خاکوں کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔

ڈاکٹر اختر اورینوی

عبدالحق — بابائے اُردو

مولوی عبدالحق ایک ادیب ہیں، ایک بڑی شخصیت ہیں، ایک تحریک ہیں، ایک سنگِ میل ہیں، ایک علامت ہیں اور ایک مینارِ ہدایت۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے عبدالحق صاحب کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ وہ ایک منفرد طرز کے انشا پرداز ہیں ایک صاحب بصیرت نقّاد اور ایک غائر نگاہ رکھنے والے محقق۔ تفصیلات پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔ میں سرسری طور پر محض اپنے تاثرات پیش کر رہا ہوں۔

سرسیّد مرحوم اور حالی مرحوم کی رہبرانہ انشا پردازی کو عبدالحق صاحب نے متانت، نئی سلاست، نیا آہنگ اور نیا مستقبل بخشا ہے۔

عبدالحق صاحب کے اسلوب میں طاقت، عصریّت اور استواری پائی جاتی ہے۔ اس میں سادگی کے ساتھ ہَی سی نمکینی ملتی ہے۔ نیز ابیّت کہیں نہیں مگر سنجیدہ تیکھا پن موجود ہے۔ عبدالحق صاحب نے اُردو نثر کی صحت مندانہ روایت کو آگے بڑھانے میں بڑا اہم کام کیا ہے۔

ناقد کی حیثیت سے عبدالحق صاحب نے انفرادی نظر، غیر جانب داری اور جراءتِ اظہار کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے۔ ان کی سخن شناسی نے کبھی متانت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہوش مندی بھرپور پن کے ساتھ تعاون کرتی

رہی ہے۔ ان کی تنقید میں اقدار کی چھان پھٹک تو نہیں ملتی۔ لیکن مسلّمہ قدروں کے برتاؤ میں مولوی صاحب بڑی ذہانت اور متانت کو راہ دیتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے اور مشکل کام ہے۔ میرے خیال میں حالی کے ساتھ ساتھ عبدالحق نے بھی اُردو تنقید کی فضا سمت اور مزاج و میلان بدلنے میں بڑی مدد کی ہے۔

تحقیق کے میدان میں عبدالحق صاحب میرِ کارواں ہیں۔

اُنھوں نے اُردو دُنیا کو مائل بہ تحقیق کیا اور خود بھی عملی طور پر نوادر پیش کرتے ہیں۔ عبدالحق صاحب کی روشِ تحقیق شُترِ بے مہار نہیں۔ اُس کی منزل اور منہاج واضح ہے۔ وہ مخطوطات کی محض نقطہ شماری نہیں کرتے، ان کا مقصود نکتہ رسی ہے۔ اُن کے ہاں انتخابِ موضوع کے معاملہ میں بھی توازن پایا جاتا ہے۔ وہ تحقیقِ مہمل نہیں کرتے۔ بعض محقق ہر مفقود و نامشہور کو مشہور و معدود بنانے کے خبط میں رہتے ہیں۔ میرؔ کے سَر کے بالوں کی تعداد کیا تھی؟ یا وفات کے وقت مصحفیؔ کے کتنے دانت تھے؟ غالبؔ نے فلاں فلاں لفظوں کو کتنی بار استعمال کیا ہے؟ ایسے ہی سوالات کے محققانہ جواب دے کر وہ جی کے حوصلے نکالتے ہیں۔ وہ بڑے فن کاروں کی صرف و نحو کی غلطیاں گنتے، ادیبوں کی مٹی پلید کرتے اور ادب و شعر میں کیڑے ڈال کر مسرور ہوتے ہیں۔

دوسرے محققوں سے غار کھاتے ہیں اور اپنی ذہنی کوتاہ قدی کو گردن اکڑا کر دور کرنا چاہتے ہیں۔

مولوی عبدالحق کی تحقیق کارآمد، عظیم اور بصیرت افروز ہوتی ہے۔

تحقیقِ حق میں لغزش و افتاد سے کون بری ہو سکتا ہے؟ لیکن دوسروں کی چوک یا نارسائی پر بغلیں بجانے والے، اپنی ذہنیت اور ظرف کا ثبوت دیتے ہیں۔ سچائی کے اظہار اور سوقیانہ دندان نمائی میں فرق ہے۔ انکشافِ حقائق اور متکبرانہ عیب جوئی میں بڑا بُعد ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیقات یا کسی محقق کے انکشافات حرفِ آخر کبھی نہیں ہوتے۔ سچّا اور بھلا محقق وہ ہے جو انکسار و تعاونِ باہمی کے ساتھ بڑی لگن سے اہم کاموں میں لگا رہے۔ مولوی صاحب نکتہ چینوں کے نیش اور مدّاحوں کے نوش کے باوجود دوبا وصف مخلصانہ طور پر اپنی تحقیق میں مشغول رہے ہیں۔

مولوی عبدالحق کی شخصیّت نہایت ہی بالیدہ و منفرد ہے۔ اس میں ارادہ، عزم، تدبّر، قوّتِ فیصلہ، صلاحیّتِ کارکردگی، دور بینی، معاملہ فہمی، مادّۂ ایثار کے ساتھ ساتھ اخلاص، محبّت، وفاداری، بے غرضی، وقار، حُسنِ اخلاق، شگفتگی اور بذلہ سنجی کے عناصر بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں

وفاداری و دوست پرستی مولوی صاحب کی شخصیّت کی بڑی مشکل گرہیں ہیں۔ اس عقدۂ لاینحل کی وجہ سے خود اُنہیں

وراُن کے مدّاحوں کو بڑی بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے۔ آپ میں خود شناسی اور پندار بھی ہے۔ اُردو کی مہموں میں وقار و پندار بڑے بڑے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن کبھی خود شناسی خود بینی میں اور وقار عجبُ میں بدل جاتا ہے اور انفرادی و اجتماعی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ بہرکیف مولوی صاحب کی شخصیّت مجموعی طور پر بڑی متحرک، محمود و محبوب ہے۔ ایسی شخصیّتیں نادر اور بے بہا ہوتی ہیں

> یہ اُردو کلچر کی سعادت تھی کہ اُسے ایسا سالارِ کارواں ملا
> جس نے ہر محاذ پر اس کی حفاظت میں سینہ سپر کیا
> اور ہر میدان میں اس کی ترقی کے لئے اقدامات کئے۔

بابائے اُردو روحِ عصر اور مسیحائے اُردو ہیں۔

> عبدالحق تاریخِ اُردو کے ایک روشن باب ہیں۔ جب بھی
> جہادِ اُردو کی تاریخ لکھی جائے گی، مولوی صاحب اُس
> کی سُرخئیِ افسانہ ہوں گے اور تمّت بالخیر بھی۔

مولوی عبدالحق صاحب بڑی فعّال و متحرک قوّت کے مالک ہیں۔

> اُنھوں نے اپنے دلِ گرم و جانِ بےتاب کا سوز و ساز، ذوق و
> شوق اس برّصغیر کے سارے اُردو دوستوں کو عطا کیا۔

قریباً نصف صدی سے مولوی صاحب اُردو تحریک کی برقِ مقناطیسی لہریں اپنی ذات سے ایک عظیم ڈائنمو کی طرح بکھیر رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی طبیعت میں سیمابیّت نہیں بلکہ پہاڑوں جیسا جماؤ ہے۔

> وہ اُردو تحریک کی راہ میں بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرائے
> ہیں۔ اور ماضیٔ قریب کی تاریخِ ہند گواہ ہے کہ اُنھوں نے
> کبھی شکست نہیں کھائی۔

میں نہایت قریب سے جانتا ہوں کہ وہ بڑے استوار مزاج کے آدمی ہیں، لیکن وہ صُلح جوئی اور مفاہمت سے گریز نہیں کرتے ڈاکٹر سیّد محمود سابق وزیر تعلیمات، بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی قائم کی تھی۔ برادرِ گرامی پروفیسر سیّد نجم الھدیٰ صاحب اس کے معتمد تھے۔ 'ہندوستانی' کا تصوّر خود گاندھی جی کا پروردہ تھا۔ لیکن حقیقی و عملی دُنیا میں 'ہندوستانی' زبان کی تعریف بڑی کشاکش کی بات اور تصادم خیز مسئلہ بن گئی تھی۔ اس معاملہ میں ہمارے موجودہ راشٹرپتی جی شری راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق صاحب کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے "راجندر عبدالحق پیکٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ سے 'ہندوستانی' کی تعریف نے قطعیّت اختیار کی اور ایک ایسی فضا مُلک میں پیدا ہوئی جس میں سادہ و سلیس اُردو کی ترقی کے بڑے امکانات

تھے۔اُتری ہندوستان کی عام بول چال، شبھُ ساگر (لغت ہندی) اور فرہنگِ آصفیہ کو معیار قرار دیا گیا۔ بہار کی ہندوستانی کمیٹی کے معزّز اراکین میں مولوی عبدالحق صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (موجودہ گورنر بہار) ڈاکٹر سچِدانند، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ سے اس اہم مجلس کی زیب و زینت تھی۔ ہندوستانی کمیٹی کے لئے مولوی عبدالحق ایک بسیط ہندوستانی لغت بھی تیار کر رہے تھے۔ غالباً اس کی تکمیل ہوگئی تھی کیوں کہ جب پرافسر سیّد نجم الھُدیٰ صاحب کے بعد میں ہندوستانی کمیٹی کا سکریٹری مقرر ہوا تو میں نے دھلی سے ۱۹۴۶ء میں لغت کا مسوّدہ منگوایا تھا اور اُسے بہار کے شعبۂ تعلیم میں داخل کر دیا تھا۔ نہ معلوم اس گراں قدر امانت کا حشر کیا ہوا۔

اُردو کے ارتقائی سفر میں ہر ناشرِ اُردو کے لئے مولوی
عبدالحق کی ان تھک کوششیں سنگ ھائے میل
کی حیثیت رکھتی ھیں۔

ان سے بصیرت، تقویّت اور ہمّت حاصل ہوتی ہے۔اُردو کی نشر و اشاعت، صحافت، کتابت اور اقامت میں مولوی صاحب کے کارنامے روشن ہیں۔آپ جامع اُردو ہیں۔کتب خانہ، پریس، جرائد اور کارکنوں کے اکٹھا کرنے میں مولوی صاحب نے رہبرانہ کام کئے ہیں۔ اُردو دُنیا اُن سے تنظیمی سلیقہ سیکھتی رہی ہے۔

عبدالحق صاحب اُردو کی ایک زندہ علامت ہیں۔اُن کا تَن، مَن، دَھن اُردو ہے۔اُنھوں نے اپنا سب کچھ اُردو پر قربان کر دیا۔ اُن کی پوری زندگی اُردو پر نچھاور ہوگئی۔

اُردو کے پودے کو عبدالحق نے اپنے خونِ دل و جگر سے سینچا
ھے۔ اُردو کے چاھنے والوں کے ذھن و قلب میں جو اُردو
لُغت ھے اُس میں لفظِ اُردو کے معنی یوں لکھے ھوئے
ھیں ــــــ "عبدالحق"
حال و مستقبل کے لئے مولوی عبدالحق اُردو کے تاج محل
بھی ھیں اور قطب مینار بھی۔

عبدالحق کے عزائم اور فتوحات کی مثالی روشنی ہمیشہ کڑی اور تاریک راہوں کو روشن کرتی رہے گی۔مولوی عبدالحق مدظلہٗ ایک مقدّس و محبوب مینارِ ھدایت ہیں۔

احمد اسحاق نعمانی

مولوی عبدالحق کی نثر ــــ ایک جائزہ

کسی قوم کے تہذیب یافتہ ہونے کا اندازہ اس میں مروجہ نثر کے معیار سے کیا جا سکتا ہے۔ جو قوم جس قدر تہذیب یافتہ اور شائستہ ہوگی۔ اسی قدر اس میں پختہ، شستہ، صاف ستھری اور اچھی نثر کا چلن ہوگا، رقص، موسیقی، مصوری اور شاعری وغیرہ اصناف انسانی زندگی کے اس دور کی نشانی ہیں جب وہ ہنوز اشرف المخلوقات بننے کی کوشش میں سرگرداں تھا اور جب وہ قدرت کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا تھا۔ اظہار مطلب کے لئے وہ رقص، موسیقی، مصوری اور شاعری ہی سے کسی کو کبھی استعمال کرتا تھا لیکن "وہ آیا، اس نے دیکھا، اور فتح کر لیا" کے مصداق جیسے جیسے وہ قدرت پر فتح حاصل کرتا گیا اور "وحشی جانور" سے "سماجی جانور" بننے کے سارے مراحل طے کر لیے تو اپنی ضروریات کے مطابق اظہار بیان کے لئے ایک نئی صنف کو جنم دیا اس نئی صنف کا نام نثر پڑا؛ جو مندرجہ بالا اصناف کے مقابلہ میں زیادہ واضح، متنوع، عام فہم اور آسان ثابت ہوئی اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ بلوغیت کی پرکھ کے لئے نثر سے زیادہ موزوں کوئی مقیاس نہیں۔

اردو نثر دکن کی خانقاہوں سے قلعہ معلیٰ میں داخل ہونے تک نیم وحشی رہی مگر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس میں بھی نمو کے آثار نظر آنے لگے اور غالب کی اردوئے معلی سے ہی اس میں "تہذیب" کا پرتو ملنے لگتا ہے لیکن علی گڑھ تحریک کے اردو نثر کے اس دور کا آغاز ہوتا ہے جہاں سے وہ اپنی ثقہ بہنوں سے آنکھیں ملانے کے قابل ہو جاتی ہے سر سید پہلے نثر نگار ہیں جنھوں نے اردو نثر کو اس دور کے مصنوعی تکلفات، عیاشانہ رامش و رنگ اور ذہنی دیوالیہ پن سے نجات دلائی سیدھے سادے انداز میں دو ٹوک اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا سلیقہ سکھایا۔

سر سید کے علاوہ آزاد، نذیر، حالی اور شبلی کے ہاتھ اردو نثر نے ارتقائی منازل طے کیں اور ان کے بعد

آنے والی نسل یعنی مولوی عبدالحق اور مولوی سید سلیمان ندوی مرحوم تک اردو نثر کچھ روایات کی امین ہو چکی تھی۔ آزاد، حالی،
نذیر اور شبلی اپنا اپنا انفرادی اسلوب بیان رکھتے تھے اور انفرادی اسلوب رکھنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔

اگر آزاد، نذیر، حالی اور شبلی کی نثر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا اسلوب ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں نہیں
اور انفرادی رنگ رکھنے کے باوجود ان میں ایک تسلسل ہے اور ان کی طرز تحریر کی انفرادیت (FREAK OF NATURE)
ہیں۔ فطری اور نامیاتی نشوونما کا نتیجہ ہے۔ آزاد کی داستان طرازی، گلکاری و سحر نگاری، نذیر احمد کی لطیف ظرافت، ٹھیٹھ گھریلو
اور ٹھیٹھ علمی الفاظ کا امتزاج اور حالی کی سنجیدگی، سادگی اور انگریزی الفاظ سے بھری ہوئی نثر میں ہمیں ایک تسلسل ملتا ہے
جو ارتقاء کے بنیادی اصولوں پر پورا اترتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ شبلی کی نثر میں ملتا ہے۔ شبلی کی نثر میں پرکار سادگی، برجستگی اور
تیزی، علمیت و گہرائی اور بے ساختگی و سلاست روی میں آزاد، نذیر اور حالی تینوں کا پرتو ملتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد
یہ نتیجہ نکالنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ شبلی کے بعد آنے والی نسل چاہے اول الذکر حضرات میں سے کسی کی بھی پرستار رہی ہو،
شبلی کے اثر سے نہ بچ سکی اور شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلی کا اثر اس نے قبول کیا۔

اس نتیجہ کی روشنی میں اگرچہ مولوی عبدالحق اور مولوی سید سلیمان مرحوم کی نثر کا موازنہ کریں تو دونوں کی
طرز تحریر میں یکسانیت اور مماثلت کا راز مل جائے گا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان میں ایک صرف حالی کا پرستار
ہے۔ اور دوسرا صرف شبلی کا۔ لیکن دونوں شبلی اور حالی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات جب مولوی سلیمان مرحوم
خالص علمی مضمون لکھتے وقت قطعیت کے ساتھ معروضیت پر زور دیتے ہیں۔ تو وہ شبلی سے زیادہ حالی کے پیرو نظر آتے ہیں
اور اس طرح کبھی کبھی مولوی عبدالحق کی شگفتہ نثر پر شبلی کی پرچھائیں کا دھوکہ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کی ذہنی تربیت میں حالی اور شبلی کا جو حصہ ہے اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن
ان پر ان بزرگوں سے زیادہ اس دور کے سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر ہوا۔ آجکل یہ عام روش ہے کہ مولوی عبدالحق
کی نثر کو حالی کی نثر کا پرتو کہہ کر ان کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ الزام بعض حد تک صرف اس لئے درست
معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی زندگی کا آخری دور اور مولوی صاحب کی ادبی زندگی کا ابتدائی دور اتفاق سے ایک تھا، اور
دونوں کے محرکات یکساں تھے۔ دونوں مسلم تہذیب کے پرستار، دونوں کے دل میں مسلمانوں کے زوال کا دکھ، دونوں
ایک سیاسی تحریک کے جاں نثار سپاہی، دونوں ایک ہی بت کے پرستار، دونوں ایک ہی منزل کے طلبگار، دونوں
ایک ہی زبان (اردو) کے رسیا اور اس کی ترقی کے خواہاں، دونوں کے دشمن ایک، دونوں کے دوست ایک،
دونوں کے حاکم ایک۔ اب اس کے بعد بھی دونوں کے نثر میں مماثلت نہ ہوتو کیا۔ اس میں شعور سے زیادہ جذبہ کو
دخل ہے اور مولوی عبدالحق کا نہیں محرکات کا ہے۔

مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں ایک نقطہ

بھی تفریحِ طبع کے خاطر نہ لکھا۔ ان کی ہر تحریر
کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد کوئی نہ کوئی جذبہ
کارفرما رہا ہے۔ ان کی زندگی بجائے خود
ایک مشن رہی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا اسلوب بیان ان کے رجحانات کے مطابق ڈھل گیا۔ مولوی صاحب کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت بیان میں دوٹوک انداز اور قطعیت ہے۔ وہ اپنے موضوع پر لکھنے کے لئے نہ تو طول طویل تمہید کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ لذتِ بیانی کی۔ اگر کسی کو ان کے موضوع سے دلچسپی ہے تو ان کی تحریر بھی بھلی لگے گی اور اگر نہیں ہے تو مولوی صاحب کی طرف سے ان کی دلچسپی کا سامان بہم پہنچانے کی کوئی کوشش نہ ہوگی۔ بعض لوگ صرف اچھی نثر کے شائق ہوتے ہیں۔ بعض لوگ موضوع کے۔ مولوی صاحب کو آخر الذکر لوگوں سے مطلب ہے۔ اول الذکر سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے ان کی نثر خشک اور دلچسپی سے مبرا ہوتی ہے

اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے مولوی صاحب ہمیشہ دلائل
کا سہارا لیتے ہیں اسی لئے ان کی تحریروں میں ایک
خاص قسم کی سنجیدگی، سادگی اور خلوص پنہاں ہوتا
ہے۔ ان کا ایک ایک جملہ دل سے نکلی ہوئی آواز
معلوم ہوتی ہے۔ اور ہر بات کے پیچھے ان کی پوری
زندگی کے تجربے کا وزن ہوتا ہے۔

وہ کوئی بات اس وقت تک کہتے ہی نہیں جب تک اس کی ضرورت محسوس نہ کرلیں اور اس کی افادیت کے قائل نہ ہولیں۔ اسی لئے اختلاف رائے کے باوجود آپ کے لئے ان کی کہی ہوئی بات کو مسترد کرنا بے انتہا مشکل ہوگا۔

خلوص اور استدلال کے امتزاج سے ایک انوکھے اندازِ
بیان کی تشکیل اور اس اندازِ بیان میں ذہن کو
مسخر کردینے والی اور بات منوا لینے کی قوت
پیدا کر لینا معجزے سے کم نہیں ہے۔ یوں تو
نثر نگار اور بھی ہیں مگر یہ اعجاز
کسے نصیب ہوتا ہے۔

مولوی صاحب کے اسلوبِ بیان کی نشو ونما میں ان کی زندگی کے "مقاصد" نے نمایاں حصّہ لیا ہے

چونکہ انھیں اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانی ہوتی ہے اور ان کا تخاطب صرف جاگیردارانہ اور بورژوا طبقے تک محدود نہیں ہے بلکہ ان ہزاروں اور لاکھوں عام آدمیوں سے بھی جو ایک زندہ زبان کے امین ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا کہ ان کا انداز عام فہم ہو۔ اس لئے ان کی نثر بول چال کی زبان سے بہت قریب ہوتی ہے اور وہ اپنے خیالات کو طویل جملوں اور بعض اوقات پیراگرافوں میں ادا کرتے ہیں۔

فرانسیسی انشا پرداز MONTAIGNE نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اسے نیچرل، سادہ اور تصنع سے مبرّا نثر، ویسی ہی لکھی ہوئی جیسی بولی گئی - اور ویسی ہی کاغذ پر جیسی زبان پر، بے انتہا پسند ہے۔ مولوی صاحب کی نثر اس زمرے میں آتی ہے ان کے انداز بیان میں وہی سادگی اور خلوص پنہاں ہے جو عام بول چال کی زبان کا خاص جُز ہے۔ اس پر نہ خوشنما الفاظ کا ملمّع ہوتا ہے، اور نہ موضوع کی سنجیدگی کی بے جا دکھاوٹ۔ یہی وجہ ہے جو اُن کے انداز میں گھریلو پن اور تاثراتی رنگ کی جھلک ہوتی ہے۔

مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں بار بار ثقیل فلسفیانہ نکات اور خالص علمی دلائل بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عقائد و نظریات کے انبار سے نکال کر گھریلو محاوروں اور تشبیہوں کے ذریعہ ادا کئے ہیں۔ وہ محاوروں کا استعمال نذیر احمد کی طرح بے جوڑ اور بے وقت نہیں کرتے۔ بلکہ استعمال شدہ محاورے ان کے دلائل کا اہم ترین جز معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی پر ان کے اسلوب بیان کی انفرادیت کی بنیاد ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اس اکھاڑے میں اترنا اور بلدہ نکل آنا اصل حکمت اور تدبر ہے۔ وہ (محسن الملک) کوئلوں کی اس کوٹھری (نظام کے دربار) میں گئے اور ہمیشہ بے داغ نکل آئے۔

(۲) انھوں (سرسید) نے زندگی کو برتا تھا، اس کے نشیب و فراز دیکھے تھے اس کے رگڑے جھیلے تھے۔

(۳) اردو زبان کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب، زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس (باغ و بہار) سے لگا نہیں کھاتی۔

(۴) مولوی امین صاحب زبیری مارہروی، مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے بڑا کام کیا ہے کہ نواب محسن الملک مرحوم اور نواب وقار الملک مرحوم کے خطوط چھاپ دئیے۔ ان کے حاصل کرنے میں انھیں بڑی کھکھیڑ اٹھانی پڑی ہوگی۔

(۵) کس قدر حسرت کی بات ہے کہ وہ آبدار موتی جو اب تک بکھرے ہوئے تھے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہمارے سامنے موجود ہے جن کی جوت سے آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔

(۶) یورپ کے جدید تمدن کا طلسم ان (اقبال) کی نظروں میں مکڑی کے جالے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا جو محض خود غرضی اور خود پرستی پر مبنی ہے اور بنی نوع انسان کے حق میں سم قاتل ہے۔

(۷) انھوں (انگریزی) نے ہمیں متحد ہونا، ذات پات کی تفریق مٹانا، باہم ہمدردی کرنا، اور قوم بنانا سکھایا ہے ان کے نمونے سے جو بات ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ اس سے قبل ہمیں کسی مصلح کی کوشش و سعی سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں وہ "گھر جگ" نہیں کرنی چاہیئے جو بدھ یا رام موہن رائے نے کی تھی۔

(۸) اصلاح کا یہ سلسلہ کوئی پانچ سال تک قائم رہا۔ ایک اقبال اور ایک اکبر مرحوم تو ان کے دام میں نہیں آئے باقی کوئی ان کی زد سے نہیں بچا۔ بعض نے دبی زبان سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ مگر حضرت شوق کب مانتے ہیں۔ سر ہو گئے۔ شاگرد ہو کر مرے۔ اصلاح لے کے چھوڑی۔ بعض حضرات کو جب اس کی بھن گن معلوم ہوئی کہ ان کی اصلاحی غزلیں دوسری جگہ بھی اس غرض سے گئی ہیں تو انھیں شبہ ہوا اور حضرت شوق سے دریافت کیا معلوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے ایسی تھپکی دی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ استادی کا شوق بھی برا ہوتا ہے۔ جل میں آگئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے۔ انھیں اصلاحوں کی یہ پوٹ ہے جو چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

چونکہ مولوی صاحب اپنی نثر کو آسان تر اور عام فہم بنانا چاہتے ہیں اور موضوع کو ادا کرنے میں جگہ جگہ محاوروں اور تشبیہوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے بیان میں اکثر پھیلاؤ اور طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ طوالت کا اثر کم کرنے کے لئے بعض اوقات وہ تکرار سے لطف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تکرار۔ محاورات کے استعمال اور بیان میں پھیلاؤ کے کے باعث ایک مدھم اور رواں دواں موسیقیت اور ردم کا احساس ہوتا ہے اس سے نثر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے اور قاری دم بخود ہونے کے بجائے سوچتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور بے چینی کے بجائے اسے راز کے افشا ہونے کا انتظار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو مولوی صاحب کی تحریروں میں سے کوئی بھی جملہ تسلسل کو گزند پہونچائے بغیر نکالا جا سکتا ہے اور ان کے جملے غزل کے شعر کی طرح کل کا جز بھی ہوتے ہیں۔ اور منفرد بھی۔

مولوی صاحب کی نثر کی خصوصیات میں سب سے زیادہ اہمیت اس خوبی کو حاصل ہے کہ اس کے ہر جملے

> اور جدید پیراگراف میں ان کی اپنی شخصیت کا پرتو ملتا ہے
> اور تحریر اور شخصیت متوازن خطوط بنائی ہے وجاہت
> ذہانت خوش بیانی، فیاضی، عام مقبولیت، ہر دلعزیزی
> تدبر، انتظامی قابلیت، سادگی، خلوص، جوش، صداقت
> وسعت، دور بینی، شرافت، ہمدردی، صاحب ذوق
> وقار، جودتِ طبع، استقلال، صداے سعادت، تبحّرِ علمی
> وغیرہ ان کے پسندیدہ الفاظ ہیں اور اسے اپنے مضامین
> مقدمات میں وہ اکثر و بیشتر استعمال کرتے ہیں۔ وہ
> لوگ جنھوں نے مولوی صاحب کو قریب سے دیکھا
> ہے یا ان کے بارے میں پڑھا ہے۔ اچھی طرح جانتے
> ہیں کہ ان میں سے بیشتر الفاظ خود ان کے لئے استعمال
> کئے جا سکتے ہیں۔

چونکہ مولوی صاحب نے اپنی شخصیت کی تعمیر و تربیت چند بنیادی مقاصد اور چند اصولوں کے زیر اثر کی ہے اس لئے
افادیت کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کا معیار (بحیثیت ایک صنف) کے بجائے خود بہت بلند ہوگیا۔ ہربرٹ ریڈ نے انگریزی
نثر کا اسلوب میں لکھا ہے کہ "شستہ نثر پیش خیمہ ہے فکر عمیق کا"

> مولوی صاحب کی نثر کی کامیابی کا راز بلند مقاصد، فکر
> عمیق اور شخصیت کی عظمت میں پوشیدہ ہے۔

اسی لئے ان کا اسلوب نہ صرف آنکھوں کو سجاتا ہے۔ جو کہ دیکھنے سجاتی ہے بلکہ ہاتھوں کو بھی جو تولتے اور پرکھتے ہیں
اور ذہن کو بھی جو محسوس کرتا ہے۔

مولوی صاحب کی نثر کی تعمیر میں الفاظ اور حسن اور الفاظ و عمل میں قربت کا سرچشمہ وہی شخصیت ہے جو مختلف
تحریروں میں مختلف شکل و صورت میں آشکار ہوتی ہے۔ جس میں انانیت کا جوش بھی پنہاں ہوتا ہے اور سپردگی
کی نرمی بھی۔ جو متحرک اور متنوع ہے، سیمابی ہے۔ جد و جہد کرتی ہے۔ نئی نئی منزلوں اور نئی نئی راہوں کی تلاش
میں سرگرداں رہتی ہے۔ جو دکھ درد میں بھی راحت ڈھونڈتی ہے، اور جو پرانی رہ کر بھی ہمیشہ نئی اور تر و تازہ رہتی ہے
جس میں سیمابی تڑپ اور لازوال قوت پوشیدہ ہے اور جو انسان کی عظمت کی علامت ہے۔
شخصیت کا یہ چراغ ہمیشہ ہمیشہ روشن رہتا ہے، اور اس کا اجالا تا ابد قائم رہتا ہے اور اس کی

(باقی صفحہ ۲۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

آنسہ حفیظ خاتون اسدی

مولوی عبدالحق کا مشن

پنڈت مالویہ ایک جگہ ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ بے شمار آدمی ہیں۔ بے پناہ روپیہ ہے۔ کاش ایک عبدالحق ہوتا۔" ادھر ہم لوگ اتنے بدنصیب ہیں۔ کہ ہمارے پاس مولوی عبدالحق موجود ہیں لیکن ہم نے ان کے راستے میں کس کس طرح روڑے نہیں اٹکائے یہ الگ بات ہے۔ بقول حالی؎

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

ان کی زندگی ایک ادیب یا عالم کی نہیں بلکہ ایک مجاہد کی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اُردو زبان و ادب کے لئے جس جذبے، خلوص اور عشق سے کام لیا ہے۔ اس کی مثال اردو ادب تو کیا کسی اور زبان کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ زبان اور ادب کی خدمت میں بسر کر دیا ان کی ساری خواہشیں سمٹ کر ایک مقدس خواہش بن گئی ہیں۔ اور وہ خواہش ہے۔ اردو زبان کو اس کی معراج پہ پہنچانا۔

اور اس زبان کی نشو و نما کے لئے تعلیمی اداروں، بلند پایہ تصانیف اور ٹھوس کام مثلاً تعمیری انجمنوں کا قیام وغیرہ۔

مولوی عبدالحق کی تربیت ان لوگوں میں ہوئی۔ جو زندگی بھر اپنے مشن کے حصول میں غرق رہے۔ سرسید اور حالی، مولوی عبدالحق کے رہبر رہے ہیں۔ اور مولوی صاحب ان دونوں سے بے حد متاثر ہیں۔ سرسید کے مشن کے حالی مؤید تھے۔ مسدس اس مشن کا ترجمان ہے۔ سرسیّد کے سامنے ایک تعمیری مشن تھا۔ وہ اپنی بگڑی ہوئی قوم کو اس مقام پر لے جانا چاہتے تھے۔ جو زندہ اور آزاد قوموں کا ہے۔ اپنے اس مشن کی تبلیغ و اشاعت کے لئے انھوں نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ جس سے اردو زبان کو بھی بہت فروغ ہوا۔ سرسیّد نے اپنے بہت سے مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ مولوی عبدالحق نے بھی اسی اسپرٹ سے اس کام کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ جو سرسیّد کا شروع کیا ہوا ہے۔ جس طرح شبلی کے بعد سیّد سلیمان ندوی ان کے مشن کے جانشین ہیں۔ اسی طرح سرسیّد کے مشن کے مولوی عبدالحق ہیں۔

> انھوں نے اپنی تحریر میں حالی اور سرسیّد کی نثر کی خصوصیات یعنی سادگی، فصاحت اور دلنشینی کو اپنایا۔ سرسیّد کی وجہ سے تعمیری جذبہ اور حالی کی وجہ سے خاموش انداز میں کام کرنے کا انداز سیکھا۔ مولوی صاحب کی تحریروں میں آزاد کی شوخ رنگینی، نذیر احمد کے چٹخارے اور محاورے اور شبلی کا جوش نہیں ملتا۔ بلکہ ان کا اسلوب بیان حالی کی طرح سادہ اور سلیس ہے۔ ان کا کام کرنے کا انداز بھی خاص طور پر حالی کا سا ہے۔ مولوی صاحب بہت سی باتوں میں حالی سے مشابہ ہیں۔ خود ان کی تحریروں میں حالی سے بہت سی مناسبات ملتی ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر یہ بات پورے ایمان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ زبان و ادب کی خدمت میں تعمیری انداز میں غرق رہنا ان کی خوراک بن گیا تھا۔ اپنے ایک خط میں حکیم امامی صاحب کو لکھا ہے کہ

> "عزیزمن! جہاں تک ہو سکے، جس طرح بن پڑے کام کئے جاؤ۔ کام ہی سے زندگی ہے۔ اور زندگی کے معنی کام ہیں۔ بےکار اور کاہل شخص مردہ ہے۔ اور مردہ زندوں پر بار ہوتا ہے۔ خدا نے جو صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اس کو ضائع کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ زندہ وہی ہے جو کچھ کرتا رہے۔ اپنی مدد آپ کرو۔ دوسرے بھی تمھاری مدد کریں گے۔ اور خدا بھی تمھاری مدد کرے گا۔ جس کام کا بیڑا تم نے اٹھایا ہے۔ اس سے کبھی غافل نہ رہو۔"

مولوی عبدالحق نے اپنی زندگی اردو زبان کی ترقی اور خوش حالی کے لئے وقف کر دی ہے۔ اور پچاس سال تک اردو زبان و ادب کی انتھک خدمت نے ان کے نام کو اردو کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ دونوں کا تصوّر ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے۔ اور زبان و ادب سے وابستگی کی ایسی مثال دوسری زبانیں مشکل سے پیش کر سکیں گی۔

ہر نیا دور اپنے ساتھ نئے تقاضے لاتا ہے۔ ان تقاضوں کو پورا کرنا اور پھر زندگی کی رفتار کو تیز تر کرنا ہر بڑے آدمی کا مشن رہا ہے۔ پچھلے پچاس سال ایک دورِ پُرآشوب محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں کئی ایک نئی تحریکوں نے بھی جنم لیا ہے۔ تحقیقات کے لئے نئے نئے انداز پیدا ہوئے۔ مولوی صاحب نے اس نئی صدی کا نہ صرف یہ کہ پورے طور پر ساتھ دیا بلکہ کتنی ہی باتوں کی مکمل اور صحت بخش رہبری بھی کی۔ اردو زبان و ادب کی کتنی ہی گم شدہ کڑیاں سامنے لاکر اس زبان کی عمر بڑھائی۔ اور اردو زبان کی بلندی اور عظمت کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ اس زبان کا نام بھی فخر سے لیا جانے لگا۔

مولوی صاحب کی پہلو دار شخصیت ان کے مشن کی کامیابی میں معاون ہوئی۔ وہ بوڑھوں میں بوڑھے جوانوں میں جوان اور طالب علموں میں طالب علم ہیں۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں ان کی شخصیت کے اسی پہلو نے انھیں ہر جگہ کامیاب بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے عزم و استقلال اور غیر معمولی قوّتِ ارادی سے وہ بڑی بڑی مخالفتوں اور دشواریوں میں پیچھے نہیں ہٹے۔ بلکہ ان میں اس سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اور بھی زیادہ قوّت و توانائی آتی گئی۔ اس کا اندازہ ان کے اس خطبہ سے ہوتا ہے۔ جو اردو کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے پڑھا کہ:۔

> "کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیّوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ اور عملی قوّت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جِلا دیتی ہے۔ جو پہلے مدّھم پڑے تھے۔ مخالفت در پردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص و استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک کامیاب ہوگی۔ مخالفت نے پاکستان بنایا۔ ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا۔ اور مخالفت ہی کے طفیل اردو کو ترقی نصیب ہوئی ہے۔"

اس بیان سے ان کی حوصلہ مند طبیعت، مشکلات پر عبور حاصل کرنے کا جذبہ اور مخالفتوں کو دبانے کی

صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کی عظمت کا راز اس میں مضمر ہے کہ انھیں اپنی
بات پر یقین کامل ہے۔ وہ اردو کی عظمت کے قائل ہیں۔ اور
دوسروں کو بھی قائل کرنا چاہتے ہیں۔

آج تک انھوں نے اردو کی جتنی خدمت کی ہے۔ شاید ہی کوئی کر سکے۔ انھوں نے تنقید اور تحقیق کے کام کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ بہت سے قدیم اور نایاب نسخوں کی باقاعدہ اشاعت کی۔ پرانے تذکرے شائع کرکے ان پر بصیرت افروز مقدمے لکھے۔ ان کے تحقیقی کارناموں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ابتدائی تنقید میں لفظی بحثیں اور تقریظیں ملتی ہیں۔ تاثراتی انداز ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق اپنی توجہات اور تحقیقات میں ادراک سے
زیادہ کام لیتے ہیں ان کے دلائل معقول اور وزنی ہوتے
ہیں۔ لہجے میں متانت اور بلندی ہوتی ہے۔

پھر ایک اور اہم کام اردو انگریزی ڈکشنری مولانا کی سرکردگی میں انجام پایا۔ وضع اصطلاحات کا کام اور اردو ٹائپ میں اصلاح اور اسی سلسلے کے اور بھی کئی کام باوجود دشواریوں کے انھوں نے سرانجام دئے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے مشن کو پورا کرنے کے لئے سینکڑوں قربانیاں دیں۔ ۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے انجمن ترقی اردو کا چارج لیا۔ تو اس کا کُل اثاثہ ایک چوبی صندوق، ایک خشک دوات دو لوٹے ہوئے قلم اور دو رجسٹر تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی کل جائیداد انجمن کو دے دی۔ اور اپنے اثر و رسوخ سے انجمن کی لائبریری کو ہندوستان کی بہترین لائبریری بنا دیا۔ بہت سے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ ہر حال میں آگے بڑھتے رہے، ادبی، تحقیقی اور تعمیری کام برابر ہوتا رہا۔ وہ صرف تحریر و تقریر کے میدان ہی کے نہیں بلکہ ناساعد حالات کے باوجود تعمیری کام کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً دارالترجمہ دکن، عثمانیہ یونی ورسٹی، اردو کالج کراچی اور اردو یونی ورسٹی کے قیام کی جدوجہد

جس کے بارے میں ان کی سابقہ کلام یابیوں کو سامنے رکھتے ہوئے پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب کی زندگی میں اردو یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آ جائے گا۔

تقسیم ملک سے پہلے مولوی صاحب کا جھکاؤ تحقیقات و تنقید کی طرف تھا۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد تعمیر و اصلاح کی طرف بھی توجہ دی۔ لیکن کچھ لوگ انجمن پر قابض ہوئے جنھوں نے مولوی صاحب کے تحریری، تحقیقی اور اصلاحی کاموں میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ یہاں تک کہ ان کی ذاتی لائبریری کو بھی ان سے چھین لیا گیا۔ ان کو بے دل اور ہراساں کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی۔ لیکن مولوی صاحب کے جذبۂ استقامت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ انھوں نے اپنوں ہی کے سب سے قیمتی ورثے کے لئے اپنوں ہی کا مقابلہ کیا۔ اور یہ ان کے لئے بہت بڑا المیہ ہے ؎

غیر کا ڈر نہیں، جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مشن کے حصول میں لگے رہے اور ان کے جذبۂ عمل میں کبھی مایوسی نہیں آئی۔ ہمیشہ بڑی بڑی مخالفتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔ چند ہم عصر میں لکھتے ہیں کہ

"کار زارِ دنیا میں بغیر لڑے بھڑے کام نہیں چلتا۔ یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں اور زخم بھی کھانے پڑتے ہیں۔ سر بھی دینا پڑتا ہے۔ جو اس کے لیے تیار نہیں، اس کے لیے یہی ہو جاتا ہی بہتر ہے۔ بلکہ سرے سے اُسے میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیئے۔"

مولوی عبدالحق کی ایک تاریخی تقریر جو انھوں نے بزم فروغ اُردو اسلامیہ کالج لاہور میں کی۔ اس میں ان کے عزم و استقلال کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہتے ہیں کہ:۔

"میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں۔ میری طرح کبھی بوڑھے نہ ہوں۔ اس دعا کو معمولی یا ناممکن نہ سمجھیں۔ ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی کو قائم رکھنے کے لئے بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے زندگی بنتی ہے اور بڑھتی بھی ہے۔ اور قائم بھی رہتی ہے۔ آپ بار بار مجھے بوڑھا کہتے ہیں۔ میں ابھی دو سال پہلے تک بڈھا نہیں تھا۔ جوانی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمت اور عزم

سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی
بوڑھا نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس دو سال کے عرصے میں بعض غدار فطرت
ساتھیوں نے مجھ پر ایسے ایسے مظالم کئے ہیں۔ کہ میں بڈھا ہو گیا۔ انھوں نے
انجمن کو تباہ کرنے کی، میرے رفیقوں اور ہم دردوں کو مجھ سے الگ کرنے
کی کوشش کی۔ تاکہ مجھے ختم کر دیں لیکن مجھے پھر بھی ختم نہ کر سکے۔ انھوں
نے سوچا اس کا کام اس سے چھین لیا جائے۔ تو یہ مر جائے گا۔ میں پھر بھی نہ
مرا۔ میں اپنی جوانی کو پھر واپس لاؤں گا۔ میں مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔
اور اس وقت تک نہیں مروں گا۔ جب تک اردو یونی ورسٹی قائم نہ کر لوں۔
آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل ہو۔ جس کے لئے میری تعریف کی گئی
ہے۔ تو آپ کو اس کام میں میری مدد کرنی چاہئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ میں
دوبارہ جوان اور آپ ہی جیسا گبرو جوان ہو جاؤں گا۔"

اس سے ہمیں مولوی عبدالحق کے عظیم اور بلند ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انھوں نے اُردو کی بقا کے لئے دل و جان سے کوشش کی۔ اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

زبان کی خاطر دُنیا میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں۔ جنگ و جدل ہوئے ہیں۔ لیکن جن کو اپنی زبان عزیز تھی۔ انھوں نے سب کچھ سہا، طرح طرح کی قربانیاں کیں مگر زبان کی نشو و نما میں لگے رہے۔ ایسی ہی قابل قدر ہستیوں میں مولوی عبدالحق کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے مغربی پاکستان اردو کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"ایمان کے بعد مجھے جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہے وہ اُردو زبان کی
ترقی و ترویج ہے۔"

اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس کو قلم بند کرنے کے لئے کئی ایک کتابوں کی ضرورت ہے۔ اُردو سے ان کی بے پناہ وابستگی انشاءاللہ اردو یونی ورسٹی کی شکل میں نمودار ہو کر رہے گی۔ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ :-

"جب کبھی ہم ذریعۂ تعلیم بدلنے اور اپنی زبان میں تعلیم دینے کی تجویز کرتے ہیں
تو وہی فرسودہ اور پامال دلائل پیش کی جاتی ہیں۔ جو سو سال سے بار بار پیش کی
جاتی رہی ہیں۔ اب اس بارے میں مذکرے، مباحثے، سوال و جواب اور ردّ و کد

بے کار ہے۔ اس کا واحد علاج صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کا نام لے کر اردو یونی ورسٹی قائم کردیں۔ جسے نہ غدار کی غداری مٹا سکے، نہ پولیس ایکشن کی قہاری۔ یہ کام ایسا مشکل نہیں جیسا سمجھ لیا گیا ہے..... یہ یونی ورسٹی بن کے رہے گی۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، اس کی بنا پڑ کے رہے گی۔"

اس سے مولوی عبدالحق کے عزم و استقلال اور اپنے مشن کی کامیابی پر یقینِ کامل کا اظہار ملتا ہے۔ مارشل لا لگنے کے بعد مولوی صاحب کو جو سہارا ملا ہے۔ اس سے ان کا عزم پھر جوان ہو گیا ہے۔ ان کو اپنی صلاحیتیں سامنے لانے کا پھر سے موقع ملا ہے۔ اور ہماری نگاہیں پھر سے مولوی صاحب کی طرف مرتکز ہو گئی ہیں۔ جیسے کہ ہم ان سے کسی عظیم اور بلند پایہ کام کی پھر سے توقع کر رہے ہیں۔

ہمیں مولوی عبدالحق پر فخر و ناز ہے۔ اس لیے بھی کہ انھوں نے سرسیّد احمد خاں کے دور کو دیکھا اور ان کے ساتھ کام کیا اور آج تک اُسی اسپرٹ کو اپنائے رکھا جو ان کی خصوصیت تھی۔ جب بھی اُردو زبان کی تاریخ لکھی جائے گی۔ تو مکمل اور حیات بخش رہبری بابائے اُردو ہی سے ملے گی۔

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص، ترا نام جگمگائے گا
اٹھے گی جب کبھی اردو کے ارتقا پہ نظر
خیال تیرے تصوّر میں ڈوب جائے گا

اس لیے میں طالب علموں کی جانب سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ

ع ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

[او]ر مولوی صاحب کو یقین دلاتی ہوں۔ کہ اردو یونی ورسٹی کے قیام کے سلسلے میں جس قسم کی خدمات

ہم طالب علموں سے درکار ہیں۔ وہ ہم اسی جذبے سے کریں گے۔ جس کی توقع مولوی صاحب کو جوانوں سے رہی ہے۔ اور ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کو اپنا مشن مکمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ درازیٔ عمر عطا کرے ؎

جانِ عبدالحق سلامت، عمرِ عبدالحق زیاد
باغِ اردو میں ہو خنداں اور گل ہائے مراد
اس دعا کے سامنے بابِ اثر خود باز ہے
فرد کا نعرہ نہیں یہ قوم کی آواز ہے

بقیہ:۔ مولوی عبدالحق کی نثر ——— ایک جائزہ

تابندگی ہر کس و ناکس کے ذہن کو جلا بخشتی ہے (کیونکہ اس کا تعلق خاکی جسم نہیں روح سے ہوتا ہے) اس لئے

مولوی صاحب کی نثر ایک عہد آفریں شخص کا جلوہ ہونے کے باعث ایک ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ اور ہم عصر اردو ادب کی تاریخ میں اس کی جگہ سب سے نمایاں ہوگی۔

بقیہ: اردو زبان اور مولوی عبدالحق

شخصیت کے اثرات ملک میں تیزی سے عام ہوتے جا رہے ہیں اس اعتبار سے بھی اردو ادب میں ان کا بہت بلند مقام ہے۔ وہ صحیح معنوں میں بابائے اردو کہلانے کے مستحق ہیں انھوں نے اردو کو اپنے جگر پارے کی طرح پالا پوسا پرورش کیا اور پروان چڑھایا اور آج "فنا فی الاردو" اور "بقا بالاردو" کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں، بلاشبہ وہ اس ممتاز مقام کے اہل ہیں۔

شمسہ کلثوم

عبدالحق اور ادب

مولوی عبدالحق اور اردو دو الگ الفاظ نہیں۔ بلکہ ایک کو دوسرے کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ روح کو جسم کے ساتھ۔ ان کی شخصیت اردو ادب سے ہی عبارت ہے اور ادب انسانیت کا دماغ ہے۔ انسانی زندگی کا سارا مدّوجزر اس میں بے نقاب نظر آتا ہے۔ بقول عبدالرحمٰن چغتائی صدیوں کا علم ادب اور یادیں ان کی شخصیت میں سمٹ آئی ہیں۔ ان کی روحانی بصیرت میں چمک پائی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر کام کرنے کا جذبہ کس قدر تیز سودمند اور قابلِ قدر ہے۔

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ کے ایک قصبے سرادہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہاپڑ اور سرادے میں حاصل کی۔ اور پھر بی۔اے علی گڑھ سے کیا۔ یہ زمانہ بڑے ہنگاموں کا تھا۔ مسلمانوں کی حالت بڑی ابتر تھی۔ اس نازک دور میں سرسیّد اپنے رفقا کے ساتھ قوم کی ذہنی زندگی بدلنے پر تیار ہوئے۔ سرسیّد کی تحریروں نے اردو ادب میں نئی جان ڈال دی۔ مقصدی ادب کے لئے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔" زبان کو پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی۔ خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔" حالی کی مسدس حالی سرسیّد کے مقصد کی آواز ہے۔ سرسیّد کے ساتھی حالؔی، شبلؔی، نذیراحمد، محسن الملک، وقارالملک مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے تحریر و تقریر دونوں طرح سے کام لے رہے تھے۔

سرسیّد کو زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کا پوری طرح احساس تھا۔
ابتدا میں وہ صرف مسلمانوں کی ترقی چاہتے تھے۔ لیکن جب حالات کو
دگرگوں دیکھا تو مسلمانوں کی ترقی کے لیے ہر ممکن کام کرنے کو تیار ہو گئے
اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ اردو ادب تھا۔

کیوں کہ ادب انسانوں کے درمیان رہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ فیرل نے اسی وجہ سے لکھا ہے کہ ادب کے دو پہلو ہیں۔ ایک افادی اور دوسرا جمالیاتی۔ اور ادب ان دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ غرض کہ مولوی عبدالحق کے ارد گرد ایک ایسا ماحول تھا جہاں دن رات مسلمانوں کی تمدنی و تعلیمی زندگی کو بدلنے کے لئے سرسیّد اور ان کے رفقا علم و ادب کی تخلیق کرتے، نوجوانوں میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ ان کا نصب العین "ایک زبان اور ایک قوم" تھا۔

گویا پاکستان سرسیّد کے خواب کا نتیجہ ہے۔ اور عبدالحق صاحب آج تک
ایک قوم کے لئے ایک زبان بنانے کی جدوجہد میں پوری طرح مصروف ہیں۔

اس مبارک ماحول میں عبدالحق نے تربیت حاصل کی۔" سرسیّد زیادہ سے زیادہ وقت عبدالحق کو ساتھ رکھتے۔ حالیؔ اور شبلیؔ ہر ہر موقع پر ان کی رہبری کرتے۔ گویا یہیں سے عبدالحق نے علمی و ادبی کارناموں کی داغ بیل پڑی۔ سیّد کے قومی خدمت کے جذبے نے حالیؔ کے ساتھ عبدالحق میں بھی ایک لگن پیدا کر دی۔ ان میں انھیں کے اثر سے وسعت نظر، علمی شغف، [illegible] نظری اور حقیقت پسندی کی عادت پیدا ہوئی۔ وہ اردو ادب کے عناصرِ خمسہ سرسیّد، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد اور آزاد کے آخری رکن ہیں۔

سرسیّد نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے علم و ادب کی شمعیں فروزاں کر دی تھیں
ان کا مقصد ان کی زندگی میں پوری طرح پورا نہ ہو سکا۔ بزم سرسیّد اپنا فرض
پورا کر کے عالمِ جاوداں کو سدھاری۔ لیکن وہ اپنے پیچھے ایک ایسا چراغ
چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ جلتا رہے گا۔ عبدالحق صاحب سرسیّد کے مقصد کی آواز ہیں
اور حالیؔ کے جانشین۔ انھوں نے سرسیّد کے مقصد کو آگے بڑھایا اور حالیؔ
کی طرح خاموش کام کیا۔ انھیں اس کا پوری طرح احساس ہے کہ کام کی لگن ہی
انسان کو انسان بناتی ہے اور کام اس وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے
لگے۔ عبدالحق عزم و ارادہ ہستی ہیں اور اردو ادب میں ان کی وسعت نظر

اور وسیع المشربی دراصل سرسید ہی کا پرتو ہے۔

عبدالحق ایک کامیاب نقاد ہیں۔ وہ ہمیشہ متوازن رائے دیتے ہیں گو انھوں نے مغربی انداز سے بھی فیض حاصل کیا ہے لیکن وہ ہمیشہ مشرقی انداز سخن سے لطف لیتے ہیں اپنے اس نقطۂ نظر کو وہ اردو تنقید کا ارتقا کے دیباچے میں پوری طرح ظاہر کر چکے ہیں " دیوان ولیؔ " ہو یا " زبان اردو پر سرسری نظر"، " شعرالہند" ہو یا " مجموعہ نغز " ان کا متوازن قلم ہر جگہ ایک جیسی روانی دکھاتا ہے " پنجاب میں اردو" مصنف حافظ محمود شیرانی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" انھوں نے ایسی ایسی تحقیق کی ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔ اس میں شمالی ہند اور پنجاب کے قدیم اردو لکھنے والوں کو جو انھوں نے کھوج لگا کر نکالا ہے وہ بالکل نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ادبی اور لسانی نکات ایسے پائے جاتے ہیں جو ہر لحاظ سے لائق تحسین ہیں۔ پروفیسر شیرانی کی یہ کوشش اردو داں طبقے کے لئے قابل فخر ہے۔"

تنقیدات عبدالحق اور مقدمات دو دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بہت اہم ہیں۔ اگر انھیں کسی نظریہ سے اختلاف بھی ہو تو ان کا قلم کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔ وہ اپنی بات صاف کہہ دیتے ہیں اور جو بات انھیں جائز نظر آتی ہے اس کی ہر طرح تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ہاں دلائل، سلیقہ، تفصیل اور دلکشی ہے۔ وہ پڑھنے والوں کے لئے مزید معلومات بہم پہونچاتے ہیں۔ مقدمہ میں ہر ہر طرح بحث کرتے ہیں۔ جہاں خوبی دکھاتے ہیں وہاں عیب بھی جتاتے ہیں۔ ان کے بیان میں روانی صفائی اور زور ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی کے خیال میں ان کے ہاں " زور تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مقدمہ لکھتے نہیں لڑتے ہیں۔"

مولوی عبدالحق کے خطبات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے موضوعات کا ہمارے ادب سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ یہ خطبات سیاسی، سماجی، لسانی، معاشرتی، اور ادبی حیثیت سے اردو ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان میں مشاہدہ و تجربہ واقعیت اور صداقت ہے۔ پاکستان اگر سرسید کے خواب کی تعبیر ہے تو ان خطبات سے اس نظریۂ خیال اور پاک و ہند کی صد سالہ تاریخ کا ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان میں زبان پر بھی بحث کی ہے۔ تو تنقید اور تحقیق پر بھی، اردو زبان کو ترقی دینے والی چار بڑی تحریکوں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ، اور اورنٹیل کالج لاہور کی خدمات بھی بیان کی ہیں ۔
اور یہ بھی بتایا ہے کہ اردو کا ادب نظم و نثر نویں صدی ہجری سے مسلسل موجود ہے
اردو زبان کس طرح پھیلی ؟ " وہ خود رو نونہال جو دوآبہ گنگ و جمن اور اس کے قرب وجوار
میں پھلا پھولا ، اقتضائے زمانہ کی ہوا اس کے بیج دور دور تک اڑا لے گئی ۔ ہر سرزمین کی
آب و ہوا جہاں وہ پہونچے ۔ انھیں راس آئی اور ہر خطے کی زمین ان کے موافق نکلی ۔
انھیں بے حقیقت بیجوں سے لہلہاتے ہوئے شاداب پودے نکلے ۔۔۔۔ وہی نازک
پودے آج سرسبز تناور درخت ہیں جن کے پھول پھل سے ہمیں اس وقت ذوق تکلم
حاصل ہے ۔"

اردو زبان کی ابتدا کے مختلف نام بتائے ہیں ۔ مثلاً گجری ، گجراتی ، دکنی ، ہندی ، کھڑی بولی ، ہندوی
ریختہ صورز ، مسلمانی ، زبانِ ہندوستان ، اندوستان ، ہندوستان ، زبان اردوئے معلی شاہ جہاں آباد
اور سب سے آخر میں ' اردو ' رہ گیا ۔ اردو زبان کے وجود میں آنے کی ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں ۔

مسلمان اس ملک میں آریاؤں کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے تھے ۔ وہ فارسی بولتے
تھے ۔ اور اہل ملک دیسی زبان ۔ ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے معاشرتی ملکی اور
کاروباری ضرورت سے مسلمان بول چال میں دیسی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے
تھے ۔ اور ہندو فارسی الفاظ ، فاتحوں کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں بہت کم تھی اور
اسی لئے وہ اہل ملک کی زبان سیکھنے پر مجبور تھے ۔ دو چار نسلوں کے بعد ان کی اولاد
ملکی زبان بہ خوبی بولنے لگی ۔ لیکن فاتح قوم کی زبان کا اثر بھی ملکی زبان پر برابر پڑتا رہا
اور اسی اختلاط نے ایک گم نام بولی کو جو عوام بلکہ دیہات کی بولی تھی ایک شائستہ اور مستقل
زبان کے رتبے تک پہونچا دیا ۔ جسے آپ چاہے اردو کہئے یا ہندوستانی ۔"

یہ خطبات عبدالحق کی شخصیت کے پوری طرح آئینہ دار ہیں ۔ جیسی باغ و بہار ، پروقار ، دلچسپ ،
مفید ، بارعب ان کی شخصیت ہے ۔ ویسے ہی یہ خطبات ہیں ۔ مقدمہ میر میں لکھتے ہیں کہ " انسان کا طرز
بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے " ان کا یہی مقولہ ان کے کلام پر پوری طرح صادق آتا ہے ۔ وہ
خود لکھتے ہیں ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے ..... سرسیداحمدخاں
یا مولانا حالی زندگی کے واقعات اور اس کی مشکلات سے بحث کرتے تھے ۔ قومی تنزل کے اسباب ، آئندہ
ترقی کی تدابیر ، تعلیم کی ترغیب ، دشواریوں سے مردانہ وار مقابلہ ، رسم و رواج اور توہمات کی بیخ کنی

تنقید ادب کی اصلاح وغیرہ وغیرہ ایسے مضامین تھے جن پر بحث کرنے سے ان کا قلم نہیں تھکتا تھا۔ مولوی نذیر احمد جیسے عالم نے جتنے ناول لکھے وہ سب اسی وقت کی زندگی اور معاشرت کا آئینہ ہیں۔ اسی طرح مولوی صاحب کا قلم ایک روانی کے ساتھ چلتا ہوا اپنے مقصد سے کبھی نہیں ہٹتا۔ ان کے قلم میں سرسید احمد خانی خلوص و درد اور جوش و ہمت ہے۔ اور وہ اردو زبان کی ہر ممکن ترقی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ تبصرہ نگاری میں بھی وہ منفرد ہیں، بے جا تعلیّ سے کام نہیں لیتے، لیکن کسی کا دل بھی نہیں دکھاتے۔ اور اچھی طرح کتاب اور ادیب کی اہمیت اجاگر کردیتے ہیں۔ انھیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ نقاد کے لئے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔ "صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لئے مفید ہے" اور وہ ضرورت سمجھتے ہیں کہ نئی چیزوں کے پرکھنے کے لئے ہمیں نئے اصولوں سے کام لینا پڑے گا۔

نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ محقق ہو۔ مولوی عبدالحق اس صدی کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ تحقیقات کی علمی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے انھوں نے عربی ادب، صرف و نحو، ہندی زبان، دکنی اور گجراتی اردو میں دسترس حاصل کی۔ انھوں نے تحقیقات کی جانگسل گھاٹی سے گزر کر یہ ثابت کردیا کہ ولی گجراتی اردو کے پہلے شاعر نہیں بلکہ قلی قطب شاہ اردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ اور اردو کی سب سے پہلی کتاب معراج العاشقین ہے۔ سب اس قطب مشتری، من لگن اور کئی ایک دوسری کتابیں اس بلند پایہ محقق کی وجہ سے اردو ادب میں اضافہ ہوئیں۔ عبدالحق صاحب نے ان تحقیقات کی وجہ سے اردو زبان کی تاریخ میں دو سو سال کا اضافہ کردیا۔

بابائے اردو کی تمام ریڈیائی تقریروں میں وہ خصوصیتیں موجود ہیں جو اس کے لئے ضروری ہیں۔ وہ ہمیشہ موثر انداز میں راست گوئی کے قائل رہے ہیں۔ ان کے چھوٹے، متوازن جملے، آواز کے زیر و بم کے ساتھ سادگی سے دلوں پر پوری طرح اثر کرتے ہیں۔ ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ:

> "ہر تحریک خواہ اصلاحی ہو یا اخلاقی کسی ایک شخص کے دماغ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر چند ہم خیال اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم دردوں کا حلقہ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ اور تنظیم کی بنیاد پڑتی ہے۔ تنظیم کے ساتھ مقصد کی تبلیغ و اشاعت اور عمل کی نوبت آتی ہے"۔ وہ الفاظ کی قوت سے پوری طرح واقف ہیں کیونکہ مقصد تو انھیں کے ذریعہ ہی ظاہر ہوتا ہے" لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال

میں قوت پیدا کرتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے کئی ایک مفید ادارے قائم کئے۔ ان کی اہمیت اردو ادب میں ہمیشہ سنگ میل کی رہے گی۔ ان کی ایک کامیاب اور منظم کوشش جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس کے تحت بے شمار کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ وضع اصطلاحات علمیہ اور تاریخ لغت کا کام ہوا۔ رسالہ اردو، سائنس، معاشیات اور پندرہ روزہ ہماری زبان کے ذریعے اردو کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی لیکن حقیقت میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ انجمن ترقی اردو ہے۔ ابتدا میں جب کہ ۱۹۰۲ء میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی تو شبلی سکریٹری مقرر ہوئے اس کے بعد دس سال تک مختلف لوگ اس کے سکریٹری رہے۔ جب عبدالحق صاحب نے اس کا چارج لیا تو اس کا کُل سرمایہ ایک بوسیدہ سا صندوق ایک رجسٹر، ایک قلم اور ایک دوات تھا۔ مولانا قریب پچاس سال سے اس کی خدمت دل و جان سے کر رہے ہیں۔ اگر " انجمن ترقی اردو کی کہانی عزم و استقلال، ہمت و ہمدردی اور خلوص و ایثار کی ہے۔ تو یہی خصوصیات خود مولوی عبدالحق صاحب کی ہیں۔ آج انجمن ترقی اردو اور عبدالحق کو ایک ذات سمجھا جاتا ہے انھوں نے انجمن کی شاخیں تمام ہندوستان میں قائم کیں ہر ممکن طریقے سے کتابیں جمع کیں۔ انجمن نے اصطلاحات علمیہ کی لغت تیار کی۔ فرہنگ اصطلاحات شائع کی۔ تقریباً کئی سو کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں۔ تین چار رسالے نکالے۔ قدیم نسخوں کو پھر سے شائع کیا۔ جامع اور مکمل ڈکشنری تیار کرائی۔ قدیم اردو کا بے بہا ذخیرہ فراہم کیا مولوی صاحب کی نظر میں ترجمے کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کو اصل کتاب سے کسی طرح کم نہیں سمجھتے " ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے اس میں اسی قدر جان کا ہی اور دردسری کرنی پڑتی ہے۔ جتنی نئی تالیف یا تصنیف میں۔"

سوانح نگاری میں بھی مولوی صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ مولوی عبدالحق نے چند ہمعصر میں مختلف افراد کے خاکے پیش کئے ہیں۔ اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے قلم سے اس ضمن میں کچھ ایسی باتیں نکل گئی ہیں جو اردو کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانیت کے لئے ہمیشہ مایۂ ناز رہیں گی۔

" عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت، کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری انصاف، ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب سے ایثار کا درجہ سب سے

اعلیٰ ہے - یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے - اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے - انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے - شرافت اسی سے عبارت ہے -"

مولوی عبدالحق صاحب ایک کامیاب انشا پرداز ہیں - ان کا اسلوب بڑا دلکش ہے - ان کی تحریروں میں ہر جگہ ایک عالمانہ انداز موجود ہے - ان میں حالی کی طرح استدلالی رنگ بھی ہے اور سر سید کی طرح مقصدیت بھی - لیکن یہ تحریر روکھی پھیکی نہیں - بلکہ سادہ و شگفتہ ہے - جس سادہ اور دلکش نثر نگاری کا آغاز میر امن نے کیا تھا - جس کو غالب نے شوخ و بے تکلف بنایا تھا - اور جسے حالی و سر سید نے وسعت و جامعیت عطا کی تھی - مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اس میں تکمیل کی شان پیدا کی - اسلوب کا یہ دلکش انداز خطبات میں پورے عروج پر ہے -

اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب نے مختلف طریقوں سے اردو ادب کی ترقی کے لئے زندگی بھر کام کیا - اور کام کی یہ لگن دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے - ان کی تصنیفات خطبات ، میر تقی میر مرحوم دلی کالج ، مقدمات ، تنقیدات ، ڈکشنری ، تبصرے ، قواعد اردو ، اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ اور ستر کے قریب دوسرے مضامین میں ہر جگہ ان کا مقصد پھیلا ہوا ہے

"اردو کو ترقی دینے کی لگن نے مولوی صاحب کو جوان بنا دیا - ان کے ارادے مضبوط بہت بلند اور جذبۂ عمل سچا ہے - وہ اردو زبان کی ہر طرح ترقی چاہتے ہیں - اس سے وہ کسی لمحے بھی غافل نہیں ہوئے - ان سے پیشتر اردو ادب میں اس قدر وسعت نہ تھی - انھوں نے سر سید کی روایت کو بڑھایا - حالی کی طرح خاموش کام کیا - اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کو ہی اپنا اولین و آخرین مقصد بنا لیا - مولوی صاحب وقت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ آگے رہتے ہیں - وہ ہر اس تحریک کی حمایت کرتے ہیں - جو اردو کو آگے بڑھائے - ان کے ہاں تنگ نظری نہیں وہ تازگی اور جدت و توانائی کے ہمیشہ قائل رہے ہیں " ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی ، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے - اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں "

انھوں نے ہمیشہ اپنے اسی نصب العین پر پوری طرح عمل کیا - حتیٰ کہ اردو کو ترقی دینے کے

لئے اپنی ساری جائیداد وقف کردی - پاکستان بننے سے پیشتر بھی ان کو اردو کی ترقی کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - اور پاکستان میں اپنوں نے ہی ان کے راستے میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے - لیکن اس مرد مجاہد کے قدم ڈگمگانے نہ پائے - اسی لئے وہ ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے سب سے بڑے مجاہد ہیں - جنہوں نے اردو زبان کی ترقی کے لئے دیوانہ مردانہ وار قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ اردو زبان کی ہر طرح ترقی ہو - یہ دنیا کی سب سے بڑی زبان بن جائے - وہ اردو کالج قائم کر چکے ہیں اور اردو یونی ورسٹی قائم کرنا ان کا موجودہ وقت کا سب سے بڑا مقصد ہے - خدا ان کو اس مقصد میں کامیاب کرے - آمین -

عرض کہ مولوی صاحب ایک ایسا سرچشمہ ہیں جن سے اردو زبان کی مختلف شاخوں کے دھارے پھوٹ رہے ہیں - وہ صاحب طرز ادیب ہیں - طنز نگار ہیں - انھیں زبان کے قواعد پر پوری طرح عبور ہے لسانیات کے ماہر ہیں - اور بلند پایہ محقق جدید علمی تنقید کو انھوں نے ثقافتی اور ملی رنگ دیا - قدیم اردو ادب ان کا خاص موضوع ہے - گویا وہ اردو تحقیق و تنقید کے رہبر ہیں - سرسید کے زمانے سے لے کر وہ آج تک مسلسل اور پورے انہماک اور یک سوئی کے ساتھ اردو کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں - ان کی تحریروں میں زور اور روانی ان کے عقیدے کی مضبوطی اور دھن کی جولانی کو ظاہر کرتی ہے -

اردو ادب اور بابائے اردو دونوں ایک ہیں - اردو زبان و ادب کی اشاعت ہی ان کی زندگی کا واحد نصب العین ہے اور اب تک وہ اس پر پوری طرح گامزن ہیں - وہ صحیح معنوں میں بابائے اردو ہیں - اردو ادب میں ان کا نام سب سے اوپر اور سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا ان کی محنت اور اردو ادب کو فروغ دینے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اردو ادب میں آپ کے ڈانڈے ایک طرف تو سرسید اور حالی سے ملتے ہیں اور دوسری طرف عہد حاضر میں شامل ہیں ان سب باتوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عبدالحق اور اردو ادب یک جان دو قالب ہیں اردو ادب میں ان کا نام شہاب ثاقب کی طرح روشن رہے گا - انہی کے الفاظ میں ہم خاتمہ کرتے ہیں جو اردو ادب میں عبدالحق اور ان کی خدمات کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں - اور جن پر زندگی بھر ان کا عمل رہا ہے -

وہ کامیابی آسمان سے نہیں اترتی - یہ سب محنت، صبر، استقلال کی کرامات ہے جانیں کھپانی پڑتی ہیں تب کچھ ہاتھ آتا ہے -

ہر اِک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد ... بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ

فردوس خاتون

مولوی عبدالحق کی شخصیت

چند ہمعصر کے آئینہ میں

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ذات ہمارا قیمتی اور قابل قدر سرمایہ ہے۔ ان کی زندگی ہمیں ایک عزم مسلسل کی تلقین کرتی ہے وہ ہمارے معرکہ آرا ماضی کی آخری یادگار ہمارے پُرامید حال کے معاون اور ہمارے تابناک مستقبل کے پیامبر ہیں۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو نہ صرف ہمارے قومی اوصاف ہیں بلکہ فخر و افتخار کا باعث بھی ہیں۔ ان کی شخصیت ایسے افراد میں سے ایک ہے جو اپنا لوہا اپنی زندگی ہی میں منوا لیتے ہیں دنیا ان سے سرسیدؒ کے تربیت یافتہ، حالیؔ کی چلتی پھرتی تصویر ایک عظیم مورخ اور محقق کی حیثیت سے واقف ہے لیکن اس حقیقت سے غالباً کم لوگ واقف ہوں گے کہ وہ تحقیق و تنقید کے میدان کے علاوہ شعر و سخن کے گلستان میں بھی محو گل گشت نظر آتے ہیں چنانچہ آپ کا یہ شعر

نہ فکر معیشت نہ عشق بتاں ہے
گذرتی ہے کیوں جاگتے رات ساری

ان کی شخصیت کی کس قدر عکاسی کر رہا ہے اور حقیقت سے کتنا قریب ہے اس میں جس لگن اور تڑپ کا اظہار کیا گیا ہے وہ کسی مزید صراحت کی محتاج نہیں انھوں نے ۶۰ برس تک جس طرح اردو ادب کی بقا اور اشاعت کے لئے انتھک جد و جہد کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

انگریزی زبان کے ایک ناقد کا خیال ہے کہ "اسلوب شخصیت ہے" یعنی جیسی شخصیت ہوتی ہے اس کا عکس انداز بیان میں پایا جانا لازمی ہے۔ یہ جملہ مولوی صاحب کے حق میں حرف بہ حرف صحیح ہے۔ ان کی شخصیت، سادگی، خلوص، دردمندی،

قومی ہمدردی اور راستبازی کا آئینہ ہے۔ تصنیف مصنف کے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے اور تصنیف سے نہ صرف مصنف کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس کی شخصیت بھی پڑھنے والے کی نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی تحریر دل و دماغ کی غیرمعمولی اور رلازوال قوتوں کی حامل ہے۔ مولوی صاحب کی تحریر کردہ کتاب "چند ہمعصر" جسکا تعلق ان کی نجی یادداشت سے ہے انہی خصوصیات کی نمائندہ ہے "چند ہمعصر" کے آئینہ میں خود مولوی صاحب کی شخصیت بھی بعض مقامات پر جھلکتی ہے۔

ہر شخص دوسرے شخص کے حسن و قبح پرکھنے کا ایک الگ معیار رکھتا ہے۔ اور جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے اسی کو دوسروں میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ "چند ہمعصر" میں مولوی صاحب نے اپنے ہمعصروں کا جائزہ لیا ہے اور ہر شخص کے کردار میں انسان دوستی کی صفت کو تلاش کیا ہے اور جس میں یہ خوبی نظر آئی ہے اس کو نہایت ہی لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔ انسان کی عظمت صرف دولت سے ہی عبارت نہیں ہے بلکہ انسان دوستی بھی اس کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور مولوی صاحب نے اسی جذبے کو قابل التفات گردانا ہے جس کی نمایاں مثال نور خاں کے مرقع میں اپنی تمام آب و تاب سے جلوہ گر ہے:۔

"لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے لکھتے ہیں ناموروں لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید اسے کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں امیروں اور بڑے لوگوں کے حالات ہی لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہوتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں۔"

مولوی صاحب نے نور خاں کے کردار میں بھی انسان دوستی کی صفت ظاہر کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان خواہ غریب ہو یا امیر دوسروں کی مدد کرنے میں سچی خوشی محسوس کرتا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو عالم کون و مکاں میں ربط و نظم رکھتا ہے یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کو حیات جاوداں بخشتا ہے

زندگی کی بہترین اقدار کا اجتماع صرف بڑے لوگوں ہی میں نہیں ہوتا بلکہ ان لوگوں میں بھی ہوتا ہے جن کو ہم چھوٹا اور حقیر سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ نام دیو مالی ایسا ہی ایک شخص تھا۔ مولوی صاحب نے جس سلیقہ سے نام دیو مالی کے کردار کو ایک اخلاقی قوت بنا کر پیش کیا ہے وہ نقید المثال ہے:۔

"وہ بہت سادہ مزاج۔ بھولا بھالا اور منکسر المزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا تھا۔ کام

سے عشق تھا اور کام کرتے ہی کرتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔"

دیوہالی کا خاکہ پڑھ کر ہمارے دل پر خاص اثر ہوتا ہے اور بڑائی کا وہ معیار سامنے آجاتا ہے جس کی طرف مولوی صاحب سے پہلے کسی نے ہماری توجہ مبذول نہیں کرائی یعنی ہر وہ شخص جسے اپنے کام سے عشق ہو وہ امر ہوجاتا ہے۔ مولوی صاحب کو بھی کام سے کتنی الفت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں بھی وہ نوجوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں اور ہر کام از آغاز تا انجام شوق کی فراوانی کے جلو میں تکمیل پاتا ہے۔ ان کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو یہی انہماک یہی دلچسپی اور یہی لگاؤ دلگن ہے جو وہ اپنے اداروں سے وابستہ رکھتے ہیں۔

مولانا حالی کی شخصیت سے متعلق متعدد مضمون لکھے جا چکے ہیں لیکن کسی نے حالی کی شخصیت کے بنیادی پہلوؤں کو واقعات کی مصوری سے اتنا اجاگر نہیں کیا جتنا مولوی صاحب نے کیا ہے چنانچہ تحریر کرتے ہیں:۔

"مولانا حالی کی سیرت میں بس دو ممتاز خصوصیات تھیں ایک سادگی اور دوسری درد دل اور یہی شان ان کے کلام میں ہے ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں کہئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں"

حالی کی ذات میں جو دردمندی، سادگی اور راست بازی کے جوہر تھے مولوی صاحب کی دوررس نظر نے ان تمام گوہروں کو ڈھونڈھ نکالا ہے جو حالی کی شخصیت میں مخفی تھے۔ اس بات سے مولوی صاحب کی اس صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ کردار کی خوبی پرکھنے کی مولوی صاحب میں کتنی صلاحیت ہے۔ مختلف چیزوں میں ایک ربط اور تعلق تلاش کرنے کے لئے ایسی ہی چشم بصیرت چاہئے۔

مولوی چراغ علی کی شخصیت میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ انسان کا اپنے بل بوتے پر آپ کھڑا ہونا ہے اور یہی وہ وصف ہے جو رفعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مولوی صاحب فرماتے ہیں:۔

"مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر اپنے آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت، لیاقت، فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔"

یہ کردار انہی خصوصیات کا حامل ہے مولوی چراغ علی کسی کی مدد کے محتاج نہ تھے بلکہ انھوں نے خود اپنی ہی ذات پر اعتماد کیا ہے مولوی عبدالحق بھی اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو اپنی زندگی کی تعمیر میں منت کش غیر نہیں ہونا چاہئے بلکہ "اپنی مدد آپ کرو" کا اصول پیش نظر رکھنا چاہیئے

میرن صاحب سے متعارف کراتے ہوئے مولوی صاحب نے ان کے اسی جوہر انسانیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا واضح ثبوت میرن صاحب نے اپنے استاد کی لڑکیوں کی پرورش کرکے دیا ہے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک بات میرن صاحب کی سیرت میں ایسی تھی کہ جتنی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ غدر کے ہنگامہ میں ان کے استاد لاپتہ ہو گئے تھے اور ان کی دو لڑکیاں تھیں جو بے یار و مددگار تھیں۔ میرن صاحب کو جب معلوم ہوا تو وہ ان لڑکیوں کو اپنے گھر لے آئے اور بیٹیوں کی طرح پالا اور اس محبت سے پرورش کی کہ وہ اپنے باپ کو بھول گئیں۔ جو کچھ کماتے تھے ان کے سامنے لاکر رکھدیتے خود طرح طرح کی تکلیف اٹھاتے لیکن ان پر آنچ نہ آنے دیتے۔ غرض ان کو پڑھایا لکھایا اور اچھی جگہ شادی کردی۔ حق شاگردی شاید ہی کسی نے اس طرح ادا کیا ہو۔ جو میرن صاحب نے ادا کیا اپنے کو مٹا کر دوسروں کی خدمت کرنا ہی جوہر انسانیت ہے"

میرن صاحب کے کردار میں سب سے بڑی خوبی دوسروں کی خدمت کرنا ہے اور یہی وہ جوہر انسانیت ہے جس میں انسان کی کامیابی کا راز مضمر ہے

سرسید دراس مسعود کے ضمن میں بھی مولوی صاحب نے خلوص، ہمدردی، محنت اور انسانیت ہے چنانچہ تحریر کرتے ہیں کہ:-

" وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے مصیبت زدوں کی داستان سن کر ان کا دل بھر آتا تھا اور فوراً اس کی مدد کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔ تعصب ان کے مزاج میں نام کو نہ تھا ہر مذہب و ملت کے لوگ ان کے دوست تھے اور سب سے یکساں مخلصانہ برتاؤ کرتے تھے اور سب کے کام آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے اور بھولے سے بھی ایسی بات نہ کہتے تھے جو کسی فرقہ کو ناگوار ہو"

اس مضمون میں سر راس مسعود کی ان خوبیوں کو، جو ان کی ذات سے متعلق تھیں جن جن کو پیش کیا ہے کا اخلاق، ہمدردی، محبت اور قوم کی بھلائی کا خیال جو ان کے کردار کی سب سے اہم خصوصیات ہیں دلچسپ کی ہیں جن کو پڑھکر ان کی شخصیت سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔

سرسیدؒ کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے مولوی صاحب سید صاحبؒ کی اس تحریک کو جو انھوں نے ا میں شروع کی تھی، جب لوگوں میں خلوص و محبت اور قومی جوش و خروش فنا ہو چکا تھا اور سرسیدؒ مسلمانانِ ہند کی کیا کوشش کر رہے تھے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

" سرسیدؒ کے دل میں قوم کا درد اور اس کو ذلت اور تباہی سے بچانے کی تڑپ موجود تھی۔ انھوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب قوم کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا

سرسید غدر ۱۸۵۷ء کے طوفان میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے جو بھلائے نہیں جا سکتے تھے وہ ایک عرصہ تک اسی درد سے بے تاب رہے اور آخر کار قوم کو ذلت کے غار سے نکالنے کے لئے ایک نئے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے سرسید میں انسان کامل کی صفات موجود تھیں سب سے بڑھ کر ان کا جذبۂ ایثار تھا جس نے انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی عطا کی'۔

سرسید کے کردار میں مولوی صاحب نے اس بات کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے کہ انسان اپنی ذاتی اغراض کے بجائے قومی مفاد کو ترجیح دے اور قوم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد قوم کی عزت و وقار کو اپنی عزت و وقار رکھے اور دوسروں کی خدمت کرنے میں اپنے آپ کو بھول جائے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو مولوی صاحب کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں اور وہ دیگر حضرات میں بھی انہی خصوصیات کو دیکھنے کے تمنی نظر آتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنے تمام مضامین میں جو کہ "چند ہمعصر" میں ہیں، ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ اپنے بھائیوں کی مدد کرنی چاہیئے اور کام سے کبھی نہ گھبرانا چاہیئے۔ چنانچہ کام کی لگن اور خدمت خلق یہی ان کے موضوع سخن ہیں۔ اس کتاب کے چند خاکے دراصل مولوی صاحب کی شخصیت کا عکس ہیں۔ مولوی صاحب کے یہی وہ اوصاف حمیدہ ہیں جن کے باعث وہ مقبول خاص و عام ہیں۔

"چند ہمعصر" اپنی بلند ادبی حیثیت کی وجہ سے اُردو ادب میں نادر اضافہ ہے جس کی عبارت میں صفائی، سلاست، سادگی اور روانی کے دوش بدوش بے ساختگی اور شگفتگی بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اس کی زبان بھی تصنع اور مبالغہ سے مبرا ہے اور اس کا دامن انسان دوستی، وطن پرستی فقر و استغنا کے موتیوں سے پُر ہے اسلوب بیان نہایت عمدہ دلکش، شگفتہ موثر اور دلپذیر ہے مولوی صاحب نے اس کتاب کو لکھ کر بعض گمنام شخصیتوں کی خوبیوں سے ہم کو متعارف کیا ہے۔ نام دیو مالی اور نور خاں کے خاکے تحریر کر کے اردو ادب میں ان کا نام زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ انھوں نے یہ مضامین نہ تو طنز و مزاح کی خاطر لکھے ہیں اور نہ تفریح طبع کے لئے۔ ان کی تحریر بالکل سادی اور سہل ہے وہ خیال کو مقدم سمجھتے ہیں اور اظہار تمنا کو موخر۔ ہمیں اس کتاب کو پڑھ کر ایک لمحے کے لئے انسان کے دل سے قریب ہونے کا موقع ملتا ہے جس میں خندۂ زیر لب بھی ہے اور گریۂ شبنم بھی۔

یہ کتاب انسانی ہمدردی، اخلاق و سادگی اور خود اعتمادی کی بھی نمائندہ ہے۔ جس میں نور خاں کے اصول، میرن صاحب کی انسان دوستی، راس مسعود کی مخلصانہ طبیعت، مولانا حالی کی سادگی، چراغ علی کا اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا، نام دیو مالی کا کام سے عشق اور سرسید احمد خاں کی تربیت و اصلاح کی تحریک کے حالات مفصل طور پر تحریر کر کے قوم کے جوانوں کے جذبات ایثار و قربانی کو نہایت لطیف پیرائے میں ابھارا گیا ہے۔

مونسیہ زرین لکھنوی

عبدالحق بحیثیت ایک نقاد

اگر ہم اردو ادب میں تنقید نگاروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور اس سلسلہ کی تمام تصنیفات کی تنقیح کریں تو پتہ چلے گا کہ بہت ہی کم کتابیں ایسی ہیں جو معیار تنقید پر پوری اترتی ہیں حالی پہلے نقاد ہیں ——— جنھوں نے اس کوچے میں سب سے پہلے قدم رکھا اور "مقدمہ شعروشاعری" لکھ کر اردو ادب میں فن تنقید کی ابتدا کی اور اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت بخشی۔ آپ کے تنقیدی کارنامے آپ کی سنجیدہ دماغی، وسعت نظر، خوش مذاقی، غیر جانب داری اور بہترین طرز بیان کے بیش بہا خزانے ہیں، مولوی عبدالحق صاحب حالی کے ہونہار شاگرد ہیں۔ حالی اسکول قائم ہی آپ کے دم سے ہے۔ آپ حالی سے کافی متاثر ہیں۔ آپ کی شخصیت اور فن دونوں میں ان کا پرتو نظر آتا ہے۔ آپ کی تحریروں میں وہی سادگی اور وہی خلوص ہے جو مولانا کا طرۂ امتیاز تھا، وہی ایثار و ہمدردی ہے جس کا حسین امتزاج ہمیں حالی کے یہاں نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ کی تنقیدوں میں بھی وہی بے لاگ تبصرہ اور غیر جانب داری ہے جو حالی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ آپ کی زبان میں نذیر احمد کے چٹخارے، آزاد کی شوخی اور شبلی کا زور بیان نہیں بلکہ حالی کی سادگی، سلاست اور خلوص ہے اور بدرجہ اتم ہے۔

مولوی صاحب خود ایک اچھے انسان ہیں اس لئے وہ ایک اچھے ناقد بھی ہیں۔ آپ نے ادبیات، لسانیات اور متفرقات پر بہت سے بصیرت افروز مقدمات لکھے ہیں۔ آپ کے شوق تجسس اور ذوق تحقیق کی وجہ سے صدہا پرانے قلمی نسخے جو دیمک اور جھینگروں کی خوراک بنے پڑے تھے اب وہ زیب قرطاس ہو کر ہماری ضیافت طبع کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ آپ کے ذوق علمی اور مساعی جمیلہ کی بدولت آج ہم تاریخ نظم و نثر اردو سے تھوڑے بہت واقف ہیں۔ آپ کے

زیر ہدایت انجمن ترقی اردو نے مایہ ناز تصنیفات و تالیفات شائع کیں۔ بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کیا۔ قابل فخر جواہر پاروں کو خاک سے اٹھا کر افلاک پر پہنچایا۔ اردو شعرا کے تذکرے، جدید اصول ترتیب و تدوین کے مطابق شائع کئے۔ اردو زبان کی پہلی معیاری قواعد لکھی۔ فنی و علمی اصطلاحات اور ان کے مخففات کی طرف توجہ دی۔ اوقات کے ضابطے اور ان کی علامات مقرر فرمائیں۔ لفظی بحثوں اور مبالغہ آمیز تقریظوں اور جذباتیت کے بجائے ٹھوس دلائل اور حقائق کو فضیلت بخشی۔ وقت کے دبیز پردوں کو اٹھا کر عظیم شخصیتوں کے کارناموں کو بے نقاب کیا۔ جانب داری یا کم فہمی کی وجہ سے جو افضل ہستیاں افضل تسلیم کر لی گئی تھیں ان کے کلام کو تحقیق و انصاف کی کسوٹی پر پرکھ کر لوگوں کو کھرے اور کھوٹے کا فرق بتایا۔

غرض تحقیق و تجسس سے ہر فن کار کو اس کے صحیح منصب پر سرفراز کیا۔ مثلاً ولی دکنی کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں آپ نے اس کو دور کیا اور ٹھوس دلائل کی روشنی میں یہ واضح فرمایا کہ اولیت کا سہرا اور سرفرازی کا تاج قلی قطب شاہ کے سر ہے۔ آپ کسی تحقیق کو حرف آخر نہیں سمجھتے بلکہ ہمیشہ سعی و جدوجہد کے تیشوں سے پرانے دفینوں کو کھودتے ہیں۔ پھر اپنی بیش بہا معلومات سے تمام علمی دنیا کو روشناس کر دیتے ہیں۔

بابائے اردو نے "سب رس" پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا اور اس کو شائع کرا کے ملّا وجہی کے مرتبہ کو متعین کیا۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں پر بے لاگ تبصرہ کیا۔ اور ان کے دور کو پیش نظر رکھ کر ان کی ادبی کاوشوں پر مفصل بحث کی "باغ و بہار" پر مقدمہ لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کیا کہ وہ فارسی کتاب "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ آپ نے مثالیں پیش کر کے اور ٹھوس حقائق کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ اس کا ماخذ "چہار درویش" نہیں بلکہ "نوطرز مرصع" ہے۔

مولوی صاحب نے "روح ادب" "روح سیاست" "حزن اختر" "انجام زندگی" "رسائل عماد الملک" اور "افادات مہدی" وغیرہ پر تبصرے کئے۔ "اردو لٹریچر" "مکاتیب امیر مینائی" "شرح دیوان غالب" اور "تذکرہ اعجاز سخن" پر تنقیدی مقالے لکھے۔ آپ کی تنقیدات کے مجموعے "تنقیدات عبدالحق" سے آپ کے تنقیدی شعور پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم "مقدمات عبدالحق" کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ متنوع واردات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جس میں ہر بحث موج بن کر ابھرتی ہے اور دلائل کے موتی بکھیر کر روپوش ہو جاتی ہے۔ ہر مقدمہ اپنی انفرادی شان میں نظر آتا ہے۔ کسی میں فن شاعری پر بحث ہے تو کسی میں فن مکتوب نویسی پر تبصرہ۔ کسی میں قواعد اور صرف و نحو پر روشنی ڈالی ہے تو کسی میں اسلوب اور طرز تحریر پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ غرض ہر مقدمہ اپنی جگہ بہت خوب ہے۔

تنقید کے متعلق مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"تنقید پر صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع اور نظر دور بیں ہو۔ جو صرف ذوق صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دنیائے ادبیات کا شناور ہو۔ جس نے ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد ان امور کے

متعلق خاص رائے قائم کی ہو اور اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کے دل نشیں کرا سکتا ہو۔"

آپ کی تنقیدیں اس بات کی شاہد ہیں کہ آپ میں یہ جملہ صفات موجود ہیں۔ مشہور ناقد ہڈسن کہتے ہیں کہ:

" ادبی نقاد اس کو کہتے ہیں کہ جس میں کسی فن پارے کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ اس فن کے ماہر کا یہ کام ہوتا ہے کہ کسی فنی تخلیق کو دیکھے سمجھے غور کرے اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی جانچ کرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگائے۔"

اس قول کی روشنی میں اگر ہم "تنقیدی سرمایہ" کے مصنف عبدالشکور کی ناقدانہ رائے کو سامنے رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ میں ایک اچھے ناقد کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

" مولوی صاحب کی زبان صاف ستھری۔ رچی ہوئی اور دھلی ہوئی ہوتی ہے۔ اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ وہ جس کتاب پر بھی مقدمہ لکھتے ہیں بہت غور و خوض اور تامل و مطالعے کے بعد لکھتے ہیں ان کے نزدیک تنقید نگاری ایک اہم اور ذمہ دارانہ فرض ہے اس لئے بغیر کافی تیاری اور اہتمام کے وہ تنقید لکھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔"

ناقد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تنقید کا بارگراں اٹھانے سے پہلے لٹریچر فن اور موضوع پر کافی دسترس حاصل کرلے کیونکہ مطالعہ کی وسعت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ غور و فکر کی گہرائی۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب عجلت پسند نہیں آپ کو اکثر مصنفین سے شکایت ہے کہ:

" بعض انشا پردازوں کو مصنف بننے کی اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ ان کے کارناموں میں ایسی قابل افسوس خامیاں رہجاتی ہیں جو صرف محنت اور غور و فکر سے ہی رفع ہو سکتی ہیں۔"

تنقید کرتے وقت آپ لسانی خوبیوں کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتے۔ عموماً زبان کی صفائی اور سادگی پر کافی زور دیتے ہیں۔ اپنے ایک خطبے " آسان اردو" میں اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ:

"ہم آسان کیوں نہیں لکھتے اور مشکل کیوں لکھتے ہیں"۔ آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان نہیں. . . . . . "

مولوی صاحب زبان کی سلاست پر بہت زور دیتے ہیں آپ کی تحریریں سلیس اور شگفتہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس

ادگی میں بھی مقفیٰ اور مسجع عبارت جیسا حسن نظر آتا ہے مثلاً نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مرحوم
ے مکاتیب پر تبصرہ کرتے ہوئے دونوں شخصیتوں کا جو موازنہ کرتے ہیں وہ ملاحظہ ہو:-

"ایک سیاسی عیاریوں کا بادشاہ ہے تو دوسرا صاف گوئی اور استقلال میں اٹل ہے۔ ایک ہوا کو دیکھتا اور زمانے کے موافق چلتا ہے تو دوسرے کو اپنے ایمان اور صداقت پر اعتماد ہے۔ ایک اپنی میٹھی باتوں سے دل لبھاتا ہے تو دوسرا منطقی دلائل اور معاملہ کی تہ تک پہنچ کر قائل کرتا ہے۔ ایک کی خوش بیانی اور ظرافت اور دوسرے کا وقار اور صبر و سکون دونوں قابل داد ہیں، ایک معاملات کو دیکھ کر جلد جلد رنگ بدلتا بگڑتا اور خوش ہوتا ہے دوسرا پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہے۔"

سادگی اور سلاست کے باوجود ان ہلکے پھلکے جملوں میں جو خوبی پنہاں ہے وہ محتاج بیان نہیں اس
یں علمیت کی گہرائی ضرور ہے مگر علمیت کا رعب کہیں نہیں۔ میدان میں بہتے ہوئے دریا کی طرح سبک رفتاری ہے
ہاڑی سے گرتے ہوئے آبشار کی طرح شور و تلاطم نہیں۔ آپ نہ صرف ادب کے اچھے نقاد ہیں بلکہ زبان کے
یک اچھے نباض بھی ہیں۔

مولوی صاحب سادگی زبان کے ساتھ درد و اثر اور سوز و گداز کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں لہٰذا مقدمہ
انتخاب کلام میر" اور مقدمہ "مثنوی خواب و خیال" میں اس کی کافی وضاحت فرماتے ہیں۔ تنقید کرتے وقت
(۱۵) اور ہیئت (FORM) دونوں پر نظر رکھتے ہیں اور ساتھ ہی جزئیات کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔
ارجی اور داخلی دونوں قسم کے حسن پر غائر نظر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا پروفیسر عبدالشکور کہتے ہیں کہ:-

"ان کی تنقید اگر ایک طرف (FORM) کا جائزہ لیتی ہے تو دوسری کو پرکھتی ہے۔ مولوی صاحب حیرت انگیز توازن کے ساتھ دونوں جانب متوجہ ہوتے ہیں۔"

مولوی صاحب کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ آپ کا اشہب خامہ میدان ادب میں کافی جولانیاں دکھاتا ہے لیکن
شتاق شہسوار کی طرح غیر جانبداری کی باگیں آپ کے ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹتیں۔ ڈرائڈن (Dryden) جو خود بھی ایک بڑا نقاد
ھا اعتراف کرتا ہے کہ

"نقادوں میں نفرت کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ محاسن سے بھی چشم پوشی کر لیتے ہیں۔"

لیکن مولوی صاحب کا دامن ان آلودگیوں سے پاک ہے آپ نے محاسن سے کبھی چشم پوشی نہیں کی بلکہ ان کو اور اجاگر کیا اسی طرح خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ ان پر بھی بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں لیکن معائب پر روشنی اس انداز سے ڈالتے ہیں کہ مصنف کی اصلاح ہو تحقیر نہ ہو "ارباب نثر اردو" میں آپ فرماتے ہیں کہ "تحقیق اگلوں کی ہو یا پچھلوں کی قابل قدر ہے اگر اس میں کوئی خطا ہے تو قابل اصلاح ہے نہ کہ لائق سب و شتم ....."

آپ اپنی تنقیدوں میں اس چیز کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین اتنے اعتراضات کے باوجود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ

"عبدالحق صاحب کسی کی بے جا سرزنش نہیں کرتے وہ غلطیوں کا انکشاف البتہ روا سمجھتے ہیں لیکن اس طریقہ پر کہ اس انکشاف سے مصنف کی تحقیر نہیں ہوتی اور نہ اس پر استہزا کیا جاتا ہے۔"

"تنقید اور تجزیہ لازم و ملزوم ہیں تنقید کی پہلی شرط یہی ہے کہ تنقید نگار فنی تخلیقات میں ڈوب کر اور کھو کر فن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس انداز سے سوچے جیسا کہ فن کار نے سوچا ہے پھر ان خیالات و افکار اور ان کی نوعیت پر روشنی ڈالے اور عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر فنکار کے احساسات کو پڑھے پیش کردہ مواد پر غور کرے اور اس کے فنی حسن کا پتہ لگائے۔ آپ کی تنقیدات اس کسوٹی پر پوری اترتی ہیں آپ مصنف اور تصنیف پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس کے دور، حالات، واقعات اور جذبات و احساسات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

"چند ہمعصر" میں مولوی صاحب نے حالی، سرسید اور اقبال وغیرہ پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور ان کی شخصیت کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں کو بڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی مرحوم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں وہ مختلف متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہیں ہوگا ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ۔ تباہی بھی موجود ہے۔"

سرسید کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:-

مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا کیا منشاء تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی انھی دنوں اور انھی کی بدولت ...

اس کتاب میں ایک طرف خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں تو دوسری طرف خود مولانا کی شخصیت کے تار و پود بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور آپ کی ذہنی سطح۔ ادبی صلاحیت اور نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی صاحب چونکہ ایک قابل نقاد کے ساتھ عظیم محقق بھی ہیں اس لئے ان کی تنقیدوں میں تحقیق کا عنصر غالب نظر آتا ہے آپ کی تنقیدیں سلجھی ہوئی اور بے لاگ ہوتی ہیں بعض جگہ متانت و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ظرافت کا رنگ بھی نظر آتا ہے اور کہیں ظرافت میں بھرپور طنز بھی ملتا ہے لیکن اس سے اسلوب کی دلآویزی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ حسن میں اور اضافہ ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ محمد تراب علی خاں باز لکھنے ...

"بعض اوقات تنقید میں ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں اس وقت تحریر میں اس قدر دلآویزی آجاتی ہے کہ
اصل کتاب سے زیادہ تنقید کے مطالعہ میں مزا آتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر ایک نظر" میں مولوی صاحب کی تنقید پر کافی اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً وہ بنیادی چیزوں سے سروکار نہیں رکھتے۔ مغربی خیالات کو سمجھنے ان کی مفید باتوں کو منتخب کرنے اور انہیں مشرقی قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے شاعری کی ماہیت سے واقف نہیں لہٰذا نظم کی خوبیوں اور برائیوں کی تمیز کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں انھوں نے آلۂ تنقید پر مزید جلا نہیں کی ہے اس لئے ان کی اہمیت باوجود ان کی قابل قدر خدمتوں کے بہت زیادہ نہیں وہ محض معمولی نقاد کی طرح لکھتے ہیں لہٰذا جس نقاد کی اردو دنیا منتظر ہے وہ عبدالحق نہیں لیکن اتنی نکتہ چینیوں کے باوجود وہ اعتراف کرتے ہیں کہ

عبدالحق صاحب نے جا نکتہ چینی سے احتراز کرتے ہیں عبدالحق صاحب میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا مادہ بھی موجود ہے اور وہ اس سے کام بھی لیتے ہیں: انہیں اس کا احساس ہے کہ اردو زبان میں تنقید کی کمی ہے اور حالی نے جس کی داغ بیل ڈالی تھی اس کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے ضرورت ہے۔ عبدالحق صاحب: کا ر میں اس سے عجلت سے کام نہیں لیتے محنت اور غور و فکر ان کی عادت ہے وہ عموماً اپنے موضوعات پر کامل عبور رکھتے ہیں اور جب تک کسی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے رائے زنی نہیں کرتے ہیں۔ اپنی حدود کے اندر ذوق صحیح کے بھی حامل ہیں اچھے برے کھوٹے کھرے کی تمیز رکھتے ہیں وسعت نظر بھی موجود ہے۔ مغربی ادبیات سے نہ سہی مغربی تنقید سے واقفیت حاصل ہے۔ جزئیات سے کافی شغف ہے اور معمولی سی معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

جس کتاب پر تنقید لکھتے ہیں تو اس پر کامل عبور کے بعد قلم اٹھاتے ہیں عموماً بے لاگ رائیں دیا کرتے ہیں کتاب کے محاسن اور معائب کو ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ تنقید کو مثالوں سے جامع کرتے ہیں اور کج فہمی اور کوتاہ نظری سے اپنی تنقید کو آلودہ نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ

کمال ہے کلیم صاحب مولوی صاحب میں ایک اچھے ناقد کی ساری خوبیاں گنانے کے بعد پھر یہ کہتے ہیں کہ "جس نقاد کی اردو دنیا منتظر ہے وہ عبدالحق نہیں" ان کے یہاں کس قدر تضاد ہے شروع میں لکھتے ہیں کہ

"عبدالحق صاحب نے جو اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے وہ مثل روز روشن ہے اردو زبان وادب کی خدمت ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور جو احسانات انھوں نے اردو پر کئے ہیں اسے دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی"۔

لیکن پھر خود ہی کہتے ہیں کہ "ان کی اہمیت باوجود ان کی قابل قدر خدمتوں کے بہت زیادہ نہیں"۔

حالی جن کے مرتبہ تک مولوی عبدالحق صاحب نہیں پہنچ سکتے خود ان کے متعلق ہی فاضل ناقد کی رائے ہے کہ "خیالات ماخوذ واقفیت محدود۔ نظر سطحی۔ فہم و ادراک معمولی۔ غور و فکر ناکافی۔ تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط" لہٰذا کچھ کہنا ہی بے کار ہے جہاں تک شاعرانہ خوبیوں اور شاعری کی ماہیت سے واقفیت کا تعلق ہے اس ضمن میں ہم دوسرے ناقد آل احمد سرور کی رائے پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مولوی صاحب کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ شاعر نہیں لیکن یہ بات ان کے ایک اچھے نقاد ہونے میں مخل انداز نہیں"۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب ایک کامیاب نقاد ہیں ان کے جواہر پارے اردو ادب کا وہ گراں مایہ سرمایہ ہیں جن پر ہمیشہ فخر کیا جائے گا اور جوں جوں وقت گذرتا جائے گا ان کی اہمیت میں اور

(باقی صفحہ ۲۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

افروز شوکت

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سیاسی بصیرت اردو کے سوبے میں

اردو زبان کے لئے بابائے اردو نے جو خدمت انجام دی ہے اور جس کے لئے انھوں نے اپنی عمرِ عزیز وقف کر دی ہے اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خود زبان کی اہمیت کا تصور نہ واضح ہو جائے لہٰذا معاشرہ کے ارتقا میں زبان کے دائرۂ عمل کی اہمیت کا ایک اجمالی خاکہ بطور تمہید پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

معاشرہ کے اجزائے ترکیبی میں ہر جز وا اپنی مخصوص انفرادیت سے اس کی ہیت مجموعی کو قائم رکھتا اور اس کے ارتقا میں اپنے دائرۂ عمل سے تعاون کرتا ہے اگر یہی اجزاء باہم دگر نہ مل سکیں تو معاشرہ نہ تو ترقی کر سکتا ہے اور نہ اس کی ہیت مجموعی قائم رہ سکتی ہے ان ہی اجزا میں "زبان" ایک مخصوص کردار کی حامل ہے بنا بریں ایک ترقی پذیر اور متوازن معاشرہ کا قیام بغیر ترقی پذیر زبان کے ممکن نہیں۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ زبان اپنی دنیا میں "تثلیثی احاطہ" پر قائم ہے۔

مذہب — زبان کا تعلق مذہب سے

ثقافت △ (زبان) ادب — زبان کا تعلق "ثقافت" سے

زبان کا تعلق "ادب" سے

یہ اضافی تقسیم یا حد بندی دراصل ان مخصوص تصورات و مقاصد کے پیش نظر لازمی ہے جنھیں وہ مختلف صورتوں میں جنم دیتی ہے اور ان ہی کی فراوانی قوم کی ترقی کا پیمانہ ہے کوئی بھی زبان ہو۔ خواہ وہ قدیم یونانی ہو۔ لاطینی ہو۔ یا عربی۔ سب نے اسی نظریۂ تثلیث کے تحت زبان کے آئینہ

میں مذہب، ثقافت اور ادب کو پیش کیا اور آنے والی نسلوں نے ان خدوخال کو گراں قدر سرمایہ کی صورت میں قبول کرکے ماضی کی حسین و تلخ یادوں کے ملے جلے تاثرات سے اپنے لئے نئی راہیں متعین کیں!

" اردو زبان کی ابتدا اپنی نوعیت میں بالکل انوکھی ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں اس زبان کو جو نام دیا گیا اس کا پس منظر دو بنیادی تصورات کی وضاحت کرتا ہے۔!

(۱) دنیا کی کم و بیش جتنی زبانیں ہیں وہ علاقائی اور نسلی تصورات کی غمازی کرتی ہیں اور اسی خطہ کے نام سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً انگریزی (انگلش) اطالوی (اٹالین)، جرمن وغیرہ ہم۔ یعنی ان سے "بوئے قوم پرستی" آتی ہے۔ لیکن مقام فخر ہے کہ "اردو" اس جغرافیائی قید و بند اور نسلی امتیاز کے ماورا ہے اس کا تصور محدود قوم پرستی کا متحمل نہیں۔

(۲) ظاہر ہے کہ جس زبان کا لقب ہی "ترکی" زبان کا لفظ ہو اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کے ذخیروں کو خود میں ضم کرنے اور انھیں منتقل کرنے کی کس درجہ صلاحیت موجود نہ ہوگی، یہ خوبی ہر زبان میں نہیں ہوتی، اگر اردو میں یہ وصف نہ ہوتا تو تعجب نہیں کہ وہ کب کی مردہ ہو چکی ہوتی سب سے پہلے اپنی کم سنی میں جس پختہ زبان سے سابقہ پڑا وہ اپنے وقت کی شاہی زبان "فارسی" تھی۔ اور اب جس سن رسیدہ زبان سے مقابلہ ہے وہ "انگریزی" ہے۔ جو حکومت وقت کی زبان ہے۔

یہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جس سے ہمیں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے کارناموں اور ان کی خدمات کو دیکھنا ہے

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کو ایسے جاں گسل حوادث کا شکار نہیں ہونا پڑا جن سے "اردو" دوچار ہوئی۔ اس نے برصغیر ہند و پاک میں پراکرت بھاشاؤں کے درمیان جنم لیا اور ان پر سبقت لے گئی حالانکہ یہ اردو کی کم نصیبی ہے کہ اسے شاہان وقت کی سرپرستی نصیب نہ ہوئی ملک کے ہر گوشہ میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود رہے، جس زمرہ میں اس نے تدریجی منزلیں طے کیں گو ابتدا میں وہ عوام سے متعلق تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے معاشرہ کے بلند طبقے کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیا۔ یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ ہر غالب رائج الوقت زبان دوسری مقامی زبان پر اثر انداز ہوتی ہے اس وقت غالب اور درباری زبان "فارسی" تھی۔ چنانچہ فطری طور پر ملک کی دیگر مقامی زبانیں بھی فارسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ لیکن جغرافیائی قید و بند کی سختی سے مقید ہونے کی وجہ سے انھیں وسعت کی راہیں میسر نہ آسکیں اس کے برخلاف اردو کی تخلیق اور بنیادی تصورات میں چونکہ فارسی کو دخل تھا اور فارسی خود عربی سے متاثر ہو چکی تھی لہٰذا ایک ہی وقت میں اردو عربی اور فارسی ادب۔ ثقافت اور مذہب کی نمائندہ بن گئی یہ ایک عجیب بات ہے کہ اردو سرزمین ہند میں پیدا ہوئی لیکن "بوئے ہند" پیدا نہ کر سکی بلکہ اس نے جن تصورات کی غمازی کی وہ قریب قریب اسلامی تھی یہی بنیادی مرکز قبول ہے جس نے اردو کو ہمیشہ کے لئے مسلمانوں سے منسلک کر دیا اور ان کی تہذیب کی نشان دہی کر دی حالانکہ غیر مسلموں کی کثیر تعداد اس سے نہ صرف واقف اور قدر داں رہی بلکہ انھوں نے قابل قدر خدمات بھی انجام دیں۔ لیکن باوجود وسعت کے اردو "بجز احساس تشکر کے انھیں اور کچھ نہ دے سکی یہی وہ مقام ہے جہاں "اردو" "مسلم قومیت" کو ایک علٰحدہ روپ میں پیش کرکے "دو قومی نظریہ" کی بنیاد رکھتی ہے۔

سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں اردو سے نفرت و بیزاری کا اظہار چند ذی رتبہ ہندوؤں سے شروع ہوتا ہے اس لئے کہ انھیں اردو میں "بوئے غیر" یا "بوئے مسلم" آتی تھی جو خصوصی طور پر مسلم ملت کی تہذیب و تمدن، مذہب و ثقافت ادب و حکمت کی آئینہ دار تھی لہٰذا برنائے تعصب اردو کو ختم

کرنے کے لئے اس سے اظہار نفرت کیا گیا اور ہندی کی ترویج و ترقی کی اسکیم و تجاویز زیر غور آنی شروع ہوئیں یہی نہیں بلکہ باقاعدہ کمیٹیوں، سبھاؤں اور مجلسوں نے مختلف ناموں سے جنم لیا اور اردو کی بیخ کنی کے لئے مورچہ قائم کیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا سالانہ جلسہ گاندھی جی کی زیر صدارت ناگپور (سی پی) میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے بہ حیثیت ایک رکن کے شرکت کی اس میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ملک کی زبان کیا ہونی چاہئے جب ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ہندوستانی" گاندھی جی کے مزید استفسار پر آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کے رزولیشن کی وضاحت کی کہ "...... ملک اور کانگریس کی زبان ہندوستانی ہوگی......" جس پر گاندھی جی فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں...... " بابائے اردو نے جواباً فرمایا "اگر ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا......" الغرض گاندھی جی نے پینترے بدلے اور ڈاکٹر صاحب کی بحث کے نتیجہ میں گاندھی جی کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ یعنی "...... میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا......" جس پر آپ نے فرمایا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑیں...... " آخر دل برداشتہ ہو کر مولوی عبدالحق صاحب اس انجمن کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے اس لئے کہ وہ ذہنیت بے نقاب ہو چکی تھی جو اس انجمن کے پس پردہ کار فرما تھی۔

اس سے قبل سر سید اور دیگر ہمدردانِ زبان کی کوششیں قومیت کے محدود تصور سے بالاتھیں، اپنے اور پرائے کا امتیاز نہ تھا۔ اگر منتہائے مقصد کچھ تھا تو صرف "زبان" اردو کی بقا اور اس کا ارتقا۔ لیکن گاندھی جی کی ہندی نوازی نے سوتے فتنہ کو جگا دیا۔ ایک طرف تو مسلم ملت نے

ایک علیحدہ "قومیت" کا اعلان کیا دوسری طرف ڈاکٹر صاحب نے اپنی جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔ اس لیے کہ اب اردو کا مسئلہ صرف زبان ہی کی حد تک نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس سے مسلم ادب ثقافت اور مذہب وابستہ تھا جس کا تحفظ مسلم معاشرہ کا تحفظ تھا اور جس کی بقا مسلم قوم کی بقا تھی۔ لہٰذا اسی سال کل ہند اردو کانفرنس علی گڑھ میں بلائی گئی اور دہلی کو انجمن کا صدر مقام تجویز کیا گیا، نیز چونکہ ملک کی کانگریس کا طبقہ چھایا ہوا تھا جس کی اردو دشمنی اظہر من الشمس ہو چکی تھی اس لیے ہر گوشۂ ملک پر نظر رکھنی اور انجمن کی شاخوں کو جا بجا پھیلا کر اردو کو زندہ اور اس کو جاری و ساری کرنے کی ہر ممکن سعی کی گئی چنانچہ بابائے اردو کا یہ قول صداقت پر مبنی ہے کہ "تعمیر پاکستان کی تعمیر میں سب سے پہلی اینٹ جس نے رکھی وہ اردو زبان ہے......"

اگر ڈاکٹر صاحب موصوف کے جملہ کارناموں اور کاوشوں کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین طریق کار نظر آتے ہیں۔ اول مدافعانہ۔ دوم تناعت سوم اردو ادب کو وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ گراں قدر بنانا۔ ان ہی کے پیش نظر انجمن نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دی جہاں اردو کا جنازہ تیار کیا جا رہا تھا۔ مثلاً ریاست کشمیر اور جے پور میں اردو جسے سرکاری حیثیت حاصل تھی ختم کیا جا رہا تھا۔ وہاں اس سعی کو ناکام بنایا گیا۔ جہاں اردو سے مغائرت برتی جا رہی تھی وہاں سعی بسیار کے بعد اردو کو داخل نصاب کرایا گیا۔

بابائے اردو نے خود گاندھی جی سے اور دیگر وزرا سے اس ضمن میں ملاقات کی۔ سی۔ پی اسمبلی میں اردو میں تقریر کی اجازت، اردو میں رپورٹ لکھنے کی منظوری اور اسٹینوگرافر کا تقرر عمل میں

لایا گیا، ڈاک خانوں کے فارم اور ریلوے کے ٹکٹوں پر اردو تحریر کرائی گئی۔ ان کے علاوہ اسی قسم کی مختلف مدافعانہ کارروائیاں کی گئیں۔

دوسرا کام اشاعت کا تھا جس کے لئے انجمن نے حتی الامکان سعی کی۔ ہر گوشۂ ہند میں انجمن کی شاخوں کو پھیلایا۔ ان علاقوں پر خصوصی توجہ دی جو اردو سے قطعی نابلد تھے۔ مثلاً ملیبار، کالی کٹ، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، ٹراونکور اور کوچین کو نہ صرف آشنائے زبان کیا بلکہ ان میں ذوق ادب بھی پیدا کیا۔ چھوٹا ناگپور جو کیتھولکس کا مرکز تھا اس میں اس درجہ اردو کا پرچار کیا کہ نہ صرف وہ زبان سیکھ گئے بلکہ وہاں کے مقامی نیم وحشی باشندے بھی اردو کی بدولت انسانیت سے ہم کنار ہو گئے۔

سی پی جسے اردو کے لئے قتل گاہ تصور کیا جاتا تھا وہی اردو کی اشاعت میں اول رہا اور اس کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ جہاں گاندھی جی نے اپنی ذہنیت کو اجاگر کیا تھا جہاں کے وزیر اعظم پنڈت روی شنکر شکلا نے تعصب کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمانوں کی وفاداری کو " اردو زبان کے قطعی ترک استعمال " کے زریں اصول سے مشروط کیا تھا۔ وہاں انجمن نے فضا کو یکسر بدل دیا۔ انجمن کی متعدد شاخیں، کتب خانے، مدرسے قائم ہوئے۔ حکومت کو اردو تعلیم کی طرف توجہ کیا۔ اردو کو داخل نصاب کرایا، کالجوں میں اردو کے پروفیسروں کا تقرر عمل میں آیا۔ نتیجے کے طور پر، لوگوں میں علمی ذوق اس انتہا کو پہنچا کہ اردو کانفرنسیں اور مشاعرے ہر طرف منعقد ہونے لگے مزید برآں وہاں مسلمان اقلیت میں ۲ - ۲½ فی صد تھے جن میں قومی بیداری اور روشن خیالی اس درجہ بیدار ہوئی کہ وہ ہمیشہ وہاں کی اکثریت پر چھائے رہے۔

۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی سعی پیہم سے اینگلو انڈینز کو اردو زبان سے آشنا کرایا، اور اردو کی طرف رغبت دلائی اور انہوں نے بعد ازاں باقاعدہ ایک قرارداد کے ذریعہ اپنے مدارس میں اردو کی تعلیم لازمی قرار دی۔

> بابائے اردو نے برصغیر ہند و پاک کا کوئی مقام ایسا نہ چھوڑا جہاں اردو کی خاطر تشریف نہ لے گئے ہوں اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس امر کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا کہ اردو کی ترویج و ترقی میں کس طرح حصہ لیں، باہمی رنجش و منافرت کو پسِ پشت ڈال کر خلوص و یک جہتی، خوش خلقی اور اتحاد عمل سے اس مشن میں تعاون کریں۔ ادیب، مصنفین، شعرا، طلبا اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور عام لوگ سب ہی کو اردو کی ترویج میں دعوت عمل دی۔

بنگال میں گو انجمن نے اردو داخل نصاب کرادی گئی تھی۔ لیکن حکومت نے اسکولوں میں اردو اساتذہ کے تقرر سے گریز کیا لہٰذا ڈاکٹر صاحب موصوف نے دہلی میں جو بنگالی حضرات تھے انھیں اردو میں تعلیم دے کر وہاں بھیجا۔ لیکن افسوس ان کا تقرر انجمن کے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ بہر نوع اردو کے لئے وہاں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑا۔

تیسرا کارنامہ ادب کی توسیع اور انمول شہ پاروں سے مزین ہے۔ انجمن نے کم و بیش دو سو پچاس کتب شائع کیں، جن میں ادب، تاریخ، فلسفہ سائنس، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، لغات، صرف و نحو، اصلاحات، سوانح، معلومات عامہ اور تنقید کی گراں قدر تصانیف شامل ہیں اصطلاحات

علمیہ کی متعدد جلدیں، اصطلاحات پیشہ وران آٹھ جلدوں میں، انگریزی اردو کی جامع لغات، وضع اصطلاحات دنیا کے ادبیات عالیہ کے تراجم شائع کئے۔ اردو کے سینکڑوں قدیم بڑی کاوش سے دستیاب کئے بعض کو شائع کیا اور ان پر مضامین تحریر کئے جنہوں نے تاریخ اردو کی ماہیت ہی کو بدل دیا۔ علاوہ ازیں "پندرہ روزہ" "ہماری زبان" اور سہ ماہی "سائنس" ماہانہ اور معاشیات کے رسالے شائع کئے جو اپنا علیحدہ ایک مقام رکھتے تھے۔ نیز ان قدیم مطبوعات اور مخطوطات کا کتب خانہ قائم کیا۔

افسوس جس گراں مایہ سرمائے کو انتہائی عرق ریزی، سعی پیہم اور جستجوئے بے پایاں سے یکجا کیا تھا وہ ۱۹۴۷ء کے تاریخی انقلاب کے نذر ہو گیا، کچھ تو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ کتب خانہ کا جو بیشتر حصہ انقلاب کی دست برد سے بچا اسے حکومت ہند نے منتقل کرنے کی اجازت نہ دی، اس طرح کئی لاکھ مطبوعات وہیں چھوڑنی پڑیں۔ مزید برآں نقد سرمایہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ انجمن بھی ایک لٹے پٹے مہاجر کی طرح پاکستان پہنچی۔ کراچی پہنچ کر دل شکن اور مایوس کن حالات سے دوچار ہونے کے باوجود بابائے اردو نے ہمت و استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا، بلکہ اور زیادہ تندہی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سے اپنی دھن میں لگ گئے۔

گو یہاں علمی و ادبی و تحقیقی سرگرمیوں میں کتب کی کمی کو شدت سے محسوس کیا گیا، لیکن مسلسل کاوش اور رات دن کی محنت سے ایک عام کتب خانہ نیز علمی و تحقیقی کتب خانہ بھی وجود میں آ گیا۔ بابائے اردو کی یہ کاوشیں انمول اثاثہ کی صورت میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ "اردو کالج" کا قیام ہے۔

آج ہم اردو کو جس رنگ، جس روپ اور جس منزل پر دیکھ رہے ہیں جس طرح اس کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں، اردو ادب میں جن نوادرات کا اضافہ ہمیں مل رہا ہے، آج علمی و ادبی تحقیق کی راہوں نے ہم میں جو تحقیقی ذوق اور لگن کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب زیر بار احسان ہے بابائے اردو کی ان مساعی جمیلہ، تدبر و استقلال، ذہنی کاوش، جدت طبع، بے لوث خدمت، خلوص و ایثار اور حسن عمل کا جن کی بدولت وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوا جس کی بعض کوتاہ بینوں کی نظر میں کوئی وقعت و حقیقت نہ تھی ——!

بقیہ: ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سیاسی بصیرت اردو کے روپ میں

اضافہ ہوتا جائے گا۔ آپ نے اردو ادب کی ترقی ترویج اور تحفظ کے لئے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے آپ کی انتھک لگن اور خلوص و ایثار ہم سب کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے!

آنسہ خورشید احسن صدیقی

مولوی عبدالحق ــــــ ایک مطالعہ

مولوی عبدالحق نے ایک طرف سرسید اور حالی کے ساتھ زندگی گزاری تو دوسری طرف آج کل کی نئی نسل کی ذہنی، علمی اور ادبی تربیت میں ان کا براہ راست حصّہ ہے تاریخی اعتبار سے آج کی سب سے اہم شخصیت مولوی عبدالحق صاحب کی ہے جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کے پچاس ساٹھ سال گزار کر تحقیق اور تنقید کے مختلف گوشوں کو منور کیا۔ وہ حالی کے سچے جانشین ہیں انھیں اردو زبان سے نہایت گہرا عشق ہے۔ ان کی زندگی صحیح معنوں میں اسی عشق سے عبادت ہے اور اسی کی روشنی میں ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کو پرکھا جا سکتا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں ادب اور تاریخ کے مضامین میں ان سے بہتر طالب علم علی گڑھ میں موجود نہ تھا۔ سرسید سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ سرسید کے علاوہ یونی ورسٹی کے پروفیسروں اور اہل علم سے بحیثیت ایک ذہین طالب علم کے وہ متعارف تھے۔ ان کے تحقیقی انہاک اور خطابت کے فن کی مہارت کا اندازہ اسی زمانے میں لوگوں کو ہو چکا تھا۔ ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی اسی دور میں کی جا چکی تھی لیکن علی گڑھ والوں نے جہاں ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی وہیں ان کو بنانے اور ان کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا زبردست حصّہ لیا۔ مولوی صاحب پر سرسید اور حالی کا گہرا اثر وہیں پڑا۔ سب سے پہلے اور سب سے گہرے طور پر علی گڑھ ہی میں وہ اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے جس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں آج بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کی قومی زندگی سے اپنا تعلق انھوں نے اسی درس گاہ میں استوار کیا لیکن بعض معاملات میں شخصیتیں آزادانہ اثر قبول کرتی ہیں۔ مولوی صاحب کے سامنے متعدد ذی رہنما تھے جو بیک وقت قومی اصلاح سیاسی مسائل اور ادبی خدمات انجام دے رہے تھے ان میں عبدالحق نے خاص طور پر حالی کا

انتخاب کیا۔ اس انتخاب سے ان کے مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ بنیادی طور پر مولوی صاحب اسی قبیلے کے ایک سرگرم کارکن نظر آتے ہیں جس کی قیادت ادب وفن میں حالی نے کی۔

حالی کی ذات میں مولوی صاحب کو ایک نئے شعور کا آہنگ ملا۔ حالی میں جو سادگی تجزیہ نگاری کی صلاحیت اور عقلیت پسندی ملتی تھی مولوی صاحب اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں خود بھی ادب کے ان نئے رجحانات سے دل چسپی تھی۔ ان کا جھکاؤ واقفیت اور حقیقت پسندی کی طرف رہا۔ نئے علوم کی ترویج کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ تجزیہ نگاری کو رواج دیا جائے سادگی اور فطری انداز آج بھی مولوی صاحب کی زندگی کے اوّلین اصول ہیں۔ ذہنوں کی اسی مماثلت نے انھیں حالی کی طرف مائل کیا جس کی وجہ سے آج بھی ان سے بڑا حالی کا کوئی مداح نہیں۔ اور اگرچہ حالی پر ان کے مضمون کی وہ اہمیت نہیں ہے جو غالب کی شخصیت سے متعلق حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" کی ہے (یہاں یادگارِ غالب کے اس حصّے سے بحث نہیں ہے جس میں غالب کی شاعری پر تنقید ملتی ہے) لیکن حالی کی شخصیت اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ کی سب سے اہم کڑی اسے ماننا پڑے گا۔

علی گڑھ سے نکلنے کے بعد ان کی زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے حیدرآباد دکن میں ملازمت کی۔ وہاں ملازمت کرنے کا فیصلہ بھی اردو ادب کی خدمت کے مدّ نظر ہی کیا گیا تھا۔ حیدرآباد کی حکومت اس زمانے میں مسلم کلچر کے تحفّظ اور اردو زبان کی ترویج واشاعت میں خاص دل چسپی لے رہی تھی۔ مولوی صاحب نے حیدرآباد پہنچ کر اس دل چسپی کو ایک تحریک کی حیثیت دی لیکن اپنی مصروفیات کو اردو زبان وادب کی اشاعت اور تحقیق اور تنقید تک محدود رکھا تاکہ اس شعبے میں خاطر خواہ ترقی ہو سکے اس زمانے میں متعصب ہندوؤں کا نزلہ صرف مسلم کلچر اور ان کی قومی ترقی ہی پر نہیں گرا تھا بلکہ وہ اردو زبان کے بھی مخالف تھے۔ مولوی صاحب کی تنہا شخصیت ہے جو سینہ سپر ہو کر زبان کی حفاظت کے لئے سامنے آتی ہے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں انھوں نے دو اہم خدمات انجام دیں۔ تحقیقی ادارہ کا قیام انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا جہاں مولوی صاحب نے اپنی ذاتی کاوشوں سے ہزاروں نایاب کتابیں جمع کر دیں۔ دکنی اردو کا جو ادب ہمارے سامنے ہے وہ بیشتر مولوی صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی دوران میں ہندوستان کے سیاسی پلیٹ فارم سے جب بھی اردو کی مخالفت ہوئی مولوی صاحب ایک مجاہد کی طرح اس کی حفاظت میں ہمہ تن لگ گئے۔ انجمن ترقی اردو کی حیثیت مولوی صاحب سے پہلے نہایت رسمی تھی۔

مولوی صاحب کے سکریٹری ہونے کے بعد اس انجمن میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے اصول وضوابط باقاعدہ متعین کئے گئے اور اسے ہندوستان میں ایک ہمہ گیر تحریک کی حیثیت دی گئی۔

مولوی صاحب ابتداء سے یہ چاہتے تھے کہ تعلیم کا انتظام یہاں کی قومی زبان میں کیا جائے تاکہ اس قوم کی نئی نسل ذہنی غلامی سے آزاد ہو سکے اور اپنے تمدّن اور علم وادب کی ترویج پر آمادہ ہو۔ ان باتوں کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی یونی ورسٹی کا قیام عمل میں

لایا جائے جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ مولوی صاحب کو یہ خواب حیدرآباد میں شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے پوری جدوجہد کی۔ نتیجے کے طور پر عثمانیہ یونی ورسٹی قائم ہوئی جہاں سے سینکڑوں اہلِ علم فارغ التحصیل ہو کر قوم اور علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان امور کو سرانجام دینے میں مولوی صاحب کے علاوہ دوسری شخصیتوں کی اہمیت بھی ہے خصوصاً راس مسعود کی لیکن مولوی صاحب کی حیثیت روحِ رواں کی ہے جن کے بغیر یہ سارے کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔

جن نئی کتابوں کو وہ پہلی بار منظرِ عام پر لائے اگر ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے علاوہ انھوں نے اور کچھ نہ کیا ہوتا جب بھی مولوی صاحب اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہ کئے جاتے۔

مختلف کتابوں پر جو مقدمے انھوں نے لکھے ہیں وہ ان کے ادبی شاہکار ہیں ان سے عبدالحق کے طرزِ انشاء اور اسلوبِ بیان کی معنویت کا پتہ چلتا ہے مولوی صاحب کی ذہانت، علم، سنجیدگی اور تحقیقی بصیرت کا ان مقدمات سے صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

کچھ لوگ مولوی صاحب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے مستقل تصانیف کے بجائے صرف مقدمات لکھ کر تن آسانی کا ثبوت دیا ہے لیکن مولوی صاحب نے جن مختلف النوع مصروفیات میں زندگی گزاری ہے اس کے تحت ان سے اس قسم کا مطالبہ کرنا مناسب نہیں دوسرے ان کے بعض مقدمات مستقل تصانیف کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں کی جا سکتی۔

تحقیق اور تنقید کا جتنا خوب صورت امتزاج ان مقدموں میں ملتا ہے کم از کم اردو ادب میں عنقا ہے۔

اس کے علاوہ "چند ہم عصر" کے نام سے جن شخصی خاکوں کو انھوں نے مرتب کیا ہے وہ اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم ان کی تحریر میں رشید احمد صدیقی کی ظرافت تلاش نہ کریں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ "گنج ہائے گرانمایہ" میں جو تصویریں ملتی ہیں ان کو بنانے میں رشید احمد صدیقی نے "چند ہم عصر" سے کیا کچھ لیا ہے۔

مولوی صاحب ایک روایت کو مستحکم کرتے ہیں رشید احمد صدیقی کی تحریر سے اس روایت میں نئے تجربوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ مولوی صاحب کے پیش کئے ہوئے کردار ان کی زندگی کے نصب العین کا ایک عکس ہیں ان میں جو مستقل مزاجی خاموشی سے کام کرتے رہنے کی اُمنگ ملتی ہے وہی ان کے کرداروں کا طرۂ امتیاز بھی ہے جنھیں پیش کرتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنی زندگی ہی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اٹھائی ہے ان میں ظرافت کا ایک دبا ہوا عنصر موجود تھا جو ٹھوس علمی کاموں میں کبھی نمایاں طور پر ابھر نہ سکا لیکن یہ خندۂ زیرِ لبی "چند ہم عصر" کے کرداروں کو ابھارنے میں پوری طرح ممد و معاون نظر آتا ہے جس سے ہنسی کے بجائے رومانی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ مولوی صاحب کی یہ کتاب ان کے کارناموں میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے

لیکن ادب میں اس کی حیثیت بہت بلند ہے۔

اردو والوں کے پاس کوئی ایسی ڈکشنری نہیں تھی جس سے مغربی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلہ میں مدد مل سکے۔ یہ خاصی محنت کا کام تھا۔ مولوی صاحب ہی کی محنت کا نتیجہ کہئے کہ ایسی ایک ڈکشنری اردو والوں کے بھی حصہ میں آئی۔ اگر تنقید کی نظر سے اسے دیکھا جائے تو اس میں خامیاں بھی ملیں گی اور تشنگی کا احساس بھی ہوگا لیکن نقشِ اوّل کی حیثیت سے یہ ایک اہم خدمت قرار پائے گی اور خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسری ڈکشنری نہیں تو جہاں ایک طرف اردو ادیبوں عالموں اور زبان کے بولنے والوں پر رونا آتا ہے وہیں مولوی صاحب کی وقعت نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے۔ اسے اگر مشعلِ راہ سمجھ کر نئی نسل کے لوگ ایک ایسی ڈکشنری تیار کرنے کی طرف مائل ہوں جو ہماری آج کی ضرورتوں کو پورا کر سکے تو مولوی صاحب کی وہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے گی جس نے انھیں ایسی ڈکشنری کو پوری کدو کاوش سے تیار کرنے پر آمادہ کیا اور میں سمجھتی ہوں کہ اس بڑھاپے میں مولوی صاحب کی یہ خواہش بہت شدید ہو گئی ہے جو ان کے خلوص کی ترجمان ہے۔

اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے جو حصہ لیا اسے مولوی صاحب نے ایک رسالہ میں مختصر طور پر قلم بند کر دیا ہے۔ بظاہر یہ ایک رسالہ ہے لیکن لسانیات کے مطالعہ کی ایک اہم کڑی کی حیثیت سے اگر جانچا جائے تو یہ اردو کی ابتدائی ترقی کے ایک دور کو احاطہ کرتی ہے اور اردو سے متعلق ماہرینِ لسانیات نے جو جدید ترین تحقیقات کی ہیں ان سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ ایک خالص تحقیقی کام ہے لیکن غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ اس میں اضافے کی گنجائش ضرور ہے لیکن ہر نئے محقق کو مولوی صاحب کا یہ رسالہ سامنے رکھنا ہوگا۔

مولوی صاحب کی زندگی کا تیسرا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ حیدر آباد سے دلی منتقل ہو جاتے ہیں جہاں انجمن ترقیٔ اردو ہند کا مرکزی دفتر قائم کیا گیا۔

انجمن ترقیٔ اردو کی تاریخ کا یہ سب سے درخشاں باب ہے۔

یہاں پہنچ کر مولوی صاحب نے مختلف علوم کے رسالے جاری کئے جو نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ اردو ادب سے ہٹ کر اب ان کا دائرہ عمل اردو زبان کی توسیع کی طرف پوری طرح منتقل ہو جاتا ہے اور وہ ہمہ تن اس جد و جہد میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ یہ زبان جلد از جلد قوم کی تمام ادبی، فنی، علمی اور ٹکنیکل ضروریات کو احاطہ کرلے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ

انجمن ترقی اردو نے دلی کے قیام کے اس مختصر عرصے میں جس وسیع پیمانے پر اردو زبان کو فروغ دیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

تعجب ہے کہ مولوی صاحب جو ان تمام امور کے روحِ رواں تھے کیوں کر اس زمانے میں بھی تحقیقی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ مولوی صاحب نے اس قیام کے دوران میں دلی یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم کرانے کی جو جد و جہد کی وہ ناکام نہیں رہی۔ افسوس اس بات پر ہے کہ برّ اعظم ہند و پاک کے ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ان کے بہت سے سوچے سمجھے ارادوں

(باقی صفحہ ۸۰۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

کنیز فاطمہ اشرف

بابائے اُردو کے خطبات

میں

لطیفے اور چٹکلے

بابائے اردو موجودہ دور کی ایک عظیم شخصیت ہیں اس شخصیت کی بزرگی و بلندی اور علمی ادبی خدمات کے کسی پہلو پر اظہار خیال کرنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ ان کی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے [illegible] لیاقت اور حسنِ نظر کی ضرورت ہے اس سے میں اپنے آپ کو تہی دامن پاتی ہوں۔ مگر جس طرح ایک مفلس بڑھیا کچے سوت کی لچھی پر یوسفؑ کے خریداروں میں شمولیت کا فخر حاصل کرنا چاہتی تھی اسی طرح میں بھی چند سطریں سپردِ قلم کرکے اس بزمِ حق میں شمولیت کا اعزاز پانے کی متمنی ہوں۔

بابائے اردو ایک بلند درجہ محقق ہیں، نقاد ہیں، ادیب و انشاپرداز ہیں اور ساتھ ہی بلند مرتبہ مقرر بھی ہیں ان کے خطبات و تقاریر میں اس امر کی روشن دلیلیں موجود ہیں۔

خطابت ایک فن ہے۔ متمدن ممالک میں بہ حیثیت فن اس کو سیکھا اور سکھلایا جاتا ہے۔ وہ لوگ اس کے بڑے قدر شناس ہیں۔ اس فن کے شوقین برسوں مشق کرتے ہیں تب کہیں کسی قابل بنتے ہیں اس کے برعکس ہمارے ہاں علوم و فنون کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ایسے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں جو فن کی اہمیت اور اس کی نزاکتوں کا پورا پورا پاس رکھتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر جس تقریر میں چیخ پکار ہوتی ہے اسی کو بہترین تقریر خیال کیا جاتا ہے۔

فن خطابت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ مواد و موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ زبان اور تیسرا حصہ اندازِ بیان سے۔ دراصل زبان اور اندازِ بیان کو الگ نہیں کیا جا سکتا؛ لب و لہجہ یا اندازِ بیان زبان کے ساتھ جاتا ہے۔ الفاظ کا استعمال زبان کی روانی، آواز کا اتار چڑھاؤ، جملوں کی ساخت وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں اور پھر زبان و اندازِ بیان کے مواد و موضوع کے ساتھ وابستگی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ غرض اس طرح اس فن میں خود اپنی نزاکتیں اور باریکیاں ہیں۔ اسی طرح مقرر یا خطیب اپنے سننے والوں کے جذبات اور ذہنی کیفیتوں میں بھی خیال رکھتا ہے۔ اور اسی کی مناسبت سے وہ مواد کو ترتیب دیتا ہے اور زبان بھی اسی کے مطابق موزوں اور مناسب استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح خطیب یا مقرر اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کئی ترکیبیں کام میں لاتا ہے۔ کہیں وہ زبان کے چٹخارے سے کام لیتا ہے۔ کہیں موقع و محل کے پیشِ نظر طنز و مزاح کو آلۂ کار بناتا ہے۔ جس طرح شاعر اپنے خیال کو ہم تک پہنچانے کے لئے تشبیہ و استعارہ کا استعمال کرتے ہیں یا جس طرح صوفی اپنا پیغام پہنچانے اور تصوف کے نکات سمجھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے لطیفوں اور چٹکلوں سے کام لیتا ہے اسی طرح مقرر بھی سامعین کو متوجہ کرنے اور اپنا خیال ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے لطیفوں اور چٹکلوں سے کام لیتا ہے۔ اس کے استعمال میں بھی بڑی ہوشمندی اور زیرکی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا لطیفہ یا چٹکلہ خیال سے مناسبت رکھتا اور زود اثر ہے اگر اس میں ذرا بھی چوک ہوتی ہے تو پھر مقرر اور خطیب، مقرر اور خطیب نہیں ہوتے۔ بلکہ داستان گو اور لطیفہ گو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

بابائے اردو فنِ خطابت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے خطبات فنِ خطابت کا اعلیٰ نمونہ ہیں یہ جس طرح اردو زبان و ادب کے ہر گوشہ سے واقف ہیں اسی طرح فنِ خطابت سے بھی پورے پورے آگاہ ہیں۔ اس فن کے برتنے میں بابائے اردو نے صوفیوں کا تتبع کیا ہے۔ اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بابائے اردو نے صوفی اور مولوی کے فرق کو واضح کیا ہے۔

> "اصل صوفی بہت بڑا ماہرِ نفسیات ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ دنیا سے ایک گونہ بے تعلق اور مولوی اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ دنیادار ہوتا ہے۔ مگر وہ علما کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہنچتا ہے۔ جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں۔ جن سے ہم خود بھی واقف نہیں ہوتے۔ مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ اس میں صوفی کی جیت ہے .... جب دل ہاتھ میں آگیا تو سب کچھ مل گیا۔ کسی کا دل ہاتھ میں لانا ایک نئی دنیا فتح کرنے سے کم نہیں۔ یہ جو

مشہور ہے کہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" یہ صوفی ہی کا قول ہے اور صوفی ہی اس پر عمل کر سکتا ہے"

کہنے کو تو بابائے اردو کہتے ہیں کہ یہ صرف صوفی ہی کر سکتا ہے مگر اس موقع پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بابائے اردو نے اسی خیال کے پیش نظر اپنے خطبات ترتیب دئے ہیں۔

بابائے اردو کے خطبات کے محاسن پر تفصیلی بحث میری ہمت و لیاقت سے بہت بلند ہے میں یہاں صرف اس کے ایک پہلو سے متعلق عرض کرنا چاہتی ہوں۔

بابائے اردو کے خطبات اپنے مباحث اور مضامین کی وجہ سے نہایت متنوع ہیں۔ انہیں خوشی و مسرت غم و غصہ وغیرہ ہر قسم کے جذبات کے اظہار کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن بظاہر نہ یہ کھلا کھلا کے ہنستے ہنسائے گئے نہ روتے دکھائی دئے اور اسی طرح کبھی بھی غیض وغضب میں چیخے نہ چلائے۔ یہ سب کام انھوں نے الفاظ اور لب و لہجہ سے لیا ہے۔ وہ ہنسے اور ہنسایا۔ روئے اور رُلایا غصہ میں آئے۔ اور غصّہ دلایا۔ اسی میں ان کی کامیابی رہی اور اسی سے انہوں نے گڑھ جیتے ہیں۔ اسی طرح بابائے اردو نے بعض جگہ لطیفوں اور چٹکلوں سے بھی اپنے مافی الضمیر کو ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کے کثیر التعداد خطبات میں معدودے چند لطیفے اور چٹکلے ہیں مگر جہاں کہیں ان سے کام لیا گیا ہے وہاں یہ اتنے برمحل ہیں کہ چٹکلے کے ذریعہ دفتر کے دفتر ہمارے ذہنوں میں بھر دئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ موضوع خاص کے علاوہ سامعین اور قارئین کے سامنے بیک وقت کئی اور پہلو بھی آجاتے ہیں۔ اس جگہ ان کے بیان کئے ہوئے چٹکلوں کو ذرا وضاحت سے پیش کرتی ہوں۔

بابائے اردو کی زندگی کا مقصد صرف زبانِ اردو کی اشاعت ہے۔ سیاست سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر عابد علی نے اپنی جانب سے بابائے اردو کی تقریر کے لئے جس موضوع کا اعلان کیا وہ تھا۔ "سیاست اور اردو زبان" اس پر بابائے اردو نے جو واقعہ اپنی تقریر میں بیان کیا وہ دلچسپ بھی ہے اور بابائے اردو کے خیال کی پوری طرح وضاحت بھی کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس عہد کے سیاست والوں کے کھوکھلے پن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

"جس زمانے میں کوسلم یونیورسٹی نہ تھی اور ایم۔ اے او کالج تھا اس وقت کالج میں ایک حجام عنایت اللہ نامی تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسے اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ وہ بہت سمجھدار اور وفادار شخص تھا۔ اس نے حیدرآباد میں خاص حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اور ہم سب اسے عزت سے دیکھتے تھے۔ کچھ دنوں بعد مولوی شبلی حیدرآباد تشریف لے گئے انھیں وہی خیال رہا اور عنایت اللہ کی نئی حیثیت کی خبر نہ تھی۔ انھوں نے عنایت اللہ سے کہا کہ "میاں

خلیفہ ذرا ناخن تولینا" یہ اسے ناگوار تو ضرور ہوا مگر خیر ان کے ناخن تو لئے۔ مگر ایک ناخن ذرا گہرا بھی کاٹ ڈالا۔ جس سے مولوی صاحب کو ذرا جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "اب تم کیا کرتے ہو" عنایت اللہ نے کہا کہ "مولوی صاحب اب میں پولیٹیکل ہوگیا ہوں" اس زمانے میں حیدرآباد کی فضا کچھ ایسی ہی تھی میں جب اس زمانے کا خیال کرتا ہوں اور آجکل کے زمانے کو دیکھتا ہوں تو ہر شخص حجام یعنی پولیٹیکل نظر آتا ہے۔"

بابائے اردو کا خیال ہے کہ ہندوستان میں کوئی اچھا مدرسہ نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ماضی سے حُسنِ ظن رکھتا ہے۔ اچھائیاں یاد رہ جاتی ہیں اور برائیاں بھول جاتا ہے۔ اپنے اس خیال کی وضاحت میں انھوں نے جو واقعہ لکھنؤ کے (۱۹۳۶ء والے) خطبہ میں بیان کیا ہے وہ طنز و مزاح کی بہترین مثال ہے۔

"میرے نوجوان رفیقو! اور دوستو!"

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا چلتے چلتے رستہ میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا۔ "جوانی میں کون سے تیر مارے تھے"۔ جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آجاتا ہے۔ ایک دو بار نہیں بار بار میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ پہلے کے جوان (تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی"

اس واقعہ سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ انسان خود کچھ کرتا دھرتا نہیں مگر بڑھاپے میں دوسروں کے سامنے ڈینگیں مارتا ہے۔ مضمون یا تقریر کی یکسانیت سے آدمی اکتا جاتا ہے جس طرح منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ہم کبھی کبھی چٹ پٹی چیزوں کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک خطیب سے ہم اسی وقت متاثر ہوسکتے ہیں جب کہ وہ ہمیں تلخیوں کے ساتھ ساتھ اپنی شیریں بیانی سے محظوظ کرے۔ بابائے اردو کے خطبات اس خصوصیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ (۱۹۳۶ء) میں اپنے خطبہ میں قوم کے نوجوانوں کی بیکاری اور کام کی یکسانیت پر ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے جو اپنی جگہ پر لطف اور برمحل ہے۔

"ایک شخص کو تسخیرِ جن کا بہت شوق تھا۔ اور اس کا عمل کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک عامل ملا۔ بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دُھن

میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کرکے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا
کہ فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ جو حکم ہوگا اسے بسر وچشم بجا لاؤں گا۔ عامل صاحب بہت خوش
ہوئے اور انھوں نے اپنی دانست میں بڑے مشکل کام اسے بتائے جن نے جھٹ پٹ
کردئے۔ اور وہ کام لینے کے لئے حاضر ہوگیا۔ کہتے ہیں جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا ہر وقت
اس کے لئے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہیئے۔ اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کرتا ہے
اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کے لئے جو ہر
وقت هَلْ مِن مَزِيدٍ کی صدا دیتا تھا اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اب جن
نے انھیں ستانا شروع کیا۔ اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین انھیں ایک تدبیر
بہت خوب سوجھی کہا کہ ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اُس پر چڑھو اور اترو۔ اترو
اور چڑھو اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر چڑھتے رہو۔ کچھ دن تو وہ اترتا چڑھتا رہا
۔لیکن کب تک! آخر اس قدر عاجز اور تنگ ہوا کہ چیخ اٹھا اور عامل صاحب کی دہائی
دینے لگا کہ " خدا کے لئے مجھے اس عذاب سے بچ لیئے۔ آپ جو کہیں گے وہی کروں گا"
عامل صاحب نے حکم دیا اچھا اب اترنا چڑھنا بند کرو جب ہم کسی کام کا حکم دیں اسے
کرو۔ ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو"۔ بیکار بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی
مگر معاً املی کے درخت کا خیال آجاتا۔ تو وہیں دبک کے بیٹھ جاتا۔ اب بیکاری کی وجہ
سے جن صاحب کا یہ حال تھا کہ بیٹھے اونگھا کرتے اور منہ پر مکھیاں بھنکتی رہتیں"۔

یہ قصہ جھوٹ ہی سہی لیکن نہایت سبق آموز ہے۔ اول یہ کہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بد بلا ہے کہ جن جیسی ہستی میں توانائی اور مستعدی کوٹ کوٹ کے بھری ہے وہ بھی اس سے عاجز آجاتی ہے۔ دوسرے بے کاری انسان کے قویٰ کو مضمحل اور بے کار اور شوق اور امنگ کو خاک میں ملا دیتی ہے یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ کہ توانائی انسان کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی، اس کا اقتضا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ انسان کی تمیز وشعور پر ہے کہ کون سا کام ایسا کرے جو ممدِ حیات ہو۔ اگر وہ املی کے پیڑ پر چڑھتا اترتا رہا تو سمجھو کھو گیا"۔

۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک خطبہ میں بیان کرتے ہیں۔

"گری زدن سوستان کا ایک پرگنہ ہے۔ اور پہاڑی علاقہ ہے اس کی ایک بڑی خصوصیت
یہ ہے کہ وہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ان کے ہاں قدیم سے ایک روایت مشہور چلی
آرہی ہے۔ کہ خالقِ عالم نے فرشتہ میکائیل کو بچوں بھرے تھیلے دیئے۔ اور فرمایا کہ" جاؤ

تم دنیا کا ایک چکر لگاؤ اور زبانوں کے بیج لوگوں کے سروں میں بوتے چلے جاؤ "۔ فرشتہ نے ارشادِ خداوندی کی تعمیل کی اور یہ بیج بنی نوع انسان کے دماغوں میں جم گئے۔ اور فوراً اگنے شروع ہوئے۔ اور زبانیں چشمے کی طرح ابلنے لگیں۔ جب فرشتہ مکائیل اپنے تھیلے خالی کر چکا اور خلاقِ عالم کے پاس واپس آنے کو ہوا تو یہ دیکھ کر اسے سخت ندامت اور پریشانی ہوئی کہ گری زون کا علاقہ چھوٹ گیا ہے۔ اس نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں اس فروگزاشت کے متعلق عرض کیا۔ خدا نے مختلف تھیلیوں کے ملے جلے بیج جو بچ رہے تھے اسے دیئے۔ اور کہا کہ " جاؤ یہ وہاں جاکر بو آؤ "۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہاڑی آبادی میں طرح طرح کی بولیاں اور زبانیں پائی جاتی ہیں۔ یہ نقل بہ نسبت گری زون کے ہندوستان پر زیادہ صادق آتی ہے جہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ "

زبانوں کی کثرت کا خیال دلانے کے لئے اس سے بہتر کون سا لطیفہ ہو سکتا ہے۔

بقیہ :- مولوی عبدالحق ——— ایک مطالعہ

کو منتشر کر دیا اور حالات کے تحت انھیں دلی سے کراچی منتقل ہونا پڑا جہاں پہونچ کر وہ اپنی زندگی کا چوتھا دور شروع کرتے ہیں جو اب تک جاری ہے۔ یہاں ان کی توقعات بہت زیادہ تھیں لیکن اس ملک کی سیاسی پیچیدگیوں نے انھیں پورا نہ ہونے دیا دوسرے فوری طور پر انھیں ایسے سنجیدہ اور باوقار لوگوں سے ملنا بھی نصیب نہ ہوا جن کی ہندوستان میں کمی نہ تھی اور یہ مشکلیں ان کی راہ میں ایسے زمانے میں حائل ہوئیں جب کہ انھیں مخلص دوستوں سنجیدہ کارکنوں اور حکومت کے تعاون کی زیادہ ضرورت تھی وہ اپنی عمر کے تقریباً پچھتر سال گزار چکے تھے۔ عملی جدوجہد کے نئے قوتیں جس توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اب باقی نہ تھی۔ یہ اردو زبان کے ایک مجاہد کی تنہائی کا زمانہ تھا۔ ایسی تنہائی جس میں مخلص ساتھی تو نہ تھے لیکن پے بعد دیگرے نئی نئی دشواریوں کا سامنا ضرور تھا۔

ان حالات میں بھی اردو کالج کراچی میں بنیاد پڑی جو آج اس شہر کا ایک بڑا کالج ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ مولوی صاحب کی کوششوں سے جلد یا بدیر اردو یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا۔

انجمن ترقی اردو کے تحقیقی امور بھی باقاعدگی سے انجام پاتے ہیں وہ رسالے اور میگزین جو دلی سے چھپا کرتے تھے کسی نہ کسی شکل میں یہاں سے بھی نکلتے رہے یہ اور بات ہے کہ ان کے نام بدل گئے یا ان کا معیار نسبتاً ہلکا ہو گیا اس کے علاوہ اردو زبان کو قومی حیثیت دینے کی جدوجہد انھوں نے برابر جاری رکھی اور شاید دمِ واپسیں تک یہ سلسلہ ختم نہ ہو یا تو حکومت ان کی زندگی میں اس طرف توجہ دے گی اور ان کی خواہش کا احترام کرے گی یا ان کے بعد ان کی زندگی اردو زبان کی ایک زندہ اور تابناک تحریک کی صورت میں ہمارے سامنے ابھر آئے گی جو ہماری بہترین رہنما ثابت ہو گی۔

عذرا کیفی

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

تلون پسند دنیا کے بسنے والے خود کس قدر متلون مزاج ہوتے ہیں کچھ کہنے سننے کی بات نہیں۔ میرے اس بیان کی تائید میں آپ جس قدر واقعات چاہیں دنیا کی ڈائری سے چن سکتے ہیں۔ آئے دن کے انقلاب، روز روز کی نئی نئی تبدیلیاں خواہ وہ نظام حکومت سے متعلق ہوں یا شخصی زندگی سے آپ کو قدم قدم پر ملیں گی۔ ان تبدیلیوں اور ان انقلابات کے پردے میں کہیں علم نجوم کی کارفرمائی ہے تو کہیں عمل جغرافیائی کی۔ کسی جگہ تقاضائے مصلحت ہے تو کہیں مقتضائے فطرت یعنی بقول اقبالؔ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ انسان کی ذہنی رو بہکتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ دنیا والے تبدیلیٔ حالات کو اپنی فطرت اور ماحول کے عین مطابق سمجھتے ہوئے انھیں بہ آسانی قبول کر لیتے ہیں۔ یہ جسے آج اچھا کہتے ہیں کل ممکن ہے اسی کو برا کہنے میں بالکل نہ جھجھکیں یا آج جسے برا سمجھتے ہیں کل شاید اسے اچھا کہنے لگیں۔ اب سے چند سال پیشتر تحقیق و تدقیق کی روشنی رقابت و تعصب کے اندھیروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ پرانے اہلِ علم کسی مجوزہ اصول پر نیک و بد میں امتیاز پیدا کرنے کے بالکل قائل نہ تھے ... غالبؔ مرحوم جن کے ایک مصرعے کو میں نے زیرِ نظر مضمون میں بطور عنوان استعمال کیا ہے آج بڑی اہم اور ناقابل فراموش ہستی ہیں حالانکہ یہی غریب اپنی زندگی میں بالکل بھلائے ہوئے سے تھے۔ لوگ انھیں برملا برا بھلا کہتے تھے اور یہ برا بھلا کہنے والے اپنی بدقسمتی سے وہی لوگ تھے جو آج غالبؔ کے مقابلے میں تقریباً ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں اور جو اُس زمانے میں مستقبل کے

مفکرِ اعظم مرزا غالب کے بالمقابل بیٹھ کر" مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" جیسی کھلی ہوئی طنز کرتے تھے۔ لوگوں کی تردیدی جراتیں یہ برخود غلط حوصلے غالب کے کارناموں سے انحراف اور انھیں عظیم شاعر تسلیم نہ کرنے کے اعتراف میں بڑے یقین و اعتماد کے ساتھ سرگرم عمل تھے۔ یہ معاصرینِ تنگ نظر یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ غالب جیسے لوگ زندہ رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوئے۔ ان کے نزدیک دوامی زندگی صرف انھیں کا حصہ تھی جو تاریخ ادب کی کہانی میں معمولی معاون کرداروں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ خود غالب بھی ان حالات سے کچھ کم بددل نہیں تھے وہ بیچارے بھی" ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے" جیسی باتیں کہہ کہہ کر اپنا دل سمجھا لیتے تھے۔ غالب کی شاعرانہ تعلّیوں سے قطع نظر میں نہ جانے کیوں یہ بات ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں کہ غالب نے اپنی زندگی ہی میں خود کو ایشیا کا عظیم شاعر مان لیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ سمجھتے رہے ہوں مگر یہ بات تو یقیناً وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد دنیا کی آنکھیں کھل جائیں گی اور یہ مردہ پرست لوگ ان کی شخصیت کا کوئی صحیح مقام متعین کرسکیں گے اور تحقیقِ جدید و رجحاناتِ نو نیز دورِ موجودہ کی حق گوئی و صداقت بقول آزاد ان کے سر پر بھی " "شہرتِ عام و بقائے دوام" کا تاج رکھ سکیں گے۔ میں نفسِ مضمون سے اس تھوڑی سی علیحدگی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میری مراد اس طویل تمہید سے صرف اس قدر تھی کہ آج کا انسان فطری طور پر انقلاب و تغیر پسند ہونے کے باوجود شعور و وجدانِ صحیح کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ آج کچھ ایسے اصول وضع کرلئے گئے ہیں جن سے رُوگردانی نہیں کی جاسکتی۔ لازوال کارناموں سے چشم پوشی آج بدترین گناہ ہے اور ایک ایسی چوری ہے جو کبھی نہ کبھی ظاہر ضرور ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ایسی خطا ہے جسے مستقبل کبھی نہ معاف کرسکے گا۔ آج " حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی۔" اور اس لئے ہم آج فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کل تک اگر ہم مردہ پرست تھے تو آج زندہ حقیقتوں کے معترف بھی ہیں اور انھیں چند زندہ و پایندہ حقیقتوں میں سے ایک مثالی شخصیت بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی بھی ہے۔

> مولوی عبدالحق کے نام کے ساتھ ہی ایک ایسے تابناک ہیرے کا تصوّر ذہن میں ابھرنے لگتا ہے جس کا ہر رخ اپنی آب و تاب میں بے مثال ہو۔ آپ اردو ادب میں ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں تبصرہ نگاری تنقید و تحقیق، سیرت نگاری اور مقالہ نویسی کی گوناگوں صلاحیتیں موجود ہیں۔ اردو ادب میں ایسے مصنّف شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں جو ایک ہی وقت میں مختلف اصناف ادب کے تقاضوں کو پورا کرسکتے ہوں۔

مولوی صاحب کے ادبی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد ہر شخص یہ حقیقت تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب یقیناً ایک عظیم و کامیاب فن کار ہیں۔ ان کے کارناموں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دنیا بھر کا علم و ادب مولوی صاحب میں سمٹ آیا ہو۔ انھوں نے جب بھی قلم اٹھایا ہے بھرپور اٹھایا ہے۔ مولوی صاحب کی علمی و ادبی عظمت کا اندازہ نیاز فتحپوری کے چند جملوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ان کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے متعلق کم سے کم جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" زیادہ سے زیادہ کے لئے کوئی لفظ نہیں"

مولوی عبدالماجد دریا بادی مولوی صاحب کی خدمات پر تبصرہ فرماتے ہیں۔

"آپ کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے اردو کی خدمات تو کم و بیش ایک عرصے سے بے شمار اردو کے محسنوں نے کی ہیں لیکن مجموعی طور پر اگر کسی ایک کو محسنِ اعظم کا لقب دیا جاسکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے۔"

ان اقوال کی روشنی میں جب ہم بابائے اردو کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ تبصرہ نگاری کے میدان میں دیکھئے ان کے ہمعصر پنڈت کیفی، پروفیسر محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی، اور عبدالماجد دریا بادی یقیناً اردو ادب کے درخشندہ ستارے ہیں لیکن مولوی صاحب کی شانِ انفرادیت یہاں بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مولوی صاحب کا موازنہ ان کے ہم عصر تبصرہ نگاروں سے کرتے ہوئے اپنی مشہور کتاب "اردو تنقید کا ارتقا" میں فرماتے ہیں:۔

"ان سب محققین میں سے ڈاکٹر عبدالحق نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ کی ہے۔ بے لاگ تبصرہ کاری میں وہ اور ان کا رسالہ "اردو" جس میں ان کے تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں ان دونوں کو اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق اپنی تبصرہ نگاری میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتے ہیں۔ اور زیرِ تبصرہ کتاب پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ کتاب پڑھے بغیر بھی اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت ان کی تبصرہ نگاری کی یہ ہے کہ وہ بے لاگ رائے دیتے ہیں۔"

یہ صاف گوئی اور بے باک نگاری یقیناً ایک عظیم فن کار کی پہچان ہے اور مولوی صاحب اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ سر سید احمد خاں مرحوم اور مولوی صاحب کی ان سے ارادت محتاجِ بیان نہیں۔

مولوی صاحب سرسید احمد خان کی صلاحیتوں کے اس قدر مداح ہیں۔ کہ وہ انہیں" امامِ وقت "کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن یہ محبت یہ عقیدت ان کی صاف گوئی اور بے باک نگاری پر غالب نہیں ہوتے پائی۔ سرسید احمد خاں پر تبصرہ کرتے ہوئے کس قدر صاف گوئی سے فرماتے ہیں۔" مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا منشا کیا تھا۔ اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی ان ہی دلوں اور ان ہی کی بدولت۔"

اسی طرح اپنی کتاب "چند ہمعصر" ہی میں مولوی سید علی بلگرامی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔
"مرحوم شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا حبِ جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں"

مولوی صاحب کی سادہ و پرخلوص فطرت کا یہ مخصوص جوہر جسے ہم حق گوئی و بے باکی کے نام سے یاد کر رہے ہیں صرف ان کی تصانیف تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے خطوط سے بھی اس کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر اور ایک ایسے دور میں جبکہ ہر طرف خون ریزی کا دور دورہ تھا، ہندوں کا دور اقتدار تھا' مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی گاندھی جی کو ایک تاریخی خط میں کس بے جگری سے تحریر فرماتے ہیں۔" جب اچھی طرح قتل و خون ریزی، غارت گری، تباہی اور بربادی ہو چکتی ہے تو اس کے بعد آپ ان مقامات پر تشریف لے جاتے ہیں۔ بڑے اہتمام سے عبادتی جلسے منعقد کرتے ہیں۔ اور مختلف ترکیبوں سے خاص فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کہنے کو تو عبادتی جلسے ہیں لیکن دراصل یہ بھی سیاسی چال ہے۔" مولوی صاحب گاندھی جی کے رویہ کی مزید نقاب کشائی فرماتے ہیں۔" جو نصیحت آپ مسلمانوں کو کرتے ہیں۔ آپ نے پاکستانی ہندوؤں کو بھی کی یا ان کے لئے وفاداری لازم نہیں۔ کبھی آپ نے ہندوؤں سے ہتھیار حوالے کرنے کے لئے فرمایا؟ حالانکہ ہندوؤں سے ہتھیار لینے کی زیادہ ضرورت ہے۔" اس خط میں مولوی صاحب کے جذبات، حق گوئی و بے باکی کا اندازہ اس جگہ کچھ اور بھی زیادہ ہوتا ہے فرماتے ہیں:۔" آپ صاحبوں نے وفاداری کی رٹ لگا رکھی ہے یہ آپ کا وظیفہ ہو گیا ہے جس کا موقع بے موقع ورد کیا جاتا ہے۔ آخر یہ وفاداری ہے کیا بلا؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہے آپ کو یہ لکھ کر دے دے کہ" میں پاکستان سے ہمدردی نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا مخالف ہوں۔ میری زبان ہندی ہے اور میرا رسم الخط ناگری ہے فارسی نہیں۔ میں اپنی زبان اور کلچر کا کبھی مطالبہ نہیں کروں گا۔ میں گائے کی قربانی جائز نہیں رکھوں گا۔ مسجد کے سامنے باجا بجانے اور رقص کرنے پر مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ ترنگے جھنڈے کے سامنے ڈنڈوت کروں گا۔ میری قومیت آج سے ہندوستانی ہوگی اس

کے علاوہ حکومت جو حکم دے گی اس کی بلا عذر تعمیل کروں گا۔"

مولوی صاحب کی بے باکی و حق گوئی جوں جوں وہ اس خط میں آگے بڑھتے جاتے ہیں تیز تر ہوتی جاتی ہے مثلاً۔" گاندھی جی وفاداری مول نہیں لیتی"۔ یا فرماتے ہیں۔" اگر آپ نے اپنی روش نہ بدلی اور یہی طریقہ جاری رکھا اور مسلمانوں کو غیر وفادار، غدار، ففتھ کالم کہہ کہہ کر ان کے دل کو دکھاتے رہے تو آپ کو سچی وفاداری کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے"۔" مجھے آپ سے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان عموماً آپکے رویّہ سے خوش نہیں۔" یہ جرأت، یہ بے باکی و حق گوئی مولوی صاحب اور صرف مولوی صاحب ہی کا حصّہ ہے چلتے چلتے مولوی صاحب کی تیغِ قلم کی برش کا ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ حامد اللہ افسر میرٹھی کی کتاب " نقد الادب" پر کیا بھرپور تبصرہ فرمایا ہے اور صرف چند الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

" جناب حامد اللہ صاحب کی یہ مختصر کتاب " باسل ورس فورڈ" کی تالیف کا چربہ ہے۔" فرمائیے ہے کوئی جواب اس صاف گوئی کا۔ دراصل یہی وہ بے باک تبصرہ نگاری ہے جو مولوی صاحب سے پیشتر اردو میں قطعاً نایاب تھی اور جس کی افادیت سے کسی تنگ نظر ہی کو انکار ہوسکتا ہے۔

بقول کلیم الدین احمد۔" تبصرہ تنقید کی ایک شاخ ہے۔" مولوی صاحب کے یہاں یہ تنقیدی پہلو بھی موجود ہے جو ان کے مندرجہ بالا صرف ایک ہی جملے سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں ہر لفظ برمحل ہر جملہ نپا تلا ہوتا ہے جس سے ادب کی فضیلت بڑھ جاتی ہے۔ جب تک ہر بات کو دلائل کی کسوٹی پر نہیں پرکھ لیتے فیصلہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فیصلے صحیح، تنقید و تبصرہ بے لاگ اور غیر جانب دار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی مولوی صاحب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" مولوی صاحب کے بارے میں چند رسمی الفاظ کہہ کر سبکدوش ہوجانا بعید از قیاس ہے۔ ان کے عظیم محققانہ کارناموں اور اردو پر احسانات کے سرسری سے تذکرے کے لئے صدہا صفحات ناکافی ہیں۔" آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں " بابائے اردو نے تحقیق کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے۔"

> تنقید و تحقیق کی دنیا میں مولوی صاحب بڑی حد تک حالؔی کے نظریات و خیالات سے متاثر ہیں۔ مثلاً ہمدردی، خلوص، سادگی و سلاست اور کام کرنے کی سچّی لگن وغیرہ۔ لیکن ان کو حالؔی کی صدائے بازگشت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ ایک حیثیت سے قدرے مختلف ہیں۔ حالؔی مغربی ادبیات سے پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ مغربی ادب سے بہت زیادہ متاثر اور اس کی تقلید کے خواہاں نظر آتے ہیں اس کے برخلاف مولوی صاحب مغربی ادبیات سے

پوری طرح واقف ہیں اور ساتھ ہی مشرقی علوم پر بھی ان کو کامل دستگاہ حاصل ہے
لیکن اس معلومات کا لطیف و نازک ترین پہلو یہ ہے کہ مولوی صاحب دونوں کا
مزاج بھی پہچانتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرقی ادب، مشرقی ادب ہے
اس کا اپنا ایک الگ مزاج ہے۔ وہ حالی کی طرح مغربی دھاروں کے ساتھ بہتے
نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں مشرقی رنگ کی شعوری کوشش نظر آتی ہے
اور بقول کلیم الدین احمد۔" ان کی تنقید مشرقی فضا میں سانس لیتی ہے۔" وہ مشرقی
ادب کو مشرقی معیار پر ہی پرکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ قدامت
پسند نقاد ہیں۔ وہ مشرقی اصولوں سے کام لینے کے علاوہ مناسب موقع پر مغربی
تنقیدی اصولوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر
ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب مولانا حالی سے متاثر تو ضرور ہیں لیکن مقلد نہیں۔
وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بھی بروے کار لاتے ہیں۔ ان کے نظریات سائنٹیفک
ہیں۔ اگرچہ مولوی صاحب نے نظریاتی طور پر کوئی مستقل کتاب تنقید پر نہیں لکھی
لیکن ان کے خطبات، مقدمات، تبصرے، مقالے، مضامین وغیرہ ان کی تنقید
کی بہترین مثالیں ہیں۔

مولوی صاحب تنقید میں دو باتوں کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھتے ہیں۔" مسدس حالی" پر جو مقدمہ مولوی
صاحب نے لکھا ہے۔ اس میں یہ دونوں پہلو پوری طرح نمایاں ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ دو پہلو کون
سے ہیں جو مولوی صاحب کو دیگر نقادوں پر اولیت بخشتے ہیں۔ دراصل مولوی صاحب تنقید کرتے وقت افتادِ طبع اور
ذہنی رجحان کا اندازہ کرنے کی خاطر ماحول اور ذاتی زندگی کا ضرور پتہ لگاتے ہیں۔" مسدس حالی" پر جو مقدمہ تحریر فرمایا
ہے اس میں مسدس کے لکھنے کی وجوہ کے سلسلے میں ہندوستان کا سیاسی وسماجی پس منظر پہلے بیان کیا ہے اس
کے بعد مفصّل تبصرہ فرمایا ہے۔ مولوی صاحب کے مقدمات انھیں نمایاں خصوصیات کی بنا پر اردو ادب میں "بیش
قیمت سرمایہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی تنقید کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ پہلے ایک محقق اور پھر ایک نقاد ہیں۔ یہی
وجہ ہے کہ غور و فکر اور چھان بین مولوی صاحب کی تنقید کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی تنقید بے لاگ ہونے
کے علاوہ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی۔" مغربی و مشرقی تنقید کا سنگم ہے۔ خلوص، ہمدردی، وسعت، دوربینی
تخیّل کی بلند پروازی، احساس کی شدّت اور شعور کی بیداری۔ ان سب نے مل کر ان کی تنقیدات کو بہت بلند

کردیا ہے اور وہ اردو تنقید کی دنیا میں منفرد نظر آتے ہیں۔"

مولوی صاحب کبھی کبھی دورانِ تنقید زبان کی طرف بہت متوجہ نظر آتے ہیں مگر اس بات کو ان کی تنقید کی خامی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی وجہ سے جزئیات نگاری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مزید براں اس تذکرۂ اردو کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اوّل تو وہ ایک ماہر لسانیات ہیں دوسرے انھیں اردو سے لگاؤ نہیں عشق ہے کیوں کہ اردو زبان کے اس نازک دور میں جب کہ بادِ مخالف کے تیز و تند تھپیڑوں نے اس بیچاری زبان کی نیّا کو منجدھار میں ہچکولے کھانے کے لئے چھوڑ دیا تو اسی بوڑھے مگر جوان ہمت مانجھی نے اپنے عزم و استقلال کی پتوار لے کر تن تنہا ان طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ یہ ایسے طوفان تھے جس میں نہ صرف غیروں کی بلکہ اپنوں کی تخریبی جد و جہد اور تباہ کن کوششیں برابر کی شریک تھیں اور آخر انھیں بوڑھی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی سرگرمیوں نے اردو زبان کی ڈوبتی کشتی کو ساحل مراد تک پہونچا دیا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے مولوی صاحب کے اس بے لوث جذبۂ خدمت کو بجا طور پر جذبۂ جہاد سے تعبیر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "عبدالحق کو تو میں ان انے گنے مجاہدین ادب میں شمار کرتا ہوں جن کی رہنمائی ہزاروں کو راہ راست پر لائی۔ جن کی کاوش اور جہد متعدد طاقتوں سے نبرد آزمائی میں کامیاب رہی اور اردو زبان و ادب کے لئے تائید یزدانی ثابت ہوئی۔" مولوی صاحب کا یہ جذبۂ جہاد کچھ ایسی بات ہے جس نے یگانوں کا تو ذکر ہی کیا ہزاروں بیگانوں کے دلوں کو بھی موہ لیا۔ اس کے ثبوت میں اردو ادب کی مایۂ ناز ہستیوں کے بے شمار حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر کے چند الفاظ جس طرح مولوی صاحب کے تمام کارناموں کا احاطہ کر لیتے ہیں اپنی مثال آپ ہیں وہ لکھتے ہیں۔ "جو کام گاندھی جی نے ہندوستان کے لئے مسٹر جناح نے پاکستان کے لئے کیا وہ کام اردو کے لئے مولوی عبدالحق نے کر دکھایا۔ بلاشبہ مولوی عبدالحق نے اپنے خون سے اس زبان کو سینچا ہے"۔ آل احمد سرور اپنے خیالات کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔" میری نظر سے بہت سے محقق، نقاد، انشا پرداز گزرے ہیں مگر اردو کا ایسا عاشق نظر سے نہیں گزرا۔" مولوی صاحب کی خدماتِ اردو سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان کے خطبات کو کس طرح جھٹلایا جا سکتا ہے۔ انھیں پڑھ کر ہمیں نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کس طرح بنی، کن کن مراحل سے گزری بلکہ ہندو پاک کی سیاسی و سماجی تاریخ بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ خطبات اردو زبان کے جہاد کی داستان ہیں جس میں اغیار کی صف آرائیوں کے بالمقابل تنہا مولوی صاحب اپنے خطبات کے درمیان ایک مردِ غازی کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں مولوی صاحب ہندوؤں کے عظیم ترین رہنما گاندھی جی تک سے ٹکرا گئے۔ ان سے بھی بڑی تلخیوں تک نوبت پہونچ گئی جس کا ذکر اوپر کہیں گزر چکا ہے۔ لیکن بابائے اردو نے انھیں بھی اس طرح قائل کیا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا عبدالحق صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔"

مولوی صاحب کے یہ خطبات تاریخی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں بہت کچھ ہے مثلاً زبان اردو کہاں عالم وجود میں آئی، کہاں پروان چڑھی، کن کن موانعات سے دوچار رہی اور کن لوگوں نے اسے آگے بڑھانے میں مدد دی، یہ تمام حقائق مولوی عبدالحق صاحب کے خطبات سے بہ آسانی معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

مولوی صاحب کی خدمات کو جن کے بارے میں خود ان کا خیال ہے۔ "اردو کی خدمت کرنا اور اسے فروغ دینا عبادت ہے"، کہاں تک بیان کیا جائے۔ جو شخص اپنی محبوب زبان کی خدمت کو بہ منزلہ عبادت سمجھتا ہو، اسے ایمان جانتا ہو، اس کے خلوص میں کسی کافر ہی کو شک ہو سکتا ہے تاہم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے بھی ملاحظہ فرما لیجئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ "قوموں کی زندگی میں زبان جو اہمیت رکھتی ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔ یہی وہ سانچہ ہے جس میں خیال ڈھلتا ہے اور خیال ہی وہ مسالہ ہے جس سے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے علم برداروں میں ایسے بہت کم تھے جنہوں نے اس راز کو سمجھا کہ سیاسی آزادی ذہنی آزادی پر موقوف ہے اور ذہنی آزادی کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے خیالات و جذبات کی ترجمان خود ہماری زبان ہو۔ اس مقصد کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے والا ایک ہی شخص نکلا۔ آج اردو زبان کو نہ صرف مشرقی علوم بلکہ مغربی علوم سے بھی مالا مال کر دیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہے اور ایشیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ان تحریکوں کا نتیجہ ہے جس کی روحِ رواں مولوی صاحب کی ذات ہے۔" جامعہ عثمانیہ، سررشتہ تالیف و ترجمہ" ان ہی کے خواب کی تعبیر اور" انجمن ترقی اردو ان ہی کے دست و بازو کی تعبیر ہے۔" ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رائے کا ایک ایک حرف صداقت پر مبنی ہے واقعہ بھی یہی ہے کہ مولوی صاحب نے اردو کی پرورش کے لئے اپنے دن رات ایک کر دیئے۔ ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر دیا۔ اور آج "ایک جان دو قالب" کی مشہور ضرب المثل کے برخلاف مولوی صاحب اور اردو "ایک جان ایک قالب" بن چکے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ذہنی بلکہ مالی سرمایہ بھی اس پر دل کھول کر صرف کیا۔ جب انجمن ترقی اردو کو مالی امداد کی ضرورت پڑی تو مولوی صاحب نے اپنا کل سرمایہ اس کی نذر کر دیا۔ مولوی صاحب کے اس عمل، ان کی اس جرات نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور ہر طرف سے یہ صدائیں آنے لگیں۔" مولوی صاحب نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" آخر وہ اپنا ذاتی روپیہ اس قدر بے دردی سے کیوں صرف کر رہے ہیں؟" ــ مولوی صاحب دنیا کی اس ہمدردی سے بالکل خوش نہیں ہوئے بلکہ جھنجھلا اٹھے اور پھر جو جواب انہوں نے اس سلسلے میں دیا وہ صرف انھیں کا کام تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا کام۔ انہوں نے فرمایا۔" یہ تم نے کیا کہا میں اپنا ذاتی روپیہ بیدردی سے کیوں خرچ کر رہا ہوں؟ تمہارے بھائی یا بچے پر خدا نخواستہ کوئی آفت پڑے تو کیا تم اس کی مدد

نہ کروگے؟ اور کیا ایسے وقت میں تم روپیئے کا منہ کروگے؟ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہوگیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشااللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں سکریٹری رہوں یا نہ رہوں۔،، کس قدر عظیم و پرخلوص ہے مولوی صاحب کا یہ عہد۔ ایک ایک لفظ پر غور کیجئے ۔ صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ملے گی۔

پاکستان آنے کے بعد" اردو کالج" کا قیام اپنی نوعیت کا ایک ہی کارنامہ ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر" اردو یونی ورسٹی،، کی تجویز ہے جو مولوی صاحب کے عزم اور انتھک کوششوں کی بدولت بہت سے مراحل طے کرچکی ہے اور عنقریب ہی اس کا قیام نہ صرف ایشیا بلکہ تمام عالم کو متحیر و متعجب کردے گا۔

ہمارے ادب میں ایسی شخصیتیں خال خال ہی نظر آئیں گی۔۔۔ جن کی عظمت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا ہو لیکن مولوی صاحب کی عظمت و ہردلعزیزی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ نہ صرف ادیبوں ہی نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ سیاسی رہنماؤں نے بھی انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وزیر مواصلات جناب ایف۔ایم۔خان اپنے ایک پیغام میں فرماتے ہیں۔" بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بارے میں عقیدت مندی کا اظہار کرنا بھی ایک فخر کی بات ہے۔ مولوی عبدالحق کی ہستی دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں اُردو اَدب میں جو مقام آپ کو حاصل ہے اس کے صحیح اندازہ کے لئے" بابائے اردو،، کا لقب کافی ہے۔ مولانا عبدالحق ایک طرف تحقیق و تنقید میں اپنی آپ مثال ہیں اور دوسری طرف ایک صاحب طرز انشاء پرداز ہیں۔ ان کی تحریروں کی سادگی، نکتہ آفرینی اور لطافت ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ مولانا عبدالحق اردو زبان کے ایک ایسے ستون ہیں جن کو دنیائے ادب کبھی اور کسی حالت میں فراموش نہیں کرسکتی۔۔،، جناب ذوالفقار علی صاحب بھٹو کا قول ہے۔" فروغ اردو کے سلسلے میں مولانا عبدالحق کی خدمات جلیلہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گی۔،،

مولوی صاحب کی علمی و ادبی اہمیت یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ آپ کے ادبی کارنامے بے شمار ہیں۔ سیرت و کردار نگاری کے سلسلے کی ایک عظیم کڑی ان کی کتاب" چند ہم عصر" ہے۔ اس تصنیف میں صرف اس دور کی محترم و مقتدر ہستیاں ہی نظر نہیں آتیں یا مولوی صاحب کی نگاہِ دوررس محض محلوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ ان کی نظرِ انتخاب جھونپڑی کے پیچھے ہوئے ہیروں تک پہونچتی ہوئی نظر آتی ہے جو مولوی صاحب کی عظمت، انسان دوستی، اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ ہمارے ادب میں ایسے شاہکار

نایاب ہیں کیونکہ ہمارے ادیبوں کی تنگ نظری تمسّق پسندی زمانے کی شہرت یافتہ شخصیتوں یا صاحبان زر و اقتدار ہی کے گرد گھومتی ہے یہ لوگ انھیں کو اپنی فکر و نظر کا محور و مرکز سمجھتے ہیں جس کے برعکس مولوی صاحب رنگ و نسل کے امتیاز سے کوسوں دور ہیں۔ وہ انسانیت کے علم بردار ہیں۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہیں اور اسی دنیا کے ہر شخص کو بلا تخصیص اپنی فکر کا موضوع و مرکز سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسانی عظمت کسی کی میراث نہیں۔ وہ اسی کو عظیم جانتے ہیں جو انسانی خصوصیات سے متصف ہو۔" نام دیو مالی " اور " نورخاں "، گو آج دنیا میں نہیں مگر" چند ہمعصر" کے خالق کے قلم کی ہلکی سی جنبش نے انھیں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی دے دی۔ ایسے کرداروں پر اس قدر تفصیلی تبصرہ مولوی صاحب کے بے پناہ خلوص، ان کی گہری ہمدردی عمیق مشاہدے نیز تلاش و کاوش کا پتہ دیتا ہے۔" نام دیو مالی" کی شخصیت کو انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کو بلا واسطہ ایک ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ایسی ہمدردی جو جذبۂ انسانیت کے سارے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیتی ہے۔ جس کی صدائے بازگشت تادیر روح کی پہنائیوں میں گونجتی رہتی ہے انسانی زندگی کا مطالعہ کیونکہ بغیر ہمدردی کے ناممکن ہے لہٰذا ایسے زندۂ جاوید شاہکار ایسے ہی عظیم فنکار کی جانگدستی سے ظہور میں آ سکتے ہیں جس کے سینے میں انسان کا دل دھڑک رہا ہو اور جس نے انسان کو انسان ہی کی حیثیت میں بہت قریب سے دیکھا ہو۔ لیکن مولوی صاحب کی ہمدردی ان کی حقیقت نگاری و صاف گوئی پر حاوی نہیں آتی انھیں خواہ کسی سے کتنی ہی عقیدت و انسیت کیوں نہ ہو وہ جس طرح اس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اسی طرح بہت صفائی اور غیر جانب داری سے اس کی کمزوریاں بھی بیان کر جاتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جو ان کی تبصرہ نگاری میں بھی صاف صاف جھلکتا ہے اور جس کا ذکر تبصرہ نگاری کی ضمن میں وضاحت کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔

ایک اچھے سیرت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک اچھا انشا پرداز و مصوّر بھی ہو۔ مولوی صاحب نے سیرت نگاری میں صحیح مصوّری کا حق ادا کر دیا ہے۔ سیرت نگاری کی سادہ تصویر میں اپنے قلم کی جنبشوں سے ایسے رنگ بھرے ہیں کہ یہ تصویریں چلتی پھرتی، ہنستی بولتی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی انشا پردازی کا ایک کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے یوں محسوس کرنے لگتا ہے گویا وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ مولوی صاحب کے یہاں اس مرقع نگاری کے پس پردہ کوئی نہ کوئی افادی پہلو بھی نظر آتا ہے۔ مثالی انسانوں کی عکاسی کا مقصد انسانی کرداروں کی اصلاح کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

بعض کرداروں کے پردے میں مولوی صاحب خود صاف جھلکتے نظر آتے ہیں

نام ڈیو مالی کے کام کی گہری اور سچی لگن۔ نور خاں کی اصول پرستی مولوی صاحب کے اپنے کردار کی جھلک ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کی تصویر کسی رخ سے اٹھا کر دیکھئے یہ اپنے ہرانداز سے پرانے دور کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ بھلا آج کل ایسے مخلص ایسے صادق لوگ کہاں ہیں۔

مولوی صاحب کی عبارت میں سادگی، دلنشینی، تاثر، پختگی، متانت، اعتدال پسندی، حقیقت نگاری، استقامت، روشن دماغی، کشادہ دلی، گہرائی اور گیرائی کے علاوہ جگہ جگہ ظرافت کی رنگ آمیزیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سادگی و شگفتگی نیز دلچسپی ان کی تحریر کی خاص خوبیاں ہیں انتشارِ ذہنی اور خیالات کا ہجوم کبھی قلم پر طاری نہیں ہوتا۔ ثقیل و مشکل الفاظ اور مشکل عبارت لکھنے کے سخت خلاف ہیں جیسا کہ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں دکن میں آسان زبان لکھنے کے سلسلے میں خود فرمایا۔" ہم کیوں لکھتے ہیں۔ اس لئے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہونچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے پڑھ سکیں اگر مشکل زبان میں ہو گی تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔" اسی مشکل پسندی کی مذمت کرتے ہوئے اسی تقریر میں آگے چل کر مولانا ابوالکلام آزاد پر جو بے باکانہ تبصرہ فرمایا ہے اس سے نہ صرف حقیقت پسندی بلکہ ان کی ظرافت کا بھی اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں۔" مشکل پسندی کا دوسرا دور اس وقت آیا جب مولوی ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ اور اس کے بعد انہوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لئے "بدل اشتراک" ایڈیٹر کے لئے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کے ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ کہ اپنے اسمِ شریف کو بھی عربی کا لباس پہنا دیا یعنی "احمد المکنیٰ بہ ابی الکلام الدہلوی" لاحول ولا قوۃ۔ یہ اردو ہے یا اردو دشمنی۔"

مولوی صاحب کے علمی و ادبی کارناموں میں ان کی "اردو قواعد" کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ اردو زبان و اردو ادب کی ترقی و نشو و نما کے لئے آپ نے جو کچھ کیا یقیناً اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ واقعی یہ انھیں کی جواں ہمتی، سعی پیہم اور بلند عزائم کی بدولت آج ہماری زبان کا دامن نئی نئی اصلاحات اور نئے نئے الفاظ کے کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں سے مالا مال ہے۔ انہوں نے اردو کی تنگیٔ داماں کا علاج کیا اور اس کو وہ وسعت بخشی کہ آج وہ

ادب کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بن گئی۔ دنیائے نثر ہو یا جہانِ نظم آج سب پر اردو زبان کی حکمرانی ہے۔ وہ آج ہر مکتبِ خیال کی ترجمانی کے فرائض سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ سب کچھ ایک مولوی عبدالحق صاحب کے خلوص اور انتھک محنتوں کا پھل ہے۔ انھوں نے اسے وہ اسلوب بخشا جسے بقول رشید احمد صدیقی "اردو ادب کا بنیادی اسٹائل کہہ سکتے ہیں۔ اس اسٹائل نے اردو کو دنیا کی مشہور اور اہم زبانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔" مولوی صاحب کے انداز تحریر نے بہت سے ادیب اور فنکاروں کو جنم دیا اور ان کی رہنمائی کی۔ جس کا اعتراف فراق گورکھپوری کے الفاظ میں دیکھیے۔ " بابائے اردو مولوی عبدالحق کی یاد ہندو پاک میں لوگ آسانی سے فراموش نہ کرسکیں گے۔ خود میں نے ان کی تحریروں سے ادبیات کا درس لیا ہے۔ ان کی نثر میرے لئے اور مجھ سے کئی اوروں کے لئے چراغِ راہ رہی ہے۔ کاش مجھے یہ توفیق ہوئی ہوتی کہ کچھ عرصے تک ان کے قریب رہ کر اپنے ذوقِ ادب پر احسان کرتا۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جو کچھ کیا وہ ایک بڑی انجمن کا کام ہے لیکن اس انجمن میں مولوی صاحب سے زیادہ اہم کوئی نہیں۔ ان کی ذات بالاتفاق رائے خود "تمام انجمن" ہے۔ سر سید احمد خان کے بعد مولوی صاحب ہی ایک ایسے انسان ہیں جو بجائے خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقول خواجہ غلام السیّدین " مولوی عبدالحق کی سالگرہ منانا دراصل اردو زبان اور اردو ادب کی ترقی و توسیع کی سالگرہ منانا ہے۔" واقعی ہے بھی ایسا ہی کیونکہ مولوی صاحب اور اردو زبان و ادب کوئی دو دو نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہیں یا پھر غلام رسول مہر کے قول کے مطابق۔" ان کے کارنامے اس درجہ بلند گرانمایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔" بہ ظاہر اس قدر کہہ دینے کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی مگر یہ موضوع سب کچھ کہہ دینے کے بعد بھی تشنہ ہی نظر آتا ہے اور واقعی کیوں نہ نظر آئے کیونکہ یہ ذکر ہے زبان اردو کی جہد البقا کا۔ جیسے ذکرِ جمیل یا حکایت لذیذ کہہ سکتے ہیں اور پھر اس کے پردے میں جو ہمہ خلوص، تمام ایثار شخصیت ہے اس کے لئے تو .... "زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے۔"

اُردو کے معمار اعظم

بابائے اردو ، ڈاکٹر مولوی عبد الحق

سرسید احمد خاں کے بعد جس شخص نے علمی اور ادبی کاموں میں اپنے تن من دھن کی بازی لگادی وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی شخصیت ہے۔ اردو کے یہ محسن ۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ کے شہر ہاپوڑ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے ننھیال سراوہ میں پائی۔ جو ہاپوڑ کے قریب میرٹھ ہی کے ضلع میں واقع ہے۔ پرائمری کے بعد مڈل تک ان کی تعلیم مشرقی پنجاب میں ہوئی، جہاں ان کے والد محکمۂ مال میں ملازم تھے۔ یہاں سے وہ علی گڑھ جیسی عظیم درسگاہ میں مزید تعلیم کے لئے چلے گئے جہاں انھوں نے کئی برس تک دنیا کی نگاہوں سے دور اپنا مطالعہ خاموشی سے جاری رکھا۔

آج مولوی صاحب کو اردو کے ایک نقاد اور معمار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مولوی صاحب ریاضی کے بہترین طالب علم تھے۔ اور ان کا مقابلہ مشہور ریاضی دان ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سے کئی سال تک رہا۔

اس کے بعد ان کا رجحان فلسفہ کی طرف ہوا تو اس قدر کہ اپنے اصحاب میں "فلاسفر" مشہور ہو گئے۔ یہ سب سرسید، حالی، اور شبلی جیسی بلند پایہ ہستیوں کی قربت کا نتیجہ تھا۔

علی گڑھ یونی ورسٹی سے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرسید

مولوی صاحب سے اتنی ہی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے جتنا اپنے لڑکے سید محمود سے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو جاتا ہے کہ کالج میں جب پہلی بار ترکی ٹوپی اور کوٹ کی یونی فارم تجویز کی گئی تو سب سے پہلے اپنے لڑکے محمود اور مولوی صاحب کے لئے یونی فارم سلوائی اور مولوی صاحب کو خود اپنے ہاتھوں سے پہنائی۔

عبدالحق صاحب نے کالج کے حاصل کردہ علم پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ انھوں نے عربی ادب، ہندی زبان و ادب، صرف ونحو، گجراتی کی تحصیل بھی بقدر ضرورت کی۔ اورنگ آباد کے ایک پنڈت سے تلسی داس کی رامائن پڑھی۔

مولوی صاحب کے مذہب کے بارے میں ان کے دوستوں کی مختلف رائیں ہیں۔ کوئی انھیں "ملحد" اور "زندیق" بتاتا ہے، کوئی "دہریہ" کوئی کہتا ہے کہ ان کا مذہب "لا ادریت" ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ وہ "اناسٹک" ہیں، لیکن مولوی صاحب کے ایک قریبی دوست عطا حسین کا خیال ہے کہ "خدا اور رسول کے شیدائی ہی نہیں بلکہ مسلمان گر بھی ہیں۔"

جس قدر مختلف اور متضاد باتیں مولوی صاحب کے مذہب کے بارے میں مشہور ہیں۔ اسی قدر باتیں ان کے ابتدائی رجحانِ طبع کے بارے میں بھی مشہور ہیں۔ ان کے ایک قریبی دوست کا خیال ہے کہ ان کا رجحان شروع میں فارسی کی جانب تھا۔ کیوں کہ انھوں نے سعدی کی یاد میں ایک انجمن اپنے زمانۂ طالب علمی میں قائم کی تھی اور حافظ کے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے ایک اور قریبی دوست محمد امین صاحب کا خیال ہے کہ ان کا رجحان ابتدا میں انگریزی ادب کی طرف تھا۔ کیوں کہ انھوں نے کالج کے زمانہ میں "لٹن ڈان" کا میڈل حاصل کیا تھا۔ اس کے برخلاف ان کے ایک شاگرد شیخ چاند مرحوم کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کا رجحان شروع ہی سے اردو کی جانب تھا اور طالب علمی کے زمانہ کے ایک مضمون میں اردو کو ترقی دینا اپنا شعار بنایا تھا۔

حقیقت میں، سرسید، حالی و شبلی جیسے ذی علم لوگوں کی صحبت اور مشرقی، ومغربی علوم پر دسترس کے باعث ان کے رجحان کا صحیح اندازہ لگانا بہت دشوار ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی دوست تک ان کے رجحان کا صحیح اندازہ نہ کر سکے اور مدتوں غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

کالج کی تعلیم ختم ہونے کے بعد مولوی صاحب کچھ دن بمبئی میں رہے اور پھر وہیں سے حیدر آباد آ گئے۔ یہیں سے مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا، اردو زبان کو وسیع تر بنانے کے لئے رات دن محنت کی۔ شروع شروع میں ۱۸۹۵ء میں وہ مدرسۂ آصفیہ کے صدر

مدرس رہے اس کے بعد مہتمم تعلیمات پھر صدر مہتمم تعلیمات اور بعد ازاں اورنگ آباد کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

اسی دوران میں آپ کو انجمن ترقی اردو کا سکریٹری چنا گیا۔ انجمن نے جس قدر اردو زبان کی خدمت کی وہ بڑی حد تک مولوی صاحب کی ذات کی وجہ سے ہوئی۔ انھوں نے رسالہ سہ ماہی "اردو" جسے لوگ اردو رسالوں کا "سالار قافلہ" کہا کرتے تھے اور "سائنس" جاری کیا۔ بہترین کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ نایاب کتابیں طبع کرائیں انجمن کا شاندار کتب خانہ قائم کیا، جس میں اردو کی قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا نایاب ذخیرہ جمع کیا اسی زمانے میں کئی کتابیں تصنیف وتالیف کیں، بہت سی کتابوں کے مقدمات لکھے۔

مولوی صاحب نے حیدر آباد کے قیام کے دوران جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا وہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے۔ ساری دشواریوں کو جو اس جامعہ کے قائم کرنے میں حائل تھیں۔ حل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے لیے بہترین اور نایاب کتابوں کو فراہم کیا۔ معیاری کتابوں کے ترجمہ کے لئے یونی ورسٹی میں "دارالترجمہ" قائم کیا۔ جس کے زیر نگرانی، کیمیا، طبیعیات ریاضی، جغرافیہ، فلسفہ، تاریخ، وغیرہ کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

تمام علوم کو اردو میں پڑھانے کے لئے بہترین اور قابل اساتذہ کو اس جامعہ میں جمع کرایا۔ ان میں چودھری برکت علی، قاضی محمد حسین، وحیدالدین سلیم، خلیفہ عبدالحکیم، مرزا رسوا، ہارون خاں شروانی، عبداللہ عمادی، الیاس برنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد دکن سے مولوی صاحب دہلی تشریف لائے۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ شمالی ہند میں بھی جامعہ عثمانیہ کی طرز پر ایک اردو یونی ورسٹی قائم کی جائے۔ اس مقصد کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے ہزاروں روپے کی مالیت کا ایک قطعہ زمین خریدا۔ اس کے لئے مولوی صاحب نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے عوام سے بطور چندہ جمع کیا اور اپنی عمر بھر کی کل پونجی جو کہ چوّن ہزار روپے اور کچھ آنے ہوتی تھی۔ اس فنڈ میں جمع کر دی۔ ایسی مالی ایثار کی مثال موجودہ زمانے میں کوئی نہیں پیش کر سکتا۔

تقسیم ہند کے وقت تک انجمن نے ڈھائی سو سے زائد کتابیں تالیف وطبع کرا چکی تھی اور اس کا اثاثہ پانچ لاکھ روپے تک پہونچ چکا تھا۔ اس کے علاوہ لاکھوں روپے کی مالیت کی نادر کتابوں کا ذخیرہ اور قیمتی مجموعہ جات اس ذخیرہ سے علیحدہ تھے۔

اس وقت انجمن چار رسالے پابندی سے نکال رہی تھی۔ دو رسالے "سائنس" اور "اردو" سہ ماہی تھے۔ "معاشیات" ماہانہ نکلتا تھا، اور "ہماری زبان" پندرہ روزہ تھا جو انجمن کا سرکاری آرگن تھا۔ یہ پندرہ روزہ "قومی زبان" کے نام سے اب تک جاری ہے۔

تقسیم ملک کے بعد حالات نے مولوی صاحب کو ہندوستان ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔

گو کہ مولوی صاحب نے ہرممکن کوشش کی کہ ان مخالف حالات کے باوجود دلّی میں ڈٹے رھیں لیکن شوئی قسمت ایسا نہ ہوا۔ اور انھیں کراچی آنا ہی پڑا، آپ کو کامل یقین تھا کہ پاکستان کی قومی و سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ لیکن حالات اس کے برعکس ہی نکلے۔

جہاں تک قائداعظم کا تعلق ہے، قائداعظم کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی، حالانکہ خود قائدِاعظم کی مادری زبان اردو نہ تھی۔

مولوی صاحب نے کراچی میں بے سرو سامانی کی حالت میں اردو کالج کی بنیاد ڈالی، انجمن پریس قائم کیا تصنیف و تالیف کا سلسلہ نئے جوش سے شروع کیا۔ کئی علمی پرچوں کا اجرا کیا، جس میں "قومی زبان" قابل ذکر ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ایک رسالہ "معاشیات" جاری کیا جس کا ملک میں خیر مقدم کیا گیا لیکن ۱۹۵۴ء میں یہ رسالہ بند کر دیا گیا۔

مولوی صاحب کو اردو زبان و ادب کی ترقی سے کس درجہ تعلق خاطر ہے اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ کیا جاسکتا ہے کہ جب مشہور عالم کلاسیکی شاہکار "مارکس کی کتاب داس کیپٹال" کا ترجمہ مولوی صاحب کو سنایا گیا تو اس کے اردو میں منتقل ہونے کی کامیابی پر ان کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ یہ علم کی محبت کے آنسو تھے علم و ادب سے ایسی والہانہ محبّت اور خلوص صدیوں میں نظر آتا ہے۔

یہاں پر یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ قائدِ اعظم اور خان لیاقت علی خان کے بعد آپ کا کوئی قدر دان باقی نہ رہا۔ اس دوران میں آپ پر وہ وہ حادثے گزرے جن کا کہ تصور تک دردناک ہے۔ لیکن واہ رے مردآہن پیشانی پر بل تک نہ آیا، ہر قسم کی صعوبتیں جھیل لیں۔ لیکن اردو کا بال بیکا بھی نہ ہونے دیا۔

مولوی صاحب خود بوڑھے ہیں لیکن ان کے ارادے جوان اور عزائم چٹان کی طرح مضبوط ہیں۔ ان کے جذبات کا مندرجہ ذیل خطبہ ترجمانی کرتا ہے جو کہ انھوں نے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پڑھا تھا۔

> "میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں میری طرح بوڑھے نہ ہوں۔ اس بات کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھئے ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی۔ لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی قائم رکھنے کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے زندگی بنتی ہے، بڑھتی ہے اور قائم بھی رہتی ہے، جوانی کوئی چوڑے چکلے ہوئے ڈنڈ، اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا، سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمّت و عزم کا دوسرا نام ہے۔ جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہے۔ میں اپنی جوانی پھر واپس لاؤں گا اور اس وقت تک نہ مروں گا۔ جب تک کہ اردو یونی ورسٹی قائم نہ کر لوں گا۔"

اس وقت مولوی صاحب کی سب سے بڑی خواہش "اردو یونی ورسٹی" کا قیام ہے۔ اور وقت کا اہم تقاضہ بھی یہی ہے کہ اب ہماری اپنی قومی زبان جو کہ پہلے غیروں کی سیاست کا شکار رہی اور بعد میں اپنوں کے تعصب کا، اب اپنا صحیح مقام حاصل کرے۔ یہی وہ سب سے بڑی خواہش ہے جس کے پورا ہونے سے شبلیؔ، حالیؔ اور سر سیدؔ کے مابین رہی ہوئی واحد عظیم ہستی شاید دو چار سال اور جی لے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اُس دور کے عبدالحق ہمارے درمیان موجود ہیں۔ اور یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم ان کے وجود کی اہمیت کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو ہیرا سمجھ لیتے ہیں۔ اور گدڑی میں لعل کا تصور نہیں کر سکتے، اگرچہ یہ لعل ہمیشہ گدڑی میں ہی ہوتے ہیں اور اردو ادب کا یہ معمار بھی اپنے وجود کو گدڑی میں روپوش کئے ہوئے ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کاش ملک کا سرمایہ دار طبقہ اردو یونی ورسٹی کی اہمیت کو محسوس کرے کیوں کہ اسی طبقہ پر ملک و قوم کی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے۔

پودے اور اُن کی زندگی

اس میں پودوں کی دنیا کے پراسرار حالات درج ہیں اس کے مطالعے سے ثابت ہوگا کہ نباتات کا نظام زندگی بھی اتنا ہی منظم اور باضابطہ ہے جتنا کہ اشرف المخلوقات انسان کا۔ تصویریں بھی بہ کثرت شامل کتاب کی گئی ہیں۔ پروفیسر سعید الدین صاحب (شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ) نے خاص طور پر یہ کتاب انجمن کے لئے لکھی ہے قیمت مجلد تین روپے

اُردو زبان میں علمی اصطلاحات کی تاریخ

از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ قیمت ۸ آنے

انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ، کراچی

عزیز الرحمٰن

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

نہیں گم نام میں اہلِ سخن میں مرا نامہ ہے نامی انجمن میں

جب تک اردو ادب کو بقا ہے، مولوی عبدالحق کے نام کو بھی ہے۔ اپنی نوے سالہ زندگی کو جس طرح اردو کے لئے انھوں نے وقف کردیا وہ ایک ایسی مثال ہے جس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

اردو تو حالؔی اور شبلؔی کے ساتھ ہی مرچکی ہوتی لیکن یہ صرف عبدالحق ہی ہیں کہ اردو آج کل پورے برصغیر ہند و پاک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ورنہ یہ وہی اردو ہے جس کے بارے میں مہدی حسن افتادی کی زبان سے صرف اتنا سن لیجئے۔

"جس زبان کی حیاتِ طبعی بوڑھے نذیر احمد، حالؔی اور شبلؔی کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے۔"

ایسی زبان جس کی زندگی کا دار و مدار صرف تین شخصیتوں پر ہو اس کے جسم میں نیا خون دوڑاتا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اردو کی لغات مرتب کرائے اس کے اصول منضبط کرکے اس کو تعلیم کا ایک ذریعہ بنا کے، اس کو جس عظمت سے بابائے اردو نے ہم کنار کیا اس کا صحیح جائزہ تو آئندہ آنے والی نسلیں ہی لے سکتی ہیں۔ ہم لوگ تو صرف یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اردو ادب کے تحفظ و ترقی کے لئے انھوں نے کتنی مصیبتیں اٹھائیں

انسان بہرحال انسان ہے، اس کی فطرت ہے کہ بڑھاپے میں آرام کرے۔ لیکن عبدالحق

اور آرام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑا جائے اور
اگر ہو سکے تو آج کا کام بھی آج ہی کر لیا جائے۔ وہ صحیح معنوں میں انتہا پسند ہیں اور اعتدال
کے دشمن، کیوں کہ اعتدال اور ترقی میں کوئی مناسبت نہیں اور اعتدال پسند آدمی کبھی کسی کام
کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکتا،

اردو عبدالحق کی جان ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو زبان پیدا نہ ہوتی تو عبدالحق بھی پیدا نہ ہوتے۔ ہر حالت میں —— چاہے خوشی ہو یا غم —— انھیں بس اردو کی ہی فکر رہتی ہے۔ اس کا اندازہ عبادت بریلوی کے الفاظ میں کیا جا سکتا ہے۔

"—— دلّی میں قتلِ عام ہو رہا ہے —— وہ لوگوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو بہا
رہے ہیں۔ انھیں اس کا بڑا غم ہے۔ خطوں میں اس غم کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ لیکن اردو کے
خیال کو اس موقعہ پر بھی دل سے نہیں نکالتے۔ اور آخر میں لکھ ہی دیتے ہیں۔"

"میں نے اسکیم پاکستان میں اردو کی اشاعت کے متعلق تیار کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان سے تو اردو کو دیس نکالا مل گیا۔ اب کراچی جاکر مشورہ کروں گا کہ انجمن
کا صدر مقام کہاں ہو اور ہندوستان اور پاکستان میں کام کس طرح انجام دیا جائے۔"

عبدالحق مسلمانوں کی پستی کی وجہ اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کی اصل وجہ ذہنی غلامی ہے۔ اور اس ذہنی غلامی کی اصل وجہ وہ غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں——

"غیر زبان میں تعلیم دینے سے یہی نہیں ہوتا کہ ذہنی ترقی رُک جاتی ہے۔ بلکہ اس کا
اخلاق پر بھی اثر ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ آدمی ۔ ۔ ۔ ۔ انسان سے کھلونا بن جاتا ہے۔"

بابائے اردو کے نزدیک قومی زبان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حقیر سے حقیر زبان بولنے کی زندگی سے اس طرح لپٹی ہوتی ہے کہ اس زبان کے بغیر بولنے والوں کی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اس نظریہ کے تحت "زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے"۔

بابائے اردو کے نزدیک چوں کہ مسلمان قوم کی پستی و ترقی کا سوال تھا اس وجہ سے انھوں نے اس بات کو نہایت اہم سمجھا کہ اس ملک کی زبان اردو ہو۔ اردو سے ان کی محبت دراصل قوم سے محبت کا نتیجہ ہے، اور اسی لئے انھوں نے اپنا سارا اثاثہ (نصف لاکھ سے زیادہ) اور

اپنی زندگی اردو پر نچھاور کر دی۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک اردو کے لئے یہ پیش کش ایک احمقانہ بات تھی، کہ اس بڑھاپے میں مستقبل کی طرف سے لاپرواہ ہونا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن ان لوگوں کو کیا معلوم بابائے اردو کو اپنی زندگی سے زیادہ اردو عزیز ہے۔ وہ اردو کے بابا ہیں اور اردو ان کی گود میں ایک بچی۔ ایک باپ اگر اپنے بچے کی زندگی کے لئے ساری پونجی لٹا دے تو اسے ہم بے وقوفی نہیں بلکہ قربانی کہیں گے۔

شرم تو ہمیں آنی چاہیئے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے لیکن ہم نے اب تک اس کے لئے کچھ نہیں کیا — بے وقوف تو دراصل ہم ہیں کہ ایک زبان جو ہماری قومی زبان ہے اس سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ اور ایک غیر زبان کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، جب کہ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اردو زبان نے رکھی اور بقول بابائے اردو

"اسی کے طفیل میں پاکستان کا پروپیگنڈا ہوا اور اسی کی جدوجہد ساحلِ کامیابی تک پہونچی"

اگر غور سے دیکھا جائے تو بابائے اردو کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔

علامہ اقبالؒ مرحوم نے سب سے پہلے اپنی شاعری سے قوم میں ایک نئی روح پھونکی اور آزادی کا جذبہ پیدا کیا۔ پھر ہمارے لیڈروں نے اپنی تقاریر سے قوم میں خودداری پیدا کی۔ اور یہ دونوں چیزیں اردو زبان ہی کے ذریعہ میسر ہوئیں یعنی پاکستان کے لئے جدوجہد اردو زبان میں ہوتی تھی — اگر کسی اور زبان میں پاکستان کا پروپیگنڈا کیا جاتا تو یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ مسلمانوں میں یہ گرمی اور یہ حیرت انگیز جوش پیدا ہوتا۔ علامہ اقبالؒ نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کی ہے اس میں بھی مسلمانوں کی خودداری کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، اور بہت سوں کے نزدیک تو ان کی فارسی شاعری ان کے فن کے کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن لوگوں نے دیکھ لیا کہ جو کام ان کی اردو شاعری نے کیا اس کا عشرِ عشیر بھی فارسی شاعری نہ کر سکی اسی وجہ سے بابائے اردو اس بات کے حامی ہیں کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے سے پاکستانیوں میں اور زیادہ اتحاد پیدا ہوگا۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے صرف اس وجہ سے محبت نہیں ہے کہ وہ اردو ہے بلکہ اس لئے کہ اس زبان نے مسلم تہذیب کے دفاع و تحفظ میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری قومی تحریک اور اردو ہم معنی لفظ بن گئے ہیں۔ عبدالحق اردو کو اسی نظریہ

سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی اہمیت سے انکار کرنا بابائے اردو کے نزدیک ایک قومی تحریک کی توہین کرنا ہے، جس تحریک نے پاکستان کو جنم دیا۔

بابائے اردو کی ساری خدمات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(i) اس وقت کی خدمات جب کہ برصغیر آزاد نہیں ہوا تھا۔ اور

(ii) آزادی پاک کے بعد کی خدمات۔

اگرچہ عبدالحق کی اردو کے لئے محنت اور کوشش خواہ یہ آزادی سے پہلے کی ہو یا بعد کی دونوں میں ایک سلسلہ پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی دونوں کو الگ الگ کر دینا اس لئے ضروری ہے کہ آزادی سے پہلے اردو کے لئے انھیں غیر قوموں سے لڑنا پڑتا تھا لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد اپنی ہی قوم سے اردو کے لئے متواتر لڑنا پڑ رہا ہے۔

یوں تو بابائے اردو کو زبان سے شروع ہی سے لگاؤ رہا ہے۔ لیکن اردو ادب کی اصل خدمت انھوں نے اپنی تعلیم کے بعد شروع کی۔ جس زمانہ میں وہ تعلیم پا رہے تھے، انھیں ریاضی سے کافی لگاؤ تھا۔ اور اپنے ہم جماعتوں میں —— جن میں سر ضیا الدین مرحوم بھی شامل تھے —— ریاضی کے اچھے طالب علم شمار ہوتے تھے۔

> تعلیم کے بعد مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر انھوں نے اردو کی خدمت شروع کی اور اسے ایک تحریک کی صورت دی۔ اس سے پہلے زبان صرف بولنے کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی زبان کو بھی تحریک کی صورت دی جا سکتی ہے لیکن عبدالحق نے اس کا سبب یہ بتایا کہ زبان ہمیشہ تہذیب و ثقافت کی بنیاد ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر آزادی کی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے۔

بابائے اردو نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں اور اپنے تمام سرمائے کو نچھاور کر دیا۔

دلّی یونی ورسٹی میں پہلے شعبۂ اردو اور فارسی ایک ہی ساتھ تھا، دلّی یونی ورسٹی نے اس وجہ سے اردو کا الگ شعبہ بنانے سے انکار کر دیا تھا کہ یونی ورسٹی سائنس کی طرف توجّہ دے رہی ہے اس لئے اردو کے لئے روپیہ منظور نہیں کر سکتی۔ عبدالحق کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے دو ہزار کا ایک چک اپنی طرف سے دے دیا کہ اردو کے لئے ایک معلّم کا تقرر کیا جائے۔ اور اس روپے سے اسے ایک سال کی تنخواہ دی جائے۔ اور اسی طرح دلّی یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کی بنیاد پڑی۔ اگر مولوی صاحب نہیں ہوتے تو شاید دلّی یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کبھی قائم نہیں ہوتا۔

بابائے اردو کے نزدیک روپے کی اردو کے سامنے کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بعض اوقات تو وہ اردو کے لئے سخت سے سخت قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ایک دفعہ آپ ایک وفد کے ساتھ یوپی کے وزیر تعلیم سے اسکول میں اردو کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرنے گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ کوشش حکومت کی جانب سے کی جا رہی تھی کہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد اسکول میں کم ہو جائے۔ چناں چہ اردو کے حامیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ وزیر تعلیم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ وہاں پتہ نہیں وزیر تعلیم نے اردو کی مخالفت میں کچھ کہہ دیا یا کوئی اور بات ہوگئی کہ بابائے اردو یک دم بھڑک گئے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ وفد کے کچھ لوگ آڑے آ گئے ورنہ اس ملاقات کا اختتام جنگ پر ہوتا۔

اسی طرح مولانا آزادؔ مرحوم کو بھی بابائے اردو سے بہت سخت باتیں سننی پڑیں۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی اردو کے معاملات کو طے کرنے کے لئے عبدالحق اور حکومت ہند کے درمیان بہت طویل گفتگو ہوتی رہی حکومت کی طرف سے اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم اس کام کے لئے مقرر تھے۔ دوران گفتگو میں مولانا آزادؔ مرحوم بار بار یہی کہتے حکومت یہ نہیں چاہتی اور حکومت وہ نہیں چاہتی۔ بابائے اردو پہلے تو ان کی باتیں سنتے رہے لیکن جب دیکھا کہ ان کی باتیں سننا لا حاصل ہے اور وہ بار بار حکومت کا ذکر کر رہے ہیں تو بابائے اردو سے رہا نہ گیا اور آپ نے کہا۔

"آپ بار بار حکومت کا ذکر کرتے ہیں کہ حکومت یہ نہیں چاہتی،
حکومت وہ نہیں چاہتی —— حکومت اب کہاں ہے؟ ——
وہ تو ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہوگئی؛ —— آپ
اپنے آپ کو حکومت سمجھتے ہیں۔"

عبدالحق نے غرض ہر مخالفانہ چال سے ٹکر لی اور اکثر موقعوں پر انھیں کام یابی ہوئی۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے اس جدو جہد کو ترک نہیں کیا۔ قائدِ اعظمؒ اور قائدِ ملّتؒ کی زندگی تک تو انھیں اردو کی اتنی زیادہ فکر نہیں رہی۔ لیکن ان دونوں لیڈروں کا ہم سے جدا ہونا تھا کہ اردو کی مخالفت نے ایک ایسی آندھی کی صورت اختیار کرلی کہ معلوم ہوتا تھا اردو کا یہ پودا ہمیشہ کے لئے جڑ سے اکھڑ کر ختم ہو جائے گا لیکن بابائے اردو کی شخصیت نے اس پودے کو اس وقت بھی فنا نہ ہونے دیا بلکہ اس تاریکی میں شوق اور ولولے کی شمعیں فروزاں کیں۔ لیکن بابائے اردو کی ان سب خدمات کے باوجود آج کل بہت سے لوگ ان پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرنے سے بھی باز نہیں آتے اور پھر نکتہ چینی بھی ایسی جس

کا نہ تو کوئی سر ہے نہ پیر۔ بہت سے لوگ انھیں حد سے زیادہ جذباتی انسان سمجھتے ہیں کہ یہ ابھی سے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہتے ہیں۔

ایسے لوگوں پر ہنسی تو اس وقت آتی ہے جب بابائے اردو اور اردو پر یہ نکتہ چینی اردو زبان میں ہی کی جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کالج بنا کر بابائے اردو نے اردو کے دشمنوں سے بڑی حد تک یہ تسلیم کروا لیا ہے کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔ اب آپ اردو یونیورسٹی کی تکمیل کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ یہ اردو یونی ورسٹی درحقیقت اردو کو ایک نئے دور میں داخل کر دے گی۔ جہاں سے وہ کسی بھی زبان کا مقابلہ کسی بھی پہلو سے کر سکتی ہے۔

"زبان کو بنتے بنتے اور سدھرتے سدھرتے دیر لگتی ہے۔ انگریزی زبان بھی، ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں ترقی کر سکی تھی لیکن یہ اردو کی، اردو جاننے والے طبقہ کی اور مجموعی طور پر پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں عبدالحق جیسا آدمی ملا جس نے اردو کو ایک مختصر سے عرصہ میں ایک ننھے سے پودے سے ایک تنو مند درخت بنا دیا کہ اب تیز سے تیز آندھی بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی۔"

اردو جو حالؔی، شبلؔی، اور سرسیدؔ کے دم تک ہی محدود سمجھی جاتی تھی آج دنیا کی ایک بہت بڑی زبان بن گئی ہے۔ ان ساری خدمات کے باوجود عبدالحق کو قوم کی طرف سے کچھ نہ ملا۔ اصل میں آج کل کی دنیا مردہ پرست ہے کسی کی زندگی تک تو اسے کوئی نہیں پوچھتا لیکن اس کے مرجانے کے بعد اس کے نام کو لانڈری میں بھیج کر دھلوا دیا جاتا ہے اور رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی ساری برائیاں بھی اچھائیاں بن جاتی ہیں۔ ورنہ عبدالحق کی شخصیت ایک عظیم شخصیت ہے جس کا اندازہ عبادت بریلوی کے ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

"میں جب بھی ان کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ایک اتھاہ سمندر اور ایک سر بفلک پہاڑ کا خیال آتا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس سمندر کی بے پایاں وسعت اور اس پہاڑ کی بے اندازہ عظمت کے نظارے سے مبہوت ہو جانے والا ایک خاموش تماشائی ہوں!" — سچ ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شرلاڈلوی

اُردُو کا باپ

جب تک دُنیا رہے گی اُردُو بھی جاری رہے گی اور حق تو یہ ہے کہ اُردُو کے ساتھ ساتھ عبد الحق
کا نام نامی بھی یقینی رہے گا۔ اور یہی اُردُو اس برہم چاری کی اولادِ نرینہ تا ابد باقی رہے گی۔ اسی وجہ سے
یہ بابائے اُردُو ہیں۔

پاکستان تو کیا دُنیا کا ہر ملک اس اُردُو کو اپنائے گا کیوں کہ اُردُو "توحید" کی زبان ہے اُردُو
آزادی کی زبان ہے اُردُو بہادر سپاہی کی زبان ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اُردُو جنّت، بہشت اور سُور
کی زبان ہے اس کا رسمِ تحریر الہامی ہے، تمام دُنیا کے اوتاروں، دیوتاؤں، پیغمبروں کو مختلف زبانوں م
الہامات ہوتے ہیں لیکن جب بھی ان کو تحریر میں لایا گیا تو سب کی تحریریں داہنے ہاتھ سے شروع ہوتی تھیں
جب قومیں گمراہ ہوگئیں تو اُن کی تحریریں بھی اُلٹی ہوگئیں لہذا اُردُو الہامی رسم الخط کی یادگار ہے۔ اس لئے اُردُ
حق پر ہے اور حق اُردُو کے ساتھ ہے۔

اُردُو کی تحریک میں حصّہ لینا ثواب دارین ہے اُردُو کے پرچار میں پاکستان کو کام کرنا ہوگا یہ نام نمود کا نُ
نہیں ہے بلکہ جنّت کا حق دار ہونے کا ثوابِ عظیم ہے اسی لئے عبد الحق

بابائے اُردُو ہیں ——————

—————— زندہ باد بابائے اُردُو

افکارِ عالیہ

مدیر: ر

خطباتُ الحق

اُردو ـــــ ایک مخلوط زبان

یوں تو دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبانوں کے لفظ نہ پائے جاتے ہوں۔ کیونکہ کوئی قوم دنیا
ں بالکل الگ نہیں رہ سکتی۔ دوسری قوموں کے میل جول سے لامحالہ کچھ نہ کچھ لفظ ان کی زبان کے آہی جاتے
یں۔ لیکن قطع نظر اس کے بعض زبانیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں کے اثر اور میل سے کھچڑی بن گئی ہیں۔ یہ
لوط زبانیں کہلاتی ہیں۔ ایک زمانے تک علمائے لسانیات کو مخلوط زبانوں کے وجود سے انکار رہا۔ لیکن
عد کی تحقیقات نے قطعی طور سے ثابت کر دیا ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں۔ انھیں میں ہماری زبان اُردو کا
ار ہے۔ خود ریختہ کا لفظ جو پہلے اُردو کا معروف نام تھا۔ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔

خطبات عبدالحق صفحہ ۲

خطبۂ صدارت انڈین اورنٹیل کانفرنس

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء (بڑودہ)

ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس میں اسی قدر جاں کاہی اور سر دردی کرنی پڑتی ہے۔ جتنی نئی تالیف

یا تصنیف میں۔ ترجمے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو مضمون پر حاوی ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں میں کامل دسترس رکھتا ہو، ادب کی نزاکتوں سے واقف ہو اور اصل مصنف کے صحیح مفہوم کو اپنی زبان میں اسی قوت سے بیان کر سکے۔ یہ آسان کام نہیں، اور ہر ایک کا کام نہیں۔ ترجموں سے زبانوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ یہی نہیں کہ ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ خود زبان بھی متمتع ہوتی ہے۔ ایک اعلا درجے کی تصنیف کا عمدہ ترجمہ بہت سی معمولی تصنیفوں سے کہیں بڑھ کر مفید ہوتا ہے۔ وہ ادب کا جزو ہو جاتا ہے۔

خطبات عبدالحق صفحات ۱۶۱، ۱۶۷

خطبۂ صدارت انڈین اورنٹیل کانفرنس

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء (بڑودہ)

اُردو میں عربی فارسی الفاظ کا کثرتِ استعمال

قصور وار کون ہے ؟

یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی اور انھیں کی عطا کی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی ان کے ساجھی ہیں۔ لیکن شریک غالب ہندو ہی ہیں۔ اگر اس میں فارسی، عربی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت پائی جاتی ہے تو اس بدعت کے مرتکب بھی زیادہ تر ہندو ہی ہوئے ہیں۔ اور اب جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اردو میں عربی فارسی الفاظ اور ترکیبیں بہ کثرت داخل کی جارہی ہیں۔ تو (گستاخی معاف) اس کا الزام بھی ہندی والوں ہی کے سر ہے۔ وہ اگر بحیثیت جماعت اس سے کنارہ کشی نہ کرتے تو یہ نوبت نہ آتی اور ان کی شرکت روک تھام کا کام دیتی۔ اور وہی توازن قائم رہتا جو اس سے پہلے تھا۔

خطبات عبدالحق، صفحہ ۸۰۷

خطبۂ صدارت انڈین اورنٹیل کانفرنس

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء (بڑودہ)

ہفتہ وار اخبارات کی ضرورت

ہمیں ایک یا کئی ایسے ہفتہ وار اخباروں کی بھی ضرورت ہے جو روزانہ اخبار کی خبروں کو صحیح اس طرح بیان کریں

کہ ان میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے اور پڑھنے والا کامل طور پر انھیں سمجھ لے۔ معاملاتِ حاضرہ مثلاً مسائلِ سیاسیات ومعاشیات پر نہایت محنت اور غور کے ساتھ ایسے مضامین لکھیں، یا ماہرین سے لکھوائیں کہ پڑھنے والا مسئلے کے ہر پہلو کو پورے طور پر سمجھ جائے اور سمجھنے کے بعد اسے غور وفکر کرنے کا موقع ملے۔ خبروں کو سلیقے کے ساتھ درج کریں۔ اور ان کے متعلق جن ضروری معلومات کی ضرورت ہے۔ انھیں بیان کردیں۔ جتھے بندی سے بالا ہوں۔ مختلف ملتوں یا فریقوں کے لڑانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ان کے نقطۂ نظر کو صفائی یا سچائی سے بیان کریں۔ اور اپنی رائے کو کسی پر حملہ کئے بغیر آزادانہ اور بے باکانہ ظاہر کرنے میں دریغ نہ کریں۔ بے لاگ رہیں مگر ناگواری پیدا نہ ہونے دیں۔ کبھی کبھی اپنی زبان اور ادب کے متعلق ملک میں جو کام ہورہا ہے اس پر بھی بحث کرتے رہیں۔ طرزِ تحریر میں متانت، سلاست اور شگفتگی ہمیشہ مدِ نظر رہے۔ ایسے اخبارات سے اُردو داں طبقے کو خبروں کی بہم رسانی کے علاوہ تعلیمی فائدہ بھی پہنچے گا اور ان کے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ممکن ہے کہ شروع میں ایسے اخبار کی بکری کم ہو، لیکن کچھ مدت کے بعد اسے ضرور فروغ ہوگا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۱۰۱

"کیٹلاگی محقق"

آج کل یورپ کی ڈگریوں کو وہ غیر معمولی عظمت حاصل ہوگئی ہے کہ ہماری زبانوں کی اعلا ڈگریاں بھی وہیں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے متعلق کچھ نہیں کہتا، غالباً ان کا سامان وہاں یہاں سے زیادہ ہوگا۔ لیکن اُردو کی ڈگری وہاں سے حاصل کرنا، اور ایسے فضلا سے سند لینا، جو خود ہماری زبان وادب سے بے بہرہ ہیں، مجھے مضحکہ معلوم ہوتا ہے۔ میں ان حضرات کو کیٹلاگی محقق کہتا ہوں۔ ان کا علم زیادہ تر ان کیٹلاگوں (فہرستوں) پر مبنی ہوتا ہے جو یورپ کے علما نے مرتب کردی ہیں وہ سوائے کتاب کے، کتاب کے متعلق ہر قسم کا علم رکھتے ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف کون ہے؟ کس زمانے میں ہوا ہے، سنہ وفات کیا ہے۔ اس کے معاصر کون تھے، اس کی تصانیف کون کون سی تھیں، اس کے مآخذ کیا کیا ہیں، اس کے مختلف نسخے کس کس کتب خانے میں ہیں۔ ان کے سنین کتابت کیا ہیں، اور ان نسخوں میں کیا کیا اختلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب یہی کتابیں کھول کر ان کے سامنے رکھی جاتی ہیں تو ان کے سمجھنے اور بعض اوقات صحیح پڑھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تحقیق کا ڈھنگ وہیں آتا ہے۔ ہم نے وہ مقالے (تھیسس) بھی دیکھے ہیں جو وہاں سے لکھے ہوئے آئے ہیں۔ ہمارے بعض مستند طلبہ، معلمین اور پروفیسروں نے گھر بیٹھے ان سے کہیں بہتر اور زیادہ محققانہ مقالے لکھے ہیں، اس کا دوش میں ان کو نہیں دیتا۔

جو یورپ جا کر یہ ڈگریاں لائے ہیں۔ بلکہ اس میں سراسر قصور ان یونی ورسٹیوں کا ہے جو ڈگری دیکھتی ہیں اور کام نہیں دیکھتیں، اور غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے بلا امتیاز ہر ڈگری کے کاغذ کو سندِ فضیلت خیال کرتی ہیں۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۲

دلّی کالج اور سائنٹی فک سوسائٹی

دہلی کالج کا ذکر ہندوستان کے نظامِ تعلیم کے سلسلے میں نیز اُردو زبان کی تاریخ میں، ہمیشہ کیا جائے گا۔ اور تعریف کے ساتھ کیا جائے گا۔ اگرچہ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کے لکھنے والے اسے اکثر بھول جاتے ہیں۔ اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ پہلی درس گاہ تھی، جہاں مشرق و مغرب کا سنگم قائم ہوا۔ اور ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام دیا۔ اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کر دی، جس میں سے ایسے پختہ کار، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنّف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اُردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اُردو ہی کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے، اور باوجود ان موانعات کے جو معترضین ذریعۂ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے۔ وہ نہایت کامیاب رہا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۳۲

خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو ہندوستانی اکیڈمی

۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی (مجلس ترجمہ) تھی جو کالج کے طلبہ کے انگریزی سے اُردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ یہ ترجمے سب کے سب کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ہوئے ہیں۔ اس مجلس کے ترجموں اور تالیف کی تعداد قریب سوا سو کے ہے۔ جو تاریخ، جغرافیہ، اصولِ قانون ریاضیات اور اس کی مختلف شاخوں، کیمسٹری، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، عضویات، معاشیات وغیرہ علوم و فنون، نیز ادبیات پر مشتمل ہیں۔ اس کالج نے صحیح طریقۂ تعلیم کو رواج دینے اور اُردو کو علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی۔ اور اس زمانے کے لحاظ سے اس کا یہ کام نہایت قابلِ قدر ہے۔ اگر ۱۸۵۷ء

کی شورش میں اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا اور یہ کالج اسی اصول پر قائم رہتا، اور زمانے کی ضروریات کے مطابق اس میں اصلاح و ترقی جاری رہتی تو آج ہماری زبان کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۲ء میں سرسید احمد خاں مرحوم نے سائن ٹی فک سوسائٹی کی بنیا ڈالی جس کی غایت یہ تھی کہ علمی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کے لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرائیں۔ دہلی کالج کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے اُردو زبان میں علومِ جدید کو منتقل کرنے اور اسے علمی زبان بنانے کی سعی کی۔ سرسید اسے انگریزی تعلیم پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھتے تھے۔ 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ'، اور 'تہذیب الاخلاق' بھی اس کے بچّے تھے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۲۳

اَدب زندگی کا آئینہ ہے

یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت کے شعراء کو لیجئے شاعری ان کی رگ و پے میں بھری ہوئی تھی۔ معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا۔ اور تحریکِ شعر کے لئے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں، ان کی فتح و شکست، عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر، انتقام مہمان نوازی وغیرہ یہاں تک کہ ایک بچھیرے کی ولادت تک کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے۔ ان کے کلام میں تازگی، آزادی، مردانہ پن اور ذوقِ زندگی پایا جاتا ہے۔ اگر ہم ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو اس زمانے کی معاشرت رسم و رواج اور خیالات و توہمات کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۳۹

خطبۂ صدارت شعبۂ اُردو ہندوستانی اکیڈمی

۱۲ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء

انجمن حمایت اسلام

میں نے لڑکپن میں انجمن حمایت اسلام کا بچپن دیکھا تھا۔ اور اب بڑھاپے میں اس کی جوانی کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں بڑھتا جاتا ہوں، بڈھا ہوتا جاتا ہوں! یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے جوان ہوتی جاتی ہے اور اسے

اہلِ پنجاب! جب تک آپ کی ہمت جوان ہے اس کی جوانی کبھی ڈھلنے نہ پائے گی۔ اس کی ابتدا کا خیال کیجئے ایک نازک پودے سے زیادہ نہ تھی جس کی فنا کے لئے ہوا کا ایک جھونکا کافی تھا۔ مگر آج یہ ہری بھری لہلہاتی کھیتی نظر آتی ہے۔ یہ آپ کے استقلال اور ایثار کی بے نظیر مثال ہے۔ یہ انجمن آپ کی سرزمین پر ابرِ رحمت کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ اس کے اِدارے بڑھتے جاتے ہیں۔ اس کے کارخانے ترقی پر ہیں۔ اس کے مقاصد میں وسعت ہوتی جاتی ہے اور اس کا اثر اور اس کی وقعت مسلّم ہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۴۳
خطبۂ صدارت انجمن حمایت اسلام، لاہور
۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

زبان زندگی کا جزہے

حضرات! زبان صرف اظہارِ خیال کا آلہ نہیں، بلکہ ہماری زندگی کا جز ہے۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے۔ وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن وشائستگی، خیالات وجذبات، تجربات ومشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت ومشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے، ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی وفروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۴۴

ہمارا ادب سرسیّد اور ان کے رفقا کے بعد

سرسیّد احمد خاں کے زمانے میں جو جدید ادب کے بانی نہیں تو فروغ دینے والے ضرور تھے۔ ہمارا ادب عروج پر تھا۔ اس وقت ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا وہ زندگی کے صحیح معنی سمجھتے تھے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم بے خبری اور غفلت کے عالم میں تھے۔ انھوں نے ہمیں جھنجوڑا، چونکایا، خبردار کیا اور راستہ پر لگایا۔ وہ ادبی مجاہد تھے۔ وہ سربکف میدانِ عمل میں

اترے اور زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار ٹکراتے اور مقابلہ کرتے رہے اور اکثر پر غالب آئے۔ انھوں نے اپنے زورِ بیان اور قوتِ تحریر سے ہل چل مچادی اور سب کو ایک مرکز پر لے آئے۔ ان میں خلوص، بے غرضی سے دلوں میں جلا اور اپنے ایثار سے حبِّ قوم پیدا کی۔ اور ایک جماعت ایسی کھڑی کردی جو اپنی قوم کے لئے کام کرنا شرافت اور انسانیت ہی نہیں بلکہ باعثِ نجات سمجھتی تھی۔ کیا اب بھی ہمارے ادب کی یہی حالت ہے؟ یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اس راستہ سے ہٹتے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی کش مکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں۔ اس لئے وہ عالمِ خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں، اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کررہے ہیں۔ شعر و ادب صرف "حظِّ نفس" کے لئے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ تاکہ یہ حظِ نفس کے ساتھ قوتِ روح بھی ہوجائے۔ ہمیں شعر و ادب کی ان تعریفات سے فی الحال قطع نظر کرلینا چاہئے۔ جو فارغ البال اور عیش پرست قوموں نے کی ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں۔ ان سے آلاتِ حرب کا کام لینا چاہئے۔ آلاتِ حرب سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کردیں۔ نہیں، بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیئے۔ ان کے ذریعے سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجئے۔

خطباتِ عبد الحق۔ صفحہ ۷۹

ادیب کے جوہر کش مکش حیات میں کھلتے ہیں

جس دل میں آگ نہیں وہ، دوسروں میں چنگاریاں کیوں کر پیدا کرسکتا ہے۔ جس دل میں لگن نہیں وہ دوسروں کو کیسے ابھار سکتا ہے۔ یہ لگن کہاں سے اور کیوں کر آئے؟ یہ اس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے، لوگوں کی بھیڑ میں گھسیں گے، کھوے سے کھوا چھلے گا۔ ہر طرف سے ٹکریں لگیں گی، مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اس وقت آنکھیں کھلیں گی، زندگی اصلی روپ میں نظر آئے گی، اس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگے گی، اور درد اور خلوص پیدا ہوگا، اس وقت آپ کی صریرِ قلم ہول ناک توپوں کی آواز سے زیادہ کارگر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ بے کاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ معاشیاتی پیچیدگیوں نے ملک کو خستہ کر رکھا ہے۔ جس سے ادیب اور شاعر دونوں چوکڑی بھول گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ زمانہ امتحان کا ہے۔ یہیں ادیب اور شاعر کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی وقت ہے اپنے خداداد جوہر سے کام لینے کا ہے۔ جو ادیب اور صنّاع

الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے اور کارزارِ زندگی میں شریک نہیں ہونا چاہتا اور خلوص کے ساتھ اپنے فطری جوہر کو کام میں لانا نہیں چاہتا۔ وہ مجرم ہے اور اس کی سزا وہی ہے جو ایک غدار کی ہوتی ہے۔ زبان اپنی نوعِ انسان کی عملی اور روحانی زندگی کے لئے نہایت درجہ ضروری ہے۔ اس لئے زبان و ادب کی ترقی (جہاں تک ممکن ہوسکے) اسے قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے میں ہے۔ یہ نکتہ ہمارے ادیبوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۵۰

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم

یہ کچھ انسان کی فطرت سی ہوگئی ہے کہ گزشتہ کو سراہتا اور حال کو سراپتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے کے نوجوانوں میں نہیں تھی۔ اس لئے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں۔ آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہوجاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کرسکتا تھا۔ لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی۔ تو پھر میں نے گزشتہ کی تلافی، نہیں بلکہ کفارے کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہ کرسکا تو لاؤ میں نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جان نثار کوہِ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ اور تازگی اور جدت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ہمارے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہو جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہوجاتی ہے اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اکتا جاتا ہے اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس وقت آثارِ حیات گھٹنے لگتے ہیں۔ قویٰ میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں اُمنگ نہیں رہتی، دل و دماغ کے ابھارنے کے لئے طرح طرح کے محرکات استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخرا اسی عالمِ نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ روما جو کچھ

کرنا تھا کر چکے اور ان کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ لہو و لعب اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے۔ اُلو العزمیاں جاتی رہیں، حوصلے پست ہو گئے، کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیاشی ہے، مزا آنے لگا۔ انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انھیں لے جا کر دفن کر دیا۔

زمانے کا اقتضا

ہمارے اصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلیٰ اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدّت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بندریا کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی۔ اور ان میں ایسے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔ جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ مر جاتا ہے تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینے سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو، گل سڑ کر گرنے لگتا ہے یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کی دست بُرد سے گل سڑ کے گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انھیں کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۶۳، ۶۴
خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ہند
اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

زندہ ادب

ادب وہی کارآمد ہو سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اور جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہو سکتی ہے۔

لیکن ترقی کا رستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر اور استقلال اور بہت پتّا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمینِ آزادی ہی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔

ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہئے کہ جو چاہے لکھے۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ بھونڈے پن کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ ادب قابلِ مبارک باد ہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۶۷

ادب اور زندگی

ماضی اور حال کے آئینہ میں

(الف)

زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے۔ اس لئے گزشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آئندہ کی تیاری میں مدد دے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کارآمد ہو۔ یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے، نئی تحریک سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پُرانا بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی ہے۔ یہ تشبیہہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں درست ہو لیکن، ادب کے معاملے میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے تخریب ضروری ہے مگر لازم نہیں۔ ادب میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔ سوکھی شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑیں کھاد اور پانی ڈال ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں۔ لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسبِ ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے جو کہ ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو۔ اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۶۸

(ب)

ہر پرانی چیز بُری نہیں ہوتی، اور نہ ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔ اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات

کا ہر ذرہ حرکت میں ہے۔ اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے، سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں محض اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں۔ گزشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے۔ ہم گزشتہ کے وارث ہیں۔ اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر ہے، یا کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتا، تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو، نہ کوئی اصلاح کر سکتا ہے، نہ خود فائدہ حاصل کر سکتا ہے، اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۶۹

الفاظ کا صحیح استعمال

یہ کہنا صحیح ہے کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات نہیں سما سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، بہ شرطے کہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ زبان بھی ارثاگلی ہے اور جب تک ہم اس پر قدرت حاصل نہ کریں گے ہم اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہوں گے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید وہ ہمارا نہیں، اصل نہیں نقل ہے، شاید مستعار ہے، کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں، اس نے ہمارے دل میں نقش نہیں کیا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو، یعنی جسے ہم نے خود سوچ کر پیدا کیا ہو یا کسی دوسرے کا، لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہئے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ لیکن جب خیال ہی ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کی صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے۔ لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے، اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہئے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے، جو اس گُر سے واقف نہیں ہے۔ ادر لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔

یہ دو چیزیں ہیں، ایک ادب کا ظاہر یعنی "بیان" اور دوسرے ادب کا باطن یعنی "خیال"۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں کے میل سے اسلوب بیان

یعنی اسٹائل بنتا ہے۔ اس لئے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور ز
کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اور ان کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور القا
انگیز کیوں نہ ہوں پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۷۰، ۷۱
خطبہ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین ہند
اپریل سنہ ۳۶ ۱۹ء

اُردو کی پیدائش اور اُس کا نشوونما

(الف)

ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اُردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہلِ پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اُردو کا بیج ا
خطے میں اُبجا۔ اہلِ دلی کا یہ خیال ہے کہ یہ دلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اُردو کہلائی۔ صو
متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے آس پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی ہے اور اس سے ا
پیدا ہوئی یا بہ قول ایک فریق کے برج بھاشا یا سورسینی بولی سے اس کا ظہور ہوا۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں کہ یہ گجری زبا
تھی۔ ہم نے اسے نکھارا، بنایا اور سنوارا۔ اہلِ دکن کا دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی اور فروغ پایا

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۷۹
خطبۂ صدارت بہار اُردو کانفرنس
سنہ ۳۶ ۱۹ء

(ب)

وہ خود رو نونہال جو دوآبہ گنگ وجمن اور اس کے قرب وجوار میں پھلا پھولا۔ اقتضائے زمانہ کی ہوا اس کے تخ
دُور دُور تک اُڑا لے گئی، ہر سرزمین کی آب وہوا جہاں وہ پہنچے انھیں راس آئی اور ہر خطے کی زمین ان کے موافق
نکلی۔ انھیں بے حقیقت بیجوں سے لہلہاتے ہوئے شاداب پودے نکلے۔ قدرت نے ان بیجوں کی حفاظت کی، کلے
پھوٹنے پر ان کی پرورش کی، اور ہمارے اسلاف نے اپنی آبیاری سے ان کی غور وپرداخت فرمائی۔ وہی بے حقیقت
بیج اور وہی نازک پودے آج سرسبز تناور درخت ہیں۔ جن کے پھول پھل سے ہمیں اس وقت ذوقِ تکلم حاصل ہ

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۸۰
خطبہ صدارت بہار اُردو کانفرنس سنہ ۳۶ ۱۹ء

سادہ نگاری

سادہ لکھنے کی ہدایت کرنا آسان ہے لیکن سادہ لکھنا نہایت دشوار ہے۔ لوگ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بہت غیر معمولی چیز ہے۔ یہ بات علاوہ فطری استعداد کے بڑی مشاقی، بڑے تجربے، بہت مطالعے اور بہت مجاہدے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ صرف کامل ادیب ہی اسے نبھا سکتے ہیں۔ سادہ لکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنی تحریر میں سادہ اور سہل لفظ جمع کر دیں اور کوئی مشکل لفظ نہ آنے دیں۔ سادگی کے ساتھ جب تک تحریر میں لطف حسن اور اثر نہ ہو وہ ادب میں شمار نہیں ہو سکتی۔ ایک پھُس پھُسی، بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ جب تک کلام میں لکھنے والے کی روح نہ شریک ہو کلام مردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت، جدّت، تازگی اور جوش ہے تو وہ آبِ رواں کی طرح موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہوا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ، پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہوا ہو تو بحرِ مردار کے پانی کی طرح ساکن، مُردہ اور بے حِس ہوگا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۸۷

خطبہ صدارت بہار اُردو کانفرنس

سنہ ۱۹۳۶ء

زندگی قانونِ قدرت کی کسوٹی پر

ہر زندہ شئے کے لئے نشو و نما اور تغیر لازم ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے لیکن اکثر اس قانون کے ساتھ انسانی بھی لازم ہے۔ جو چیزیں ہمیں بچپن میں بہت عزیز تھیں، وہ بڑے ہو کر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن میں جو کتابیں ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے، بڑے ہو کر ان میں وہ دلکشی نہیں رہتی۔ یہی حال ادب کا ہے۔ زمانۂ گزشتہ کا ادب اور اس کا اکثر حصّہ ویسا کارگر اور پُر اثر نہیں رہا جیسا اس وقت تھا۔ وہ اس زمانے کے اقتضا کے مطابق تھا اور اب زمانے کا اقتضا کچھ اور ہے۔ جس طرح عمر کے ساتھ انسان کا ذوق بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہئے۔ بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح میں (جہاں تک زبان کی ساخت اجازت دے) لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتی رہنی چاہئے۔

خطباتِ عبدالحق۔ صفحات ۸۸، ۸۹

خطبۂ صدارت بہار اُردو کانفرنس سنہ ۱۹۳۶ء

اُردُو — ہمارے بزرگوں کی مقدس وراثت

حضرات! ہمیں یہ زبان اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہماری بول چال کی زبان ہے۔ ہمیں یہ زبان اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد اور یک جہتی کی عزیز یادگار ہے۔ ہمیں یہ اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے دل و دماغ کے نتائج، ہمارے مادّی اور روحانی خیالات کی حامل ہے۔ ہمیں یہ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت و جانکاہی، دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ ہمیں یہ اس اس لئے عزیز ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کی مقدس وراثت ہے۔ اگر اس پر بھی ہم اس کی قدر نہ کریں اور اس کے بنانے سنوارنے اور بڑھانے میں اپنی پوری ہمت صرف نہ کردیں اور اس کی ترقی ونشوونما میں جان نہ لڑا دیں تو ہم سے بڑھ کر کوئی ناخلف نہ ہوگا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۹۱
خطبۂ صدارت بہار اُردو کانفرنس
سنہ ۱۹۳۶ء

ہندوؤں میں اُردو دشمنی کا آغاز اور اس کے اسباب

۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی۔ انگریزی راج آیا، حالات نے پلٹا کھایا، جدید قانون نافذ ہوئے۔ جو آگے تھے پیچھے، اور جو پیچھے تھے آگے ہو گئے۔ چند ہی سال بعد قومیت کا خیال جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اُڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا۔ ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراعوں، کالجوں کی تعلیم آزادی اور حبِّ وطن کی تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو ور اکسایا۔ خاص کر ہنود اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ اس نئے دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی شاندار قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی دلوں میں نیا جوش پیدا کیا۔ جسے میکس مولر نے ابھارا، اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا۔ لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا۔ گروکل قائم ہوئے، جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازم تھا، ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی۔ ننگے پاؤں پھرنا، ایک بے سلی چادر اوڑھنا، لیٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیر سما سونا وغیرہ وغیرہ قومی شعار قرار پایا۔ اسی قومیت کے جذبے، مقدس قدامت اور ماضی کے غرور، نام نہاد نئی آزادی اور نئی تعلیم نے اس میں نشے کی سی کیفیت پیدا کردی

تھی۔ وہ طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے اور جس طرح ایک بے وقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی، انھوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے نزلہ اُردو زبان پر گرا۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ اسلامی عہد کی پیداوار تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں اس نے جنم لیا۔ لیکن صرف مسلمان اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت اس زمانے کے ماحول اور اس تمدن اور تہذیب کی مخلوق تھی۔ جو مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئی اور جس میں ہندو، مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اور اُردو کے بنانے میں تو (یہ میرا ذاتی خیال ہے) ہندو شریک غالب تھے، اور چونکہ یہ اس ماحول میں پیدا ہوئی جس کی تعمیر ہندو، مسلمان دونوں کے ہاتھوں سے ہوئی، اس لئے اس میں بہ نسبت کسی دوسری ہندی زبان کے عربی فارسی کے الفاظ زیادہ تھے اور وہ بھی سب ملا کر کتنے؟ بہ قول مولانا حالیؔ "جتنا آٹے میں نمک" حیرت ہے کہ آریہ اس ملک میں آئیں اور ہندی کہلائیں، مغل، ترک، عرب یہاں آباد ہوں اور ہندوستانی بن جائیں اور ریلیوں تو ہیں یہاں آئیں اور دیسی ہو جائیں، لیکن بہ قول عورتوں کے "جنم جلے" لفظ ہی ایسے ہیں جو صدہا سال رہنے سہنے کے بعد بھی غیر کے غیر ہی رہے اور اپنے نہ ہونے پائے۔ اب انھیں محض اس شبہے پر کرید کرید کر اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنا نادانی نہیں، دیوانہ پن ہے۔ قومی غرور میں اکثر ایسا ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً جرمنوں نے لفظوں پر مشق کرتے کرتے انسانوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ حال آنکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رس بس گیا، تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا، ہمارا ہو جاتا ہے۔ اسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ دوسری زبان میں رل جانے سے نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور نہ چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت، وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا۔ اور کوئی اسے وہاں گھسنے نہ دے گا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۱۰۱، ۱۰۹

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس علی گڑھ

۲۸ اپریل سنہ ۱۹۳۷ء

ہندو مسلم نفاق کی اصل وجہ

بعض حضرات نے اس نزاع کا الزام سرسیّد احمد خاںؒ کے سر تھوپا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جب سرسیّد نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی تو ہندی، اُردو کا جھگڑا پیدا ہوا۔ یہ بالکل غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ جب یہ

جھگڑا اٹھا ہے تو اس وقت کانگریس کا وجود بھی نہ تھا۔ اس کے متعلق خود سرسید کا بیان موجود ہے۔ ہم اسے کیوں نہ دیکھیں۔ وہ علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھتے ہیں: تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو، مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو، مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے، اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۱۱۲
خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس علی گڑھ
۲۸ اپریل سنہ ۱۹۳۷ء

اس زمانے میں اس نئی تحریک پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں اور دونوں فریق نے تائید و تردید میں خوب خوب دل کا بخار نکالا۔ اس زمانے کا کوئی اخبار یا رسالہ شاید ہی اس بحث سے خالی ہو۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لئے یہ بحث دھیمی پڑ گئی اور لوگ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن سر انٹونی میکڈانل کے عہد جبروت ہند میں اس دبی آگ کو پھونکیں مار مار کر سلگایا گیا، اور ابھی کچھ دنوں دم نہ لینے پائے تھے کہ شُدھی اور سنگھٹن نے وہ شعلے بھڑکائے جس کی آنچ اب تک کم نہیں ہوئی ہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۱۱۵

علی گڑھ اسکول — اور ادب میں ایک نیا رجحان

البتہ اُردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شعرا نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا۔ اور ان کے بجائے عربی، فارسی کے لفظ بھرنے شروع کئے اور یہی نہیں بلکہ بعض عربی، فارسی الفاظ جو بہ تغیرِ ہیئت یا بہ تغیرِ تلفظ اُردو میں داخل ہو گئے تھے۔ انھیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا۔ اور اس کا نام "اصلاحِ زبان" رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے۔ شاعری ضلع جگت ہو گئی تھی۔

سخن وروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس کا کام قافیے کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا۔ ان میں صنائع و بدائع کا رنگ بھر دینا، قافیہ، ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ دینا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ بہ رنگ لفظوں کا ایک ڈھانچہ تھی۔ جس پر طرح طرح کی نقاشی کی ہوئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے۔ غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان، بے لطف اور بے اثر بنا دیا تھا۔

لیکن یہ دورِ تاریکی چند روزہ تھا۔ اس کے رفع کرنے میں سب سے بڑا کام سید احمد خاںؒ نے کیا۔ اُس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ اگرچہ اس کی زبان اور اس کا اندازِ بیان سادہ تھا۔ لیکن اس میں فصاحت، اثر اور قوت تھی۔ اس نے علمی اور سنجیدہ مضامین لکھنے کا نیا ڈول ڈالا، اور موافق و مخالف دونوں نے اس کی پیروی کی۔ اور اس کے رفقا یعنی نذیر احمد، شبلی، حالی اور ذکاء اللہ خاں وغیرہ نے اسے اور چمکایا اور بڑھایا۔ سیّد احمد خاں کا اُردُو پر بڑا احسان ہے۔ اس نے صرف ہمارے ادب ہی کو نہیں بڑھایا اور سنوارا، بلکہ ہر موقع پر جب ضرورت پڑی اس کی حمایت کی۔ اور اس پر آنچ نہ آنے دی، سرسید کی وجہ سے اب اُردُو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جو "علی گڑھ اسکول" کے نام سے موسوم ہے۔

اس نئے اسکول نے پھر عام بول چال کی طرف رجوع کی، اور خاص کر نذیر احمد، حالیؔ، آزادؔ، ذکاء اللہ نے ان الفاظ کو جو گھروں کے کونوں کھدروں، گلیوں، بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے، چن چن کے نکالا، انھیں جھاڑا، پونچھا، صاف کیا، جِلا دی، اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسندِ عزت پر لا بٹھایا۔ اس نئے خون نے جو ہمیشہ ہماری زبان کی رگ و پے میں پہنچتا رہا ہے، ہمارے ادب کی رونق اور تازگی کو دوبالا کر دیا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۱۱۹ تا ۱۲۰

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس علی گڑھ

۲۸ اپریل ۱۹۳۷ء

اُردُو کے بنانے اور سنوارنے میں عورتوں کا حصّہ

اُردو زبان کی ایک اور خصوصیت ہے جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہے۔ لیکن اُردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اُردو نے جس خطے میں جنم لیا یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا۔ وہاں پردے کی

رسم رائج رہی ہے۔ اس وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہوگیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرزِ بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہوگئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امورِ خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں اس میں صرف ہوتا ہے اور اس اقلیم میں ان کی عمل داری کامل ہوتی ہے۔ پھر ان کی زبان اور لہجہ میں قدرتی لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے طرح طرح کے لفظ، محاورے اور مثلیں بنائی ہیں، وہ بڑی لطیف، نازک خوب صورت اور سبک ہیں۔ وہ گیت جو عورتوں نے بنائے ہیں بہت ہی پُر لطف اور دلکش ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ ایسے الفاظ جن کا زبان سے نکالنا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے، یا جن کے کہنے میں شرم و حجاب مانع ہوتا ہے، عورتیں ایسے الفاظ نہیں بولتیں۔ بلکہ وہ اس مفہوم کو لطیف پیرائے میں یا تشبیہ اور استعارے کے رنگ میں بڑی خوبصورتی سے بیان کر جاتی ہیں۔ عربی، فارسی کے ثقیل الفاظ جن کا تلفظ آسانی سے ادا نہیں ہوتا، وہ انھیں بہت سڈول بنا لیتی ہیں۔ بعض اوقات ان کے معنی بدل جاتے ہیں۔ اور وہ خاص اُردو کے لفظ ہو جاتے ہیں۔ ہماری عورتوں کے الفاظ اور محاورے وغیرہ زیادہ تر ہندی ہیں یا عربی، فارسی کے لفظ ہیں، تو انھیں ایسا تراشا ہے کہ ان میں اُردو کی چمک دمک پیدا ہوگئی ہے۔ اب جدید حالات کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ جہاں ہماری اور بہت سی عزیز چیزیں مٹتی جاتی ہیں۔ یہ لطیف زبان بھی مٹتی جاتی ہے۔ ریختی گو شعرا کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں بعض نے کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انھوں نے اس زبان کو محفوظ کر دیا۔ اس زبان کے سیکڑوں، ہزاروں الفاظ اور محاورے اور مثلیں ادبی زبان میں آگئی ہیں۔ اور ہمارے ادب کی زیب و زینت ہیں۔ اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دیگر اصحاب کی بدولت صنفِ نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہوگیا ہے۔ اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حسن ہی نہیں پیدا ہوا، بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

سادہ نگاری

حضرات! آج کل ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی جا رہی ہے کہ "سادہ زبان لکھو، سہل لکھو" گویا سادہ اور سہل لکھنا معمولی بات ہے۔ ایک ادیب کا قول ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے باکمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک ہی چیز مشترک ہے، اور وہ ہے سادگی۔ ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لطفِ

بیان اور اثر بھی ہو۔ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ محض سیدھے سادے لفظ جمع کر دینا اور سپاٹ، بے لطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ ہر شخص کا طرز اور اسلوب بیان جدا ہوتا ہے۔ ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ یوں نہیں، یوں لکھو۔ حکم سے یا فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا۔ زبان میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور برمحل ہوں استعمال کرے۔ جب ہم کسی بچے یا کسی گنوار سے باتیں کرتے ہیں یا بچوں کے لئے کوئی کتاب لکھتے ہیں تو خود بہ خود سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ سادہ یا مشکل، فصیح یا سلیس لکھنا حالات اور ضرورت پر منحصر ہے اور زیادہ تر لکھنے والے پر اس کا انحصار ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کس سے کہنا چاہتا ہے۔ ہماری زبان ہمیں عوام سے، ان پڑھ لوگوں سے، گنواروں سے، سپاہیوں سے پہنچی ہے اور اس لئے اس کا تعلق کبھی عوام سے منقطع نہیں ہونا چاہئے۔ بڑا آدمی وہ ہے جس کی آواز سیکڑوں، ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکتی ہے۔ جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا۔ اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔ سید احمد خاں بڑا شخص ہوا ہے، کیوں کہ اس کی آواز لاکھوں آدمیوں تک پہنچتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی تحریر سادہ، پُر اثر اور پُرخلوص تھی۔ اگر ہم میں اپنے بھائیوں کا درد ہے تو ہماری تقریر اور تحریر ضرور سادہ اور سہل ہوگی۔ لیکن بے چارے ادیب یا مصنف ہی کی گردن دبانا کہ "تو سہل لکھ" ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں دوسرے پہلو کو بھی دیکھنا چاہئے۔ آسان اور مشکل اضافی کلمے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو چیز مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے وہ آپ کے لئے آسان ہو اور جسے میں آسان سمجھتا ہوں۔ وہ آپ کے لئے مشکل ہو۔ انگریزی کی ایک بہت آسان کتاب لیجئے، اور اس کا ترجمہ اُردو میں کر یہ آسان کتاب مشکل ہو جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اصل کتاب جس ملک والوں کے لئے لکھی گئی تھی وہاں تعلیم عام ہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ الفاظ اور محاورے اور اصطلاحیں جو اس کتاب میں آئی ہیں انھیں وہاں بچہ بچہ جانتا ہے۔ اب جو ہم نے اپنی زبان میں ترجمہ کیا، تو پڑھے لکھے بھی اسے نہیں سمجھتے۔ پڑھے لکھے تو رہے ایک طرف، بعض وقت خود مترجم بھی نہیں سمجھتا کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے جہاں سادہ لکھنے کی فرمائش اور چیخ و پکار ہے، وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔ پھر کچھ ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اٹھے گا، اور کچھ ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے۔ اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا۔ اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس علی گڑھ

۲۸ / اپریل ۱۹۳۷ء

مخلوط زبان

اس قسم کی مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک خاص بات عمل میں آتی ہے جو قابلِ غور ہے یعنی ا
میں سے ہر زبان کو اسی خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آسکے، اپنی بعض
خصوصیات کو ترک کرنا پڑتا ہے، اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اخذ
کرنا دونوں کے لئے سہل ہوتا ہے اور اس طرح ان میں ایک توازن سا پیدا ہوجاتا ہے، جو فریقین کے لئے سہولت
باعث ہوتا ہے۔ اُردو یا ہندوستانی کے بننے میں بھی یہی ہوا۔ فریقین یعنی ہندو، مسلمانوں دونوں نے اپنی
زبانوں میں کتر بیونت کی، اپنی مخصوص خصوصیات کو ترک کیا، اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان بنی اسے اختیار
جو ضرورتِ زمانہ کے مطابق اور حالات کے مناسب تھی۔ اور جو اب ہماری ملکی اور قومی زبان ہے اور ہندوستان
مشترک اور عام زبان کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ ہم نے اسے قربانی کر کے حاصل کیا ہے اور کسی کا یہ منہ نہیں ہو سکا
وہ ہم سے اسے چھڑائے۔ صفحہ ۱۳۰

مسلمانوں کی آمد سے پہلے نہ اس ملک کی کوئی عام زبان تھی اور نہ کوئی ایک حکومت

رہی ہندی، سو اس کے مخالف تو ہم ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ وہ ہماری ہی ساختہ پرداختہ ہے۔ ہمیں
اس کو فروغ دیا اور پھیلایا۔ کیوں کہ جب مسلمان یہاں آئے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے، ہر علاقہ کی بولی
الگ تھی۔ نہ ملک کی کوئی عام زبان تھی اور نہ کوئی ایک حکومت تھی۔ اور نہ ذرائع آمد و رفت وسیع تھے۔ اس لئے
کا حلقہ محدود تھا۔ مسلمان فاتحوں کی زبان فارسی تھی۔ جب انھوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں کی ایک
بولی سے جو اَب کھڑی بولی کہلاتی ہے، اور جس کے معنی عوام کی بولی کے ہیں، فارسی کی مڈبھیڑ ہوئی۔ جیسے جیسے ہندو
میں میل جول بڑھتا گیا، ان دونوں زبانوں میں بھی ربط ضبط بڑھنا شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ یہ دونوں ایسی گھل مل گ
کہ فارسی اور کھڑی بولی کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اور جوں جوں اسلامی سلطنت پھیلتی گئی، اس کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا
یہ بولی جیسے کوئی جانتا پہچانتا نہ تھا۔ ہماری بدولت سارے ہندوستان میں پہنچی۔ سلطنت کی فوجیں، صوفی، درا
علما و شعرا، عمّال و حکّام جہاں گئے اسے اپنے ساتھ لے گئے، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے اسے روشناس کرا
ہم اس کی مخالفت کیوں کر کرسکتے ہیں؟ یہ ہماری زبان کی زینت اور رونق بلکہ اس کی جان ہے۔ اگر آج ہم اپنی زبا
اسے خارج کردیں تو ہماری زبان مہمل اور بے معنی ہوجائے گی۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی یا اُردو مخلوط زبان ہے۔ یہاں کی خالص زبان نہیں۔ اوّل تو دنیا کی
زبان خالص نہیں، دوسرے ہماری زبان کا مخلوط ہونا عیب نہیں، بلکہ اس کی خوبی ہے۔ اس سے اس کا یہ دعویٰ اور
قوی ہو جاتا ہے کہ وہی ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ نیز اس اختلاط کی وجہ سے اس میں ایک ایسی وسعت، قوت اور
انی پیدا ہوگئی ہے کہ ادیب کو ہر قسم کے خیالات نئے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے اور صحیح اور موزوں لفظ کے انتخاب
جو سہولت ہے وہ شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ہو۔
مخلوط ہونے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ نئے الفاظ کے بنانے اور ترکیب دینے کے لئے ایک وسیع میدان
آجاتا ہے۔ ایک ایسی زبان کے لئے جو علمی اور ادبی ہونے کی آرزو یا دعویٰ رکھتی ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

صفحہ ۱۳۴

زبان کی اہمیت

اے صاحبو! کسی حکیم کا قول ہے کہ جس چیز کو ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں۔ اسے کبھی نہیں دیکھتے، یہی نہیں بلکہ
کی قدر بھی نہیں کرتے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ ہم صبح سے شام تک اسے بولتے اور اس میں بات چیت کرتے رہتے ہیں
ہم میں سے کتنے ہیں جو کبھی اس پر غور کرتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور اس میں کیسے کیسے گن بھرے ہوئے ہیں۔ حضرات
معمولی چیز نہ سمجھئے۔ یہ ایک زبردست قوت ہے اس کی پشتی پر ایک نہایت مستحکم فصیل اور قلعہ ہے۔ وہ مستحکم
یل اور قلعہ تہذیب و تمدّن ہیں، جن پر ہماری معاشرت اور ہماری سیاست، ہمارے مذہب اور ہماری ترقی کا
ومدار ہے۔ اگر ہم ابتدا سے اب تک زبان کے ارتقا کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انسانی ترقی کا راز بہت کچھ زبان
پنہاں ہے۔ علم بڑی قوت ہے۔ لیکن اس قوت کا سہارا زبان پر ہے۔
یوں تو ہندوستان میں بیسیوں اور سیکڑوں زبانیں ہیں۔ لیکن جو امتیازی خصوصیت اسے حاصل ہے وہ یہاں
ی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ سنسکرت کی طرح باہر سے نہیں آئی۔ یہ بنگالی، مرہٹی، اُڑیہ، ملیالم، تلنگو، تامل کی طرح
خاص فرقے یا کسی خاص علاقے کی زبان نہیں، بلکہ یہ سب کی زبان ہے، اور سارے ملک کی زبان ہے، اور اسی لئے
دعویٰ ہے کہ اگر ہندوستان کی کوئی زبان ملک کی عام مشترکہ زبان ہو سکتی ہے تو یہی زبان ہو سکتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس
کہ یہ نہ باہر سے آئی، نہ پہلے سے موجود تھی نہ کسی نے اسے بنایا، بلکہ انسانی ضروریات اور زمانے کے اقتضا نے اسے بنایا
نون قدرت کی بدولت جو اٹل ہے۔ یہ بڑھی، پھیلی اور پھلی پھولی۔ مسلمان جب اس ملک میں آئے تو یہاں نہ تو ایک
ت تھی اور نہ ایک زبان۔ ہر علاقے کا الگ راج تھا اور ہر علاقے کی الگ زبان، اور چونکہ آمد و رفت کے وسائل
نہ تھے اس لئے نہ ایک حکومت ہونے پائی اور نہ کسی ایک زبان کو ایسا فروغ ہوا کہ وہ سارے ملک کی یا ملک کے

اکثر حصے کی زبان ہو جاتی۔ مسلمانوں کی بدولت رفتہ رفتہ حکومت بھی ایک ہو گئی، اور زبان بھی خود بہ خود ایک بن گئی

صفحہ ۱۴۵، ۱۴۶

خطبہ صدارت اُردو کانفرنس صوبہ متوسط

(۲۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء) (ناگپور)

وِدّیا مندر اسکیم

ودیا مندر اسکیم پر اس قدر بحث ہو چکی ہے اور اس پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اس وقت اس کے متع کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے لیکن باوجود اس کے بہت کم لوگ ہیں جو اس کے حسب و نسب سے واقف ہیں۔ بہ ظاہر آ مسٹر شکلا کو اس کی ایجاد کا فخر حاصل ہے جس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ خشکہ یا گندہ بروزہ، اگرچہ گندہ مگر ا بندہ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ اگرچہ یہ عام طور پر واردھا اسکیم کا بچہ کہلاتا ہے۔ لیکن میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ کہتا ہو کہ یہ نومولود اپنی والدہ ماجدہ سے بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے حقیقی والد سیاسی مذہبی لیڈر اور ہمارے قد دوست پنڈت مدن موہن مالویہ اور مجازی والد ان کے شاگرد رشید آنریبل مسٹر شکلا ہیں۔ یہ اسکیم بہت سوچ بنائی گئی ہے۔ اور اس کا جو منشا ہے وہ ظاہر ہے، یعنی ہماری تعلیم، ہماری تہذیب، ہمارے تمدّن اور خاص کر ہما زبان کا مٹانا۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اقلیتوں کی زبان اور کلچر کے محافظ ہیں۔ یہ اپنے مدرسہ کو وِدّیا مندر کہ اپنی حکومت کو رام راج کا نام دیں، معمولی اور مروّجہ ناموں کو قدیم سنسکرت ناموں سے بدل دیں تو ان کی قوم پر میں کوئی فرق نہ آئے اور اگر ہم کوئی سیدھی سی بات بھی کہیں تو فرقہ پرست اور ملک کے دشمن ٹھہریں۔ گویا اس کے معنی ہوئے کہ اکثریت جو کہے وہ تو قوم پرستی ہے اور اقلیت جو کہے وہ فرقہ پرستی ہے۔ اگر یہی قومیت ہے تو اس قومیت کو ہمارا دور ہی سے سلام ہے۔ یہ حضرات قومیت، جمہوریت، اکثریت اور اقلیت کے لفظوں سے کھیل ہیں۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ کھیل بہت خطرناک ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے رام راج کے بانی گاندھی جی کو میری کھلی چٹھی کی طرف بڑی التجا کے ساتھ تو دلائی اور بہت معقول اور اچھا خط لکھا۔ لیکن وہ اس معاملے کو ایسی خوش اسلوبی سے ٹال گئے کہ مجھے بھی تعریف کر ہی بنی۔ وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے عبدالحق کا خط نہیں پڑھا۔ تم مجھ سے بہت زیادہ توقع رکھتے ہو۔ میں نے مسٹر شکلا لکھا ہے۔ میری بڑی تمنا ہے کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو لوگ مجھے صرف اس بات سے یاد رکھیں نے اپنی ساری عمر اور محنت ہندو، مسلمانوں کے ملانے میں صرف کر دی۔" سبحان اللہ کیا جواب ہے! خیر، اور کوئی رکھے یا نہ رکھے، ہم تو ضرور یاد رکھیں گے مشکل تو یہ آپڑی ہے کہ گاندھی جی نہ لڑنے دیتے ہیں اور نہ ملنے دیتے ہیں۔

صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس صوبہ متوسط

(۲۳ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء) (ناگپور)

جاگ پور

اے حضرات! اگرچہ آپ کے شہر کا نام ناگ پور یعنی ناگوں بھرا ہے۔ لیکن یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس لئے کہ یہیں مجھے وہ بیش بہا سبق ملا ہے، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہیں وہ واقعہ پیش آیا جسے اب ایک گونہ تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور جس نے ہماری تحریک میں قوت پیدا کردی اور ملک کے اُردو داں طبقے کی آنکھیں کھول دیں۔ میں اس واقعہ کا ذکر ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ کرتا ہوں، اور جب تک زندہ ہوں اسے شکرگزاری کے ساتھ یاد کروں گا۔ میں اسے اب ناگ پور نہیں، بلکہ جاگ پور کہتا ہوں، کیونکہ اس نے مجھے اور آپ کو جگا یا۔

میرے ایک دوست نے جو نہایت معقول پسند اور صاحبِ فکر ہیں، مجھ سے ایک روز فرمایا کہ جب گاندھی جی نے اپنا طرزِ عمل بدل دیا ہے، اور اب "ہندی ہندوستانی" یا ہندی چھوڑ کر ہندوستانی کہنے لگے ہیں، جیسا کہ ان کی پشاور والی تقریر اور اس پیغام سے ظاہر ہے جو انھوں نے آل انڈیا اُردو کانفرنس دہلی کو بھیجا تھا۔ تو اب اس پرانے قصّے کو بار بار دُہرانا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

صفحہ ۱۵۴

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس صوبہ متوسط

(۴ر مارچ سنہ ۱۹۴۰ء) (ناگ پور)

اس مبارک شہر میں سنہ ۱۹۳۵ء کے مبارک سال میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا اجلاس ہوا تھا جس کے صدر جناب گاندھی تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ گاندھی جی نے ایک وکیلانہ، منطقیانہ اور جدّت آفریں دماغ پایا ہے۔ انھوں نے اس جلسہ میں ایک لفظ "ہندی ہندوستانی" گھڑا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ تو فرمایا کہ وہ زبان جو کتابوں میں ہے اور بول چال میں نہیں۔ اور جب یہ پوچھا گیا کہ ہندوستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے، تو فرمایا "وہ زبان جو بول چال میں تو ہے مگر کتابوں میں نہیں آتی۔

صفحہ ۱۵۶

اُردو کی پیدائش ـــ ایک عظیم تاریخی واقعہ

حضرات اُردو کی پیدائش اور اس کی تاریخ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت اہم اور ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ وہ بادشاہوں کی فتوحات اور لڑائیوں اور ان کے درباروں اور جشنوں کا حال تو بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے اہم واقعے کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جس نے ذہنی اور ادبی انقلاب پیدا کر دیا' اور جو اصل ہندوستانی تہذیب کی جان ہے۔ یہ اس وقت وجود میں آئی جب کہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ہر رجواڑہ خود مختاری کا دعوے دار تھا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک عجب بے سروسامانی' انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ آپس کی پھوٹ نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے۔ کوئی ایک ملک تھا اور نہ کوئی منظام۔ ایسے وقت میں مسلمان یہاں آئے۔ بے ترتیبی اور بدنظمی کو رفع کیا اور امن قائم کیا۔ نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کئے۔ ایک ملک ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہی تہذیب اصل ہندوستانی تہذیب اور وہی زبان اصل ہندوستانی زبان ہے۔ کیونکہ ان میں ہندو' مسلمان دونوں کا رنگ روپ موجود ہے۔

صفحہ ۱۶

آج کل کچھ ایسی ہوا چلی ہے کہ اُردو کے خلاف نئے نئے اور عجیب عجیب اعتراض گھڑ گھڑ کر بیان کئے جا رہے ہیں۔ اور ان کو بار بار دُہرایا جا رہا ہے۔ اس لئے میں ان پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ گویا بادشاہ ہی تو زبانیں بناتے اور پھیلاتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب تحقیق گاندھی جی نے کی ہے۔ یہ جملہ انھوں نے ناگپور ہی میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں فرمایا تھا۔ اب ان کے پیرو اور وہ اصحاب جن کی آنکھوں میں اُردو کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے' یہ بات لے اُڑے' اور موقع بے موقع کہتے پھرتے ہیں۔ لیکن کسی نے اب تک یہ نہ بتایا کہ کون سے مسلمان بادشاہ تھے' جنھوں نے یہ نیک کام انجام دیا۔ ہندوستان میں جب تک اسلامی حکومت رہی' درباری اور دفتری زبان فارسی ہی' بلکہ ہندو راجاؤں کی دفتری زبان بھی فارسی ہو گئی۔ خود بادشاہ فارسی بولتے اور لکھتے تھے۔ البتہ دلّی میں شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر اُردو کے شاعر تھے۔ یہ دونوں انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ شاہ عالم کی حکومت سے متعلق مثل مشہور ہے: "سلطنت شاہ عالم از دلّی تا پالم" اور ظفر صرف قلعہ معلےٰ کے بادشاہ تھے۔ لکھنؤ کی بادشاہت بہت تھوڑے دن رہی اور وہ بھی محدود رقبے میں۔ اُردو نے اگر ترقی کی اور سرکار دربار میں رسائی پائی تو انگریزی حکومت کی بدولت۔ اور انگریزی حکومت ہی نے فارسی زبان کو نکال کر اُردو کو دفتروں اور عدالتوں کی زبان بنایا۔ اس وقت کسی نے یہ اعتراض نہ کیا۔ صفحہ ۱۷

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس
(۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء) (ناگ پور)

ناقابلِ فراموش یادگار

یہ شکایت مجھے ان تمام مورخوں سے ہے، جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بادشاہوں اور راجاؤں کے شجروں اور نسب ناموں، ان کی لڑائیوں اور فتوحات، ان کے درباروں اور جشنوں، ان کے جلوسوں اور تقریبوں کے حالات بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں، لیکن ذکر نہیں کرتے تو اس چیز کا جو تاریخی اور سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ہندو، مسلمانوں اتحاد، ایک جہتی کی سب سے اہم اور عظیم الشان یادگار رہے۔ یوں تو ہماری بہت سی یادگاریں ہیں۔ لیکن ان میں بعض مٹ گئیں یا مٹنے والی ہیں۔ بعض ایسی ہیں جنہیں لوگ بھول جائیں گے۔ اور کچھ ایسی ہیں جو پرانے آثار کے کھوج لگانے والوں اور قدیم تاریخ کے محققوں تک رہیں گے۔ لیکن اُردو زبان دونوں قوموں کی کثرت اور اتحاد، اور دونوں قوموں کی معاشرت و تہذیب کے میل کی ایسی یادگار ہے، جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔

صفحہ ۵،۶

خطبۂ صدارت شعبۂ صحافت آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس

ترو پتی (جنوبی ہند — ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء)

ہندوستانی زبان اور ہندوستانی کلچر

اس کے لئے ہمیں تھوڑی دیر کے واسطے اپنی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ مستند اور قطعی تاریخی شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ مسلمانوں کی آمد پر ہندوستان کی حالت سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اعتبار سے نہایت ابتر اور درہم برہم تھی۔ طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ آپس میں نفاق اور پھوٹ تھی۔ ہر رجواڑہ خود مختار تھا۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع مفقود تھے۔ نہ کوئی ایک نظام تھا۔ نہ کوئی ایک حکومت تھی، نہ ایک ملک تھا، نہ ایک قوم تھی، نہ ایک زبان تھی۔ مسلمانوں کے تسلّط کے بعد اس وسیع خِطّے کے پریشان اجزاء ایک شیرازے میں مرتب ہو کر ایک ملک کہلائے، ایک نظام قائم ہوا، اور ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی، جو حقیقی ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زبان ہے۔ یہ ایک دن کا کام نہ تھا۔ یہ صدیوں کی مسلسل محنت، سیکڑوں اعلیٰ دماغوں کی کاوش اور باہمی اختلاط، عام رواداری، میل جول اور رفاقت کا نتیجہ تھا۔ اس سے قبل ملک کی کوئی عام اور مشترک زبان نہ تھی۔ ہر علاقے کی بولی الگ اور اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ چونکہ مختلف علاقوں کے تعلقات ناخوشگوار یا منقطع تھے اور آمد و رفت کے وسائل بھی کافی نہ تھے۔ اس لئے کوئی زبان ایسی بننے نہ پائی جو سارے ملک کی عام زبان ہوتی۔ جب اسلامی حکومت کو یہاں استقلال ہوا، اور مسلمان یہاں مستقل

بس گئے۔ اور اس ملک کو اپنا گھر بنا لیا، اور یہاں والوں سے گھل مل کر ایک ہو گئے، تو لامحالہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑا۔ اور آپس کے ربط و ضبط سے خود بخود ایک نئی تہذیب (کلچر) اور ایک نئی زبان بنتے بنتے بن گئی۔

صفحہ ۱۸۰ ، ۱۸۱

خطبۂ صدارت شعبۂ صحافت آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس تروپتی (جنوبی ہند)

ہماری زبان

زبان صرف بول چال ہی کے لئے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دور دور تک ہے۔ اور اس کے شعبے اس قدر وسیع ہیں جس قدر کہ کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جزو ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے۔ اس لئے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہو سکتی ہے جو تہذیب و تمدن کی ممدوح ہو۔ اور ان تمام افعال و اعمال کے انجام دینے میں کارآمد ہو سکے۔ جن کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔ اگر وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی، اور حالاتِ زمانہ کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تو ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اُردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ گزشتہ زمانے میں اس نے کیا کیا۔ اب اس کا کیا رنگ ڈھنگ ہے اور آئندہ اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ اور ہمیں اس کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں، میں اس کے کارنامے کے سمجھنے کے لئے فی الحال ایک اجمالی نظر بھی کافی ہوگی۔

یہ زبان عوام کی تھی، بول چال کی تھی۔ دلی سے چلی اور حکومت کے لشکر، صوبہ داروں، اہلِ عملہ، پیشہ وروں اور تاجروں کے ساتھ وسطِ ہند، راجپوتانہ، گجرات، دکن وغیرہ میں پہنچی۔ اہلِ علم ایک مدت تک اسے عوام کی بولی سمجھ کر حقارت سے دیکھتے رہے اور وہ علم و ادب کی سرحد میں قدم نہ رکھنے پائی۔ آج جو دنیا کی شائستہ ترین اور علمی زبانیں کہلاتی ہیں وہ بھی ایک وقت عوام کی بولیاں تھیں۔ اور ابتدا میں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا۔ غرض عوام کی یہ بولی آپ ہی آپ ملک میں پھیلتی چلی گئی۔ کیونکہ فطری صلاحیت اور زمانے کے حالات اس کی تائید میں تھے۔ سب سے پہلے درویشوں اور صوفیوں نے اس کی قدر پہچانی۔ سچا صوفی جس طرح انسانی نفس کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے واقف ہوتا ہے اسی طرح وہ زمانے کا مزاج شناس بھی ہوتا ہے۔ اس کا واسطہ ہر طبقے اور ہر قوم و ملت کے لوگوں سے ہوتا ہے، لیکن عوام سب سے زیادہ اس کے گرویدہ ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لئے عوام ہی کی بولی کارگر ہو سکتی ہے۔ اس کی شہادت ہمیں آٹھویں صدی ہجری سے مسلسل ملتی ہے۔ ابتدائی صوفیا کے اقوال ہندی یا اسی ملتی جلتی زبان میں ہیں۔ جس کی قسمت میں سارے ہندوستان

کی زبان ہوتا تھا-ان کے ملفوظات میں جابجا ملتے ہیں جو ان کے مریدوں نے بڑی احتیاط سے محفوظ کیے ہیں - مثلاً بابا فرید شکر گنج، حضرت بندہ نواز گیسو دراز، امیر خسرو، قطب عالم، شاہ عالم سید محمود جون پوری، شیخ بہاء الدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ محمد غوث گوالیاری وغیرہ انھیں بزرگوں میں سے ہیں- لیکن ان کے علاوہ ایسے صوفیا بھی گزرے ہیں جن کی مستقل تصنیفات پائی جاتی ہیں - جیسے شمس العشاق میراں جی، شاہ برہان الدین جانم سید میراں حسینی وغیرہ - یہ آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک کے بزرگ ہیں -

صفحات ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶

دلّی کی زبان گجرات اور دکن میں

یہ زبان جسے ہم دلّی کی زبان کہتے ہیں، صوفیوں اور درویشوں اور محمد تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن میں آئی- محمد تغلق نے جب دولت آباد کو ہندوستان کا دارالحکومت بنایا تو سارے دلّی کو وہاں لا بسایا- اور ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگ وہاں آباد ہوگئے- اور ان کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں پہنچی اور ایسی پہنچی کہ کچھ دنوں کے بعد ادب و انشا کی مالک بن گئی اور شمال پر جو اس کا مولد و منشا تھا فوقیت لے گئی- لیکن محمد تغلق کے بعد جنوب کا تعلق شمال سے منقطع ہوگیا اور یہاں خود مختار حکومت قائم ہوگئی- اس کا اثر زبان پر یہ پڑا کہ اس میں کچھ زیادہ تغیر و تبدل نہ ہونے پایا- اتنا تغیر تو ضرور ہوا جو کسی زبان کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے سے ہوتا ہے- مثلاً تلفظ کی وجہ سے الفاظ کی ہیئت بدل گئی- رسم خط میں ذرا ظاہر فرق آگیا- بعض مقامی الفاظ داخل ہوگئے یا شعرا نے اظہار خیال کی ضرورت سے کچھ فارسی، عربی یا مقامی لفظوں سے کام لیا- باقی اس کا رنگ ڈھنگ اور اسلوب وہی رہا جو اصل دہلوی زبان کا تھا-

صفحہ ۱۹۳

قدیم اور جدید ادب

نئے ادب والے اپنے خیالات کی اشاعت افسانوں کے پیرائے میں کر رہے ہیں- اگرچہ ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں- جس کلام میں تازگی، جدّت اور خیالات کی گہرائی ہے وہ ہمیشہ نیا ہے گو وہ دو ہزار سال پہلے کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو- اور جس میں یہ نہیں وہ پرانا ہے گو وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو- صفحہ ۲۰۲

خطبۂ صدارت شعبۂ صحافت آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس ترپتی (جنوبی ہند)
۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

زبان بنتی ہے، بنائی نہیں جاتی

بعض نیک دِل انسانوں نے دنیا میں زبان کی کثرت اور خلفشار کو دیکھ کر از راہِ ہمدردی اپنے زمانے میں ایک عالمگیر زبان یعنی جگت بھاشا بنانے کی کوشش کی۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ زبانوں کے اس ہجوم میں ایک زبان ایسی ہو جو ان بے ضابطگیوں سے پاک ہو، جو مروجہ زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ تاکہ لوگ اسے آسانی سے سیکھ لیں اور وہ دنیا بھر میں رائج ہو سکے۔ لیکن اس قسم کی زبانیں جو منطقی اصولوں اور خاص منصوبوں کے تحت بنائی جاتی ہیں رواج نہیں پا سکتیں اس لئے اس زمانے میں بھی جو لوگ مصنوعی زبان بنا کر ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ کسی اِرادے سے ہو۔ ان کی قسمت میں بھی ناکامی لکھی ہے۔

صفحہ ۲۲۲

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس گوالیار

(۲۷ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء)

اُردو ملکی زبان کی حیثیت سے

ہم جو اُردو کو ملکی زبان کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ اُسے اب تک یہ حیثیت حاصل ہے۔ مگر سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جبکہ اختلافات کی روز بروز قوت پکڑ رہی ہے۔ جذبات، عقل و شعور پر غالب آگئے ہیں اور نفاق نے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ ہم ان جذبات کو دھیما کرنے اور اختلافات کے فصل کو کم کرنے کے لئے اسے پیش کرتے ہیں کہ یہ اتفاق و اتحاد کی گود میں پلی ہے۔ اس نے خیالات و معاشرے اور تہذیب میں یک جہتی پیدا کی ہے اور اب بھی اس مہم کے انجام دینے کے لئے آمادہ ہے۔ یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب تک زبان کا مسئلہ طے نہ ہوگا، سب منصوبے خواہ کیسے ہی برتر اور اعلیٰ ہوں۔ ناکام رہیں گے۔ اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ دن آئے کہ اہلِ ملک کی کوششیں رائیگاں جائیں۔ کامیابی کے لئے پہلی شرط اتحاد ہے اور انسانی اتحاد کے لئے اس زبان کا ہونا لازم ہے جس میں سب کا حصّہ ہے اور وہ زبان اس ملک کے لئے سوائے اُردو کے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اتحاد سے بنی اور اتحاد ہی کے لئے بنائی گئی۔ اور اب بھی اس اہم فرض کو ادا کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ اس کے خمیر میں ہے۔

صفحہ ۲۲۳

زبان کی اہمیت

اس کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبان خواہ کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو، بولنے والوں کی زندگی سے اندر اور باہر ایسی پٹی ہوتی ہے کہ وہ اس کا جزو لاینفک ہو جاتی ہے۔ زبان کی مخالفت بولنے والوں کی مخالفت ہے کیوں کہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں یعنی سیاست، معاشرت، تہذیب و تمدن کا سرمایہ اسی میں محفوظ ہے۔ زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے۔ زبان کے لئے دنیا میں بڑے بڑے فساد اور جنگیں ہوئی ہیں۔ میدانِ جنگ میں اور اس سے باہر بھی۔

صفحہ ۲۲۶

سیاسی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں، لیکن لسانی جھگڑے ناقابلِ حل ہیں

وہ سیاسی جھگڑے جن کی لپیٹ میں ہماری زبان بھی آگئی ہے، ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ کبھی ہوگا ہی نہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب غم وغصہ کی آندھی جو آج کل چڑھی ہوئی ہے۔ تھم جائے گی۔ لوگوں کے ہوش وحواس ٹھکانے لگ جائیں گے تو وہ اپنی غلطیوں اور کج فہمیوں پر پچھتا کر سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور ساری گتھیوں کو آناً فاناً میں سلجھا لیں گے۔ لیکن اگر ہم نے زبان کے معاملے میں پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور اپنی موجودہ روش کو نہ بدلا تو سارے فیصلے اور سمجھوتے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ کچھ بنائے نہ بن پڑے گی۔ اس لئے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم زبان کو سیاسی، مذہبی جھگڑوں سے پاک صاف رکھیں ورنہ بیچ میں ایک ایسی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی کہ معاملہ سنبھالے نہ سنبھلے گا۔ اور ساری کوششیں بیکار ہو جائیں گی۔

صفحہ ۲۳۳

سیاسی لوگوں کی زبان

ہمارے سیاسی بزرگ سب کچھ کہتے ہیں۔ کہیں ان کی باتوں میں لفظ زیادہ معنی کم ہوتے ہیں۔ صاف بات کبھی نہیں کہتے۔ آدھی بات ان کے دل ہی میں ہوتی ہے اور آدھی ان کی زبان پر۔ اکثر ایسی زبان میں تحریر و تقریر فرماتے ہیں کہ وقت پر اپنے مطلب کے موافق معنی پیدا کر سکیں۔

صفحہ ۲۳۴

ہمارے مورخوں کی ایک بڑی فروگزاشت

ہماری تاریخیں راجاؤں اور بادشاہوں کے جاہ وجلال، درباروں کی شان وشوکت، لشکرکشی اور جنگ وجدل سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان تاریخوں میں نہیں ملتیں تو وہ چیزیں جو زندگی کی جان ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں ہم نے ایرانی ہندی تہذیبوں کو سموکر ایک ایسے عجیب وخوشنما تمدن کی بنیاد ڈالی جس کا اثر ہمارے رہنے سہنے، کھانے پینے، لباس، صفائی، بول چال غرض زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے۔ اور اس تمدن کی سب سے عظیم الشان، باوقعت یادگار ہماری وہ زبان ہے جو اُردو کے نام سے ہندوستان بھر میں پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۲۳۵

اُردو کی مخالفت اور گاندھی جی

اوّل اوّل یہ مخالفت یوپی اور بہار تک محدود رہی، کیونکہ ہندی بولیاں صرف یہیں بولی جاتی تھیں۔ دوسرے علاقوں اور صوبوں میں نہ کہیں بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ مخالفت کچھ زیادہ کارگر نہ ہوئی۔ یوں سمجھئے کہ جیسے کسی تالاب پر ہوا چلتی ہے تو کچھ لہریں اور بلبلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تلاطم بھی آیا، پر وہ بھی کچھ دیر کے بعد ہوا ہو گیا۔ لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا کہ اس میدانِ کارزار میں ایک مقدس ہستی نمودار ہوئی جس نے صورتِ حال کی کایا پلٹ دی۔

ملک پر اس بزرگوار کے بہت احسان ہیں۔ اس نے سیاسیات، معاشرت، اقتصادیات میں بڑا انقلاب کر دیا۔ قدرت نے اسے خاص قسم کا دماغ عطا کیا ہے۔ اس کا ذہن رسا، اس کی نظر دوربین اور اس کا ارادہ اٹل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فکر کا راستہ گو بظاہر صاف اور سیدھا ہے، لیکن بہ باطن پیچ در پیچ ہے۔ وہ اتفاق آباد جانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے نفاق نگر پر جا نکلتا ہے۔ وہ وصل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے فصل کے دروازے سے۔ وہ ایکے کا آرزومند ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچتا ہے پھوٹ کے توسل سے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ دلوں کا جاننے والا خدا ہے۔ لیکن جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھائے اور یہ امید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہے، اور آفتابِ اتحاد اَمن سے طلوع ہونے والا ہے۔ تو عین پہ اس مقدس ہستی نے سر ہلا کر برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔ پھر بہتیرا سر مارا، ہزار جتن کئے مگر نہ ماننا تھا نہ مانا۔ ہمارے

ملک میں تین ہٹیں مشہور ہیں۔ راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ۔ لیکن حضرات ایک چوتھی ہٹ اور بھی ہے۔ اور وہ ہے لیڈر ہٹ۔ وہ لیڈر ہی کیا جو دوسرے کی مان جائے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ دوسرا رخ نہ دیکھتا ہے، اور نہ اس کی اسے پرواہ ہے۔ اگر کوئی شخص کانا ہو اور وہ ایک آنکھ سے دیکھے، وہ قابل الزام نہیں، لیکن جس کی اچھی خاصی دو آنکھیں ہوں اور وہ ایک آنکھ سے دیکھے تو وہ بلاشبہ قابلِ الزام ہے۔

اس طرزِ عمل سے ملک کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اور باتوں سے خیر مجھے کوئی غرض نہیں، وہ بڑی طولانی داستان ہے۔ لیکن ہماری زبان پر جو کاری ضرب اس نے لگائی ہے، اس کا زخم ایسا گہرا ہے کہ اس کا بھرنا اب خود اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ آج تک کسی نے ہماری زبان پر ایسا بے جا، غلط اور دلِ آزار حملہ نہیں کیا تھا۔ جیسا اس مقدس بزرگ نے کیا۔ اس کی دوربین نظر نے بہت پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حکومت رہنے والی نہیں ہے، اور رہی تو اس کی یہ صورت نہیں ہوگی۔ وہ رام راج کے بیٹھے سپنے دیکھ رہا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ رام راج کی زبان ہندی ہی ہو سکتی ہے۔ اُردو نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نے ہندی کی اشاعت کو نصب العین بنایا۔ اس مسئلہ میں اس کا ہاتھ ڈالنا تھا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ہلچل مچ گئی۔ اور ایک نئے فساد کی بنیاد قائم ہوگئی۔ جو دن بہ دن بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ سیاسی مسائل جن کو آج کل اس قدر اہمیت دی جاتی ہے، اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ سیاسیات سے ہر ایک کو دلچسپی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہر شخص سیاسی مسائل سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن زبان کی بات اور ہے۔ اس کا تعلق چھوٹے، بڑے، امیر غریب، عالم، عامی سب میں ان سے جدا نہیں ہو سکتا۔ زبان پر جو چوٹ پڑتی ہے، وہ زبان پر نہیں پڑتی، دِلوں پر پڑتی ہے، اور چوٹ کھائے ہوئے دِلوں سے ڈرنا چاہئے۔

حذر کرو مرے دِل سے کہ اس میں آگ بھری ہے۔ سیاسی مسائل خواہ کتنے ہی اہم اور کیسے ہی ضروری کیوں نہ ہوں۔ کبھی خاطر خواہ حل نہ ہوں گے، جب تک زبان کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ فساد وہاں سے پھوٹا، جہاں ملک بھر کے مسائل طے ہوتے ہیں، اور یہ زہر اس زبان سے نکلا جو سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ دِل لبھانے والی ہے۔

آج کل ہندوستان کی تقسیم کے متعلق اخباروں میں بڑی گرم اور تند و تلخ بحثیں ہو رہی ہیں۔ میں نے کبھی سیاست میں دخل نہیں دیا۔ اور نہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اس لئے مجھے اس کے عیب و صواب پر بحث کرنے کا کوئی حق

وہ انھیں اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں تو وہ ایک عجیب وغریب زبان بن جاتی ہے جسے اُردو داں مشکل سے سمجھ سکتاہے ۔ اور بعض اوقات تو خود مترجم یا مولف بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے ۔ علمی ترجموں کی تو بُری طرح مٹی پلید ہوتی ہے ۔ ایک طرف تو وہ انگریزی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دوسری طرف وہ یہ نہیں جانتے کہ اُردو میں خیال کس ڈھنگ سے ادا کیا جائے کہ وہ ہماری زبان کے روزمرّہ اور محاورے کے مطابق ہو اور زبان کی فطری ساخت کے مخالف نہ پڑے ۔ انگریزی زبان کا علم ناقص، اپنی زبان پر عبور نہیں ۔ اب جو کچھ تحریر میں آئے گا وہ کیا ہوگا ؟

صفحہ ۔۔ ۲۶

اُردو کی مقبولیت

ایک بڑی بات اُردو کے حق میں یہ ہے کہ جہاں گئی مقبول ہوئی ۔ اس کی مقبولیت فارسی اور انگریزی کی سی مقبولیت نہیں ۔ فارسی حکومت کی زبان تھی ۔ اس کی بدولت دربارِ سرکار میں رسائی ہوتی اور چھوٹے بڑے عہدے اور منصب ملتے ۔ یہی حال اب انگریزی کا ہے ۔ اس کی پشت پر حکومت ہے، دولت ہے اور دنیاوی فائدے ہیں ۔ یہ دونوں باہر سے آئیں اور اہلِ ملک نے ان کی تحصیل حکومت تک پہنچنے اور دفتری خدمات حاصل کرنے کے لئے کی ۔ قطع نظر ان مادی فوائد کے ان میں علمی اور تہذیبی پہلو بھی تھا ۔ برخلاف اس کے اُردو ابتداء میں ان سب فضیلتوں سے محروم تھی ۔ یہ حکومت کی سرپرستی کی کنوڑی تھی نہ حصولِ دولت و جاہ کا ذریعہ اور نہ اسے علمی، ادبی یا تہذیبی شان کا شرف حاصل تھا ۔ لیکن باوجود اس کے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ملک کے دور و دراز گوشوں میں جا پہنچی ۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں پہنچی قبولِ عام سے سرخ رُو ہوئی ۔ مقبولیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر صوبے اس کے جنم بھومی کے دعوے دار ہیں ۔ اہلِ پنجاب کا دعویٰ ہے کہ اس کی آنول نال یہیں گڑی ہے ۔ غزنوی حکومت پنجاب میں آئی تو اس وقت اس نے وہاں جنم لیا ۔ دہلی اور یوپی والے کہتے ہیں کہ دلّی میں اسلامی حکومت کو استقلال حاصل ہوا تو دِلّی، میرٹھ کی آس پاس کی بولی پر فارسی کی قلم لگی اور ایک نئی بولی وجود میں آئی ۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں کہ یہ بیج یہیں اُپجا ۔ یہیں اس میں کلّے پھوٹے ۔ اور یہ سوغات یہاں سے ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچی ۔ اہلِ دکن کا دعویٰ ہے کہ دکن میں اوّل اوّل اس نے ادبی حیثیت حاصل کی اور یہاں سے شمالی ہند پہنچی ۔ بعض دوسرے صوبوں کو بھی اس قسم کا دعویٰ ہے ۔ ان سب کے دعوے حق بہ جانب ہیں ۔ کیونکہ یہ کسی ایک کی زبان نہیں ۔ سب کی ہے اور پھر آپ کی کیوں نہ ہو ۔

صفحات ۔۔ ۳۱۲، ۔۔ ۳۱۳

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس کالی کٹ (ملیبار)

(۷ر نومبر سنہ ۴۳ ۱۹ع)

اُردو یونی ورسٹی کے قیام کا مقصد

صرف ذریعۂ تعلیم کا بدلنا کافی نہیں۔ یہ مکھی پہ مکھی مارنا ہے۔ نقل اور اصل میں بہت فرق ہے۔ اس عیب کو دور
رنے کے لئے ہمیں طریقۂ تعلیم اور نصاب میں تبدیلی کرنی ہوگی۔ تمام مضامین حتیٰ کہ انگریزی زبان کی تعلیم بھی اُردو ہی
کے ذریعہ دینی ہوگی۔ .... طالب علم کو پوری آزادی ہوگی کہ وہ اپنے ذوق کی تکمیل بہ درجۂ
کمال کر سکے۔ جدید خیالات اور علوم کو جذب کرنے کی اس ڈھنگ سے کوشش کی جائے گی کہ وہ اپنے ہو جائیں، غیر کے نہ
رہیں۔ اصل مدعا جو طالب علموں اور اساتذہ کے پیش نظر ہوگا وہ یہ کہ وہ اپنی تہذیب و تمدّن، اپنے علم و ادب، اپنے
فنون لطیفہ، اور السنہ اور اپنی تاریخ کا نہایت عالمانہ اور محققانہ مطالعہ کریں۔ اور اپنی تحقیق کے نتائج سے اہلِ ملک کو
بہرہ ور کریں۔ یہ تمام افکار و خیالات ہماری تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوں گے۔ طلبہ کی رہنمائی اور مدد کے لئے سچے
عالم اور محقق، اعلیٰ درجے کا کتب خانہ اور شعبۂ تصنیف و تالیف مہیا کرنا ہوگا۔ اس شعبہ سے قدیم و جدید علوم و ادب پر
عالمانہ اور تحقیقی کتابیں شائع ہوں گی۔ یہ شعبہ جس طرح ارکانِ یونی ورسٹی اور طلبہ کے لئے ہوگا۔ اسی طرح ان اہلِ علم کا
بھی خادم ہوگا جو اپنی ایسی علمی تحقیقات شائع کرانا چاہتے ہیں جو ہمارے اصول اور مقصد کے مطابق ہیں۔ ان کے لئے
یونی ورسٹی میں تحقیق علم کی آسانیاں مہیا کی جائیں گی۔ ہمارا مقصد صرف امتحان پاس کرانا نہ ہوگا۔ اور نہ ہمیں یہ ہوس
ہوگی کہ اس یونی ورسٹی میں سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ شریک ہوں۔ اور نہ ہماری یہ خواہش ہے کہ اس میں ہر قسم
کے علوم و فنون کی تعلیم ہو۔ ہماری رائے میں ہر یونی ورسٹی کو اپنے لئے کوئی خاص مضمون یا مضامین مختص کر لینے چاہئیں
س سے ایک تو مصارف کم ہوں گے، دوسرے مخصوص مضامین کی تعلیم و تکمیل کے لئے اعلیٰ پیمانے پر سامان ہو سکے
گا۔ اور پروفیسر بھی اپنے فن کے ماہر بن سکیں گے۔ اور وہاں سے جو طالب علم نکلیں گے، وہ حقیقی معنوں میں طالب علم ہوں
گے۔ ہر یونی ورسٹی میں ایک سے سب مضامین پڑھانا اسراف ہی نہیں فعلِ عبث ہے۔ اُردو یونی ورسٹی کا مقصد
اُردو زبان کو ادبی اور علمی امتیاز سے کامل اور اعلا پائے کی بنانا ہے۔ اس کی بنیاد ہماری تہذیب پر ہوگی، باقی شعبے اس
محور کے گرد گھومیں گے۔ علمی و ادبی تحقیق کے ڈھنگ ہم بہت کچھ یورپ سے حاصل کریں۔ مگر اس کی روح اپنی ہو مختصر
یہ کہ ہمیں اپنی زبان اور تہذیب کو جو نڈھال پڑی ہے بحال بنانا ہے۔

صفحات ۳۲۶ ، ۳۲۷ تا ۳۲۸

اُردو

یہ (اُردو) عوام کی گودوں میں پلی۔ اور عوام سے خواص میں گئی۔ بازاروں اور گلی کوچوں سے محلوں میں پہنچی۔

فقیروں کے تکیوں اور غریبوں کے جھونپڑوں سے نکل کر انگریزی عہد میں درباروں، عدالتوں اور دفتروں میں رسائی حاصل کی۔ وہ بولی، جسے اہلِ علم حقارت سے دیکھتے تھے اور جس میں لکھنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے، آج مسندِ ادب و انشاء پر جلوہ فرما ہیں۔ وہ سنسکرت، عربی، فارسی اور جدید ہندی کی طرح اوپر سے ہمارے سر پر نہیں تھوپی گئی، بلکہ نیچے سے اوپر آئی۔ اور اب اس لئے اسے عوام اور خواص سے یکساں تعلق ہے۔

ہم کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں۔ ہر زبان کو دنیا میں پڑھنے اور ترقی کرنے کا حق ہے، اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی زبان کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کا قائل ہوں کہ ملک میں کسی ایک زبان کا مشترک ہونا لازم ہے۔ ہندوستان ایک رہے یا دو، تین حصوں میں تقسیم ہو، مشترک زبان کی ضرورت ہر حال میں باقی رہے گی۔ تاکہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے، بات چیت کرنے، کاروبار کرنے، اور ایک دوسرے کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ اگر یہ نہ ہوا تو ذرا ذرا سی بات کے لئے ترجمان کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ ہم اپنے ہاتھوں آپ اور آفت مول لیں گے۔ ایسی زبان اگر ہوسکتی ہے تو وہ اردو ہے جو ہماری مشترکہ وراثت ہے اور جس کے بنانے اور ترقی دینے میں ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ، آریہ سماج، عیسائی، اینگلو انڈین اور یورپین سب شریک ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ سکھوں اور آریہ سماجوں کا مذہبی لٹریچر اردو ہی کے ذریعے ملک میں پھیلا۔ یہاں تک کہ ان مذاہب نے اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ اردو کے ذریعہ سے کی، ہمارا دعویٰ بے دلیل نہیں۔ اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو ہی اس ملک کی عام اور مشترکہ زبان ہوسکتی ہے۔ تو ہم حق بجانب ہیں :۔

جب پہلے پہل میں بمبئی آیا (جسے پچاس برس سے زیادہ ہوتے ہیں) اور یہاں کے گلی کوچوں، بازاروں اور تھیٹروں میں پھرا، تو میں نے دیکھا کہ اس غدار شہر میں ہر قوم، ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر خیال اور ہر زبان کے لوگ موجود ہیں، اور بے تکلف ایک دوسرے کی بات چیت سمجھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے وہ سماں پھر گیا جب دلی میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد مختلف خیال و مذہب و مختلف زبان و تہذیب کے لوگ ایک جا جمع ہوئے ہوں گے۔ کاروبار کی ضرورت، میل جول کی فطری خواہش، بات چیت کے شوق نے ابھارا ہوگا۔ اور ایک دوسرے کی زبان کے لفظ سیکھے ہوں گے۔ اور ان کو ملا جلا کر ایک نئی بولی کا ڈول ڈالا ہوگا۔

خطباتِ عبدالحق۔ صفحات ۳۳۱، ۳۳۲
خطبۂ صدارت اردو کانفرنس بمبئی
سنہ ۱۹۴۵ء

پنجاب کی تاریخی و تہذیبی عظمت

قدرت نے برِ اعظم پاک و ہند کا سر ملک پنجاب کو بنایا ہے۔ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کے آثار اسی زمین کی تہوں میں مدفون ہیں۔ قدامت کے غبار میں انسانوں کے غول کے غول کابل و قندھار سے آتے اور ہند کی ماقبل تاریخ تمدن کی بستیاں یہیں بساتے ہیں۔ یہ آریہ نسل کے لوگ تھے جن کی تہذیب اور مذہب و معاشرت کی تشکیل پنجاب میں ہوئی۔ رگ وید کے توحیدی نغمے اصل الفاظ اور خاص لہجے میں یہیں گائے گئے۔ قدیم ترین دینی روایات سے ان کی خو خصلت کا جو نقشہ تصور میں کھنچتا ہے وہ سرحدی افاغنہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور بہ قول ایک مورخ کے یہ ہندی آریہ پنجاب میں ہندو نہیں بنے تھے۔ بلکہ یہ تغیر مدت بعد برہمی دور اور برہم ورت یعنی ستلج پار وادیٔ جمنا کے علاقے میں واقع ہوا۔

قومی تہذیب کی عمارت زبان کی بنیادوں پر چنی جاتی ہے۔ نو آباد آریوں کی بولی کو یہ مرتبہ پنجاب ہی میں حاصل ہوا۔ پانینی نے سنسکرت کی سب سے پہلی صرف و نحو یہیں مرتب کی۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۳۳۴، ۳۳۵

خطبۂ صدارت پنجاب یونی ورسٹی اُردو کانفرنس لاہور

۲۶، ۲۷ مارچ سنہ ۴۸ ۱۹ء

مملکتِ پاک

یہ سرزمین قدیم سے معرکہ خیز اور انقلاب انگیز رہی ہے۔ وہ انقلاب بادشاہوں اور کشور کشاؤں کے انقلاب تھے۔ یہ تازہ انقلاب جس سے آپ کو آزاد مملکت حاصل ہوئی ہے قومی انقلاب ہے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ قوم نے اپنے عزم و استقلال اور ایثار کے بل پر غیروں کے پنجے سے خلاصی حاصل کر کے نئی زندگی اور آزادی حاصل کی ہے۔ اور قومی حکومت کی بنیاد ڈالی ہے۔ اب زندگی اپنی زندگی ہوگی۔ اور حکومت اپنی حکومت۔ اب تک ہماری زندگی اپنی نہیں تھی۔ محض نقالی تھی۔ دوسروں کے رحم و کرم پر تھے۔ اپنے ہونے کا اطلاق اس پر اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ ہماری اپنی تہذیب اور روایات میں رنگی ہوئی نہ ہو۔ ہمیں یہ تہذیب اور روایات اس لئے عزیز ہیں کہ ان میں قومیت کی بو باس ہے۔ ہمیں ان کی قدر اس لئے بھی ہے کہ ان میں قومی ترقی کی بڑی گنجائش ہے۔ اور زندگی کی تکمیل کے لئے بہت بڑی وسعت ہے۔ اگر ہماری زندگی

اس رنگ سے محروم ہے تو وہ مستعار، مصنوعی، بے رنگ اور بے معنی ہے۔

قومیت کے لئے یک رنگی، ایک رنگی کے لئے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لئے ہم لسانی کی ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں، وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں، وہاں دِل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے۔ اُردو نے بہ درجۂ کمال یہی خدمت انجام دی ہے۔ اور اس کی بڑی کرامات ہے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۳۳۶، ۳۳۷

قومی زبان

مقامی یا مادری زبان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے۔ اور ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بھی زبان ہے۔ جس کا درجہ مادری یا مقامی زبان سے بڑھ کر ہے۔ اور وہ قومی زبان ہے۔ مقامی بولی ایک خاص رقبے میں محدود ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا اثر بھی محدود ہوتا ہے۔ قومی زبان کی حدود زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا ہے۔ مقامی بولی صرف ایک مقام کی ہے، قومی زبان ساری قوم کی ہے۔ قومی زبان کے ذریعہ قوم کا ہر فرد اپنی آواز ساری قوم تک پہنچا سکتا ہے۔ مقامی بولی میں یہ قوت اور دم کہاں قومی زبان پوری قوم کے خصائص اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مقامی بولی صرف ایک جز کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور بس۔ قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور قومیت کے ولولے کو زندہ اور تازہ رکھتی ہے اگر اس مسئلے کو گہری نظر سے دیکھا جائے، اور اس کی تہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت اور زبان ایک ہیں۔ جدا جدا نہیں۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۳۴۲

جہالت کا تیر بہدف نسخہ

کسی قوم کو اگر علم سے محروم رکھنا مقصود ہو تو سہل طریقہ یہ ہے کہ اسے غیر زبان کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ ہمارے ملک میں بھی یہی ہوا۔ غیر زبان میں تعلیم دینے سے یہی نہیں ہوتا کہ ذہنی ترقی رک جاتی، جدت مفقود، قوتِ مشاہدہ کند ہو جاتی اور ذوقِ تحقیق پیدا نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ اس کا اخلاق پر بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

اس تعلیم کا بڑا وصف نقالی ہے۔ جو بدترین بد اخلاقی ہے۔ آدمی انسان سے کھلونا بن جاتا ہے۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن، ذہنی اور روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ قوم کی ذہنیت اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ انتہائی تعلیم تک ہر مضمون انگریزی زبان اور انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعے پڑھنے سے اس قوم کی روایات و اخلاق، تہذیب و تمدن اس کی زبان کی تلمیحات و تشبیہات استعارات اور محاورات جن میں عیسائی مذہب اور تہذیب کا بڑا جزو ہے، ہمارے طلبہ کے دماغ میں رچ جاتے ہیں اور وہ غیر محسوس طور پر اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور ان کا طرزِ فکر اور خیالات کی روش، ان کے تخیلات اور ذوق اسی رنگ ڈھنگ کے ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں ہمارے اخلاق اور ہماری تہذیب، ہمارا تمدن اور ہماری روایات حقیر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اس نقلی تعلیم نے زیادہ تر نیم مُلاّ، خام فکر، ہمہ دان و ہیچ مدان سطحی معلومات کے لوگ پیدا کئے۔ اب اگرچہ بہ ظاہر اس میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن باطنی اثرات اب تک قائم ہیں۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۳۵۶، ۳۵۷

ایک قابلِ رحم پناہ گزیں

آپ کے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں پناہ گزیں آئے ہیں۔ اس میں ہر طبقے، ہر حیثیت اور ہر سن و سال کے اشخاص ہیں۔ آپ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کے آنسو پونچھے، ان سے ہمدردی کی، ان کی دل جوئی کی اور بے گھروں کو گھر اور بھوکوں کو کھانا دیا۔ ان مصیبت کے ماروں کے ساتھ ایک اور پناہ گزیں بھی آیا ہے۔ جو بہت قابلِ قدر اور لائقِ احترام ہے۔ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ وہ بھی پناہ گزینوں کی طرح مظلوم ہے۔ اسے بھی دوسروں کی طرح دیس نکالا ملا ہے۔ اب اس نے آپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی ہے۔ یہ آپ کے لئے اجنبی نہیں۔ آپ سے اس کا قدیمی رشتہ ہے۔ پہلے یہاں اور حیثیت سے تھی۔ اب یہ دوسری حیثیت سے آئی ہے۔ اس کی قدر کیجئے۔ یہ آپ کے بہت کام آئے گی۔ آپ کی بہت خدمت کرے گی۔ یہ فرقہ واری اور صوبہ واری رشک و حسد کو مٹائے گی۔ نفاق و افتراق کی آگ کو بجھائے گی۔ دلوں کو ملائے گی، اور پاکستان کی رعایا کو یک دل و یک جان کر دے گی۔ اس نے ہمیشہ یہی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن افسوس ہندوستان نے اس کی قدر نہ کی۔ ایسی زبان جو خالص ہندوستانی اور ہندو مسلم تہذیب و اتحاد کی عظیم الشان اور مبارک یادگار رہے۔ اس نے بڑی بے دردی سے نکالا ہے۔ ہندوستان کا یہی شیوہ رہا ہے۔ بدھ مت والوں کا اور ان کی زبان پالی کا ان کے ہاتھوں یہی انجام ہوا۔ ہندوستان

اُردو کو شوق سے اپنی حدود سے خارج کر دے، لیکن وہ ان کے خارج کئے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدر
اب بھی دنیا میں بہت ہیں۔ وہ زندہ رہے گی۔ ترقی کرے گی اور اوجِ کمال پر پہنچے گی اور برِّاعظم پاک و ہند ہی کی،
سارے ایشیا کی عام زبان ہو کے رہے گی۔ لیکن ہندوستان کی فردِ جرم میں ایک جرم کا اور اضافہ ہو گیا، بے
ہزار پردے ڈال کر بھی نہیں چھپا سکتا۔ یہ معمولی جرم نہیں، یہ قتلِ عمد ہے۔ تاریخ کے اوراق پکار پکار کر اس کے نا
پر نفرین کریں گے۔

خطباتِ عبدالحق، صفحات ۳۵۹ تا ۳۶۰

زبان کی اہمیت

زبان کی خاطر دنیا میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں، جنگ و جدل ہوئے ہیں، عقوبتیں اور راذ
پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن جن کو اپنی زبان عزیز تھی انھوں نے سب کچھ سہا، طرح طرح کی قربانیاں کیں، مگر اپنی زبا
نہ چھوڑا اور مرتے مرتے اپنے سینے سے لگائے رہے، سزائیں بھگتیں، قیدیں جھیلیں، سختیاں برداشت کیں
سہیں، پر اپنی قومی زبان سے منہ نہ موڑا۔

خطباتِ عبدالحق، صفحہ ۳۸

غیر ملکی زبان ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے

اس فیصلے نے کہ تمام مضامین اور علومِ انگریزی زبان کے ذریعے سکھائے جائیں، علم کی جڑ کاٹ دی۔ غیر
کے ذریعے سے علوم کی تعلیم اور وہ بھی ایسی اجنبی اور بے گانہ زبان کے ذریعے سے جیسی انگریزی ہے، علم سے
رکھنے کے برابر ہے۔ اس سے طلبہ کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نظام پر جو مضر اثر پڑتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں
کا تلخ تجربہ ہم ایک صدی سے جھیل رہے ہیں۔ ایک وقت تو خود زبان کے محاورے اور اس کی نزاکتوں پر
حاصل کرنے کی ہے، اور دوسری اس کے ذریعے سے مضمون سمجھنے کی۔ نتیجہ یہ کہ نہ تو زبان پر پوری قدرت حاصل
ہے اور نہ مضمون پر۔ اور وقت بھی دُگنا بلکہ کئی کئی گنا زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور عمر کا سب سے عزیز حصہ اسی الجھ
بے کار جاتا ہے۔ قوائے جسمانی و ذہنی مضمحل اور جدت و جودت مفقود ہو جاتی ہے اور سب سے بڑا نقص جو اس
میں ہے وہ یہ کہ اس تعلیم کے بندے اپنی روایات و تہذیب اور اپنے اخلاق و تاریخ سے بے گانہ ہو جاتے ہیں

بزیں جو قومیت کی بنیاد ہیں ان کی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ وہ مغربی تہذیب و رسوم کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ در مغرب کی نقالی ان کا سب سے بڑا ہنر ہوتا ہے۔ ان کا اب ایک فرقہ بن گیا ہے جو قومی نظام کے لئے نہایت خطرناک ہے۔

خطبات عبدالحق، صفحات ۳۸۷ تا ۳۸۸

اخلاق تعلیم اور تہذیب

جب ہم قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوموں کے زوال کے زمانے میں ایسے ایسے شجاع، صاحب کمال، فن کار، صنّاع، ادیب، شاعر، فلسفی، حکیم پائے جاتے ہیں جن پر بجا طور فخر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس قوم میں ایسے صاحب کمال، ذی عقل اور فرزانہ اشخاص موجود ہیں وہ کیوں زوال کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کے اخلاق گر جاتے ہیں تو کوئی قوت کوئی تدبیر ایسے زوال کی گرفت سے نہیں بچا سکتی، عقل و حکمت، ذہانت و ذکاوت، فن کا کمال کچھ کام نہیں آتا۔ جب تک اخلاقی قوت ان کے ساتھ نہ ہو۔ اخلاق تمدّن کی بنیاد ہے۔ اخلاق سے مراد صداقت، جرأت، ارادی قوت، اور ایثار ہے۔ اخلاق میں ایثار کا درجہ سب سے اوّل ہے انسانی ترقی کے لئے لازمی شرط ہے۔ اولو العزم قوموں کی تاریخ میں آپ کو ایسی ہستیوں کے نام ملیں گے جنھوں نے اپنی قوم کی نجات کے لئے اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا ہے۔ سچی عزت اور عظمت انھیں کا حق ہے۔

اس زمانے میں زندگی کی ہر چیز مصنوعی اور تجارتی ہو گئی ہے۔ دوستی و محبت، اخلاق و مذہب، عصمت و عفت، علم و حکمت سب تجارتی ہیں۔ یہی حال تعلیم کا ہے، یہ بھی ایک تجارتی شعبہ ہو گیا ہے۔ آج کل دنیا میں مادیت کا اس قدر زور ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئی ہے۔ اخلاق و مذہب اور روحانیت سب پس پشت جا پڑے ہیں۔ جدید تمدن سراسر مادی ہے جو انسان نے اس لئے اختیار نہیں کیا کہ وہ اس کے مزاج اور فطرت کے موافق ہے بلکہ مشینی اور سائنسی ایجادات اور مادی ترقی کے سیلاب نے سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اور وہ اس میں بے تحاشہ بہتا ہوا چلا گیا ہے۔ ہوس ناکی، مال و زر کی محبت، جنسی خواہشات میں بڑے چھوٹے (الا ماشا اللہ) سب مبتلا ہیں۔ جدید نفسیات کی رو سے جنسی یا دوسری مذموم خواہشات کو روکنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ نفس آزاد ہے۔ صبر و سکون، ضبط و تحمّل راندۂ درگاہ ہیں۔ تعلیم کی ہر طرف پکار ہے۔ مدرسوں اور کالجوں کا شمار بڑھتا جاتا ہے۔ طالب علموں کی تعداد روز افزوں ہے۔ کتب خانوں، کتابوں، رسالوں اور اخباروں

کی ریل پیل ہے۔ لیکن ادبی ذوق اور مطالعہ کا شوق پہلے سے کم ہے۔ یہ نہیں کہ لوگ پڑھتے نہیں، بہت پڑھتے ہیں، لیکن گھٹیا قسم کی کتابیں، ادنیٰ درجے کے ناول اور افسانے، رسالے، ہوسناکی اور شہوانی جذبات کے ابھارنے والے زیادہ مقبول ہیں۔ ایسی تعلیم جو اخلاق و مذہب اور روحانیت سے خالی ہے، ایسے انسان نہیں پیدا کر سکتی جن کی اس وقت قوم کو ضرورت ہے۔ اس تعلیم کی پیداوار آپ کے سامنے ہے۔ حکومت سے لے کر نیچے تک ہر طبقے میں نظر ڈالئے اور دیکھئے وہ کس رنگ میں ہیں۔ جن خرابیوں اور بداخلاقیوں کو آپ دیکھتے اور سنتے ہیں ان سے کہیں زیادہ ان خرابیوں اور بداخلاقیوں کی تعداد ہے جو ہمارے سننے اور دیکھنے میں نہیں آتیں اس میں ان کا تصور نہیں، ان کو تعلیم ہی ایسی دی گئی ہے جس میں نیک اور بد، نفس پرستی اور ایثار، خودغرضی اور خدمتِ خلق میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ ان کو صحبت ہی ایسی ملی ہے جہاں سب ایک حمام میں ننگے نہار رہے ہیں۔ یہ جدید تعلیم ہی کی آزادیاں ہیں۔

مروّجہ تعلیم کا ڈھچر بہت پرانا اور فرسودہ ہو گیا ہے۔ نہ یہ پہلے کچھ زیادہ کام کا تھا نہ اب کسی کام کا ہے۔ یہ زبردستی ہم پر مڑھا گیا تھا۔ یہ ہمارے مزاج، ہماری فطرت اور ہماری تہذیب اور ہمارے آداب سے مناسبت نہیں رکھتا۔ ہمیں زبردستی اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھالنا پڑا، جس سے ہماری فطرت اور دماغی قویٰ مسخ ہو گئے ان کو اصلاح پر لانا دو چار دن کا کام نہیں۔ پرانی عادات اور خیالات کا جو دل و دماغ میں بسے ہوئے ہیں، نکالنا آسان نہیں۔ لیکن اس کی داغ بیل ابھی سے ڈالنی چاہئے۔ ذریعۂ تعلیم کو بدلنا نئے نصاب تعلیم کا مرتب کرنا بلاشبہ بڑی اصلاح ہے لیکن یہ کافی نہیں۔ پورے ماحول کو بدلنا پڑے گا۔ ماحول کا انسانی تربیت، رنسرو نما میں بہت بڑا دخل نہیں ہے۔ اور ناسازگار ماحول اعلا سے اعلا دماغی صفات کو زائل کر دیتا اور اخلاق بگاڑ دیتا ہے اور ایک صالح ماحول اور صحبت انسان کو (بشرطیکہ اس میں صلاحیت ہو) کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بعض ایسے ان پڑھ لوگ دیکھے ہیں جو اچھی صحبت کی بدولت اپنی گفتگو اور برتاؤ سے ایسے شائستہ اور مہذب معلوم ہوتے تھے کہ کسی کو ان کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ ان پڑھ یا جاہل ہیں۔ ہماری زبان میں ان پڑھ شاعروں کی کمی نہ تھی۔ یہ محض صحبت کا فیض تھا۔

خطبات عبدالحق صفحات ۲۹۳ تا ۲۹۵

نیکی کیا ہے؟

اخلاق ہی کا دوسرا نام نیکی ہے، نیکی کے بھی مدارج ہیں اس کا فیصلہ کہ کون سی سب سے بڑی ہے یا کون سی نیکی دوسری نیکیوں پر ترجیح رکھتی ہے کمروں میں بیٹھ کر منطقی دلیلوں سے کچھ نہیں ہو سکتا یہ ہر زمانے کے حالات اور ضروریات پر منحصر ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی وقت ملک میں قحط پڑ جائے تو اس وقت سب سے بڑی نیکی بھوکوں کو کھانا کھلانا اور ان کی تکلیفوں کو کم کرنا ہوگی یا خدانخواستہ کبھی طاعون یا کوئی اور وبا پھیل جائے تو اس وقت بیماروں کی دوا دارو اور ان کی غور پرداخت بڑی نیکی ہوگی یا فرض کیجئے کسی ملک میں جہالت ہے تو وہاں تعلیم کی اشاعت بڑی نیکی کا کام سمجھا جائے گا۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۴۰۰

ایک بُری عادت — ذات پات کا امتیاز

ہم نے ہندوستان میں رہ کر ایک اور بُری عادت سیکھی ہے۔ وہ ذات پات کا امتیاز ہے پہلے سید شیخ مغل پٹھان کی ذاتیں تھیں، اب ہندوستانی، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی غیر بنگالی، پاکستانی غیر پاکستانی نئی ذاتیں قائم کی گئی ہیں یہ شعارِ اسلام کے بالکل خلاف ہے اسلام نے ذات پات نسب رنگ اور جغرافی امتیازات کا سختی سے قلع قمع کیا ہے یہ سب جھوٹے امتیازات ہیں اور ان امتیازات پر اپنی بڑائی یا فضیلت جتانا چھوٹی بڑائی اور فضیلت ہے آپ ہرگز ہرگز ان باتوں سے اپنے دلوں اور خیالات کو ملوث نہ کیجئے گا یہ بات سب کے لئے بری ہے لیکن آپ کے لئے زیادہ بُری ہے، کیوں کہ خدانخواستہ اگر یہ زہر آپ کے ذریعے سے آپ کے طالب علموں میں پہنچا تو اس سے نہ صرف قومی اخلاق بگڑنے اور آپس میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے بلکہ پاکستان کا اصل منشا اور مقصد فوت ہو جائے گا اور یہ خسر الدنیا و الآخرۃ کا مصداق ہوگا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے کہ مجھے اس جلسے میں بعض ایسی باتیں کہنا پڑیں جو شاید آپ میں سے بعض صاحبوں کو ناگوار گزریں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض آپ کی خیرسگالی کی غرض سے کہا ہے۔ میں نے یہ سب رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور بڑے بڑے قابلِ قدر کاموں کو ان حرکتوں کی وجہ سے بگڑتے اور تباہ ہوتے دیکھا ہے اس لئے اس سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

(خطباتِ عبدالحق) صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۳

انگریزی حکومت کی ایک برکت

ہمارے دفتر کے حکام کو اپنی قومی زبان کی قدر و قیمت معلوم نہیں اس لئے اس کا احساس بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے دفتروں کے اعلا حکام وہی حضرات ہیں جو انگریزی عہد میں یہی کام کرتے تھے انگریزی حکومت سے ان کو جو برکات ورثے میں ملی ہیں ان میں سے ایک انگریزی زبان کا ہے، بنے بنائے الفاظ اور اصطلاحات، بنے بنائے فارم، نقشے اور رجسٹر وغیرہ پہلے سے چلے آرہے ہیں و آنکھ بند کرکے لکھتے چلے جاتے ہیں اپنے الفاظ تلاش کرنے یا وضع کرنے میں محنت پڑتی ہے آسا طلب اور راحت پسند طبائع اسے گوارا نہیں کرتیں وہ چاہیں تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ انھیں پسند نہیں انگریزی کے جو لفظ وہ لکھتے ہیں — وہی مرغوب خاطر ہیں ان لفظوں سے انھیں ایسا انس ہوگیا ہے کہ ان کا ترک کرنا شاق ہوتا ہے۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۱۰

ذہنی غلامی

میں ایک بار سر سکندر حیات خاں مرحوم کے عہدِ وزارت میں یہاں آیا اور وزیرِ تعلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ یونی ورسٹی میں نہیں تو کم سے کم میٹریکولیشن جماعتوں میں اُردو کو ذریعہ تعلیم کر دیا جائے اس سے یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یونی ورسٹی کے درجوں میں اُردو ذریعہ تعلیم ہو جائے گی یہ سُننا تھا کہ ان پر ایک جلالی کیفیت طاری ہوگئی۔ فرمانے لگے کہ اُ ہو یا ہماری کوئی اور زبان ہرگز ذریعۂ تعلیم نہیں ہوسکتی۔ کوئی زبان انگریزی کا مقابلہ نہیں کرسک ایک نوجوان جو نامور مولوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ علی گڈھ کالج میں پڑھتے تھے۔ انگریزیت کا ع تھا۔ تعطیل کے زمانے میں اپنے وطن سہارن پور گئے تو ایک روز کلکٹر صاحب کی ملاقات کو بھی جا پہ کلکٹر صاحب اُس وقت ایک پرانی قمیص پہنے ہوئے تھے جس کے کفوں کے پھوسڑے نکلے ہوئے فیشن کے اس دل دادہ طالب علم نے یہ خیال کرکے کہ اتنا بڑا صاحب پرانی قمیص کیوں پہننے لگا، یہ سمج ہو نہ ہو آج کل کا نیا فیشن یہی ہے۔ بس پھر کیا تھا گھر پہونچتے ہی قمیصیں نکالیں اور ایک ا کے پھوسڑے نکال ڈالے۔

(خطبات عبدالحق) صفحہ ۴۱۲

قومی سیرت و کردار پر قومی زبان کا اثر

صاحبو! زبان کسی ایک شخص کی ایجاد نہیں ہے۔ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں ساری قوم نے کام کیا ہے اور جب تک قومی زبان میں جان باقی ہے یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اس لئے قومی زبان، قومی خصائص اور قومی اتحاد کا نشان ہے اور جیسا کہ ایک ادیب نے لکھا ہے "کوئی شے قوم کے کریکٹر اور اس کی ذہنی اور روحانی قوت کو اس صفائی سے ظاہر نہیں کرتی جیسا کہ اس کا اظہار قومی زبان کے ذریعے سے ہوتا ہے اس کھوئے ہوئے اثاثے کو حاصل کرنے اور انگریزیت کے اثر کو زائل کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہماری تعلیم قومی زبان کے ذریعے سے ہو اور تمام علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل ہوں ورنہ جو زنگ لگ چکا ہے وہ اور گہرا ہوتا جائے گا۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۱۳ تا ۴۱۴

ہماری قومی تحریکوں میں اُردو کا حصّہ

صاحبو! اُردو نے ہر مسلم تحریک کی مدد کی ہے۔ وہابی تحریک کو اس نے مدد دی، سرسیّد کے مشن کو اس نے چمکایا خلافت کا پیغام گھر گھر اس نے پہنچایا۔ لیگ کی آواز اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچائی، پاکستان کا پروپیگنڈا جس برق رفتاری اور قوت سے اس نے اس برعظیم کے کونے کونے تک میں کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں جو نیا ولولہ اور جوش اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ ہمارے اس زمانے کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں کیا اب ایسے وقت میں جب اسے اپنے وطن سے دیس نکالا ملا ہے پاکستان اس کی کچھ بھی مدد نہ کرے گا کیا آزادی اور حکومت ملنے کے بعد وہ اپنے اس محسن کو بالکل بھول جائے گا

آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو۔ کہ ہندو، مسلم اختلاف کی ابتدا سیاست سے نہیں بلکہ اُردو، کی مخالفت سے ہوئی، ۱۸۶۷ء میں جب کہ نیشنل کانگریس کا وجود تھا نہ کسی دوسری، سیاسی تحریک کا، ہندوؤں نے اُردو کی مخالفت کا آغاز کیا اور اسے دفتروں عدالتوں اور دوسرے اداروں سے خارج کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں۔ سرسیّد احمد خاں نے اُردو کی حمایت میں اس کی مخالفت کا توڑ کیا اور مرتے دم تک اُردو کی حفاظت و حمایت میں مردانہ وار لڑتے رہے۔ ہندوؤں کی کوششیں اس وقت سے برابر جاری رہیں اور اسّی سال تک مسلسل اُردو دشمنی پر تلے رہے اور مختلف صورتوں اور ترکیبوں سے اس آگ کو

سلگاتے رہے اور دو قومی نظریئے قائم کرکے ہندو مسلم اختلاف کو بڑھاتے رہے دو قومی نظریئے کے بانی ہندو تھے نہ کہ قائد اعظمؒ یا مسلم لیگ یہ قائد اعظم پر ہندوؤں کا بہتان ہے یہ بڑی طولانی داستان ہے یہ موقع تفصیل کا نہیں۔

(خطبات عبدالحق)
صفحہ ۴۱۷ تا ۴۱۸

اُردُو، قومی زبان

اس برِعظیم میں مسلمانوں کی آمد ایک عظیم الشان واقعہ ہے اس نے ملک کی معاشرت، سیاست، مذہب اور حالات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا اور ایک جدید تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی اسلامی حکومت کی برکات اس برعظیم پر گوناگوں ہیں جب مسلمان یہاں پہنچے تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا ۔ ہر راجواڑہ خود مختاری کا دعوے دار تھا ملک میں اس سرے سے اس سرے تک عجیب انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی آپس کی پھوٹ، نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے ۔ کوئی ایک ملک تھا اور نہ کوئی نظام مسلمانوں نے بے ترتیبی اور بدنظمی رفع کی امن قائم کیا نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کئے اور ایک حکومت ایک قانون اور ایک تہذیب کی بنیاد قائم کی اور سینکڑوں طریقوں سے اس ملک کے آداب و اطوار معیشت اور ذوق کے لطیف بنانے میں مدد دی حکومت کا فن جیسا مسلمان جانتے تھے ۔ اور ہند کے حکمراں نہیں جانتے تھے اور انھوں نے اپنی حکومت سے ثابت کر دیا کہ انھیں اس میں کس قدر برتری حاصل ہے جنگ کے فن میں بھی انھیں نفیلت حاصل تھی انھوں نے قلیل فوجوں سے بڑے بڑے کثیر اور جرار لشکروں پر فتح پائی بارود اور توپ و تفنگ کا استعمال مسلمانوں کی بدولت رائج ہوا بہت سی دستکاریاں اور صناعیوں کو یہاں مروّج کیا اور ان میں طرح طرح کی ایجادیں اور جدّتیں کیں چناں چہ ان صناعیوں کے نام اور ان کی اصطلاحیں اس امر کی شاہد ہیں کہ یہ غیر ہندی ہیں اور مسلمان انھیں یہاں لائے شمع، کاغذ، شیشہ اور گھر کی آرائش و آسائش کے سامان طرح طرح کے خوب صورت اور نفیس کپڑے پشمینے قالین اور لباس، لذیذ غذائیں اور خوراک مسلمانوں کے طفیل ہی اہلِ ہند کو نصیب ہوتے یہاں تک کہ زیں بھی مسلمانوں ہی کی عطا کی ہوئی ہے انھوں نے موسیقی طب علم ہیئت میں قابلِ قدر اضافہ کیا اور ان کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی ان دونوں علوم اور نجوم و کیمیا میں اصلاح و ترقی کی اور تاریخ و جغرافیہ کے علوم سے اہل ہند بالکل ناآشنا تھے ۔ مسلمانوں کی بدولت پہلی بار یہ یہاں کے علم ادب

کے شعبے قرار پائے۔ اکبر کے عہد میں جو نظام مال گزاری مرتب ہوا موجودہ طریق مال گزاری کی بنیاد اب تک اسی پر ہے مسلمانوں نے سڑکیں، پل، نہریں، کارواں سرائیں، ڈاک خانے بنائے فن باغ بانی کو کمال درجہ ترقی دی اور نئے نئے پھلوں اور پھولوں نے اس ملک کی رونق بڑھائی فنِ تعمیر میں ایسے نمونے پیش کئے کہ اس وقت تک دُنیا کے اعلا مبصران کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مسلمان تمام تجارت سمندر کے راستے دور دراز ملکوں سے کرتے تھے۔ انھوں نے اہلِ ہند کے دلوں میں......
یہ احساس پیدا کیا کہ ہندوستان بھی آباد دُنیا کا ایک حصّہ ہے اور دوسرے ممالک سے اس کا بھی تعلق ہے یہ تمام برکات ایسی تھیں جن کا وجود میں آنا دسویں صدی سے قبل ناممکن تھا۔

ہمارے مورخوں نے ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی ہیں وہ بادشاہوں کی لڑائیوں اور فتوحات ان کے درباروں اور جشنوں اور جلوسوں اور ان کی تفریحوں اور سفروحضر کے حالات بڑے آب و تاب سے بیان کرتے ہیں۔ ذکر نہیں کرتے تو اس چیز کا جتاریخی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اعتبار سے ہماری سب سے اہم اور عظیم الشان یادگار ہے یوں تو اس سرزمین پر ہماری بہت سی یادگاریں ہیں لیکن ان میں سے بعض مٹ گئیں یا مٹنے والی ہیں بعض ایسی ہیں جنھیں لوگ بھول جائیں گے اور کچھ ایسی ہیں جو پرانے آثار کے کھوج لگانے والوں اور قدیم تاریخ کے محققین تک رہیں گی۔ لیکن اُردو ہماری تہذیب کی ایسی یادگار ہے جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔

یوں تو کئی ایسی زبانیں ہیں جو اسلامی زبانیں کہلاتی ہیں ان میں سب سے بڑا درجہ عربی زبان کا ہے لیکن اسلام سے پہلے یہ کن کی زبان تھی؟ یہ کفارِ عرب کی زبان تھی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ عظیم تھا کہ اس نے ان میں سے اپنے پاک بندے کو نبوّت کا شرف بخشا جو رحمت للعالمین اور خاتم النبیین ہے اور اپنا پاک کلام زبان عربی میں نازل فرمایا اس لئے یہ ہماری مقدّس زبان ہو گئی۔ فارسی زبان آتش پرستوں کی زبان تھی جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا، اہلِ ایران نے اسلام قبول کیا اور ان کی زبان میں اپنے علم وحکمت اور اسلامی علوم کی کتابیں لکھیں تو وہ مسلمانوں کی زبان ہو گئی۔ ترکی زبان اس قوم کی زبان تھی جو اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے اور جن کے ہاتھوں مسلمانوں کی ایسی ہولناک تباہی اور خوں ریزی ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی یہ خدائے تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا کرشمہ تھا کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور ان کی زبان میں اسلامی علوم کا رواج ہوا تو وہ بھی مسلمانوں سے منسوب ہو گئی۔ اب اگر بہ نظر غور دیکھیں تو یہ زبانیں ان لوگوں کی تھیں جنھوں نے ابتدا میں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی اور ان کے قبولِ اسلام سے پہلے موجود تھیں ان سب زبانوں میں اردو ایسی زبان

ہے جو مسلمانوں سے منسوب کی جاتی ہیں صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو مسلمانوں کی بدولت وجود میں آئی اس لئے ہماری توجہ اور ہمدردی کی بہت زیادہ مستحق ہے اور اس کی ترقی واشاعت ہمارا فرض ہے۔

یہ ایک دن کا کام نہ تھا اس میں صدیاں لگیں یہ ہمارے اسلاف کی مسلسل محنت ومشقت کوششوں اور جاں کاہیوں دل سوزیوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے وہ ہمارے لئے بے بہا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جس کے ہم وارث ہیں کچھ قدرتی صلاحیت کچھ وقت کا تقاضہ اور حالات کی مناسبت اور کچھ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی طباعی اور ذہانت غرض ان تمام اسباب کے ملنے سے اس میں ایسی شیرینی اور لطافت وسعت اور فصاحت پیدا ہو گئی کہ جہاں گئی مقبول ہوئی۔ اور لوگوں نے بڑے شوق اور چاؤ سے اس کا خیر مقدم کیا حتّٰی کہ رفتہ رفتہ سارے برّعظیم پر چھا گئی اور دوسری زبانیں جو قدیم سے اس سرزمین میں مروّج رہی تھیں اس کے آگے کسمسا کے رہ گئیں اب اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس برّعظیم کا ہر علاقہ اس کا مدّعی ہے کہ اُس کے ہاں جنم لیا سندھ کا دعوا ہے کہ مسلمانوں کے قدم سب سے اوّل یہاں آئے اور ان کی برکت سے یہیں اس کا ظہور ہوا ایک دن یہیں کے کھنڈروں میں اس کی آنول نال گڑی ملے گی پنجاب والوں کا یہ کہنا ہے۔ کہ اوّل اوّل اسلامی حکومت استقلال سے یہیں قائم ہوئی اور اس زبان کی بنا یہیں پڑی اُردو سے قریب ترین کوئی زبان ہے تو پنجابی ہے اہلِ گجرات کا دعوا ہے کہ اُردو زبان کو فروغ دینے والا انھیں کا خطّہ ہے یہیں سے یہ اپجی اور یہیں ملتی ہیں اور ولی جو اُردو کا باوا آدم کہلاتا ہے گجرات ہی کا تو باشندہ تھا اہلِ دکن اس دعوے میں سب سے آگے ہیں وہ کہتے ہیں کہ محمد تغلق کے زمانے سے اُردو کے قدم یہاں آئے اور اُس وقت سے اب تک اس نے مسلسل ترقی کی پرانے اُردو ادب کی ہر صنف کی تصانیف جس قدر یہاں ملتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ اور سب سے قدیم اُردو کی کتابیں بھی یہیں دست یاب ہوئی ہیں اہلِ بہار بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں وہ وہاں کے بعض بزرگوں اور اولیا اللہ کے ملفوظات پیش کر کے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اُردو کی ابتدا یہاں سے ہوئی غرض ہر صوبہ اُردو کے جنم بھومی کا مدّعی ہے یہ سُن کر مجھے جو خوشی ہوتی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا یہ اس کی مقبولیت کی سب سے قوی دلیل ہے۔

انگریزی عہد میں انگریزی زبان خاص مصالح کی بنا پر ہم پر مسلّط کی گئی تھی ایک تو اس لئے کہ انگریز حکّام کو آسانی ہو دوسرے یہ کہ دیسی تعلیم یافتہ کم تنخواہ پر مہیّا ہو سکیں گے اور تیسری جو سب سے اہم اور دور رس

مصلحت تھی وہ یہ کہ تمام تعلیم انگریزی زبان اور انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ سے دی جائے تاکہ وہ اپنی تہذیب و روایات اپنی تاریخ اور اپنے اخلاق و معاشرت سے بیگانہ ہو جائیں ان کا ذوق انگریزی معاشرت ہو جائے تعلیم سے ملکی زبان کو اسی لئے خارج کر دیا گیا تھا کہ قومی تہذیب و روایات کی چھینٹ تک نہ پڑنے پائے اور اس طرح جو نئی جماعت تیار ہو وہ سرکار کی خیر خواہ اور وفادار اور انگریزی کلچر کی مبلغ ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا انگریزی تعلیم پانے کے بعد ان کا رہنا سہنا ان کا لباس ان کے کھیل اور تفریح ان کے عادات و خصائل سب انگریزی ہو گئے یہاں تک کہ وہ اپنی زبان بھی انگریزوں کی طرح توڑ مروڑ کر بولنے لگے اور اس پر فخر کرتے تھے غرض وہ اپنی قوم اور اپنی قومی تہذیب سے بیگانہ ہو گئے اور اپنی ہر چیز کو حقارت سے دیکھنے لگے عیسائی مشنریوں نے اس منصوبے کی بہت پُر زور تائید کی تھی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ اس قسم کی تعلیم کے بعد یہ لوگ اپنے مذہب سے بدظن اور منحرف ہو جائیں گے اور حضرت عیسٰی کے گلے میں آملیں گے غرض اس تعلیم نے ہماری قوم کو جسمانی اور دماغی اعتبار سے مسخ اور مفلوج کر کے رکھ دیا۔

پاکستان میں جتنی زبانیں ہیں ہر شخص کو اپنی مادری یا صوبائی زبان سے محبت ہوتی ہے اور ہونی چاہئے اور کسی کو اس کی ترقی میں حائل ہونے کا حق نہیں ہے لیکن صوبائی بولیاں (جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں) محدود ہوتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی میل نہیں ہوتا اگر صوبہ اپنی اپنی زبان پر اصرار کر کے اور قومی زبان کے رواج کے مانع ہو تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا ایک طرف پشتوستان اور دوسری طرف بنگلستان ادھر ہندوستان اور ادھر پنجابستان، پاکستان کہیں نہیں رہے گا اور ڈھونڈے بھی نہیں ملے گا۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۲۸ تا ۴۳۱

قومی غیرت مندی

حضرات! اس وقت سب سے مقدم پاکستان کا استحکام ہے اور استحکام کے لئے لازم ہے اتحاد اور اتحاد کا ایک بڑا ذریعہ قومی زبان ہے اردو مثل ایک شیرازے کے ہے جو مملکت کے مختلف عناصر کو منتشر ہونے سے بچائے گا اور ان کو مضبوط رکھے گا اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس شیرازے کو مضبوط کرنے کی کوشش کیجیے، جو لوگ اپنی قومی زبان کے استعمال سے شرماتے ہیں ان میں قومی غیرت نہیں اور جس شخص میں غیرت نہیں وہ مُردہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہماری قوم میں مُردوں کی اکثریت ہو۔

(خطبات عبدالحق) صفحہ ۴۳۲

بنیادِ پاکستان کی پہلی اینٹ۔ اُردُو

ترقی پسندوں کی انجمن میرے سامنے کا بچہ ہے اگرچہ اس کے جنانے میں میرا ہاتھ نہیں ابتدا میں اس کے بڑے شور تھے اس کی خود سری اور خود پسندی انتہا کو پہنچ گئی تھی اس کی حالت ایک سرکش اسپ بچھیرے کی سی تھی جو دولتیاں جھاڑتا سر اچھالتا الف ہو جاتا اور قابو سے نکل نکل جاتا ہے ترقی پسندوں نے دوسرے ادیبوں پر (جنھیں وہ رجعت پسند کہتے ہیں) بڑی لے دے کی نہایت سخت نکتہ چینی کی انھوں نے بھی ان کی خوب خبر لی اور بڑے پھبتے ہوئے اعتراض کئے غرض اس جواب' الجواب ردجواب اور کد جواب بحثا بحثی اور چھیڑ چھاڑ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ترقی پسندوں کی خود پسندی اور جوش دھیما پڑ گیا اور مخالف فریق کی بھی آنکھیں کھلیں اور اپنی اصلاح شروع کی ان دونوں میں سے کوئی یہ نہیں مانے گا کہ ایک دوسرے کا اثر نامعلوم اور غیر شعوری طور پر ہوتا ہے بس یہ تسلیم کرتا ہوں اور میں کیا ان کے مخالف بھی تسلیم کریں گے کہ انھوں نے ہمارے ادب کو بلند کیا اس کا وقار بڑھایا افسانہ نویسی اور نظم میں جدت و وسعت پیدا کی اور خاص کر تنقید کے فن پر قابلِ قدر کام کیا ابتدا میں سخافت اور ستقامت تھی۔ وہ اب نہیں رہی ایک نقص ان میں ضرور تھا جس کی طرف میں نے اپنی ایک تحریر میں اشارہ کیا تھا کہ اپنی ترقی پسندی کی ترنگ میں انھوں نے اپنے گزشتہ ادب کا مطالعہ نہیں کیا اس وقت وہ اسے قابل التفات نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان کا طرز بیان اُکھڑا اُکھڑا اور اُلجھا اُلجھا تھا اس قسم کی کچھ اور خامیاں تھیں مگر اب یہ نقص بھی باقی نہیں رہا انھوں نے اپنے قدیم ادب کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے اور اس پر خوب خوب مضامین لکھے ہیں اوّل یہ کہ غلطی کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے یہ ایک معمولی چیز ہے غلطی سب کرتے ہیں بڑوں بڑوں نے کی ہے اولیاؤں اور پیغمبروں سے غلطیاں ہوئی ہیں اور غلطی وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا بھی ہے جو کچھ کرتا ہی نہیں وہ غلطی کیا کرے گا اس کے علاوہ غلطیاں بھی ترقی کی ممد ہوتی ہیں مثلاً پچھلوں کی غلطیاں آئندہ آنے والوں کو ہدایت اور رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور پکار پکار کے کہتی ہیں کہ خبردار اس طرف نہ آنا اسی طرح ہماری غلطیوں سے آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا اس کے بعد کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے دماغ میں روشنی اور ہمارے فکر میں جولانی پیدا کرتی ہے ترقی پسند مصنفین نے بے شک غلطیاں کی ہیں جیسے اور کرتے ہیں مگر انھوں نے کام بھی کیا ہے اور سب سے بڑی تعریف کی بات یہ ہے۔ جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں کہ جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اصلاح کی کوشش کی جیسا کہ ان کے جدید منشور سے ظاہر ہے انھوں نے ان چیزوں کو خارج کر دیا ہے جو موجب اختلاف تھیں لیکن اب بھی خفیف سی ترمیم کی اور اس میں جو تلخی ہے اسے کم کرنے کی ضرورت ہے سچ بلاشبہ مقدم اور ضروری ہے لیکن تلخی

اور دل آزاری ضروری نہیں اس میں شائبہ بدذوقی آجاتا ہے۔ حکیم کنفوشش کا قول ہے کہ سب انسان کھاتے پیتے ہیں کوئی زیادہ کوئی کم کوئی اچھا کوئی معمولی کوئی طرح طرح اور قسم قسم کے کھانے کھاتا ہے لیکن ان میں کتنے ہیں جو ذائقہ کی صحیح حس رکھتے ہیں یہی حال ادب کا ہے ہم میں سیکڑوں ہزاروں لکھنے پڑھنے والے مترجم مولف مصنّف شاعر ہیں لیکن ان میں کتنے ہیں جن میں ادب کا صحیح ذوق ہے۔

انسان فطرتاً کاہل معلوم ہوتا ہے محنت کرنا نہیں چاہتا میرا یہ عقیدہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں سوائے کاہل کے کاہلی جرم ہے گناہ ہے عطیہ الٰہی سے انحراف اور کفران نعمت ہے یاد رکھئے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتی اور محنت سے جی چراتی ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب ہو گی وہ ہمیشہ ہمیشہ غلام رہیں گی اگرچہ ان کے ہاتھوں میں آزادی کے منشور کیوں نہ ہوں کام سے انسانیت آتی ہے سیرت اور اخلاق بنتے ہیں ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے ہم جان دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے اس میں پتّا مارنا پڑتا ہے عزیز اشتغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ والٹیر دُنیا کا بہت بڑا اور عجیب وغریب ادیب گزرا ہے وہ اپنے ایک ڈرامے کی مشق کر رہا تھا اس میں ایک خاتون بھی تھی جسے وہ بتا رہا تھا کہ اُسے یہ کیوں کر ایکٹ کرنا چاہیئے اور اسے کیسے ادا کرنا چاہیئے اس خاتون نے کہا کہ حضرت آپ جو جذبہ مجھ میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ میرے اندر شیطان ہو اس نے کہا بے شک جو شخص بھی کسی آرٹ میں کام یابی حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے اندر شیطان ہونا ضروری ہے یہ جب کام کرنے پر آتے ہیں تو آندھی ہیں طوفان ہیں بھوت ہیں شیطان ہیں یہ بالکل صحیح اور تاریخی واقعہ ہے کہ محض اُردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہو گیئں اور اس وقت دو قومی نظریئے کی بنیاد پڑی اور یہی دو قومی نظریہ پاکستان کی بنیاد کا باعث ہوا ہے کہ پاکستان کی بنا میں پہلی اینٹ اُردو کا بہت بڑا حق ہے اور اب پاکستان پر اس حق کا ادا کرنا لازم ہے۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۹

تنگ نظری اور ہٹ دھرمی

جناب صدر اور صاحبو!

میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے یعنی زبانِ اُردو کی اشاعت اور ترقی مجھ یا انجمن ترقی اُردو کو کسی سیاسی جماعت سے دُور کا بھی تعلق نہیں لیکن باوجود اس کے میں ہر جماعت سے تعاون کے لئے آمادہ

ہوں بہ شرطے کہ اُسے ہمارے مقاصد سے ہم دردی ہو میں جب کل یہاں حاضر ہوا تو ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب نے مجھے وہ اشتہار دکھایا جس میں انھوں نے اپنی طرف سے میری تقریر کے لئے ایک موضوع کا اعلان کر دیا تھا وہ موضوع ہے موجودہ سیاست اور اُردو زبان اسے دیکھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آیا جس زمانے میں کہ مُسلم یونی ورسٹی نہ تھی اور ایم، اے او کالج میں ایک حجّام عنایت اللہ نامی تھا مولوی عزیز مرزا مرحوم جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسے اپنے ساتھ حیدر آباد لے گئے وہ بہت سمجھ دار اور وفادار شخص تھا اس نے حیدر آباد میں خاص حیثیت حاصل کر لی تھی اور ہم سب اُسے عزت سے دیکھتے تھے کچھ دنوں بعد مولوی شبلی حیدر آباد تشریف لے گئے۔ انھیں وہی خیال رہا اور عنایت اللہ کی نئی حیثیت کی خبر نہ تھی انھوں نے عنایت اللہ سے کہا کہ میاں خلیفہ ذرا ناخن تو لینا یہ اُسے ناگوار تو ضرور ہوا مگر خیران کے ناخن تو لئے مگر ایک ناخن ذرا گہرا بھی کاٹ ڈالا جس سے مولوی صاحب کو ذرا جھنجھلاہٹ ہوئی اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اب تم کیا کرتے ہو؟ عنایت نے کہا کہ مولوی صاحب اب میں پولٹیکل ہوں اس زمانے میں حیدر آباد کی فضا کچھ ایسی ہی تھی۔ میں جب اس زمانے کا خیال کرتا ہوں اور آج کل زمانے کو دیکھتا ہوں تو ہر شخص حجّام یعنی پولٹیکل نظر آتا ہے۔

غدر سے پہلے اس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا چناں چہ جب ۱۸۳۷ء میں فارسی کی بجائے دفتروں اور عدالتوں میں اُردو زبان کو رائج کیا گیا تو کسی فرد بشر نے اس کی مخالفت نہ کی اور نہ کہیں سے یہ آواز اٹھی کہ نہیں ہندی بھاشا ہونی چاہئے اردو کو سب نے تسلیم کر لیا یہ نہ کرتے تو کیا کرتے دوسری کوئی زبان تھی ہی نہیں جو اس کے مقابلے میں آتی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سے رفتہ رفتہ زبان کی چھیڑ شروع ہوتی ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلّط اٹھ گیا اور انگریزی حکومت قائم ہو گئی تو اس وقت ہندوؤں کی ایک جماعت میں قومیت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا اور اپنی قدیم تہذیب کو پھر زندہ کرنا چاہا اسی زمانے میں سوامی دیانند سرسوتی نے سنسکرت کے پڑھنے پڑھانے اور بولنے پر زور دیا۔ ویدک زمانے کی یاد تازہ کر دی، گرو کل قائم کئے اور ان میں ویدک زمانے کی تہذیب اور رسوم کو از سرِ نو رواج دیا اس کے بعد یورپ والوں نے اس خیال کو اور تقویت پہنچایا خاص کر پروفیسر میکسمولر کی تحریروں اور میڈم بلوٹسکوں اینی بسینٹ اور کرنل اسکاٹ کی تحریروں اور تحریکوں نے اور شہ دی۔ قومیت کے لئے لازم ہے کہ زبان بھی ایک ہو وہ زبان وہ ہے جسے آج کل ہندی کہا جاتا ہے مگر وہ ایسی ہندی ہے جسے نہ شہر والے سمجھتے ہیں نہ دیہات والے۔

غرض اس طرح زبان بھی الگ کر لینے کی کوشش کی گئی یہیں سے اصل نزاع اور نفاق کی ابتدا ہوتی ہے یہ پہلا قدم تھا جو فرقہ پرستی یعنی کمیونلزم کی طرف اٹھایا گیا اور وہ فرقہ پرستی جس کے مجرم

آج ہم قرار دیئے جاتے ہیں اس کی بنا سب سے اوّل ان حضرات نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ڈالی سب سے پہلے اس کا بیج بہار میں بویا گیا اس کے بعد اس کے کلے یو پی میں پھوٹے بنارس اور الہ آباد میں سبھائیں قائم ہوئیں اور اس بات کی کوشش شروع ہوئی کہ عدالتوں اور دفتروں میں ہندی کو رواج دیا جائے . . . .

. . . . اس وقت سر سیّد احمد خاں نے اس نامبارک تحریک کی مخالفت کی اُردو کی تائید میں مضامین لکھے سر سید نہایت حیرت اور افسوس سے لکھتے ہیں کہ تیس برس کے عرصہ سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے بعض ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان ہو گیا کہ اب ہندوستان میں باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی یہ سلسلہ برابر جاری رہا لیکن رفتہ رفتہ اس کا زور کسی قدر کم ہو گیا اس کے بعد جب سر انٹونی میکڈانلڈ اس صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر ہو کر آئے تو یہ شاخ جو کملاسی گئی تھی پھر ہری ہونی شروع ہوئی وہ بہار سے آئے تھے . . . .

. . . . اور اردو ہندی کے جھگڑے میں بہت کچھ حصہ لے چکے تھے ان کے یہاں پہنچنے پر ہندی والوں نے پھر ریشہ دوانیاں شروع کیں یہ سر سیّد کی زندگی کے بالکل آخری دن تھے اس موقع پر بھی انھوں نے ایک مضمون لکھا۔

ان میں بھی اکثر اُردو کے قصّے تھے جو ناگری حروف میں چھاپ لئے تھے لیکن جب پنڈت مالویہ نے شدھی اور سنگھٹن کا قضیہ چھیڑا تو اس سلسلہ میں ہندی زبان بھی آ گئی اور اس مذہبی جوش میں ہندی زبان کو خوب فروغ ہوا اب یہ ادبی چیز نہ رہی بلکہ سیاسی اور مذہبی ہو گئی اور چوں کہ وہ اپنی الگ ایک سیاسی جماعت اور نئی قومیت بنا رہے تھے اس لئے اس پردے میں زبان کی ترقی ضرور ہو گئی۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت جی کی تحریک سے ہندی زبان کو بہت تقویت پہنچی اور خود انھوں نے اور ان کے ہم خیال اصحاب نے کوشش کر کے یہ نئی زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دی اور ہندی ادب میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا لیکن سب سے بڑی قوّت اس وقت پہنچی جب گاندھی جی نے ساہتیہ سمیلن کی صدارت قبول کی اور ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کا بیڑا اٹھایا اس سے سارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندی کا غلغلہ مچ گیا اور صوبہ مدراس پنجاب اور سرحد جیسے

علاقوں میں جہاں کی زبانوں سے ہندو اپنی اپنی حکومتوں سے ہندی کی تعلیم کا مطالبہ کرنے لگے جو بالکل ناواجب تھا کیوں کہ ہندی نہ کبھی وہاں کی زبان تھی۔

جو بار بار کہا جاتا ہے کہ آسان لکھو یہ ذرا تفصیل طلب ہے ہر زبان میں آسان لکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور مشکل لکھنے والے بھی ایک تو اپنا اپنا طرزِ بیان ہوتا ہے اور دوسرے مضمون کی نوعیت کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہے سائنس فلسفہ شعر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اشکال آہی جاتا ہے البتہ بچوں لڑکوں لڑکیوں اور عام لوگوں کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں وہ ضرور آسان اور سلیس زبان میں ہونی چاہئیں اس بارے میں لوگ الفاظ پر زور دیتے ہیں کہ غیر مانوس اور ثقیل لفظ نہ ہوں اشکال غیر مانوس لفظوں سے اتنا نہیں پیدا ہوتا جتنا پیچیدہ اور معلّق بیان سے اس سے زیادہ زور اس بات پر دینا چاہیئے کہ بیان سادہ اور سہل ہو رہا لفظ تو اس کا پرکھنے والا ادیب ہی ہوسکتا ہے وہ ہر لفظ کی نبض پہچانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ کون سا لفظ کہاں آنا چاہیئے۔ اس میں موقع اور محل کو پہچاننا بڑی بات ہے یہ انشاپردازی کا بڑا گُر ہے لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہے اور اچھا خاصا لفظ بے جان اور بے اثر ہو جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آواز زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچے تو ہمیں اسی زبان میں لکھنا یا بولنا چاہیئے جسے زیادہ سے زیادہ اشخاص سمجھ سکیں اور اگر ساتھ ہی آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر و تقریر میں اثر اور دلکشی بھی ہو تو اس کے لئے بڑی محنت، مشق اور مطالعے کی ضرورت ہے ورنہ نری سادہ زبان زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتی۔

ہم اُردو والوں کو بڑا غرّہ ہے کہ اُردو زبان میں آگے بڑھنے اور پھیلنے کی فطری صلاحیت موجود ہے وہ گذشتہ زمانے میں بغیر کسی خاص کوشش کے خود بخود پھیلتی چلی گئی اور اسی طرح آئندہ بھی پھیلتی اور ترقی کرتی چلی جائے گی۔ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اُردو میں یہ فطری صلاحیت موجود ہے لیکن اگر فطرت کو انسانی سعی کی مدد نہ ملے تو فطری صلاحیت بھی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اور اکثر اوقات ایسی چیزیں خودرو پودوں کی طرح پامال ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس لئے فطری صلاحیت کو ابھارنے اور ترقی دینے کے لئے آپ کی کوشش پیہم اور متواتر جاری رہنی چاہیئے دوسرا یہ خیال بارہا سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی اس دھوکے میں نہ رہے گا انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے یہ ہر مشکل پر غالب آسکتی ہے۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحات ۴۵۴ تا ۴۵۵

الفاظ کی اہمیت

لفظ کوئی بے جان چیز نہیں کہ جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا اس کے گنوں کو پرکھنے والے مشاق اور ادیب ہی ہو سکتے ہیں کسی اعلا درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیے ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگینہ ہے جو جڑا ہوا ہے اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے ساری لطافت و نزاکت خاک میں مل جاتے گی علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی لفظ میں یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے دوسرا اسے آسان سمجھتا ہے جیسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہے اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا وہاں تو دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آ گیا تو ایسا ہی برا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہوا نہ ہو سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۴۶۱

خیال اور الفاظ

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوع اور وسعت کی کوئی حد ہے زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے جاتے ہیں مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ سب ہم معنی نہیں ہوتے۔ ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اس لئے ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

خاص کر شاعروں کے اغراض کے لیے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہے شاعر ان کے ذریعے سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات کو ادا کر سکتا ہے پھر اسے ردیف و قافیے کے لیے بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

ادیب اور شاعر کے لیے لفظ کا انتخاب بڑی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے ایک برمحل صحیح لفظ کے انتخاب کی بہت گنجائش ہوتی ہے ذوق کا شعر ہے ؎

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھی کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

خاصا شعر ہے مگر کوئی خاص بات نہیں میر تقی میر اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہاں "کھپا جانا" کے لفظ نے کیا کام کیا ہے کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھیے یہ بات نہیں آئے گی اس شعر میں لذت اور مزہ دو مترادف لفظ ہیں اگر ایک ہی لفظ دونوں جگہ استعمال ہوتا تو شعر سُست او بے مزہ ہو جاتا ؎

محبّت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

اُردو میں ہندی اور فارسی لفظ مل جل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں اور عام بول چال محاوروں اور کہاوتوں میں بے تکلّف آ گئے ہیں۔ مثلاً تم کس باغ کی مولی ہو۔ اکّے دکّے کی خیر۔ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر۔ ایک آنکھ میں شہد ایک میں زہر۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ اللہ کا دیا سر پر۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا۔ بدن پر نہیں لتّا پان کھائیں البتہ۔ باہمن شتری بھاٹ اخواص۔ اس راجہ ہوئے ناس وغیرہ وغیرہ سیکڑوں کہاوتوں میں یہی حال محاوروں کا ہے مثلاً اللہ بیلی۔ آنکھوں میں خار لگنا۔ خدا لگتی کہنا۔ آنکھوں پر پردہ پڑ جانا۔ لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا۔ اللہ میاں کی گائے۔

مخلوط زبان میں ایک آسانی مرکب الفاظ کے بنانے میں بھی ہوتی ہے دیکھیے ہندی فارسی کے میل سے کیسے اچھے اچھے مرکب لفظ بن گئے ہیں۔ مثلاً دل لگی۔ نیک چلن۔ جگت استاد۔ بھتیج داماد۔ سمجھ دار گنڈے دار۔ اگال دان۔ عجائب گھر۔ کفن چور۔ جیب گھڑی۔ امام باڑہ۔ مُنہ زور وغیرہ وغیرہ ہزاروں مرکبات ہیں۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۴۷۴ تا ۴۷۵

اُردو ہندی جھگڑے کے بانیٔ اعظم

بے شک ایک زمانے میں ہندی اُردو کا جھگڑا تھا لیکن جب سے گاندھی جی نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ

میں لیا اور ہندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور یہ اعلان کیا کہ وہ ہندی کو ملک کی مشترکہ زبان بنا کے چھوڑیں گے اسی وقت سے سارے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ اور فرقہ واری عناد اور فساد کی مستحکم بنیاد پڑ گئی کانگرس گورنمنٹ نے جو اصل میں مہاتما کی حکومت تھی، اس جلتی ہوئی آگ پر خوب تیل چھڑکا۔ اس معاملے میں حکومت کے بعض حضرات اور معزز ارکان کانگرس گورنمنٹ کے وزیر، کانگرس کے ممبر نہیں رہے تھے بلکہ وہ ہندی کے شری بن گئے تھے۔ اور کانگرس کے گزشتہ فیصلوں اور قرار دادوں اور کانگرس کے آئین کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ کانگرس گورنمنٹ نے اس نے اس کو اور بڑھا اور پھیلایا۔ اور ترقی دی۔ کیوں کہ کانگرس کی آواز مہاتما کی آواز تھی۔ اور مہاتما کی آواز اہل کانگرس اور کروڑوں عوام کے لیے بہ منزلہ الہی آواز کے تھی۔ مہاتما گاندھی نے (خدا ان کو نیک ہدایت دے) اس معاملے میں ملک کے حق ایسے کانٹے بوئے ہیں اور وہ بس پھیلایا ہے اور مختصر یہ کہ وہ کام کیا ہے جو اس ملک کا بڑے سے بڑا اور سخت سے سخت دشمن بھی نہیں کرسکتا۔ ہم ملک کی ابتری اور آئے دن کے جھگڑوں اور اختلافات کے لیے غیروں کو الزام دیتے ہیں۔ مگر اپنے گریباں میں منھ ڈال کر کبھی نہیں دیکھتے۔ ہندو مسلمانوں میں جس چیز نے سب سے زیادہ بدگمانی نفرت اور باہمی عناد کو بڑھایا وہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہے اور اس جھگڑے کے بانیٔ اعظم مہاتما گاندھیؒ ہیں۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۸۲ تا ۴۸۳

سرسیّد احمد خاں

اس برّعظیم کے مسلمانوں کی تمام تر تحریکوں یعنی تعلیمی، معاشرتی، علمی و ادبی، سیاسی کا سرچشمہ سرسیّد احمد خاں کی ذات تھی یوں تو مسلمانوں کا انحطاط وزوال بہت پہلے سے شروع ہوگیا تھا مگر اس کا احساس عام طور پر نہیں ہوا تھا لیکن گزشتہ صدی کے نصف کے چند سال بعد جب ہندوستان کی حکومت میں انقلاب پیدا ہوا تو مسلمان ہی سب سے زیادہ کچلے گئے۔ ایک طرف آقایان ملک کی نظر میں وہ معتوب مردود اور باغی ٹھہرے اور دوسری طرف برادران وطن نے نئی نئی قوت اور آزادی کے زعم میں اور کچھ آقاؤں کی شہہ پاکر انھیں ذلیل و برباد کرنا شروع کیا فاتح کے ہاتھوں مفتوح پر اتنا ظلم نہیں ہوتا جتنا قوت پانے کے بعد مفتوح کے ہاتھوں فاتح قوم پر ہوتا ہے یہی حال مسلمانوں کا ہندوستان میں ہوا وہ دونوں طرف سے راندہ تھے اور چکی کے دونوں پاٹوں میں پسے اور دبے جا رہے تھے اس سے دل بجھ گئے تھے

اور مایوس اور آفسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دو بڑی قوتوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی اور یہ سمجھ چکے تھے کہ ہم سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایسے میں مولوی سیّد احمد خاں نے غیر معمولی دور اندیشی اور ہمت سے کام لے کر وہ کام کیا جو کسی اور سے نہ ہوسکا اور جس کی کسی کو توقع نہ تھی اور مخالفتوں، مزاحمتوں اور مشکلات کو سر کرکے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے تکمیل تک پہنچا کے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب قومیں قعرِ مذلت تک پہنچ جاتی ہیں تو انھیں میں سے ایسے باہمت جواں مرد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بچا لیتے ہیں اور تاریخ میں ایک نیا عہد قائم کر جاتے ہیں۔ سر سیّد بھی انھیں برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے۔ ان کے بعد بھی جتنی اصلاحات، تعمیرات اور منصوبے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں آئے جب ہم ان کی ابتدا کا سراغ ڈھونڈتے ہیں تو اسے سر سیّد احمد خاں کی مساعی میں پاتے ہیں۔

(خطبات عبدالحق)

صفحہ ۴۹۹ تا ۵۰۰

عاشق کا جنازہ

اردو کی مخالفت یوں تو ہندی والوں کی طرف سے آج ۸۳ برس پہلے شروع ہوگئی تھی لیکن اس کی رفتار کبھی تیز ہو جاتی اور کبھی دھیمی۔ اُردو بڑی سخت جان ہے یہ بھی اسی رفتار سے مقابلہ کرتی رہی۔ اُردو والوں کو سر سیّد احمد خاں کا بڑا سہارا تھا وہ اُردو کی حمایت میں آخر دم تک مردانہ وار لڑتے رہے۔ ان کا انتقال ہوتے ہی رنگ بدل گیا اور فرقہ پرست ہندی والوں نے زور باندھا اسی زمانے میں سر انٹنی میکڈانل یوپی میں لیفٹننٹ گورنر ہو کر آئے تھے جو پہلے سے ہندی کی طرف مائل تھے۔ اس سے ہندی والوں کی ہمت اور بڑھی اور ان کی متفقہ کوشش سے اپریل ۱۹۰۰ء میں وہ ریزولیوشن پاس ہوا جو سر انٹنی میکڈانل کے عہدِ جبروت مہد کو ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔ اس سے مسلمانوں میں ہل چل مچ گئی۔ نواب محسن الملک نے جو اس وقت علی گڑھ کالج کے سکرٹری تھے اس ریزولیوشن کی مخالفت اور اُردو کی تائید میں ایک بہت بڑا جلسہ لکھنؤ میں کیا جس میں اطراف و جوانب سے ہر صوبے کے نمائندے شریک تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی بے چینی اور غیر معمولی جوش و خروش صاف بتا رہا تھا کہ انھیں اپنی قومی زبان اُردو سے کیسا عشق ہے نواب محسن الملک بڑے فصیح البیان مقرر تھے۔ اس موقع پر جو تقریر انھوں نے کی ہے وہ نہایت پُرجوش اور دل ہلا دینے والی تھی اور جب انھوں نے یہ مصرع پڑھا۔ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے

تو جلسے میں ہنگامہ مچ گیا اس جلسے میں بعض ہندو صاحبوں نے اُردو کی حمایت میں بہت اچھی تقریریں کیں جب اس جلسے کی کیفیت سرانٹنی میکڈانل کو معلوم ہوئی تو وہ سخت برہم ہوا۔ اور اس نے اپنی حاکمانہ اور جابرانہ قوت سے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا اور نواب صاحب کو بھی اس خوف سے کہیں اس کا نزلہ کالج پر نہ گرے دست بردار ہونا پڑا۔

(خطباتِ عبدالحق)
صفحہ ۵۰۱ تا ۵۰۲

ہندی ہندوستانی؟؟

اس ضمن میں اس واقعے کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس نے انجمن کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اس کی مختصر روداد یہ ہے ۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (جو اب بے غذا کے غذائی وزیر ہیں) مجھ سے حیدر آباد آکر ملے اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت ہو سکے آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جایئے چوں کہ یہ ادبی معاملہ تھا میں نے منظور کر لیا ۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگ پور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا اس انجمن کا نام "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد" تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پریشد کی زبان کیا ہونی چاہیے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا۔ ہندوستانی گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لئے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ ریزولیوشن ہے کانگرس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگرس کے آئین کی دفعہ ۱۲ میں صاف طور سے یہ درج ہے گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا رہا تو کام کیسے چلے گا۔ گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے۔ جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے۔ بول چال میں ہے نہیں پھر میں نے پوچھا۔ ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں اس پر میں نے دریافت کیا تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا کہ جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں اس پر انھوں نے ایسا غلط اور عجیب وغریب

جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اُردو کو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔

اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ انجمن کا صدر مقام دلی میں منتقل کر دیا جائے ملک میں اس وقت کانگرس حکومتوں کا راج تھا۔ اس لئے اُردو کی طرف سے تشویش پیدا ہو گئی اور انجمن کو ہر علاقے اور مقام پر نظر رکھنی پڑی۔ بمبئی، یوپی، بہار اور خاص کر سی پی کی حکومت سے بڑے بڑے معرکے کرنے پڑے۔ جہاں کہیں اُردو پر آنچ آئی اس کے انسداد کی انجمن نے فوراً کارروائی کی جہاں اُردو مدرسے بند ہو گئے تھے انھیں کھلوایا جہاں از روئے قواعد اُردو تعلیم نہیں ہوتی تھی اسے جاری کرانے کی کوشش کی۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۰۳ تا ۵۰۵

اُردو کا فروغ

بڑی شان دار اُردو کانفرنسیں ہوئیں اور مشاعروں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ انجمن نے اچھوتوں کے لئے مدرسے قائم کئے تمام کالجوں میں جن کی تعداد آٹھ تھی اُردو لیکچرار کا تقرر کرایا۔ بعض لیٹو اسمبلی میں اُردو میں تقریریں ہونے لگیں۔ اور ان کی تقریروں میں اُردو فارسی کے شعر پڑھے جانے لگے۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۰۹

ہماری غفلت اور تساہلی

بعض حضرات جنھوں نے بچپن سے آخر عمر تک انگریزی تعلیم پائی انگریزی لکھتے پڑھتے رہے تعلیم بھی دی تو انگریزی میں صرف لکھنا پڑھنا ہی نہیں بلکہ ہر انگریزی حرکت کو بہ نظر استحسان دیکھیے اور قبول کرتے رہے جنھوں نے کبھی اپنی زبان وادب کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ اسے نظر حقارت سے دیکھا وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اُردو تعلیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے ان کی رائے سے مرعوب ہو کر دوسرے اصحاب بھی جو اچھی خاصی عقل سلیم رکھتے ہیں ہاں میں ہاں ملا دیتے گویا ذریعہ تعلیم صرف ایک الٰہی اور مقدس زبان انگریزی ہو سکتی

ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یہ حضرات دُنیا بھر کی سیر کرتے ہیں مگر ان کی چشمِ تنگ کثرتِ نظارہ سے بھی وا نہیں ہوتی وہ یورپ کی سیر کو جاتے ہیں ملک ملک پھرتے ہیں۔ کبھی یہ دیکھا کہ انگلستان کے سوا یورپ کے کسی ملک میں بھی انگریزی میں تعلیم ہوتی ہے اس پر غور نہیں کرتے اس لئے کہ ان کی انگریزیت کو ٹھیس لگتی ہے چند صدی پہلے یورپ کی بعض زبانوں میں اتنی وسعت و قدرت بھی نہیں تھی جتنی اُردو میں ہے اور وہ اپنی زبانوں کو علم وحکمت کا اہل نہیں سمجھتے خود فرانسیسی اور انگریز یہ کہتے تھے کہ ہماری زبانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ ان میں علمی اور حکیمانہ مضامین لکھے جائیں یا علم وحکمت کی تعلیم دی جائے۔ آج وہی زبانیں دُنیا پر چھائی ہوئی ہیں اور علم وحکمت کا سرچشمہ ہیں کیا ان کے لئے اصطلاحات اور الفاظ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے چوتھے آسمان سے نازل کیے تھے۔ انھوں نے کوشش کی۔ محنت کی اور اپنی زبان کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

ہماری زبان نے ہم سے کبھی بے وفائی نہیں کی اس نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا اور ہر زمانے میں حالات اور ضروریات کے مطابق ڈھل گئی۔ اگر کوئی کمی ہے تو اس میں زبان کا قصور نہیں یہ ہماری نااہلی غفلت اور تساہل کا نتیجہ ہے۔ تقسیم ملک کی بنیاد اس نتیجے پر تھی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۱۶ تا ۵۱۸، ۵۲۰

سب کچھ اردو کے طفیل

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندو مسلم نزاع اسی مسئلے سے شروع ہوئی اور دو قومی نظریئے کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی اس سے قبل ہماری زبان میں قوم کا لفظ ذات کے معنوں میں آتا تھا۔ یعنی، سیّد، مغل، شیخ، پٹھان کے معنوں میں سرسیّد احمد خاں نے اس لفظ کا مفہوم بدل دیا اور پہلی بار لفظ قوم کو کے معنوں میں استعمال کیا، اور قومیت کا خیال پیدا کیا اور یہ سب کچھ اُردو کے طفیل ہوا۔ ہماری ہر قومی تحریک کی اشاعت و کامیابی 'اُردو' زبان کی زیرِ بارِ منت ہے سرسیّد کا مشن اسی کی بدولت سرخ رو' ہوا خلافت کا غلغلہ اور جوش و خروش ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسی نے پیدا کیا پاکستان کا پیغام گھر گھر اسی نے پہنچایا اور سارے برعظیم میں آگ سی لگا دی اگر یہ تحریک کسی علاقائی زبان کے ذریعے

کی جاتی تو کیا اس میں یہ غیر معمولی قوّت اور گرمی اور یہ حیرت انگیز جوش پیدا ہوتا اسی کی بدولت دو قومی نظریہ وجود میں آیا اور اسی کے طفیل میں پاکستان کا پروپیگنڈا اور اس کی جدوجہد ساحلِ کامیابی تک پہنچی اس لئے اگر یہی کہوں تو بالکل بجا ہوگا کہ قصرِ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ جس نے رکھی وہ اُردو زبان ہے پاکستان پر اُردو کا بہت بڑا حق ہے اور پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اس حق کو ادا کرے۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۲۱

حلّیت کا ضماد

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا اس کے گھٹنے میں درد تھا حکیم صاحب نے معائنے کے بعد کہا "حلّیت کا ضماد کرو" وہ بے چارہ ہکّا بکّا ہوکر ان کا مُنھ دیکھنے لگا۔ اب کے حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا "حلّیت کا ضماد کرو" وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہما انھیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شررسے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ خیر وہ تو ایک گنوار تھا۔ آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اس تقریر کے سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ ان میں سے کتنے ہیں جو اس کا مطلب سمجھے اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے کہ بھئی "ہینگ کا لیپ کرو" تو کیا ان کی شان میں بٹّے پڑ جاتے اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آجاتا؟ مگر نہیں وہ طب کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اگر عام بول چال میں یہ باتیں آگئیں تو شان کہاں رہی۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۲۴

اعترافِ برتری

سرسیّد احمد خاں نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے سرسیّد کی سادہ نویسی مشہور ہے مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی مامائیں اور سائیس بھی سمجھ لے۔ اور انھوں نے یہ کر دکھایا

سنجیدہ اور علمی مضمون بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں۔ اور بعض وقت انھیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال نے وہ قوت اور دل کشی پیدا کر دی ہے جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں جس زمانے میں مولانا شبلی حیدر آباد میں تھے میں ایک روز ان سے ملنے گیا دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا مولانا کس فکر میں ہیں فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں سرسیّد نے بھی اس پر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۲۵

آسان نویسی

آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان نہیں بہت مشکل ہے اوّل تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اس کا ہر پہلو اس قدر رچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہمارے ذہن میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرزِ بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے اس میں لفظ صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کون سا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر کرتا ہے بعض وقت اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی اُلجھن ہوتی ہے ایک لفظ آتا ہے وہ اسے روک دیتا ہے دوسرا آتا ہے اسے بھی ہٹا دیتا ہے تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا آخر اسی ردّ و بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا جو اس گُر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب ایچ پیچ اور ہیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ہے۔

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۲۲ تا ۵۲۷

آدمی کو بھی میسّر نہیں انسان ہونا

ہم اپنا زیادہ وقت اور اپنی کمائی کا زیادہ حصہ حیوانیت اور بہیمیت میں صرف کرتے ہیں ہم کپڑے تن ڈھکنے اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے نہیں پہنتے بلکہ شیخی اور فیشن کے لئے اور اپنے کو معزز جتانے کے لئے بھی۔ ہم کھانا صرف زندہ رہنے اور صحت کی خاطر نہیں کھاتے بلکہ زیادہ تر مزے کی خاطر کھاتے ہیں جس سے صحت اور زندگی دونوں برباد ہو جاتی ہیں ہم میں کتنے ہیں جو انسانیت کی خاطر کام کرتے ہیں ایسا کام جس سے نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچے اور جب ہم شوق اور محبت سے کوئی کام اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں کھانے پینے وغیرہ کا سامان ملتا رہے اگر یہ مجبوری اُٹھ جائے تو شاید ہزار میں سے ایک بھی کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حیوان بھی یہی کرتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کم ہوتی جاتی ہے حیوانیت بڑھتی جاتی ہے یا شاید انسانیت کا معیار بدلتا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر اقبال ایک زمانے میں انار کلی میں رہتے تھے اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے نیچے دکانیں تھیں جس نے نہایت جلی حروف میں خوش خط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع رکھا تھا۔

"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے وہ وقت کے تقاضے کو خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے خوب کام لیا اس نے ہماری ایک مشکل بھی حل کر دی یعنی انسان اب درزی کی دکانوں ہیئرڈریسنگ سیلونوں اور بیوٹی کلچر ایوانوں میں بنتے ہیں۔

(خطباتِ عبدالحق)
صفحہ ۵۵۲

ڈرو اس سے جو وقت آنے والا ہے

میں اپنے دوستوں رفیقوں اور عزیزوں سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر وہ دنیا میں انسانیت اور خود داری کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اگر ان کے دل میں اپنی قوم کی اپنے پاکستان کی بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی آرزو ہے تو خود غرضی ہوس ناکی اور اسی قسم کی ادنا خواہشوں اور عادتوں تو ہمات و تعصبات کو ترک کر دیں اور محنت و مشقت اور برداشت کی عادت ڈالیں یاد رکھیے کوئی بڑا کام محنت

مشقت اور تکلیف اٹھائے بغیر اور بغیر سخت ریاضت اور ایثار کے نہیں ہو سکتا اگر کرنا ہے تو یہی روش اختیار کرنی ہوگی ورنہ قدرت کا قانون تادیبی کارروائی کے لئے سر پر کھڑا ہے۔

"ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

(خطباتِ عبدالحق)

صفحہ ۵۵۳

تاریخ ملّتِ عربی

پروفیسر فلپ۔ حتی کی مشہور تاریخ ہسٹری آف دی عربز کا اُردو ترجمہ مع حواشی۔ مترجمہ مولوی سید ہاشمی فریدآبادی صاحب

قیمت چھ روپے آٹھ آنے

★

تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اُردو

انجمن ترقی اُردو کی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۵۳ء تک پنجاہ سالہ تاریخ مرتبہ سید ہاشمی فریدآبادی۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کے جشنِ طلائی کے موقع پر شائع کی گئی تھی ضخامت ۱۳۰ صفحات۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

★

اردو کا قاعدہ

بچوں کے لئے آسان قاعدہ جس سے بچے بہت جلد اُردو الفاظ اور جملوں کا پڑھنا لکھنا سیکھ جاتے ہیں۔ قیمت ۴ آنے

★

حیوانیات

از محشر عابدی صاحب (شعبۂ حیوانیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

حیوانیات پر مفید اور پر از معلومات کتاب۔ قیمت بلا جلد دو روپے چار آنے

انجمن ترقی اُردو پاکستان اُردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

منظومات

نواب جعفر علی خاں اثر
ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
جگن ناتھ آزاد
شاد عارفی
سلام مچھلی شہری
رئیس امروہوی
محشر بدایونی
بلراج کومل
جمیل نقوی
بہار کوٹی
انجم اعظمی
صہبا اختر
حمایت علی شاعر

شاہد عشقی
فضا ابن فیضی
یوسف جمال انصاری
رضا ابن حامد رضوی
نصیر کوٹی
جام بنارسی
سہیل اقبال
محسن بھوپالی
ناصر کاسگنجوی
مظہر جعفری
نیرنگ نیازی
شریف کمال عثمانی
خورشید حیدر صدیقی

جناب جعفر علی خاں اثرؔ

نذرِ عقیدت

☆

وہ عبدالحق کہ ہیں "بابائے اردو" — نہ کیوں شعر و ادب ہوں اُن پہ نازاں
کہاں سے اس کو پہنچا یا کہاں ہے — ہزاروں ہیں زباں پر ان کے احساں

☆

وہ عبدالحق نیک خو نیک باطن — جو سرچشمہ حُسنِ خُلق و صفا ہیں
عطا نوح کی عُمر ان کو ہو یارب — سفینہ ہے اُردو تو یہ ناخُدا ہیں

☆

آئینہ ہے خُلوص کا میرے — جو میں کہتا ہوں حق ہی بالکل حق
ڈھونڈھتے پھریئے کیوں مسیحا کو — فضلِ خالق سے ہیں تو عبدالحق

☆

منوّر ان سے دُنیائے ادب ہے — ضیا لیتے ہیں سب تارے یہیں سے
نہ کیوں ہو ناز عبدالحق پہ ہم کو — نظام اُردو کا قائم ہے انھیں سے

☆

گلزار کو اُردو کے سجانے والا — کوئی نہیں زنہار بجز عبدالحق
البیلی بہار خود ہو جس پر لہلوٹ — ہے کوئی طرح دار بجز عبدالحق؟

☆

"تو نے جوشِ عشق میں اپنا نہ تن بخشا نہ من"

(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی)

اے کہ تیرے فیض سے شاداب اردو کا چمن
اے کہ تیری شمع سے روشن ترقی کی لگن

اے کہ تیری ذات خود اپنی جگہ پر انجمن
فخرِ پاکستان و فخرِ بھارت و فخرِ دکن

تیرے ذوقِ کار سے تا دم جوانوں کا جنوں
تیرے جذبِ شوق سے زندہ روایاتِ کہن

اس بڑھاپے کے زمانے میں بھی اتنا ولولہ
درسِ ہمت تجھ سے سیکھیں نوجوانانِ وطن

مارتے جاتے ہیں اب بھی منزلوں پر منزلیں
ہیں ترقی کی طرف تیرے رسالے گام زن

"عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے"
تو نے جوشِ عشق میں اپنا نہ تن بخشا نہ من

تیرا یہ دیوانہ پن بابائے اردو الاماں
ہم جوانوں کو عطا ہو کاش یہ دیوانہ پن

تیرے فیضِ تربیت سے ایک رتبہ پا گئے
سینکڑوں اہلِ زباں اہلِ ادب اہلِ سخن

نقد و تنقیدِ ادب کے تھا کمال باہراب کہاں
تجھ سے قائم ہو گیا اردو میں حالی کا چلن

تھا ادب میں اپنے اصنامِ خیالی کا رواج (ق)
اور اسی کہتے تھے اک اندازِ فنِ اربابِ فن

حسنِ ظاہر کی ولیکن تاب و تابش کب تلک
ایک عبدالحق نے باطل کر دیا سب مکر و فن

مانتے ہیں ہم تجھے تحقیق میں تنقید میں
حیثیت تیری ادب میں ہے بشکل بت شکن

کاش مدت تک رہے روشن تری شمعِ حیات
تیری ہستی ایک عرصہ تک رہے سایہ فگن

کاش ہر اردو کا خادم تجھ سے اب بھی سیکھ لے
یہ طلب یہ ذوق یہ جذبہ یہ ہمت یہ لگن

کاش تیری لَو سے روشن ہو ہر اک دل کا چراغ
کاش عبدالحق بنیں دو چار ہی نورالحسن

جگن ناتھ آزاد

'بابائے اردو'

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

صفحات ہر اک دور میں تاریخِ ادب کے
تیرے ابدی کام سے تابندہ رہیں گے

اہلِ قلم اردو کے رواں آج ہیں جن پر
جادے وہ سرِ شام سے تابندہ رہیں گے

وہ ہند ہو یا پاک ہوا ے محسنِ اُردو'
دونوں یہ ترے نام سے تابندہ رہیں گے

شادؔ عارفی

دخت کشی

نذرِ بابائے اردو

دخترِ مادرِ ہندی ہے زبانِ اُردو — "دُخت کُش" اسکی تباہی کے اٹھاتے ہیں سوال
یہ دکن میں ہوئی پیدا تو پلی دِلّی میں — لکھنؤ میں ہوئی دوشیزۂ سلمائے جمال
کچھ دنوں خطۂ دلچسپ اَوَدھ میں ٹھہری — اور پنجاب میں پہونچی بہ سرِ اَوجِ کمال
پھر ہمالہ سے چلی راس کماری کی طرف — حیدرآباد سے چھاتی ہوئی آئی بنگال
یعنی ہر سمت بہاتی ہوئی امرت ساگر — گوشہ گوشہ کو دیا ذائقۂ لطفِ وص

سنسکرت اس کی ہے دادی تو ہے پوتی اُردو — باعثِ حسن ہیں ایران و عرب کے خد و خال
لوچ الفاظ میں لہجے میں نزاکت آئی — کھو دیا فیضِ فصاحت نے تنافر کا وبال
سعیِ مشاطۂ معنی نے سنوارا ہے مگر — وہی عفت وہی عصمت وہی صورت وہی چال
ہائے ہٹ دھرموں کو اپنوں کی بھی پہچان نہیں — وائے بر ضعفِ بصر ہائے تعقّل کا زوال
سچ ہے یہ قول کہ اُردو کی فنا ممکن ہے — مگر ایسے بھی ہیں ممکن کہ جو ہوتے ہیں "محال
ہے یہ جاں دادۂ اردو کی زباں سے جاری — "دِل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہوجانا"

سلام مچھلی شہری

کارِ دور افتادہ

ہر تازہ شمع جلتی ہے شمعِ قدیم سے
میں یہ سمجھ سکا ہوں بہ ایں عمرِ فن سلام!
اُے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے فکر!
یہ عہدِ نو بھی دورِ گذشتہ کا ہے غلام

میں خود بھی ہر "چراغ" کا قائل نہیں مگر
جس نور کا ہے ذکر، وہ جلوہ مرا بھی ہے
تم سازِ پاک پر جسے گاتے ہو صبح و شام
دُنیا یہ جانتی ہے، وہ نغمہ مرا بھی ہے

یادش بخیر، اک "ہمہ معنیٰ بزرگ" تھے
ہم لوگوں کو سکھاتے تھے مطلب "زبان" کا
وہ ہم سے دُور دُور رہیں، پر پاس پاس ہیں
سایہ ہر ایک چیز پہ ہے آسمان کا

حالاتِ روزگار نے جو کچھ کیا — کیا
"بابائے اُردو" آج بھی زندہ ہیں — شکر ہے
بزم زبان میر بھی کہتی ہے دوستو!
وہ نُور ہی نہیں، ہمہ جلوہ ہیں — شکر ہے!!

لیکن سوال یہ ہے، وہ تنہا کریں گے کیا
اہلِ دیارِ پاک اُنھیں حوصلہ تو دیں
ہر رہنمائے وقت غلامِ عوام ہے
وہ کاروانِ شوق کو آگے بڑھا تو دیں!

اے یاسمین و نسترنِ گلستانِ نَو!
تم اپنے ہی لبوں کی یہ نکہت سمجھ تو لو
"اردو" اسیرِ گیسوئے "افرنگ" ہو نہ جائے
حالات کی یہ تلخ نزاکت سمجھ تو لو—!

اک "ناتواں سا جسم" بنا ہے چراغِ راہ
للّٰہ، اِس چراغ کی عظمت سنبھالنا،
میرے بھی فکرِ تازہ کے حاضر ہیں چند پھول
اے دوستو! یہ نذرِ عقیدت سنبھالنا—!!

رئیس امروہوی

اُردو نامہ

بابائے اُردو کی خدمت میں

ہے بزرگانِ قوم سے فریاد
کہ سنیں اس غریب کی رُوداد

کچھ بھی کہتے رہیں حسد سے عدو — آج آفاق گیر ہے اُردو
جدِّ امجد عرب نژاد مرے — باپ تھے فارسی نہاد مرے
میری ننھیال خود بلند مقام — برج بھاشا ہے میری ماں کا نام
میرا ہم شکل ہے خطِ قرآں — عربی میری پیاری دادی جان
فارسی میری ایک ہمجولی — اور ہندی؟ بہن ہے منہ بولی
مجھ سے سندھی کا ارتباطِ کہن — بنگلہ ہے میری خالہ زاد بہن
مرہٹی تو مری سہیلی ہے — رہی پشتو تو [illegible] کھیلی ہے
میں نے دہلیز سب کی ہے دابی — میری چھوٹی بُوا ہے پنجابی
کھوج پایا۔ جو دُور کی سوجھی — ہے مری رشتہ دار بلوچی
اپنا ننھیال دِل نواز مجھے — اپنی سسرال پر ہے ناز مجھے
کس پہ ظاہر نہیں حسب میرا — کس سے پوشیدہ ہے نسب میرا؟
کیا بتاؤں۔ کہاں رہا مسکن — سندھ و ملتان میں کٹا بچپن

ہوش کے ساتھ سِن بڑھا جب اور　　سَیر کرنے کو میں گئی لاہور
ہائے لاہور میں قیام مرا　　آیا دِلّی سے پھر پیام مرا
ترک تازانِ ہند کے ہم راہ　　ساتھ لے کر تمام خیل و سپاہ
راہ بے راہ ٹھوکریں کھا کر　　میں نے دِلّی میں دَم لیا جا کر

رونقِ ایشیا عروسِ بلاد
ہائے کیا شہر تھا بہشت سواد

شہرِ دہلی کا دیکھ کر جو بَن　　بس اُسی جا بنا لیا مسکن
لیکن اس مُستقل اقامت پر　　تھا مرے پاؤں میں عجب چکّر
کبھی بنگال کے لیے پھیرے　　کبھی ڈالے بہار میں ڈیرے
کبھی مدراس کی فضاؤں میں　　کبھی آسام کی ہواؤں میں
بوئے گُل تھی۔ چمن میں جم کے رہی　　ایک مدّت دکن میں جم کے رہی
تھے مرے دو وطن بہت مشہور　　حیدرآباد اور بیجاپور
لیکن اِن کُوچہ گردیوں میں کبھی　　چھوٹ کر بھی نہ چُھٹ سکی دہلی
گھر مرا قصرِ خسروانہ تھا　　آگرہ جس کا صحن خانہ تھا
مَیں ہُوں از روئے ربطِ بنیادی　　دہلوی اور اکبرآبادی
الغرض یونہی گھومتے پھرتے　　سالہا سال مُجھ کو بیت گئے
عام لوگوں کی ترجُمانی کی　　بادشاہوں کی میزبانی کی
مَیں ہُوں۔ صوفی سے جو گلے مِل لے　　خانقاہوں میں کھینچ کر چلّے
ناگہاں جہل کا مٹا سایا　　خُسروِ علم و فن کا عہد آیا
جس سے تاریخِ ہند کی تزئین　　عہدِ شاہِ جہاں۔ شہابُ الدین

سر پہ بالِ ہُما۔ خدا کی قسم
تختِ طاؤس۔ جس کے زیرِ قدم

لعل قلعہ تھا۔ جس کا نقشِ عمل — جس کا نقشِ خیال۔ تاج محل
اُسی سُلطانِ نکتہ پرور نے — "بوالمعالی ابوالمظفر" نے
خود کو شاہِ جہاں خطاب دیا — مجھ کو "اُردُوِ زباں" خطاب دیا
تھا جو تقدیر میں مجھے بخشا — قلعہ جاگیر میں مجھے بخشا
دیکھ کر بادشاہ کے الطاف — آملے مجھ سے سارے اہلِ خلاف
لیکن اس قُربِ شاہ کے باوصف — مجھ میں کچھ وصف تھا تو اتنا وصف
بزمِ شہ میں اُداس رہتی تھی — عام لوگوں کے پاس رہتی تھی
مجھ کو جمہور سے محبّت تھی — مجھ سے جمہور کو عقیدت تھی
اُن کی رُوحوں کی رازداں میں تھی — اُن کے سینوں کی ترجماں میں تھی
ہم زبانی عوام سے تھی پسند — خود پرستوں سے بول چال تھی بند
میں تھی آدابِ انجمن سے نفور — اُمرا کے فریب و فن سے نفور
اُن کی چوکھٹ نہ چُومنے والی — میلوں ٹھیلوں میں گھومنے والی
کام کی بات کام کی بولی — سیدھی سادی عوام کی بولی
دلّی والوں سے تھی میں شیر و شکر — جمّا مسجد سے پُوچھ لو جاکر
میری طبعِ رواں کی تھی اِک دُھوم — گومتی سے کرے کوئی معلوم
ہر روایت ہے اہلِ ذوق کو یاد — کوئی راوی سے پُوچھ لے رُوداد
صاف میرا نشانِ عظمت ہے — چار مینار خود شہادت ہے
سیکڑوں محفلیں سجا کے رہی — لکھنؤ میں تو گھر بنا کے رہی

گردشِ بخت کا نہ تھا ہولا — پشت پر تھے جو آصف الدولہ
موج میں آکے دُور دُور گئی — مُرشد آباد و رام پور تک بھی
علم میں تھے جو شہرۂ آفاق — مجھ کو قدرت نے وہ دیے عشاق
سرِفہرست جن کا نام جلی — کون؟ وہ شاعروں کے پیر "ولی"
کیا شرف اُن کی ذاتِ پاک کو ہے — فخر جن پر دکن کی خاک کو ہے
ابتدا میں جو فن کے خاتم تھے — مظہر و آرزو و حاتم تھے
پھر جو اُردو کے دست گیر ہوئے — اُن میں سب کے امیر "میر" ہوئے
جن سے خود میں نے زندگی پائی — شیخ سودا تھے میرے سودائی
پھر ہوئے مصحفِ سخن کے امیں — مصحفی۔ اہلِ فن کے صدر نشیں
مصحفی سے رواج شعر ہُوا — جس کے شاہد ہیں جرأت و انشا
مجھ سے جن کو عقیدۂ راسخ — ایک آتش تھے دوسرے ناسخ
ذوقِ نو کا جو دل ہوا طالب — رونقِ انجمن ہوئے غالب
رہ گئے جب سخن میں نقالی — آئے تبدیلِ حال کو "حالی"
جن کی خدمات کی نہیں کوئی حد — شبلی آزاد اور نذیر احمد

فاتحِ ذوقِ عصر۔ سر سیّد
"نظم" حالی تھے "نثر" سر سیّد

یہ مری بزم کے تھے صدر نشیں — جن کا ثانی کوئی جہاں میں نہیں
کیا مبارک مرا ستارا ہے — جس کو اقبال نے اُبھارا ہے
الغرض میرا نام۔ میرا نشان — مایۂ فخر ہند و پاکستان
آج کو عاجز و ذلیل ہُوں میں — عظمتِ قوم کی دلیل ہُوں میں

اللہ اللہ یہ میری جاں بخشی — میں نے اس قوم کو زباں بخشی
جب ہوئی جاں بلب مغل شاہی — عہدِ اسلاف۔ جب ہُوا راہی
خاتمہ کر کے خانہ جنگی کا — دَور دَورہ ہوا فرنگی کا
عربی۔ غم سے سر ٹپکنے لگی — فارسی۔ خارسی کھٹکنے لگی
طرزِ انگلش کا زور شور بڑھا — فاتحوں کی زباں کا زور بڑھا
چھوڑ کر رن جو سُورما بھاگے — میں اکیلی تھی۔ پر بڑھی آگے
کس نے ہمّت یہ آج تک کر لی — میں نے انگلش زباں سے ٹکّر لی
خود حریفانِ جنگ نے مانا — میرا لوہا۔ فرنگ نے مانا
ہاتھ مفلوج۔ پانے ہمّت لنگ — قوم جب خوف غیرت سے تھی گُنگ
سامراجی غرور و نخوت سے — سی دیا تھا لبوں کو ہیبت نے
لب تنقید کھولتا ہی نہ تھا — جب کوئی ڈر سے بولتا ہی نہ تھا
میں کہ جس نے زباں کو طاقت دی — قوم کو بولنے کی ہمّت دی
دیکھ کر ظالموں کا استبداد — میں نے چھیڑا "ترانۂ آزاد"
پا کے افکارِ قوم کو گم راہ — میں نے بخشا شعورِ نقد و نگاہ
مرضِ جہل کو شفا بخشی — میں نے تہذیب کو جِلا بخشی
تجھ کو بیدار کر دیا میں نے — میں نے اے قوم بے وفا میں نے
تیرے ماضی کی جانشیں ہُوں میں — تیری تاریخ کی امیں ہُوں میں
قوم نے میری جیب میں پائے — عربی فارسی کے سرمائے

جس سے نکھرا ہے رنگِ آزادی
میں نے جیتی وہ جنگِ آزادی

محشر بدایونی

خالق و تخلیق

وہی چمن میں بڑائی کا حق بھی پاتے ہیں
جو پھول دیتے ہیں اور آپ زخم کھاتے ہیں
جو آگے بڑھتے ہیں منزل کی دعوتیں دیتے
اُنھیں سفر میں بہت سانحے ستاتے ہیں
یہی ہے اُن کے مذاقِ بلند کی پہچان
زمانہ ہنستا ہے اُن پر وہ مسکراتے ہیں
اُن اہلِ ظرف سے پوچھو تہی نصیبیِ ظرف
جو اپنی پیاس کو مشکل سے لب پہ لاتے ہیں
ادھر بھی صرف کریں روشنی کی کچھ کرنیں
وہ جن کے قصر چراغوں سے جگمگاتے ہیں
یونہی امین چمن باغباں نہیں بنتے
چمن کی خاک کو برسوں لہو پلاتے ہیں
وہ موج موج رگ گُل میں دوڑتے ہیں جو رنگ
سمٹ کے زخمِ بہاراں میں ڈوب جاتے ہیں
اک ایسا وقت بھی آتا ہے شبنمِ گُل پر
کہ تول کر اُسے کانٹے بھی آزماتے ہیں
ستارے شب کی سیاست میں لاکھ گھر جائیں
کہیں اُجالے اندھیروں سے مات کھاتے ہیں
ہزار تیز چمک ہو ہزار سخت گرج
بنانے والے مگر آشیاں بناتے ہیں
پھر اُن کے شوق سے یہ فرق پیدا ہوتا ہے
نشیمن اپنی جگہ خود ہی برق ہوتا ہے

بلراج کومل

★

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی نذر

صحنِ گلشن کے ایک گوشے میں
باوقار و بلند و سنجیدہ
ایستادہ ہے پیڑ برگد کا

موسمِ گل ہو یا زمستاں ہو
رات اور دن ہوئے ہوں سودائی
آندھیوں کی ہو یورشِ پیہم
شعلے آکاش سے برستے ہوں
لو کے ہمراہ نرم پروائی
لے رہی ہوں گھٹائیں انگڑائی
رُت کے غمزوں کے اس تسلسل میں
وقت سے بے نیاز، بے پروا
باوقار و بلند و سنجیدہ
ایستادہ ہے پیڑ برگد کا

اس کے ٹھنڈے گھنیرے سائے میں
دوپہر آنکھ موند سوتی ہے

شام کے تیزگام لمحوں میں
نغمۂ شب کی چاپ ہوتی ہے
صُبح دم صد ہزار آوازیں
نیند کے ساتھ گھُلتی جاتی ہیں
حسنِ فطرت کے خیر مقدم کو
تازگی کا پیام لاتی ہیں
دل میں جذباتِ نو جگاتی ہے

حسرتِ دید کے گلستاں میں
باوقار و بلند و سنجیدہ
ایستادہ ہے پیڑ برگد کا

میں وہ صحرانورد ہوں جس کا
سوچ کی ایک ساعتِ سیمیں
سبز پتّوں کی محفلِ رنگیں
اپنی واماندگی کو ترسا لوں!
لمحہ بھر کو یہاں میں سستا لوں!!

اَدب کے نام پہ قائم ہیں حلقہ ہائے نہنگ
زباں کے پردۂ زرکار میں چھپے ہیں پلنگ
یہ اہلِ علم ، یہ اُردو زباں کے شیدائی
بڑے خلوص سے لڑتے ہیں اقتدار کی جنگ
زباں کا زور دِکھاتے ہیں اس طرح جیسے
کوئی حریفِ مخالف پہ پھینکتا ہے خدنگ

مرے بزرگ ، مرے رہنما ، مرے محسن
قسم خدا کی گوارا نہیں مجھے یہ ننگ
کوئی طریق کہ پیدا ہو اتحادِ عمل
کوئی سبیل کہ چھُٹ جائے فطرتوں سے یہ زنگ

ترا وجود نئی زندگی کا راہنما
تری حیات نئی آگہی کی ایک ترنگ
ضمیرِ عصر سے اس طرح برسرِ پیکار
کہ جیسے شعلۂ مضطر میانِ آہن سنگ
ترا بیان ، دلِ قوم کی دُکھی آواز
ترا سکوت ، حریفِ سیاستِ افرنگ
ادب کی رُوحِ مقدس ہیں تیرے شہ پارے
کہ پیش کرتے ہیں تحقیق و جستجو کے ڈھنگ

ترے قلم کی روانی ترے بیان کا لوچ
کہ حرف حرف شگفتہ، سطر سطر ہے اُمنگ
ترے خیال کی رنگینیوں کے محور پر
سمٹ کے آتے ہیں ہر سمت سے نئے آہنگ
تری نگاہ کی جولانیوں کے پرتو سے
عیاں ہے چہرۂ "اُردو" سے اعتدال کا رنگ

زمانہ تیری صداقت سے گو رہا شاکی
مگر کبھی نہ زمانہ کی تُونے پروا کی
جہاں میں حق و صداقت کی لاج ہو تجھ سے
ترے مزاج کا جوہر ہے تیری بے باکی
ترے شعور کی مشعل ہے ہر جہت رَوشن
ترے جنوں سے گریزاں خرد کی چالاکی
یہ تیرا عزمِ مصمم، یہ تیرا جوشِ عمل
دلیلِ عظمتِ کردارِ آدمِ خاکی
ترے خلوص کی شدّت سے ٹوٹ ٹوٹ گیا
طلسمِ مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی
بجا کہ تیری قیادت پہ ناز ہے مجھ کو
بجا کہ تونے اک اعلیٰ مثال پیدا کی

لسانِ عصر ہے تو بھی مثالِ سرسیّدؒ
جمیلؔ کو بھی عطا ہو نوید، فرداکی

تو نے لَو تیز کی مشعلِ علم کی تیرگی چھٹ گئی کارواں چل پڑے
تیری للکار سے رہروانِ ادب چونک اُٹھے اور بعزمِ جواں چل پڑے

ایک ترویج اُردو کا پیغام تھا جس کو لے کر پھرا شہر در شہر تو
آفریں تجھ کو اور تیرے پیغام کو چونک کر محوِ خوابِ گراں چل پڑے

دِل کی گہرائیوں سے اٹھی تھی صدا رزم بھی جھوم اُٹھی بزم بھی جھوم اُٹھی
محملوں کے حجابوں میں جنبش ہوئی رقص کرتے ہوئے سارباں چل پڑے

تیرے جوشِ عمل تیرے کردار نے ان کو وہ عزمِ راسخ عطا کر دیا
شکوۂ تنگیٔ ارض کرتے ہوتے بعض رہرو سوئے کہکشاں چل پڑے

تجھ پہ رحمت کہ نقار خانے میں بھی تیری آواز بانگِ درا بن گئی
کچھ یہاں جاگ اُٹھے کچھ وہاں جاگ اُٹھے کچھ یہاں چل پڑے کچھ وہاں چل پڑے

اس غضب کی گھلاوٹ تھی خطبات میں اس بلا کی حلاوت تھی گفتار میں
خادمانِ زماں پاسبانِ ادب نغمہ بر لب اُٹھے نغمہ خواں چل پڑے

تیری رفتار نے تیری گفتار نے تیرے اخلاق نے تیرے اطوار نے
اک نئی روح ہر جسم میں پھونک دی نیم جاں اُٹھ گئے ناتواں چل پڑے

آج تک جو تذبذب میں تھے مبتلا تیرے اخلاق و ایثار کو دیکھ کر
تیری خدمات کے معترف ہو گئے بھول کر فکرِ سود و زیاں چل پڑے

تیرا نعرہ صداقت سے بھرپور تھا یک زباں ہو کے لبیک سب نے کہا
اہلِ ہوش و خرد اہلِ فکر و نظر صورتِ صرصرِ بے اماں چل پڑے

اس ضعیفی و کہنہ سنی میں تجھے دشمنوں سے نبرد آزما دیکھ کر
تلملا سے اُٹھے آستاں چھوڑ کر وقف سنگِ درِ آستاں چل پڑے

تیرے گلزار میں نت بہار آئے گی لہلہاتا رہے گا ترا گلستاں
ہو کے اسبابِ تزئین سے آراستہ جوق در جوق پھر باغباں چل پڑے

صہبا اختر

مشورہ

[یہ نظم میں نے اس وقت لکھی تھی جب انجمن ترقی اردو کے معاملات و مسائل میں موجودہ انقلابی حکومت کی مداخلت سے پہلے بابائے اردو کو معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا تھا]

سیلِ غم ہے تو اسے آپ ہی برداشت کریں
آپ کے غم میں پریشاں کوئی گیسو کیوں ہو
آپ اُردو کے پرستار تھے ہوں گے صاحب
اس سے ممنون صنم خانۂ اُردو کیوں ہو
ہم بھی انگلی کو کٹا کر ہیں شہیدوں میں شریک
آپ کے خون کی بس نکہت و خوشبو کیوں ہو

○

سچ یہاں خواب ہے اور خواب بھی دیوانے کا
آپ مر جائیں کہ بن جائیں فسانہ صاحب
آ گئے جن کی ہے میراث زبانِ اُردو
ڈھونڈئیے اور کہیں جا کے ٹھکانہ صاحب
آپ دستار سنبھالیں کہ بہت نازک ہے
میر صاحب کی زباں میں یہ زمانہ صاحب

○

آپ تدبیر کی مشعل کو اٹھائیں گے اگر
اور ہو جائیں گے تقدیر کے سائے گہرے

چڑھتے سورج کی پرستش تو سبھی کرتے ہیں
آپ ظلمت میں اترتا ہوا سورج ٹھہرے
آپ اَب شجرہ دکھائیں کہ نسب بتلائیں
لگ چکے کوفہ نژادوں کے ادب پر پہرے

○

روک لیتی ہے اگر راہ غرض کی دیوار
ڈھونڈھ لیتے ہیں یہاں نت نئے رستوں کو لوگ
آپ کو وقت کی رفتار کا اندازہ نہیں
چھوڑ سکتے ہیں کہاں وقت پرستوں کو لوگ
جن کے سائے نئی نسلوں کو جنم دیتے ہیں
کاٹ دیتے ہیں انہی بوڑھے درختوں کو لوگ

○

آپ نے خون دیا، دودھ پئیں گے ہم لوگ
ہم بھی ممنون ہیں دیوانۂ لیلیٰ ہوں گے
آپ نے عمر بتا کر جسے تعمیر کیا
آج اُس قصر میں ہم صاحبِ جلوا ہوں گے
تختِ اُردو پہ ضعیفی کے قدم ٹھیک نہیں
تختِ اُردو پہ نئے انجمن آرا ہوں گے

بابائے اردو

از:- حمایت علی شاعر

یہ نظم اس دور کی یادگار ہے جب انجمن ترقی اردو کے حالات ناگفتہ بہ تھے اور ابھی انقلابی حکومت نے اس کا نظم و نسق نہ سنبھالا تھا۔

وہ اک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لئے
وہ اک دماغ کہ مشعل ہے اہلِ فن کے لئے

وہ جل رہا ہے کہ اوروں کو روشنی مل جائے

دلوں کی آگ نگاہوں کا نور زندہ رہے
خیال و خواب کی راہوں کا نور زندہ رہے
لبوں پہ حرفِ تمنا کے پھول کھلتے رہیں
جہانِ دل کے یہ ننھے رسول ہنستے رہیں

مگر یہ غم کہ دلوں کو زباں نصیب نہیں
خیال و خواب کو حسنِ بیاں نصیب نہیں
لبوں پہ کاغذی پھولوں کی مسکراہٹ ہے
نظر میں جھوٹے نگینوں کی جگمگاہٹ ہے
سکوتِ درد کو اذنِ فغاں نصیب نہیں
یہ وہ زمیں ہے جسے آسماں نصیب نہیں

میں سوچتا ہوں کہ وہی چراغِ آخرِ شب
اور اس کی بزم کا ہر نغمہ گر ہی مہر بہ لب
نجانے وقت کی تقدیر میں لکھا کیا ہے
چراغِ آخرِ شب کی حیات کا کیا ہے
خدا کرے کہ اسے میری زندگی مل جائے

شاہد عشقی

اک شکن آلودہ ہاتھ

اب ہے اس برگد کا سایہ کس قدر مہماں نواز
کارواں کتنے ٹھہرتے ہیں اب اس کی چھاؤں میں
گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لئے
دوپہر کتنے گزرتے ہیں اب اس کی چھاؤں میں
لیکن اس کی زندگی ہے کتنے افسانوں کا راز

اب توانا اس کی شاخیں ہیں، کبھی نازک بھی تھیں
دھوپ سے اس کا تنِ نازک جھلس جاتا بھی تھا
اب تو ہر موسم کی شدت اس کے آگے گرد ہے
ایک دن پانی نہ ملنے پر یہ مرجھاتا بھی تھا
دور اس کو آسماں تھا سخت تھی اس کو زمیں

آج کوئی سوچتا تک بھی نہیں اس بات کو
یہ تناور پیڑ اک ننھا سا پودا تھا کبھی
جھرّیاں بن کر رقم ماضی ہے جن ہاتھوں پہ آج
ننھے پودے کو انہیں ہاتھوں نے سینچا تھا کبھی
آج کوئی دیکھتا تک بھی نہیں اس ہات کو

وقت کے دھارے پہ کتنے کارواں بہہ جائیں گے
قہقہے گونجا کریں گے پھر بھی اس کی چھاؤں میں
بھولتے جائیں گے لیکن رفتہ رفتہ کل کے لوگ
ان شکن آلودہ ہاتھوں کو خود اس کے گاؤں میں
نقش کچھ تاریخ کے صفحات پر رہ جائیں گے

فضا ابنِ فیضی

★

شاہدِ اردو

تھے جہاں سورج پشیماں اور صبحیں سرگراں
تو وہاں سوزِ عمل کی روشنی بن کر اٹھا

پردۂ شب میں جہاں خورشید محوِ خواب تھے
تو وہاں شامِ جنوں کی چاندنی بن کر اٹھا

اللہ اللہ! یہ تری تابِ نظر کی شوخیاں
ذرہ ذرہ آبروئے دلکشی بن کر اٹھا

یہ ترے کردار کی خوش قامتی یہ بانکپن
تو چمن میں اپنے "سروِ آگہی" بن کر اٹھا

یہ طبیعت کی گل اندامی یہ فطرت کا گداز
تو ہر اک محفل میں "بوئے خوش دلی" بن کر اٹھا

تھے وہ عہدِ جنوں جب تیرے جذبے کا نکھار
بھی اردو میں "شعورِ دلبری" بن کر اٹھا

دوڑتی پھرتی ہے مری رگ رگ میں روحِ ارتقا
اس ادا سے کون جانِ زندگی بن کر اٹھا

کم نہیں ہوتا کسی صورت خمارِ آگہی
کون مے خانے میں موجِ سرخوشی بن کر اٹھا

اس طرف بھی آ! کہ پیاسی ہے مری روحِ ...
اے سرودِ گل! مری آواز کے سانچے میں ...

مرغ زارِ ہند سے نزہت سرائے پاک میں
لے اڑی تجھ کو نسیمِ شوق، خوشبو کی طرح

تجھ سے رہ کر دور بھی اکثر ترا دلکش خیال
میرے شانوں پر بکھر جاتا ہے گیسو کی طرح

سوچتا ہوں تجھ سے ملنے کی یہ حسرت اب کہیں
میری آنکھوں سے ٹپک جائے نہ آنسو کی طرح

ہے خیابانِ وطن میں دیر سے محوِ خرام
زندگی تیری کسی طرّار آہو کی طرح
تیری خاموشی ہے پھولوں کا "سکوتِ شبنمیں"
تیری باتیں ہیں "حدیثِ چشم و ابرو" کی طرح
تیری شوخ و شنگ تحریروں کا آہنگِ جواں
سر پہ چڑھ کر بولنے لگتا ہے جادو کی طرح
مطمئن آشوبِ دوراں سے ہے تیری گود میں
اُردوئے رعنا "کسی معصوم گُل رو کی طرح"
ساغرِ سرسیّد و اقبال کی صہبا ہے تو
دل رُبا ہے تیرا ہر انداز اردو کی طرح

ہوں گے افسوں آشنا یل کھا کے گیسو کچھ اور
چاہتی ہے بانکپن تجھ سے مری اُردو کچھ اور

مطربِ فکر و نظر! اے ساقیٔ میخانہ ساز!
تونے اُردو کو کیا پیمانۂ قند و گلاب
زہرۂ شعر و ترنّم بن گئی ہر انجمن
لے لیا ہاتھوں میں جب تونے تخیّل کا رباب
حالی و شبلی کے ذوقِ تربیت کی چاشنی
تیرے مینائے سُخن میں ڈھل گئی بن کر شراب
یہ تیرے سوزِ تفکّر کی نکھرتی چاندنی
تُل رہے ہیں صبح کی میزان میں راتوں کے خواب
یہ تیرے "ابرِ قلم" کی رِشحہ باری ہے، مگر
بن گئی موجِ رواں افکار کی جوئے کم آب
ذرّہ ذرّہ بن تڑپ اُٹھے ہزاروں ماہ و خور
روئے پندارِ خودی سے تونے جب الٹی نقاب

یہ شعورِ دور بینی یہ عمل کی پختگی
تیری پیری لے رہی ہے نوجوانی سے حساب
تجربے کی یہ صداقت یہ حکیمانہ شعور
تیری خلوت میں ہے روحِ عصرِ حاضر بے نقاب

تیری حکمت نے یہاں ہیرے تراشے کا ہ ِ
گرم ہے ماحول تیرے فلسفے کی آنچ

یہ ترے لہجے کی نرمی، تیری باتوں کی مٹھاس
چھیڑ دے جیسے کوئی سازِ رگِ جاں پر غزل
میری حیرت آشنا نظروں میں یہ تیرا وجود
"لالۂ کہسار" ہے یا جھیل کا "تازہ کنول"
تیرے کتنے نام ہیں اور کیسے کیسے روپ ہیں
تو کہیں صہبا کہیں امرت کہیں قند و عسل
زندگی نے تجھ سے سیکھا شیوۂ فرزانگی
ہے تری ہر سانس میں خوشبوئے ایثار و عمل
انجمن بیدار رہی ہر دور میں تیری نظر
ہوں علی گڈھ کے شبستاں یا کراچی کے محل
بزمِ اُردو کو دیا پیرایۂ حُسنِ حسیں
پھول سے تونے کہا، بجلی کے گہوارے میں پل
دانش و تہذیب کا سرمایہ تیری ہر نگاہ
تیرے آئینے میں روشن جوہرِ حُسنِ ازل
اے چراغِ فکر و فن! اے شمعِ فانوسِ سخن
ہاں! اسی انداز سے محراب میں طوفاں کے جل

آشنا کر دے فسانوں کو نئے عنوان
لے لے تھوڑی شام بھی اب زلفِ پاکستان

تونے اُردو آشنا تہذیب کو آواز دی
وقت کی آنکھوں سے ٹپکا تیرے گیتوں کا خمار
تونے اک عہد آفریں اسلوب بخشا ذہن کو
تیری چتون سے عیاں ہے فکرِ شاعر کا وقار
تو سنبھلی، دانشِ بیمار کو ہوش آگیا
یوں ہوئی گرمِ کرم تیری نگاہِ چارہ کار
تیوروں میں عزم، دل میں شفقتوں کی تازگی
بکھری ہے پھوُل کی تو یا کسی خنجر کی دھار
ہیں ترے پائے سفر آگاہ کی انگڑائیاں
جو نکتی سی منزلیں یہ جاگتے سے رہگزار
ہیں اب اُن راہوں میں تیرے ساتھ اہلِ کارواں
آبلوں کو راس آجائے جہاں کانٹوں کا پیار
کن بہاروں سے ہے آخر تیری فطرت کا خمیر
بن گیا ہے نکہتِ گُل تیری راہوں کا غبار
ہے قدِ موزوں ترا یا جامہ زیبی کا طلسم
چُست ہے اس پر جہاں کا ہر لباسِ زرنگار
تیری عقلِ نکتہ پیرا ہے ہر اک فن میں دخیل
اک "ادارہ" ہے بجائے خود تری ذاتِ جمیل

ہے کہانی تیری اُردو کی کہانی کا نچوڑ
چپ ہے تو ہونٹوں میں اپنے دل کشا نغمے لئے
آفتوں کی گود میں پختہ ہوا تیرا شعور
تونے موجِ خوں میں بھی اپنے سفینے کھے لئے
گردشِ دوراں کو آئینہ دکھانا تھا ضرور
تونے اندازِ تبسّم دل کے زخموں کے لئے
سامنے آیا جو اُردو کے تحفّظ کا سوال
اُٹھ پڑا تو تیوروں میں عزم کے شعلے لئے
روشنی بکھری ہے تیرے "نقشِ پا" کی دور تک
تیرگی راتوں کی ہے ہاتھوں میں آئینے لئے
اب بھی ہے ہم سے مخاطب تیری پیری کا جلال
خال و خط میں زندگی کی صبح کے جلوے لئے
تیرے ساغر میں ہے نوّے سال کی صہبائے تیز
کون محفل میں اُٹھا امرت کے پیمانے لئے
ایک دانش گاہِ اُردو تیرے دل کی آرزو
جانتا ہوں میں کہ تو زندہ ہے اب جس کے لئے
کاش آنکھیں کھول دے تیرا یہ "خوابِ مرمریں"
آسماں بن جائے لاہور و کراچی کی زمیں

یوسف جمال انصاری

بابائے اردو کی خدمت میں

(۲۴ فروری ۱۹۵۹ء کو اسلامیہ کالج سول لائنز۔ لاہور میں تشریف آوری کے موقع پر)

جو کم نظر ہیں وہی جاہ و زر کو دیکھتے ہیں
ہنر کے دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں

جو بے عمل ہیں وہی کار گاہِ ہستی میں
دعائے صبح و مسا کے اثر کو دیکھتے ہیں

ہزار دشت بھی، دریا بھی سامنے آئے
جو رہ نورد ہیں وہ راہبر کو دیکھتے ہیں

وفا پرست ہیں بوٹے [illegible]
خلوص کیش خلوصِ نظر کو دیکھتے ہیں

شکن ہے گیسوئے اُردو میں اب بھی لیکن ہم
ردائے شب میں عروسِ سحر کو دیکھتے ہیں

وہ خضرِ چشمۂ عرفان و علم عبدالحق
جدھر نگاہ کرے سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

کمالِ آئینہ سازی پہ جن کو حیرت تھی
خود اپنی بزم میں آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

رضا ابن حامد رضوی

★

فخرِ مشاہیر

تو کہ اک فخرِ مشاہیرِ زبانِ اُردو
کلکِ معنی ترا ہمرازِ فغانِ اُردو

وہی اُردو کہ ولیؔ جس کے اسیرِ گیسو
میرؔ و سوداؔ کی غزل جس کے ذہن کی خوشبو

مصحفیؔ، دردؔ، حسنؔ، جرأتؔ و انشاؔ، آتشؔ
ناسخؔ و شیفتہؔ و ذوقؔ کی جس میں کاوش

وہی اُردو جسے مومنؔ کے سخن نے سینچا
مرزا غالبؔ سے جسے کاملِ فن نے سینچا

میرامنؔ کی زباں سلکِ گہر کی صورت
جامِ سرشارؔ کی مے نورِ قمر کی صورت

معدنِ اُردو کا اک گوہرِ نایاب نظیرؔ
فخرِ اُردو جنھیں کہیے وہ انیسؔ اور دبیرؔ
دامنِ اُردو میں آزادؔ و شررؔ سے نثّار
سیّد و شبلیؔ نے مہکائی فضائے گلزار
داغؔ و چکبستؔ بھی حالیؔ بھی شعاعِ اُردو
شاعرِ مشرق کا پیغام متاعِ اُردو
حسرتؔ و حشرؔ نے اکبرؔ نے سنوارا اس کو
آتشِ گل سے جگرؔ نے بھی نکھارا اس کو
شمسِ اُردو جنھیں کہیے وہ نذیرِ خوش خو
یلدرمؔ نے بھی سنوارے ہیں ادب کے گیسو
شاعرِ شعلہ بیاں جوشؔ کی آواز کے ساتھ
اُردو آئی ہے یہاں تک عجب انداز کے ساتھ
وہ جواں مرگ کہ آہنگ ہے جس کی آواز
شاعرِ مطربِ فطرت کہ کہیں جس کو مجازؔ
ملکِ پطرسؔ کی وہ شوخی وہ ظرافت اس میں
منٹوؔ مرحوم کا اندازِ جراحت اس میں
فیضؔ کا زورِ بیاں آج ہے زیبِ اُردو
نقشِ فریادی ہے یادستِ صبا ہیں خوشبو

منفرد اپنی جگہ پریم کا اندازِ بیاں
آج کے دور میں کرشن کے فسانے ہیں جواں

نظمِ آزاد سے راشد نے بڑا کام لیا
ساقیٔ وقت نے ہاتھوں میں نیا جام لیا

پاک اور ہند کی مشترکہ زباں ہے اُردو
بعدِ تقسیم مگر محوِ فغاں ہے اُردو

ان فضاؤں میں تری ذات غنیمت ہے بہت
اہلِ دانش کو جبھی تجھ سے عقیدت ہے بہت

تجھ پہ نازاں نہ ہو کیوں آج زبانِ اُردو
تجھ سے ملتا ہے زمانہ کو نشانِ اُردو

تجھ پہ کچھ ناز نہیں آج یہ بے جا اس کا
اک تری ذات سے وابستہ ہے فردا اس کا

زندگی وقف رہی تیری برائے اُردو
تیری کاوش سے مہک اٹھی فضائے اُردو

جامعۂ اُردو کا آغاز ہے اُردو کالج
عزمِ راسخ کا ترے راز ہے اُردو کالج

اک نئے دور کی غمّاز ہے جوبلی تیری
روحِ اُردو کو وجہِ ناز ہے جوبلی تیری

نصیر کوفیؔ

*

صد آفریں تجھے اُردو کے مونس و غم خوار
ہر اک نفس ہے تری زندگی کا بیش بہا
ترا چراغِ عمل تا ابد رہے روشن
تری متاعِ ہنر کو ہو عمرِ خضر عطا

بصد خلوص رہا وقفِ خدمتِ اُردو
ضعیف جسم جواں دل جواں اُمنگ لئے
رہِ طلب میں ترا انہماک کیا کہنا
ہر اک قدم ہے خلوص و وفا کا رنگ لئے

یہ جدّوجہدِ مسلسل یہ سعیٔ بے پایاں
مگر ہے خواب ابھی تیرا تشنۂ تعبیر
یہاں جنونِ وفا کا صلہ ملے نہ ملے
مگر جنوں میں بھی ہوتی ہے قوّتِ تسخیر

یہ چاندنی یہ ستارے یہ صبح کی تنویر
خجل ہیں تیری تجلّی کے روبرو سارے
عظیم ہے تری ہستی عظیم فن تیرا
بچھائے کیوں نہ فلک تیری راہ میں تارے

ہزار بادِ مخالف کی زد میں رہ کر بھی
زہے چراغِ تمنّا کہ جھلملا نہ سکے
قدم قدم پہ نئے پیچ و خم رہے درپیش
ترے قدم تھے کہ اُس پر بھی ڈگمگا نہ سکے

تمام عمر کی محنت، یہ خدمتِ بے لوث
ہزار کوئی بھلائے بھلا نہیں سکتا
رہے گا ثبت ترا نام لوحِ ہستی پر
مٹائے بھی تو زمانہ مٹا نہیں سکتا

جامؔ بنارسی

★

بابائے اردو

سلمائے زباں ہو کہ وہ لیلائے ادب ہو
رنگینیِ عارض ہے ترے خونِ جگر سے !

گلشن میں جواں سال جو اک سروِ زباں ہے
فردوس نظر ہے وہ ترے حسنِ نظر سے !

تھی منتظرِ شانہ بہت کاکلِ اُردو
ہاں تو نے سنوارا ہے اُسے کیسے ہنر سے !

ننھی سی کرن بن گئی انوار کا مخزن
پیشانیِ اُردو ترے تابندہ گہر سے!

اُردوئے معلّٰی کا حسیں آج سمن زار
کس درجہ ہے شاداب ترے فیضِ نظر سے!

پا جاتا ہے خود جادۂ تحقیق کا راہی
منزل کا نشاں تیری تگ و دو کی سحر سے!

اک دورِ تمدّن ہے تری ذات میں مضمر
یہ رنگ جھلکتا ہے تری راہِ گذر سے!

طوفان کے تھپیڑوں میں بھی اُردو کی یہ قندیل
رہتی ہے فروزاں تری کاوش کے شرر سے!

اللہ کرے لالۂ اُردو کی بہاریں
نکھریں تری شادابیِ ارماں کے اثر سے!

پُر نور فضائیں رہیں اُردو کی ہمیشہ
روشن رہے یہ بزم ترے شمس و قمر سے!

سہیل اقبال

★

سوچتا ہوں تری ہستی پہ جو لکھوں بھی تو کیا

تیرے بارے میں اُٹھایا جو قلم ہاتھوں نے
قریۂ دل، افقِ ذہن غزل خواں ہی ملے
جتنے الفاظ بھی آئے ہیں پئے لطفِ بیاں
تیری عظمت تری رفعت کے وہ خواہاں ہی ملے

تیرے احساس کے نغمے ترے جذبات کی دُھن
سازِ تحقیق پہ اس طرح اُبھر آئی ہے
جیسے افکارِ گل افشاں کی بدولت بابا
تیری تصویر ہر اک دل میں اُتر آئی ہے

نہ اشاروں میں بناوٹ نہ کنایوں میں فریب
تیری تحریر بھی سادہ ہے ترے دل کی طرح
تونے تشبیہہ و تراکیب کا بدلا ہے لباس
تونے اردو کو سجایا کسی محفل کی طرح

تیری کاوش سے ہوئی آج زباں اتنی وسیع
جو بھی احساس ہو دل میں وہ بیاں ہو جائے
لیکن اردو میں نہیں آج بھی وہ لفظ کہ جو
تیری عظمت تری منزل کا نشاں ہو جائے

تیری خدمات نے بخشی تجھے اے شعلہ نفس
ایسی معراج کہ جس کی کوئی معراج نہیں
صرف اظہار عقیدت ہے وگرنہ ، بابا
تیری عظمت کسی تحریر کی محتاج نہیں

سوچتا ہوں تری ہستی پہ جو لکھوں بھی تو کیا

محسنؔ بھوپالی

بابائے اردو
کی
انتھک
جدوجہد
کے نام

یورشِ بادِ مخالف کے مقابل رہ کر
طنزِ اغیار کے احباب کے طعنے سہہ کر
خندہ پیشانی سے ہر جور کو احساں کہہ کر

شمعِ حق کو کفِ ظلمت سے بچائے رکھنا
اپنی رگ رگ سے لہو دے کے جلائے رکھنا
کانپتے ہاتھوں کو فانوس بنائے رکھنا

سعیِ بے سود سہی کوشش بیجا ہی سہی
اہلِ دنیا کی نگاہوں میں یہ سودا ہی سہی
سرخیِ خونِ جگر وجہِ تماشا ہی سہی

آخر اس شب میں اجالے کا کہیں نام تو ہے
صبحِ نو دور سہی صبح کا پیغام تو ہے

نظر جعفری

بابائے اُردو

نام سے تیرے فروزاں ہے چراغِ علم و فن
تیرے ہاتھوں نے سنواری زُلفِ اُردو کی ثنا

ہر نئی مشکل میں تیرے حوصلے بڑھتے گئے
عظمتیں تیری ہیں تیرے دشمنوں پر خندہ ز

ابتدائی لفظ و معنی سے کیا اُردو کو پاک
اب متانت سے تری سنجیدہ ہے رُوئے سخ

تجھ پہ اے بابائے اُردو ناز کرتی ہو زباں
سی دیا ہے تُو نے اُردو کا دریدہ پیر

ایک خوشبو رقص کرتی ہو دل و جاں کے قریب
ہیں تری تقریر میں پنہاں گُلاب و یاسم

تو نے ہر ہر گام پر آفات کو ٹھکرا دیا
کیا ڈرا سکتی تھی تجھ کو منزلِ دار و ر

زندگی کی راحتوں سے مُنھ کو اپنے موڑ کر
وقف کر دی زندگی تُو نے برائے علم و

سادگی میں اَیسی پُرکاری جو دِل کو موہ لے
ہے تری تحریر گویا پھُول کا ایک پیر

رونقِ بزمِ ادب قائم ہے تیری ذات سے
زندگی تیری ہے سرتا پا چراغ انجم

ہر عبارت نقش ہو جاتی ہے لوحِ قلب پر
لفظ ہے ایک ایک تیرا نازشِ لعلِ یم

اے شہنشاہِ ادب اے ناخدائے علم و فضل
تیری کاوش سے ہوا شاداب اُردو کا چم

تو بہر صُورت ہماری قوم کا سرمایہ ہے
تذکرے تیرے رہیں گے انجمن در انجمن

ناصر کاسگنجوی ★

بابائے اُردو

کم نگاہی کے اندھیرے، گمرہی کی آندھیاں
خوابِ مستقبل کی بستی خوف سے اُجڑی ہوئی
وقت کے جلّاد، شمشیرِ ستم تولے ہوئے
کچھ بروئے اختلاف و کچھ برنگِ آشتی
غرقِ طغیانِ جہالت، آدمیّت کا بھرم
غیر کیا اپنے تھے بیگانے عجب شدّت کے ساتھ
داغؔ کے دل میں رہی صد داغ بن کر خوب ضرب
شکوۂ دردِ دل، سر جھکائے، بے سہارا، بے اماں

بے سرو پا رنج و کاوش، بجلیوں پر بجلیاں
اتحّاد و مرکزیّت کی ہوا، اُکھڑی ہوئی
کس مپرسی کے بھیانک دیو مُنھ کھولے ہوئے
ہر طرف بوچھاڑ، طعن و طنز کی پڑتی ہوئی
شعلۂ احساسِ قومیّت فروزاں دم بہ دم
بغض تھا تقریر میں، تحریر تھی نفرت کے ساتھ
غالبؔ و مومنؔ کی روحیں تھیں رہینِ درد و کرب
ہائے اس ماحول میں سہمی ہوئی اُردو زباں

ہر طرف رنگِ تباہی، ہر طرف امکانِ موت
ایک نوزائیدہ ہستی، اور یہ سامانِ موت

سوچتی تھی دیکھئے مجھ پر ترس کھاتا ہے کون
میری ان ناکامیوں میں آج کام آتا ہے کون

یک بیک اک پیرہن کر آیۂ رحمت بڑھا
مشعلِ جہد و عمل لے کر سوئے ظلمت بڑھا

اس نے یوں افتادہ کو اٹھایا خاک سے
سربلندی اس کی چشمک زن ہوئی افلاک سے

گرمیوں کی سرد بازاری ہوئی اغیار میں
زلزلہ آیا حریفوں کے تعصب زار میں

اللہ اللہ ضعفِ پیری میں جواں یہ ہمتیں
کانپتے ہاتھوں نے یاں آخر الٹ ہی دیں صفیں

جس کے لہجے میں گرج بادل کی، بجلی کی کڑک
جس کے فولادی ارادے، عزم جس کا بے جھجک

رمزِ ایثار و عمل سب کو دکھا کر لے گیا
صاف ہر رنجش سے اُردو کو بچا کر لے گیا

ہاں! اب اے اہلِ نظر انصاف سے کہنا ذرا
کون عبدالحق سا محسن اور اردو کا ہوا

جس نے اس بیکس کو سینے سے لگایا کون ہے؟
جس نے یوں پروان اردو کو چڑھایا کون ہے؟

نخل یہ بہنِ خزاں میں کس نے سینچا خون سے؟
کس نے افسانے تراشے اور اک مضمون سے؟

جس نے پیری میں بھی محنت کو نہیں چھوڑا، ہے کون؟
راحتوں سے اس کی خاطر جس نے منہ موڑا، ہے کون؟

غم ہو غم اس کے لئے سہنا، خوشی سمجھا ہے کون؟
خدمتِ اردو کو اپنی زندگی سمجھا ہے کون؟

کس نے سانچے میں نئے انداز کے ڈھالا اُسے؟
کس نے اپنے دل کا ٹکڑا جان کر پالا اُسے؟

محسنِ اردو ہے وہ، اُردو کی عظمت کی قسم
اب بھی ہیں صرفِ عمل جس کی زباں جس کا قلم

حق ملا حق دار کو از روئے حق و احتساب
پھر نہ کیوں اس پر سجے "بابائے اُردو" کا خطاب

خورشید حیدر صدیقی

★

بابائے اُردو کے حضور ہدیۂ تبریک و تہنیت

اے کہ تو بابائے اُردو ہے نہیں اس میں کلام ‫ — اے کہ حاصل ہے ادب میں تجھ کو اک اعلیٰ مقام
ہے یقیناً تیری کاوش سے بہت سرمایہ دار ‫ — وہ زباں جس کو سنوارا ہی کیا تو صبح و شام

اے کہ تو ہی حالیِ مرحوم کی ہے یادگار ‫ — اے کہ تو ہی گلشنِ اُردو میں لایا ہے بہار
اے کہ تیری زندگی ہے وقف اُردو کے لئے ‫ — اے کہ تو ہی اُردوئے مظلوم کا ہے غم گسار

رشک کے قابل ہیں اس سن میں یہ تیری محنتیں ‫ — داد کے قابل ہیں تیری رات دن کی زحمتیں
کون سمجھے گا کہ کیا قدرت ہے اُردو پر تجھے ‫ — اور اُردو میں بھری ہیں کوٹ کر کیا نُدرتیں

ہیں تری خدمات بے شک باعثِ صد افتخار ‫ — ہو نہیں سکتا ترے ایثار کا ہرگز شمار
خدمتِ اُردو میں گزری ہے تری عمرِ دراز ‫ — تیرے استقلال کے ہیں معترف لیل و نہار

الغرض تجھ کو بھلا دل سے بھلا سکتا ہے کون ؟ ‫ — تو نے جو خدمات کی ہیں وہ مٹا سکتا ہے کون ؟
ذرۂ ناچیز بھی خورشید تاباں ...... بن گیا ‫ — بزمِ اُردو میں چراغ ایسے جلا سکتا ہے کون ؟

نیرنگ نیازی

جس کا ایمان ہو اُردو وہ مسلماں تو ہو

گلستاں کو نئے پھولوں سے سنوارا تُو نے
راہ دشوار کو آسان بنایا تُو نے
بخش کر لفظ و معانی کا ذخیرہ تو نے
ادبِ خاص کو پھیلا دیا ہر جا تُو نے
تیری کوشش ہی نے یہ رنگ دیا اُردو کو
آج دنیا نے جو پہچان لیا اُردو کو

وہ ترا طرزِ بیاں وہ تری ہر بات کا لوچ
کوئی کیا جانے ترے طرفہ خیالات کا لوچ
دُرِ مضموں کی چمک نثر میں جذبات کا لوچ
نظم میں کیفیتیں شعر کے نغمات کا لوچ
رُوحِ افکار کا بہتا ہُوا دریا تُو ہے
یعنی مجموعۂ اوصاف ثریّا تُو ہے

شعر اک نُور ہے گنجینۂ انوار ہے تُو
دائرہ علم ہے اور مرکزِ پرکار ہے تُو
غالب و میر کی میراث کا حقدار ہے تُو
دشمنوں کے لیے چلتی ہوائی تلوار ہے تُو
تُو نے اُردو کو سرِ بام فلک پہنچایا
اور ہر حال میں اُردو ہی کے غم کو کھایا

جانِ مفہوم ہے تُو روحِ نگاراں تُو ہے
بحر میں ایک اُمنڈتا ہوا طوفاں تُو ہے
غمِ ہستی سے بھی سُنتے ہیں گریزاں تُو ہے
جس کا ایمان ہو اُردو وہ مُسلماں تُو ہے
پاس جو کچھ تھا ترے وار دیا اُردو پر
یا بابائے اُردو نے سبھی ہار دیا اُردو پر

شریف کمال عثمانی

★

بابائے اُردو

وجہِ فروغِ حسنِ بہاراں ہیں آپ ہی
یعنی کہ روحِ جانِ گلستاں ہیں آپ ہی
ظلمت کدہ میں شمع فروزاں ہیں آپ ہی
اردو ادب کے گوہرِ تاباں ہیں آپ ہی

اردو ادب کو آپ سے اُمید اور ہے
جامِ شرابِ اردو کا عالم میں دور ہے

جامِ شرابِ اردو کے مے خوار آپ ہیں
اس میکدہ کے عارفِ اسرار آپ ہیں
اہلِ ادب کے قافلہ سالار آپ ہیں
دنیائے علم و فن کے مددگار آپ ہیں

راہِ طلب میں سوزِ مجسم لئے ہوئے
سینے میں جوشِ عزمِ مصمم لئے ہوئے

اردو ادب کو آپ سا ہمراز مل گیا
فکرِ رسا کو شہپرِ پرواز مل گیا
اہلِ قلم کو ھمدم و دمساز مل گیا
مہریں ہٹیں زبان کو اعجاز مل گیا

عزمِ صمیم شوق کے ارمان ہیں بہت
اردو ادب پہ آپ کے احسان ہیں بہت

تقسیم ملک و قوم سے اردو بھی بٹ گئی
اہلِ زباں کی اس سے توجہ بھی ہٹ گئی
شمشیرِ عصبیت سے زباں حیف کٹ گئی
یہ بھی خلیج آپ کی کاوش سے ہٹ گئی

منزل کی سمت اور بھی یہ کارواں بڑھے
سائے میں آپ کے یہ یونہی کامراں بڑھے

اہلِ زباں کو اب بھی ضرورت ہے آپ کی
اہلِ قلم کے دل میں عقیدت ہے آپ کی
ہر گوشۂ بساط پہ اُلفت ہے آپ کی
یعنی سوادِ دل پہ حکومت ہے آپ کی

اردو ادب پہ آج عجب خلفشار ہے
اپنے وطن میں رہ کے غریب الدّیار ہے

انجم اعظمی

اردو

زندگی بھیس بدل کر جہاں فن بنتی ہے
میر و غالب کا ڈاندازِ بیاں ہے اُردو
کبھی کرتی ہے ستاروں سے بھی آگے منزل
چشمِ اقبال سے گویا نگراں ہے اُردو
ساتھ انشا کے کبھی ہنستی ہے دل کھول کے وہ
بھر فانی کبھی مصروف فغاں ہے اردو

حاصلِ بزم ہے اور بزم کو تڑپاتی ہے
جانِ میخانہ ہے میخانۂ جاں ہے اُردو

گاہ پروانے کی میت پہ کھڑی جلتی ہے
صورتِ شمع جہاں گریہ کناں ہے اُردو
گاہ خوشیوں کے چمن زار میں جابستی ہے
موسمِ گل کی جہاں روح رواں ہے اُردو
محوِ گل گشت جہاں حورِ بہشتی بن جائیں
قابلِ رشک وہ گلزارِ جناں ہے اُردو
ہر غزل کوچۂ جاناں سے زیادہ پیاری
ہر نظر شعر ہے تصویرِ بتاں ہے اُردو

ہر نئی نظم نئے موڑ پہ لے جاتی ہے
روحِ امروز ہے فردا کا نشاں ہے اُردو

دُھل گئی کوثر و تسنیم کے پانی سے مگر
جنتِ ارض کی مظلوم زباں ہے اُردو
باغباں مجھ کو اجازت ہو تو اک بات کہوں
نغمہ بلبل کا ہے پھولوں کی زباں ہے اُردو
ملتے ہیں اس سے ہزاروں ہمیں تہذیب کے درس
اس قدر ذہن پہ کیوں تیرے گراں ہے اُردو

اب بھی چھا جاتی ہے ہر روح پہ مستی بن کر
اس خرابی میں بھی افسونِ جواں ہے اُردو

معیاری اضافے

امام الہند (تعیرافکار)

(مولفہ ابوسلمان الہندی)

اس کتاب میں مولانا ابو الکلام آزادؔ کے حسب نسب اور ابتدائی حالات زندگی کی تمام تفصیلات دی گئی ہیں نیز مولانا کے اساتذہ اعزہ اور احباب کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی کے بارے میں پہلی کتاب ہے۔ جو مستند ماٰخذ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ قیمت ۴ روپے۔

نئی پرانی قدریں

ڈاکٹر شوکت سبزواری عہد حاضر کے نمایاں اُردو نقاد ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے چودہ گراں قدر مقالے شامل ہیں جن میں ادب کی نئی پرانی قدروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت ۵ روپے

معیار ادب

یہ بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ ادب کیا ہے اور ادبی معیار کسے کہتے ہیں، نظری اور عملی تنقید کا بلند پایہ گنجینہ ہے قیمت ۴/۵۰ پیسے

لسانی مسائل

قواعد لسانیات زبان اور رسم الخط اور لغت تحقیق سے متعلق انیس گراں قدر مقالات کا اُردو زبان کے مزاج و منہاج کو سمجھنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت

جام سرشار

سرشار کا سرمایہ صرف "فسانہ آزاد" ہی نہیں اس نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس میں "جام سرشار" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اس دلچسپ کتاب کو بدر عالم ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ نے مرتب کیا ہے مفصل مقدمہ اور طویل فرہنگ کے ساتھ ہی ، سرشار کے متعلق چکبست کا معرکہ آرا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے قیمت نو روپے

مجاہد اندلس

علی الجارم بک عربی زبان کے صف اوّل کے مصنفین میں سے ہے " مجاہد اندلس " اس کا شاہ کار ناول ہے جسے مولانا محمد زکریا مائل نے نہایت خوش اسلوبی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

قیمت ۵ روپے

افعال مرکبہ

اُردو قواعد پر مولانا تمنا عمادی کی نظر بہت گہری ہے اُردو، عربی، فارسی زبانوں کے بلند پایہ ماہر ہیں اس کتاب میں انھوں نے قواعد کے ایک نازک پہلو، یعنی افعال مرکبہ پر جامع بحث کی ہے اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے۔

اُردو اکیڈمی سندھ۔ بندر روڈ۔ کراچی۔

کوائف کالج

عہدیداران انجمن ترقی اردو پاکستان

جناب اختر حسین
صدر

جناب جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

جناب سیٹھ احمد داؤد
خازن

جناب لیفٹیننٹ کرنل محمد عطاءاللہ
شریک معتمد و پرنسپل اردو کا

جناب محمد اکرام الرحمن
وائس پرنسپل اردو کالج

جناب سید عبدالعلیم
وائس پرنسپل اردو کالج (اعلیٰ ثانوی)

الحاج جناب اختر حسین صاحب صدر انجمن ترقی اردو حج سے واپسی پر طلباء و اساتذہ اردو کالج کے ساتھ

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ... کے افتتاحی جلسہ میں صدارتی تقریر فرما رہے ہیں

عہدیداران انجمن اتحاد طلباء ڈگری

سید مرتضیٰ علی شاہ — صدر

محمود الہی ۔ معتمد عمومی

واصل احمد قدوائی ۔ نائب صدر

کشور بیگم ۔ صدر مجلس طالبات
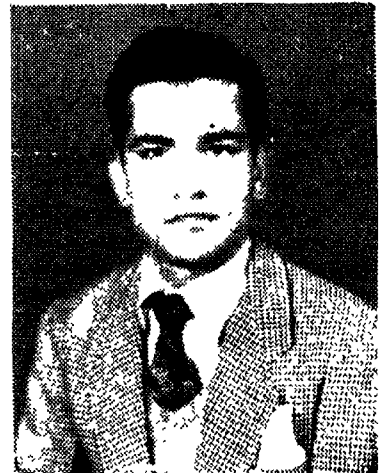
شاہجہاں بیگم ۔ معتمد مجلس ط
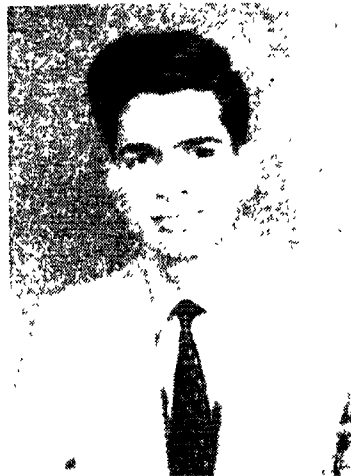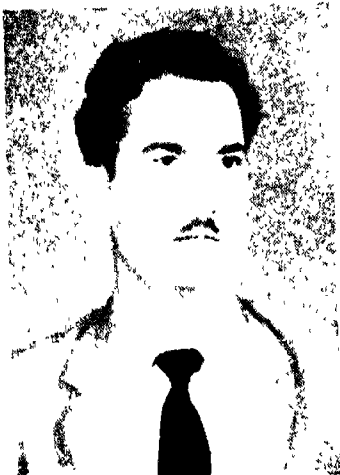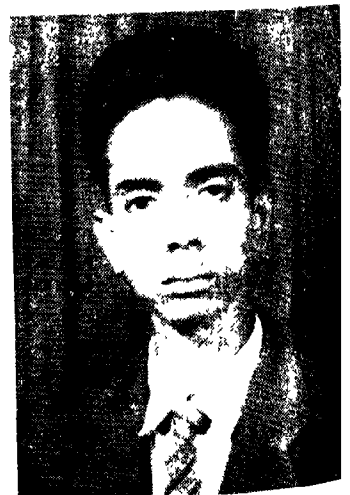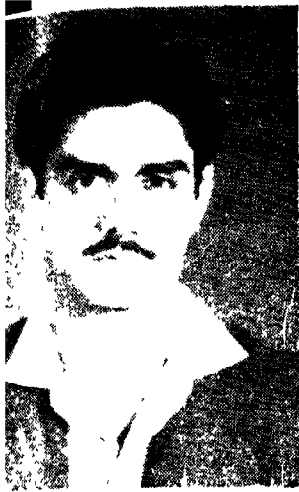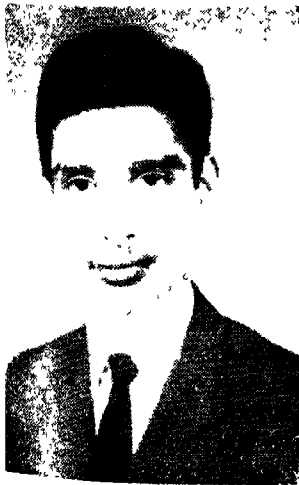
رپورٹ

انجمن اتحاد طلبا ڈگری

جمیل احمد صدیقی
مہتمم صحافت و نشر و اشاعت

پاکستان کے کالجوں میں اردو کالج کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ یہاں قومی زبان ذریعہ تعلیم ہے بلکہ درس و تدریس کے ساتھ طلباء کو عملی زندگی میں پیش آنے والے امور سے عہدہ برآء ہونے کی صلاحیتوں کو بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر با شعور شخص اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ کالج ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس میں طلباء کی تعلیمی، سماجی اور ثقافتی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ اگر کسی کالج میں طالب علم کو صرف تعلیم حاصل کرنے کے عمدہ مواقع فراہم کئے جائیں تو اس سے عمدہ صلاحیت رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقہ میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن عملی زندگی میں سابقہ پڑنے والے امور سے عہدہ برآء ہونے کی صلاحیت کا فقدان ہوگا اسی لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ طلباء کو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں پیش آنے والے امور سے روشناس کردیا جائے تاکہ اُن کی عملی زندگی درخشاں ہو۔ اور اس طرح وہ ملک و قوم کے لئے مفید ثابت ہوں۔

انجمن اتحاد طلباء اردو کالج کے طلباء کی سیاسی، سماجی، اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس انجمن کے سالانہ انتخابات عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس طرح طلباء کو اس امر کی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ جن طلباء کو اپنے حقوق کی پاسبانی کا اہل سمجھتے ہیں اُن کو اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔

اُردو کالج میں یہ پہلا سال ہے کہ ڈگری اور انٹر کے انتخابات علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو انجمن اتحاد طلبہ اُردو کالج حصہ ڈگری کے انتخابات ہوئے اور سید مرتضیٰ علی شاہ صدر اور محمود الٰہی معتمد عمومی منتخب ہوئے۔

صدر اور معتمد عمومی کے انتخابات کے بعد عہدیداران شوریٰ کے انتخابات عمل میں آئے۔ محمد شفیق جری رئیس الایوان سید شاہ جرار نائب رئیس الایوان اور محمد اقبال صدیقی معتمد شوریٰ منتخب کئے گئے۔

انتخاباتِ شوریٰ کے بعد کابینہ کے قیام کا مرحلہ تھا۔ صدر اور معتمد عمومی نے اپنے ساتھیوں کی رائے سے نہایت احتیاط کے ساتھ اہل طلباء کو چن کر کابینہ مرتب کی۔

اجلاس میزانیہ سے پیشتر شوریٰ کا باضابطہ افتتاح جناب جمیل الدین عالی معتمد انجمن ترقی اُردو پاکستان نے فرمایا انجمن اتحاد طلباء کے سرپرستِ اعلیٰ اور کالج کے پرنسپل جناب کرنل عطاء الرحیم نے خطبۂ افتتاحیہ میں اراکین شوریٰ کو چند مفید اور توجہ طلب امور کی جانب متوجہ کیا۔ اس کے بعد شوریٰ نے انجمن کے سالانہ میزانیئے کی منظوری دے دی۔ انجمن اتحاد طلباء کے ڈگری اور انٹر میں تقسیم ہو جانے کے سبب میزانیہ بہت مختصر اور محدود تھا اور لوگ حیران تھے کہ کل -/۳۰۰۰ روپے میں یہ انجمن کیا کرے گی۔

میزانیئے کی منظوری کے بعد انجمن کی گوناں گوں مصروفیات کا آغاز ہوا ابتدا جلسۂ افتتاحیہ اور انجمن کے مجلّے "اتحاد" کی اشاعت سے ہوئی۔ انجمن کے مختصر میزانیئے کی محدود گنجائش میں ان امور کا تکمیل پا جانا ناممکنات سے نظر آتا تھا لیکن سید مرتضیٰ علی شاہ صدر اور محمود الٰہی معتمد عمومی کے اخلاص نیت اور تجربے نے "اس" انہونی "کو بھی" ہونی "کر دکھایا۔

تقریب افتتاح پر نقل و تمثیل کی پیش دہی کے لئے فنکاروں کی تربیت اور دیگر امور کے اہتمام کے لئے جناب مرتضیٰ علی شاہ اور محمود الٰہی نے ایک دوسری کمیٹی تشکیل کی جس کا مسند نشین جناب ابو طالب کو نامزد کیا گیا موصوف نے جناب سید محمد حسن منصرم شعبۂ مسائل حاضرہ کی رفاقت و مساعدت سے نقل و تمثیل کا تفصیلی خاکہ مرتب کیا اور فنکاروں کی تربیت کی تکمیل کے بعد تنقیحی مشق بھی کرا ڈالی۔

۱۲ جنوری ۱۹۷۳ء کا دن اُردو کالج کے پُربہار ایام کی فہرست میں ایک یادگار اضافہ تھا۔ کالج کی عمارت کے قدامت آثار اور غریب صورت در و دیوار طرفۃ العین کی تجدید شباب سے پُر وقار و خوشحال نظر آتے تھے۔ آب رنگ و نور سے دھل دھلاکر عمارت کے در و دیوار اور گوشہ و کنار نکھر آئے تھے۔ قطار اندر قطار اور بے حد و شمار قمقموں کی روشنی نے کالج کے بام و در سے اُبلتی ویرانی اور بے چارگی کو ڈھانپ کر چشم نظارہ پر خیرگی کا پردہ ڈال دیا اور یوں ہمارے نئے مہمانوں میں ہمارا بھرم رہ گیا ورنہ بلحاظ عمارت ہماری فلاکت اور غریب الوطنی ہمیں کس کس طرح رسوا نہیں کرتی۔ مہمانوں اور طلبا کا ایک سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آرہا تھا اور مہمان خاص کی آمد تک تو یہ کیفیت تھی کہ در و دیوار پر گویا انسانوں کا غلاف چڑھ چکا تھا۔

ساڑھے چار بجے مہمانِ خاص جناب اللہ بخش کریم بخش بروہی سابق وزیر قانون و سفیر پاکستان متعینہ بھارت اپنی تمام مصروفیات کے باوصف ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے کشاں کشاں تشریف لائے۔ جناب پرنسپل اور اراکان استقبالیہ نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ مہمان خاص کے مسندِ صدارت پر اجلاس فرماتے ہی تلاوت قرآنِ کریم کے بعد صدر انجمن اتحاد طلباء سید مرتضیٰ علی شاہ نے مہمانِ خاص کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جس میں انہوں نے مہمانِ خاص کی توجہ کالج کے چند در چند مسائل کی جانب مبذول کرائی۔ اس کے بعد پرنسپل نے مہمان خاص کا ان کی زحمتِ تشریف آوری کے ضمن میں شکریہ ادا کیا اور کالج کے بارے میں جملہ کوائف سے آگاہ کیا۔ صدر کے سپاس نامے اور پرنسپل کی تقریر کے جواب میں جناب بروہی نے طلبا کو "چند پند" کا تحفہ نذر کیا۔ نیز انجمن اتحاد طلبا کے تدریسی کتب خانہ کے لئے -/۱۰۰۰ روپے کا گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا۔ اس نشست کا اختتام جناب محمود الٰہی معتمد عمومی نے مہمانِ خاص اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کر کے کیا۔ پندرہ منٹ کے وقفے میں استقبالیہ کی جانب سے مہمان

خاص رخصت ہوئے اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے تقریب افتتاح کی دوسری نشست " رنگ ونشاط" کا آغاز ہوا یہ محفل رنگ ونشاط تیسرے پہر رات تک برپا رہی اور اس کے مندرجات میں ایک منظر کے ڈرامے ، نغمے، رقص، فکاہیہ تمثیلات ، موسیقی کی دھنیں غرض کیا تھا جو یہاں نہیں تھا۔ بزم کے کیف وطرب کا یہ عالم تھا کہ سہ پہر رات بیتنے پر بھی فرمائشوں کا سلسلہ تھا کہ کسی طور پر تھمتا ہی نہ تھا۔ بادل نخواستہ یہ بزم رنگ ونشاط ۲ بجے رات کو برہم کی گئی۔

انجمن اتحاد طلباء کی ان مجموعی کارگزاریوں کی روئیداد کے بعد اس کی شعبہ واری سرگرمیوں کی تفصیل بھی سن لیجئے۔

شعبہ صحافت ونشر واشاعت

اس کے مہتمم جناب جمیل احمد صدیقی ہیں۔ آپ کا تجربہ اور جذبۂ محنت انجمن اتحاد طلبا کا اثاثۂ افتخار ہے جلسۂ افتتاح کے موقعہ پر مجلہ "اتحاد" کی دیدہ زیب طباعت اور دلکش سرورق جمیل احمد صدیقی کے حسن مذاق وانتظام کا ثبوت ہے۔ اس شعبہ کی جانب سے انجمن کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چار مجلے اشاعت پذیر ہوئے۔ "اتحاد" کا ایک شمارہ جلسہ افتتاح کے موقعہ پر پیش کیا گیا۔ "اتحاد" کا دوسرا شمارہ "سیرت نمبر" ہے جو اپنے انداز وترتیب اور معیاری مضامین اور خوبصورت سرورق کی بناء پر ایک معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ کل پاکستان اُردو متحدہ محاذ کے لئے مجلہ "تعمیر نو" جو بیاد بابائے اردو تھا اس شعبہ کی جانب سے پیش کیا گیا۔ سالانہ جلسہ کے موقعہ پر "اتحاد" کا سالنامہ پیش کیا گیا۔

اس شعبہ کی کارکردگی جناب جمیل احمد صدیقی مہتمم صحافت ونشر واشاعت کے حسن انتظام اور صلاحیتوں کی رہین منت ہے۔

شعبہ سیرت

اس شعبہ کے مہتمم سید مظفر عالم ہیں۔ اس شعبہ کے قیام کا مقصد طلباء میں اخلاقی اقدار کا پیدا کرنا اور سیرت طیبہ آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں طلباء میں ایک سچے مسلمان کے اوصاف پیدا کرنا ہے۔ اس شعبہ کی جانب سے کل پاکستان بین الکلیاتی سیرت النبیؐ مقابلے ہوتے ہیں۔ مقررین کو انعامی کپ دئیے جاتے ہیں۔

اس مرتبہ شعبہ سیرت کی جانب سے استاد اردو کالج مولانا محمد متین خطیب کی تصنیف کردہ اسلامیات لازمی پر کتاب شائع کی گئی ـــــ یہ کتاب اُس وقت شائع ہوئی جب کہ اس مضمون پر کوئی کتاب موجود نہ تھی۔

شعبہ سیرت کی جانب سے انجمن کی تاریخ میں ایک معیاری "سیرت نمبر" بھی پیش کیا گیا ـــــ بین الکالجی مقابلہ قرأت وتجوید میں ہمارے کالج نے ٹرافی حاصل کی۔ جلسہ سیرت النبیؐ کا اہتمام اس شعبہ کی جانب سے حدود کالج میں کیا گیا جس میں سرکار کے شیدائیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی اس موقعہ پر اتحاد کا سیرت نمبر حاضرین میں تقسیم کیا گیا۔

شعبہ بحث و مباحثہ

اس شعبہ کے ناظم جناب جمیل احمد صدیقی ہیں جن کی مستعد اور متحرک شخصیت کے سبب شعبے کی سالانہ کارگزاری خاصی حوصلہ افزا رہی طلباء کو فنِ خطابت کی تربیت اور مشق کے لئے حلقہ مقررین تشکیل دیا گیا۔ اس حلقے کے تربیت یافتہ مقررین نے ملک کے طول و عرض میں متعدد بین الکلیاتی مباحثوں میں شرکت کی۔ کشور بیگم، سعیدہ شاہ اور ناصر محمود نے ہر جگہ اپنی انفرادیت کا اعتراف کرایا اور خراج تحسین پایا۔ متعدد انعامات حاصل کئے۔ شعبے نے اُردو کالج کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثے کا بھی اہتمام کیا جس میں ملک کے طول و عرض سے طلباء نے شرکت کی۔ جناب قیصر حسین بختیاری نے مباحثہ کا افتتاح فرمایا

شعبہ امدادِ باہمی

امسال اس شعبہ کے مہتمم جناب مشکور علی چوہدری ہیں یہ بہت شریف النفس دیانت دار اور عمدہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی مساعی سے امسال شعبے کی کارگزاری میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ شعبے کی جانب سے تمام مضامین پر طلبا میں مطبوعہ نوٹس اور امتحانی پرچہ جات تقسیم کئے گئے۔

شعبہ کی جانب سے طلبا کے فسادات میں زخمی ہونے والے طالب علم اشفاق دیوان کی امداد کے لئے چندہ بھی اکٹھا کیا گیا جس سے طالب علم مذکور کی پریشانیوں میں یک گونہ کمی ہوئی اور اس کے علاج کی تکمیل ہو پائی۔ اس شعبے کا سب سے بڑا کارنامہ مستعاری کتب خانے کا قیام ہے جو انجمن اتحاد طلبا کے ماضی کی روایات خیر میں ایک اضافہ ہے اور انشاء اللہ مستقبل کا روایتی سرمایہ ہو گا۔

شعبہ امورِ سائنس

اس شعبہ کے ناظم جناب پرویز اختر صدیقی ہیں۔ جنہوں نے اپنے شعبہ کی سرگرمیوں کا آغاز معلوماتی دورہ سے کیا جس میں سائنس کے جملہ طلبا، طالبات اور اساتذہ شریک تھے۔ اس شعبہ کی دوسری سرگرمیوں میں نوٹس کی اشاعت اور تقسیم سائنسی اور فنی تصاویر کی نمائش، امتحانی پرچہ جات کی اشاعت اور تقسیم کھیلوں کا انتظام اور تحریری مقابلۂ مضمون نویسی کا انعقاد قابلِ ذکر ہیں۔

شعبہ سیر و تفریح

جیسا باغ و بہار شعبہ ویسے ہی باغ و بہار اُس کے منتظم، امسال اردو کالج کے حصہ ڈگری کے قریب قریب ہی

طلباء جناب یونس بٹ مہتمم شعبہ کے "نمک خواروں" میں ہیں۔ اس لئے کہ کون ہے جس نے یونس صاحب کی "نمکین پکنک" میں شرکت نہ کی ہوگی۔ بہت یادگار تھی یہ پکنک بھی جس میں طلباء و طالبات کے علاوہ اساتذہ بھی شریک تھے۔ استادوں کو نمک خواروں میں شریک کرنا کوئی بٹ صاحب سے ہی سیکھے۔!

شعبہ شعر و ادب

منتظم شعبہ شعر و ادب جناب نعیم احمد خاں ہیں۔ ذوقِ سلیم اور شگفتہ طبیعت ان کے خاص جوہر ہیں جن کا اظہار ان ہر عمل سے ہوتا ہے۔ آپ نے جس شائستگی اور نشستگی سے ایک مشاعرہ منعقد کرایا اُس کی یاد ہمیشہ خراجِ تحسین پائے گی مشا میں جن ممتاز شعراء نے شرکت کی اُن میں اُستاد قمر جلالوی، سراج الدین ظفر، تابش دہلوی، سحر انصاری، جون ایلیا، شبنم روما اور عزیز الحق صدر مشاعرہ قابل ذکر ہیں۔

شعبہ کامن روم

اس شعبہ کے لئے طلباء اور طالبات کے لئے مختلف النوع امور کے انصرام کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے اس شعبہ کے منصرم جناب مشہور احمد ہیں۔ آپ ایک عمدہ کھلاڑی اور خوش طبع طالب علم ہیں۔ شعبے کی داخلی تنظیم اس طرح ہے طلباء و طالبات کے کمرہ ہائے عام معتمدین علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اندرون خانہ کھیلوں میں طلباء و طالبات کے لئے کیرم، شطر ڈرافٹ لوڈو اور ٹیبل ٹینس وغیرہ کے لوازمات مہیا کئے جاتے ہیں۔ نیز شعبہ کے زیر اہتمام سالانہ انعامی مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ سال رواں میں طلباء اور طالبات کے لئے سالانہ مقابلوں کا اہتمام کیا گیا۔

شعبہ مسائل حاضرہ

شعبہ کے منصرم جناب سید محمد حسن ہیں۔ تقریبِ افتتاح کے موقع پر نقل و تمثیل کی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر ہے اس مرتبہ اس جشن میں انہوں نے ایک خاص اہتمام یہ کیا تھا کہ اپنے ادارے کو مہمان فنکاروں کی خدمات کی ضرورت سے بے نیا کر دیا۔ جو ناگزیر روایت کی صورت اختیار کر گئی تھی بلا شبہ روایت شکنی بڑا کارنامہ ہوتا ہے لیکن اس روایت شکنی کے لئے انہیں کیا کچھ کھکھیڑیں نہ اٹھانا پڑیں۔ شبانہ روز محنت و ریاضت سے اپنے فنکاروں کو تربیت دیکر اس قابل بنایا کہ بیرونی فنکاروں کی ضرورت کا احساس یکسر مٹ گیا۔ اسی شعبہ کی کارگزاری کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امسال بھی اردو کالج کے فنکاروں نے نیشنل کالج میں منعقد ہونے والے بین الکلیاتی مقابلۂ موسیقی میں نشان ظفر (ٹرافی) پایا۔ اور اس طرح تین سال تک مسلسل یہ ٹرافی حاصل کرکے ریکارڈ قائم کر دیا۔

شعبہ تجارت و اقتصادیات

شعبہ کے مہتمم جناب ثناء اللہ ہیں۔ شعبہ کی سرگرمیوں میں صنعتی دورہ نوٹس کی اشاعت اور تقسیم اور ضرورت مند طلباء کو مطلوبہ کتب کی فراہمی قابل ذکر ہیں۔

شعبہ طالبات

اس کی صدر کشور بیگم ہیں۔ اس مجلس کے قیام کی ضرورت اس امر کے پیش نظر محسوس کی گئی کہ طلباء کی طرح طالبات کو بھی کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا موقع ملے۔ اس مجلس کے تحت انجمن کے میزانیہ سے طالبات کا فنڈ ہوتا ہے جس کو صدر اور معتمد طالبات، طالبات کے ضروری مسائل کو حل کرنے میں خرچ کرتی ہیں۔ اس مجلس کے تحت طالبات کے تفریحی دورہ، جلسۂ افتتاح کا اہتمام، تمثیلی پروگرام اور اندرون خانہ کھیلوں کے مقابلوں کا انعقاد شامل ہے۔

سال رواں میں اس شعبہ کی جانب سے جلسہ افتتاح کا اہتمام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا جس کی صدارت بیگم چوہدری محمد علی نے فرمائی تھی۔ جلسہ کے بعد معیاری اور دلچسپ خاکوں سے مزین رنگا رنگ پروگرام پیش کیا گیا۔

کل پاکستان اُردو متحدہ محاذ

انجمن اتحاد طلباء اُردو کالج کا وہ ضمنی ادارہ ہے جس کا واحد مقصد اُردو کی ترویج و ترقی سے بابائے اُردو کی تحریک کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ ہمیں بے حد مسرت ہے کہ امسال اس ادارہ نے غیر معمولی طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مؤثر قدم اٹھائے اور دو ادبی اجلاس منعقد کرائے۔ جن کی صدارت بالترتیب جناب جمیل الدین عالی معتمد انجمن ترقی اُردو اور جناب پیر الٰہی بخش سابق وزیر اعلیٰ سندھ نے فرمائی۔ جن دو اجلاس میں اُردو کو قومی زبان بنوانے اور سرکاری طور پر تمام دفاتر میں اُردو کو لازمی طور پر جاری کرانے نیز جملہ کاروباری اداروں میں نافذ کرانے کی متعدد تدابیروں پر عمل کیا گیا۔ اُن اجلاسوں میں ادبا۔ صحافی۔ اساتذہ اور طلباء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ محاذ نے بابائے اردو کی یاد میں ایک ادبی مجلہ "تعمیر نو" بھی نہایت آب و تاب سے شائع کیا ہے جس کے نگراں جناب سید مرتضیٰ علی شاہ اور مدیر اعلیٰ سید ظہور مہدی ہیں۔ جن کی بے لوث اور انتھک کوششوں سے محاذ کے پروگرام بحسن و خوبی انجام پائے۔ اراکین محاذ کی مستقل مزاجی اور اُردو نوازی سے یہ امید ہے کہ طلباء زیادہ سے زیادہ اُردو کے فروغ میں اس شعبہ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ ۳۰ ستمبر ۶۳ء کو اس شعبہ کی جانب سے یوم بابائے اُردو منایا گیا جس کی صدارت شیخ الجامعہ کراچی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے کی۔ جلسہ سے خطاب کرنے والوں میں جناب جمیل الدین عالی، کرنل محمد عطاء الرحیم، سید محمد تقی اور اشتیاق حسین قریشی قابل ذکر ہیں۔

مستعاری کتب خانہ

۲۰ اپریل ۱۹۶۳ء انجمن اتحاد طلباء کی تاریخ میں ایک یادگار اہمیت کا حامل ہے۔ اس دن جناب اے کے بروہی سابق وزیر قانون حکومت پاکستان نے مستعاری کتب خانہ کا افتتاح فرمایا۔

اس کتب خانہ کے لئے جلسۂ افتتاح میں جناب بروہی نے ۱۰۰۰ روپیہ عطیہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ عہدیداران اتحاد طلباء نے تندہی سے طلباء کے مستعاری کتب خانہ کے لئے کام شروع کر دیا اور ۱۰۰۰ روپیہ سے زائد قیمت کی کتب خریدی گئیں۔ اس طرح اب طلباء کے لئے کتب کے حصول میں ایک آسانی پیدا ہو گئی اور اب ہر طالب علم ایک وقت دو کتب حاصل کر سکتا ہے

قلیل مدت اور محدود گنجائش کے میزانیئے میں یہ سب کارگذاری جس کی روئیداد آپ نے ملاحظہ فرمائی ایسی نہیں جسے ناکافی کہا جا سکے حتی المقدور ہم سے جو کچھ ہو سکا ہم اس پر مطمئن ہیں۔

ہم نے جو کچھ کیا وہ نہ کر سکتے اگر ہمیں پرنسپل جناب محمد عطاء الرحیم کی شفقت اور جناب پروفیسر محمد اکرم الر... کی رہنمائی اور محبت حاصل نہ ہوتی۔ ہم طلباء کی مساعدت اور اعانت سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ غرض کون ہے جس کے مرہون احسان نہیں ہیں اور جس کی محبت اور خلوص کا خراج ہم پر واجب نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ایک لفظ "تشکریہ" سے یہ سب قرض اس آسانی سے بے باق کر سکیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ یہ قرض حسنہ ہی رہے۔

رپورٹ

اردو کلب جیمخانہ

اقبال احمد خان؛
معتمد جیمخانہ

طلباء کھیل کے میدان میں

اس امر سے ہر باشعور واقف ہے کہ کسی قوم کے استحکام میں جس طرح "زبان" ایک اہم کام انجام دیتی ہے۔ طرح صحت مند سرگرمیاں بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔

جس طرح ہمارا کالج ایک قومی تحریک کا بانی ہونے کی بناء پر مشہور ہے اُسی طرح صحت مند سرگرمیوں کی وجہ سے وہ پاکستان کے کالجوں میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ طلباء کی ذہنی نشو و نما میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کی بہت اہمیت ہے۔ ہمارے کالج کے طلباء اسی اصول کو اپناتے ہوئے ہیں۔

۶۳-۶۲-۱۹ء میں ماضی کی طرح ہمارے کالج نے کھیل میں نمایاں مقام حاصل کیا اور کئی چیمپئن شپ حاصل کی

کرکٹ :- اس سال کرکٹ کپتان عزیز علوی تھے۔ عزیز علوی کا نام اب کرکٹ دنیا کے لئے نیا نہیں ہے ۶۲-۶۱ میں کرکٹ کوچنگ کیمپ میں شرکت کر چکے ہیں جو پاکستان یونیورسٹیز کے لئے اسپورٹ کنٹرول بورڈ آف پاکستان نے قائم کیا تھا۔ اس سال انٹر یونیورسٹیز ٹورنامنٹ میں کراچی یونیورسٹی کو کرکٹ چیمپئن دلانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔

اس سال ہماری کرکٹ ٹیم نے بین الکالجی کرکٹ ٹورنامنٹ میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور سیمی فائینل تک پہنچ گئی مگر "کرکٹ ایک اتفاقی کھیل ہے" اسی کا شکار ہماری کرکٹ ٹیم بھی ہوگئی اور سخت مقابلہ کے باوجود ہماری ٹیم فائینل تک نہ پہنچ سکی ۔ بین الکالجی مقابلوں میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ ہماری ٹیم نے کئی دوستانہ میچ بھی جیے

ہاکی :- سید علی رضی کپتان تھے ۔ ہماری ہاکی ٹیم میں خالد نیازی، توصیف شاہ، فصاحت قریشی، معراج احمد اور سلطان احمد خاں جیسے مشہور کھلاڑی شامل ہیں، فصاحت قریشی نے اسی سال کراچی یونیورسٹی کی نمائندگی کی ہے۔ اور سراج احمد کراچی یونیورسٹی کی ٹیم کے کپتان تھے۔

بین الکالجی مقابلوں میں ہماری ہاکی ٹیم سیمی فائینل تک پہنچ گئی لیکن بدقسمتی سے اس میچ میں ہمارے کپتان علی رضی

آنکھ میں گیند لگ جانے کی وجہ سے ہم فائینل تک نہ پہنچ سکے لیکن ہماری ٹیم نے کراچی بہادر یار جنگ ٹورنامنٹ جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ بین الکالجی مقابلوں میں ہماری ہار بالکل اتفاقی تھی۔

نٹ بال:- سال رواں میں اس ٹیم کے کپتان افضال حسین تھے۔ ہماری نٹ بال ٹیم اپنے اعلیٰ کھیل کی بنا پر مثالی شہرت کی مالک ہے۔ سال رواں میں ہماری ٹیم نے عزیز آباد اسپورٹس ٹورنامنٹ جیتا اور بہادر یار جنگ ٹورنامنٹ میں فائینل تک پہنچ گئی۔

باسکٹ بال:- ٹیم کے کپتان مختار احمد تھے۔ ہماری باسکٹ بال ٹیم نہ صرف کالجوں کی حد تک بلکہ پورے پاکستان میں بہترین کھیل کی بناء پر مشہور رہے۔ ہماری ٹیم گذشتہ سات سالوں میں سات مرتبہ انٹرکالجیٹ ٹورنامنٹ کا فائینل جیت چکی ہے لیکن اس سال بدقسمتی سے ہماری ٹیم پہلی مرتبہ فائینل میں ہار گئی۔

والی بال:- اطہر زیدی ٹیم کے کپتان تھے۔ گذشتہ سال ہماری ٹیم نے نوشاد احمد کی قیادت میں انٹر کالجیٹ ٹرافی جیتی تھی اس دفعہ ہماری ٹیم فائینل تک تو پہنچی لیکن چیمپئن شپ نہیں جیت سکی۔ ہمارے تین کھلاڑی اطہر زیدی، نعیم الرحمٰن اور خورشید کراچی یونیورسٹی کی نمائندگی کے لئے منتخب کئے گئے۔

ٹیبل ٹینس:- منیر سبحانی ٹیم کے کپتان تھے۔ ہماری ٹیبل ٹینس بہترین کھلاڑیوں پر مشتمل ہے۔ عزیز علوی پاکستانی ٹیم نمبر ۵ کے رکن رہ چکے ہیں۔ اور غلام محی الدین کراچی کے جونیئر چیمپئن تھے۔ لیکن ہماری ٹیم اتنے بہترین کھلاڑیوں کی موجودگی کے باوجود بین الکالجی مقابلوں میں ہار گئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ غلام محی الدین ملازم ہونے کی وجہ سے حصّہ نہ لے سکے اور عزیز علوی قائداعظم ٹرافی کرکٹ ٹورنامنٹ میں حصّہ لینے لاہور گئے تھے۔

بیڈ منٹن:- نسیم احمد کپتان تھے۔ گو بیڈ منٹن ٹیم کی تشکیل پہلی مرتبہ سال رواں میں کی گئی تھی۔ پھر بھی قابل تعریف بات یہ ہے کہ ہماری ٹیم نے رنرز اپ کی ٹرافی حاصل کی اور نسیم احمد کو یونیورسٹی نمبر ایک کھلاڑی قرار دیا گیا۔

اسپورٹس:- سلیم ڈار کپتان تھے۔ یہ بہترین ایتھلیٹ ہیں۔ ۶۱ - ۶۰ میں کالج چیمپئن تھے اس سال ان کی قیادت میں ہماری ٹیم نے انٹر کالجیٹ مقابلوں میں کئی قابل فخر انعام جیتے۔ اقبال اختر پانچ فٹ گیارہ انچ جمپ لگا کر یونیورسٹی ریکارڈ ہولڈر ہیں۔

طالبات:- ہمارے کالج میں طلباء کے ساتھ ساتھ طالبات کو بھی کھیل میں حصّہ لینے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس سال سعیدہ شاہ کپتان طالبات تھیں۔ اُن کی قیادت میں طالبات نے کھیل میں دلچسپی کا اظہار کیا اور کھیلوں کے سالانہ مقابلوں میں طالبات میں سخت مقابلہ ہوا۔ سعیدہ شاہ چیمپئن طالبات رہیں۔

۱۹۶۲-۶۳ء میں اردو کالج جیمخانہ کے مندرجہ ذیل عہدیداران رہے ۔

سید ضیغم یزدان	نگران جیمخانہ
اقبال احمد خاں	معتمد ״
فرحت حسین	شریک معتمد ״
سید علی رضی	کپتان ہاکی
عزیز علوی	״ کرکٹ
افضال حسین	״ فٹ بال
مختار احمد	״ باسکٹ بال
اطہر زیدی	״ والی بال
منیر سبحانی	״ ٹیبل ٹینس
نسیم احمد	״ بیڈمنٹن
سلیم ڈار	״ اسپورٹس
سعیدہ شاہ	״ طالبات
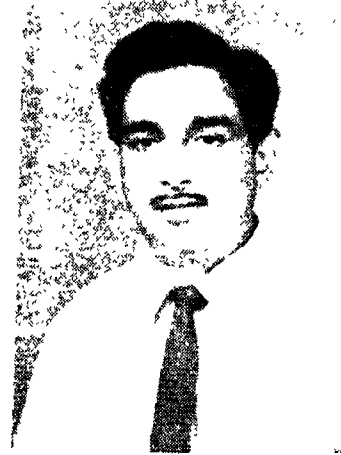
عہدیداران محکمۂ تادیب ڈگری
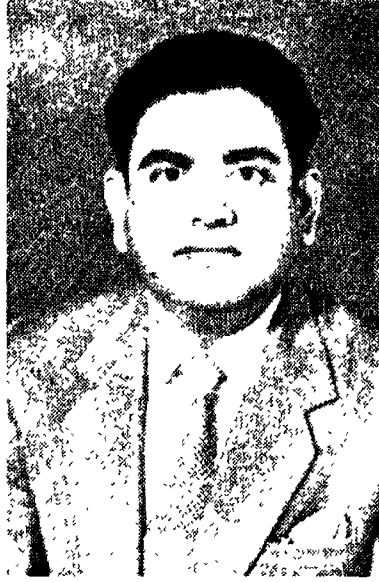
پروفیسر سید احمد حسن زیدی
ڈائرکٹر
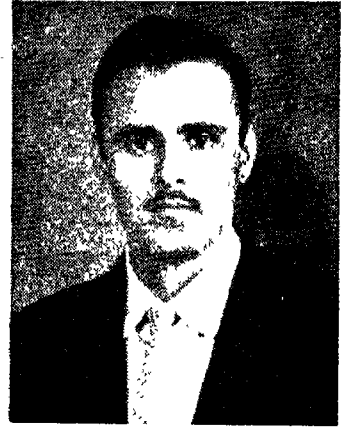
سید مسعود احمد سبزواری
سینئر ڈائرکٹوریل مانیٹر

جمیل الدین صدیقی
ایڈیشنل سینئر ڈائرکٹوریل [illegible]

غلام رضا
ڈپٹی سینئر ڈائرکٹوریل مانیٹر

محمد ضرغام صدیقی
ڈپٹی سینئر ڈائرکٹوریل [illegible]

رپورٹ
محکمۂ تادیب

جمیل الدین صدیقی
ایڈیشنل سینئر پراکٹوریل مانیٹر

محکمۂ تادیب

اردو کالج اپنی انتظامی خوبیوں کی بدولت بھی پاکستان کے دوسرے کالجوں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ کالج کا انتظام محکمۂ تادیب کے سپرد ہے۔

اردو کالج میں محکمۂ تادیب کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ طلباء میں کردار کی تعمیر اور ان کے اخلاق و آداب کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ نہ صرف مختلف اجتماعات میں سنجیدگی اور وقار کے ساتھ شریک ہوں بلکہ عام زندگی میں بھی پیش آنیوالے مواقع پر بھی نظم و ضبط کا پاس رکھیں۔

اس شعبہ کی بدولت طلباء میں ناپسندیدہ اور غیر شائستہ حرکات ختم کی جاتی ہیں۔ ترغیب و تنبیہ دونوں طریقوں سے اُن کے باہمی مناقشات کو دور کیا جاتا ہے۔ دراصل یہی ایک شعبہ ہے جو کالج میں ایک نمایاں خدمت انجام دے رہا ہے۔

شعبہ تادیب کی اہمیت کا اندازہ ان فرائض سے کیا جاسکتا ہے جو یہ انجام دیتا ہے ۔۔ شعبۂ تادیب جن فرائض کو انجام دے رہا ہے وہ یہ ہیں :۔

۱:۔ طلباء اور طالبات میں اخلاق و کردار اور نظم و ضبط کی صلاحیت پیدا کرنا اور ان اوصاف کو برقرار رکھنا۔

۲:۔ طلباء و طالبات میں درس و تدریس کی حد تک اتحاد و اتفاق پیدا کرنا۔

۳:۔ غیر متعلق افراد کو بلا ضرورت کالج کی حدود میں آنے سے باز رکھنا۔

۴:۔ ایسی غیر تعلیمی سرگرمیوں سے طلباء و طالبات کو روکنا جن کی وجہ سے ان کی تعلیم میں خلل یا رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہو یا کالج کے نظم و ضبط یا ادارہ کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۵:۔ کالج یا اساتذہ کی جانب سے منعقد ہونے والے اجتماعات میں رضاکارانہ جذبہ کے تحت خدمت خلق کے

اصول کو اپنے سامنے رکھ کر خدمات انجام دینا۔

۶:۔ روزانہ کالج میں باہمی طلباء کی چپقلش یا شکایات کو منصفانہ طریقہ سے حل کرنا۔

۷:۔ کالج کے طلباء وطالبات کی بر وقت مدد کرنا اور اچانک حادثات کے موقع پر طبی سہولتیں مہیا کرنا۔

اس شعبہ کی ترقی میں نگراں شعبہ کی عمدہ قیادت و سرپرستی کے علاوہ ہمارے محترم و ہر دلعزیز پرنسپل صاحب کی بیش بہا عنایات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جناب پرنسپل صاحب کو اس شعبہ سے گہری دلچسپی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صاحب موصوف خود زمانہ طالب علمی میں علیگڑھ یونیورسٹی میں پراکٹوریل مانیٹر رہ چکے ہیں۔ ہمارے اس تخیل کو جناب پرنسپل صاحب کے ان الفاظ سے بھی تقویت ملتی ہے!

"میں بارہا آپ کو بتا چکا ہوں اور آج بھی بتاتا
ہوں کہ پراکٹوریل مانیٹرز کا رتبہ
اساتذہ کے بعد ہے۔"

محکمہ تادیب کے پراکٹر جناب احمد حسین زیدی صاحب نے بھی حسن کارکردگی اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے ساتھ اس شعبہ کے امور کو ذمہ داری کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔

۶۳-۱۹۶۲ء کے لئے مندرجہ ذیل طلباء کو پراکٹوریل مانیٹرز مقرر کیا گیا۔

مسعود احمد شیرازی	سینئر پراکٹوریل مانیٹر
جمیل الدین صدیقی	ایڈیشنل سینئر پراکٹوریل مانیٹر
ضرغام صدیقی	ڈپٹی سینئر پراکٹوریل مانیٹر
غلام رضا	" " " "

مانیٹران:۔

افضال حسین	مقبول حسین	ناصر الدین
عبدالعزیز	خورشید احمد	میر محمد اکبر
منظور اللہ صدیقی	محمد نواز	عبدالعزیز خان
محمد انور۔	محمد نسیم	افتخار الدین
سعید الدین صدیقی	مشتاق احمد	احسن وحید
محمد نسیم	سلیم احمد رضی	+ + +

ہمارے نتائج

گذشتہ سالوں کی طرح اس مرتبہ بھی اردو کالج کے نتائج بیحد شاندار رہے ہیں۔ جامعہ کراچی کے امتحانات منعقدہ ۱۹۶۳ء میں ہمارے کالج کے طلباء نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ قانون میں ہمارے کالج کے طالب علم جناب محمد ایوب نے جامعہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

اس سال قانون فائینل اور بی ایس سی آنرز کے نتائج ۱۰۰ فی صد رہے ہیں۔ اور قانون فائینل میں ۱۱ طلباء نے درجہ اوّل حاصل کیا۔

فرسٹ ایل ایل بی اور بی۔ اے فائنل کے نتائج ۹۸ فی صد رہے ہیں۔ فرسٹ ایل ایل سے ایک طالب علم اور بی اے آخری سے ۹ طالبعلموں نے درجہ اوّل حاصل کیا ہے

ذیل میں ہم اُن طلباء کی شعبہ جاتی نتائج کی فہرست پیش کر رہے ہیں جنہوں نے مختلف امتحانات میں درجہ اوّل حاصل کیا ہے۔

قانون فائینل

۱:۔ محمد ایوب ۲:۔ شاہ ہدایت اللہ ۳:۔ ضمیر علی قریشی
۴:۔ محمد سعید فاروقی ۵:۔ مسعود احمد بیگ مرزا ۶:۔ سید نواب علی
۷: ظفر ہادی شاہ ۸:۔ سید محمد یوسف رضوی ۹:۔ سید محمد حنیف بخاری
۱۰:۔ محمد عبدالحمید ۱۱:۔ محمد ابراہیم

قانون اوّل

جمیل احمد صدیقی

بی۔ اے فائینل

۱:۔ مسعود احمد شیرازی ۲:۔ مشکور علی چودھری ۳:۔ میر خالد لطیف
۴:۔ محمد رفیق ۵:۔ چودھری محمد اشرف ۶:۔ نور محمد لاکھانی
۷:۔ مشیر علی فاروقی ۸:۔ حبیب احمد ۹:۔ رفیق احمد

بی۔ ایس سی فائینل

۱:۔ حمید رضا خاں یزدانی ۲:۔ خان ممنون حسن

ب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک
...میں افتتاحیہ جلسہ میں انعامات تقسیم کر رہے ہیں

جناب جمیل الدین عالی کل پاکستان اردو متحدہ محاذ کے
ایک خصوصی اجلاس میں تقریر کر رہے ہیں

کل پاکستان بارھواں بابائے اردو مباحثہ

جناب قیصر حسین بخاری مباحثہ کا افتتاح فرما رہے ہیں ـ

جلسہ افتتاح انجمن اتحاد طلباء ڈگری

مرتضیٰ علی شاہ صدر انجمن اتحاد طلباء ڈگری خطبہ استقبالیہ پیش کر رہے ہیں ۔

عہدیداران شوریٰ ڈگری

محمد صدیق حری
رئیس الایوان

سید شاہ حسن جرار
معتمد

محمد اقبال صدیقی
شریک معتمد

حبیب احمد
قائد حزب اختلاف

عہدیداران بزم
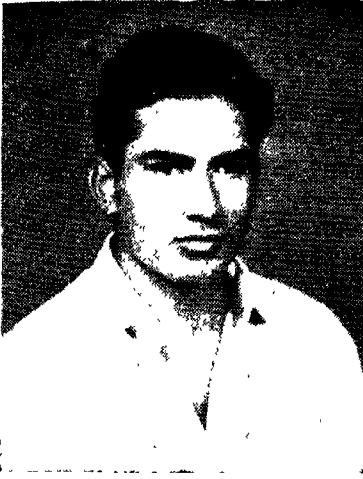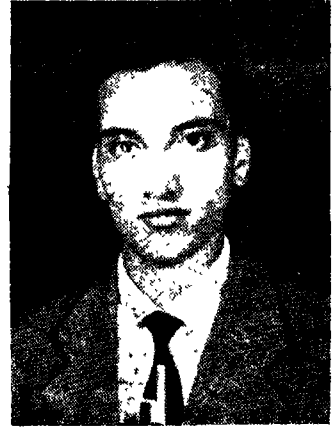
یونس خان لودھی
نائب صدر بزم سماسیات

ظہور اللہ
صدر بزم سماسیات

فیض الحسن خان
معتمد بزم معاشیات

اشفاق احمد ہاشمی
نائب صدر بزم سائنس

سید ظہور مہدی
شریک معتمد کل پاکستان اردو متحدہ محاذ

منظور اللہ صدیقی
معتمد بزم تجارت

محمد ایوب
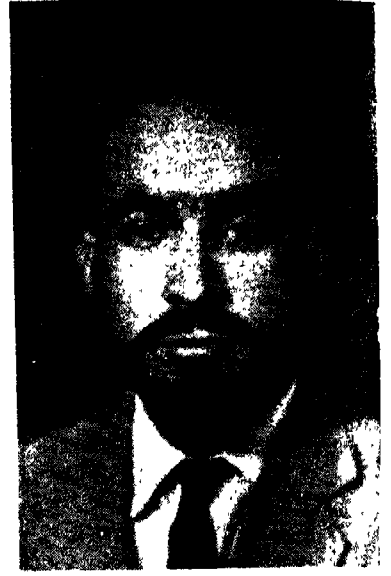
ایل ایل بی فائینل میں جامعہ کراچی

میں دوسری پوزیشن حاصل کی

سعیدہ شاہ

حمس طالبات

احسن وحید

مدیر ''سائنس''

محمود علی اسد

مدیر ''سائنس''
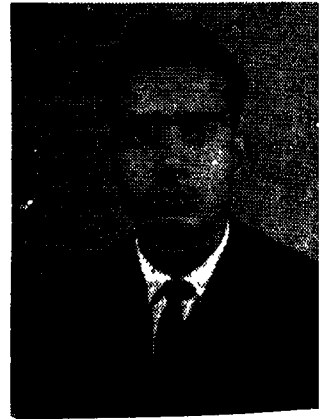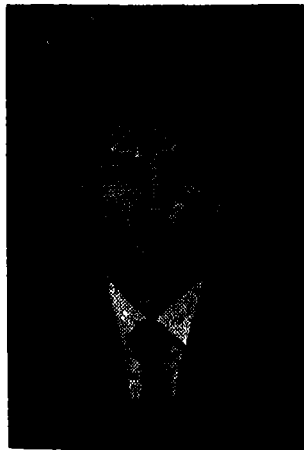
امتیاز حسین مفتی

چیئرمین تمثیل

عہدیداران انجمن اتحاد طلباء (اعلیٰ ثانوی)
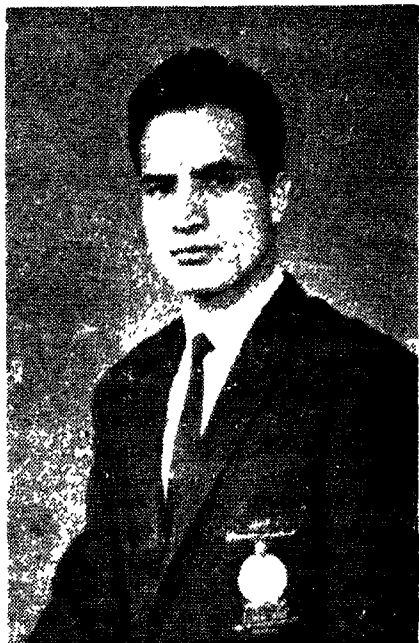
کرامت اللہ بٹ
صدر
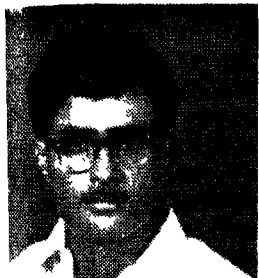
نعیم الدین
نائب صدر

82048
8.1.82

حسن امام رضوی
معتمد عمومی

انور
قائد حزب اختلاف

رئیسہ خاتون
صدر مجلس طالبات
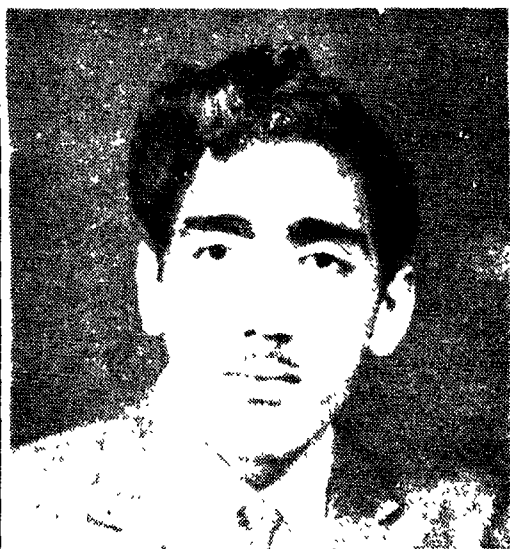
فرسٹ بٹالین یونیورسٹی آفیسرس ٹریننگ کور اُردو کالج کنٹجنیٹ

بابائے اردو کے ساتھ

نومبر سنہ ۱۹۵۰ء
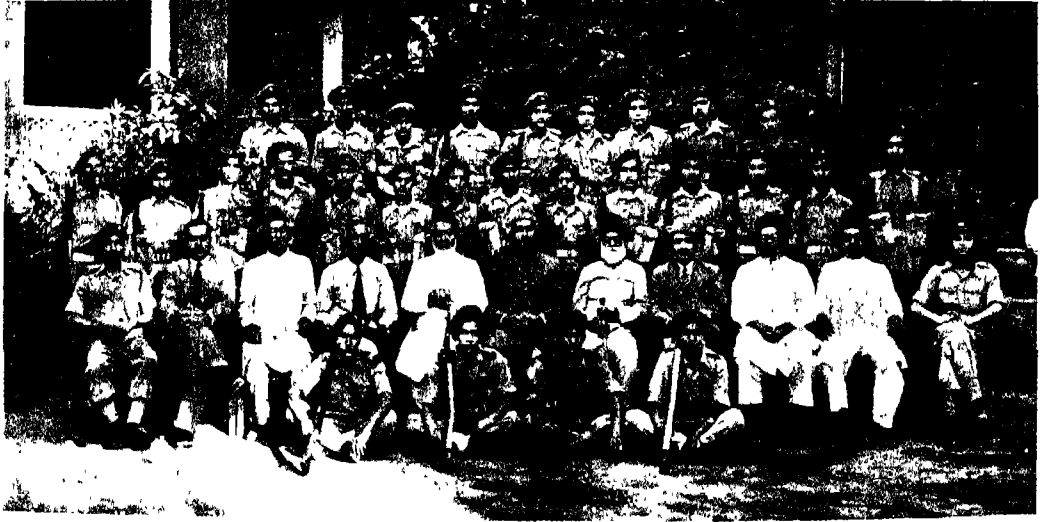
بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں۔ لفٹیننٹ جناب جلیل الدین احمد خاں۔ جناب میاں اختر جوناگڈھی (مرحوم) شریک معتمد انجمن ترقی اُردو جناب سراج
تقی الدین (مرحوم) معتمد اُردو کالج۔ جناب ڈاکٹر معین الحق سابق وائس پرنسپل۔ بابائے اردو۔ جناب ڈاکٹر محمود حسین سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان
جناب سید محی الدین سابق پرنسپل اردو کالج۔ پروفیسر جناب ابراہیم رکن مجلس منتظمہ۔ کیپٹن جناب خان صاحب کیپٹن جناب محمد اکرام الرحمٰن میں کمانڈر و دیگر اراکین
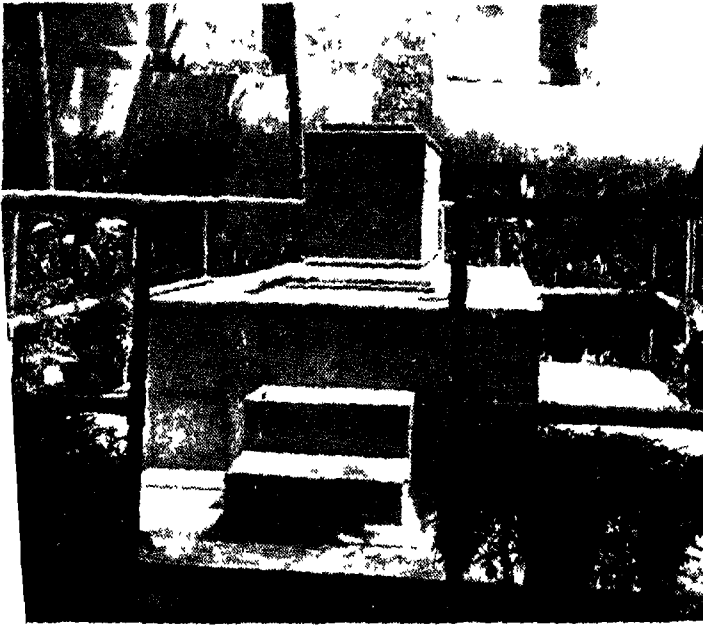
بابائے اردو کی آخری آرام گاہ